
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
جولائی 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
مسافر
نئی سنسنی خیز داستان کی
پانچویں قسط اندر کے صفحات پر

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 41 • شمارہ 07 • جولائی 2012 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ

انشائیہ

مشاعرہ

جون ایلیا

مشاعرے کے معنی ہیں شاعروں کا ایک دوسرے کو شعر سنانا یا شاعروں کا فنِ شعر گوئی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا۔ پہلے معنی کے پیشِ نظر غیر شاعر سامعین کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شاعروں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اب رہے دوسرے معنی تو ان معنی کی رو سے مشاعرے کا سامعین سے بنیادی تعلق ہے اس لیے کہ جب شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا تو اس مقابلے کا فیصلہ کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو شاعر نہ ہوں اور اگر شاعر ہوں تو اس مقابلے میں شامل نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اب ناقد کہلاتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے دو عظیم شاعروں میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ان دو شاعروں میں سے ایک شاعر کی بیوی مقرر کی گئی جو شاعری کی بہت بڑی پارکھ تھی۔ اس خاتون نے اپنے شوہر کی نظم کے خلاف اور حریف شاعر کی نظم کے حق میں فیصلہ دیا۔ عجب خاتون تھی۔ اس نیک بخت خاتون کا انجام کیا ہوا، یہ بات مجھے یاد نہیں رہی بہر حال اگر ہم میں سے کسی کی بیوی ہماری تخلیق کے خلاف اور ہمارے حریف کی تخلیق کے حق میں فیصلہ دیتی تو ہم اسے طلاق دے دیتے۔

ہمارے یہاں مشاعرے کا مفہوم مختلف ہے اور اپنے اس مفہوم کے پیشِ نظر مشاعرہ صرف اردو زبان سے مخصوص ہے۔ عربی میں مشاعرے کا جو دوسرا مفہوم ہے یعنی دو شاعروں کا باہمی مقابلہ، اس مفہوم کے اعتبار سے اردو مشاعرے اور عربی مشاعرے کی کیفیت میں قریبی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اردو مشاعرے میں بھی دو شاعروں کے درمیان تو نہیں، مشاعرے میں شریک ہونے والے تمام شاعروں کے درمیان خواہ مخواہ مقابلے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فضا کے پیدا کرنے میں سامعین حسبِ ذوق اور بر بنائے جانبداری بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی ایک شاعر یا چند شاعر داد و تحسین کی بنیاد پر مشاعرے کے فتح مند شاعر قرار پاتے ہیں۔ مگر فتح مندی، کا یہ فیصلہ ایک ہنگامی فیصلہ ہوتا ہے اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی لیکن مشاعرے کے عام سامعین بلکہ تماش بین اس شاعر کو جسے سب سے زیادہ داد ملے اور جس سے بار بار شعر سنانے کی فرمائش کی جائے سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بدترین شاعر یا بہت معمولی شاعر اپنے اشعار کے سطحی اور اپنی پڑھت کے انداز کے مؤثر ہونے کی وجہ سے بہترین شاعر قرار پاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑے شاعروں کو مقابلے کی اس سطح پر بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کم یا زیادہ داد پانا کسی کسوٹی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ مشاعروں کے انعقاد کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہرگز نہیں ہوتا کہ کون شاعر یا کون کون سے شاعر بڑے یا بہترین شاعر ہیں۔

اردو کے قدیم مشاعروں کے سامعین معاشرے کے وہ لوگ ہوتے تھے جو اعلیٰ ادبی اور فنی شعور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مشاعرہ کوئی عوامی ادارہ نہیں تھا۔ یہ مشاعرے درباروں اور امراء کی حویلیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ مشاعرے کو عوامی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب کالجوں اور یونیورسٹیوں یا دوران سال کی خاص سماجی تقریبات کے مواقع پر مشاعرے برپا ہونے شروع ہوئے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی مشاعروں کو ایک خاص اہمیت بخشی۔ بہر حال ''عظیم الشان'' مشاعرے بیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور اردو زبان کے خواص و عوام کے لیے سب سے اہم تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے خواص اور عوام کے فرق کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

مشاعرے کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اس ضمن میں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مشاعرے کی نسبت سے دیکھا جائے تو شاعری کی چار قسمیں متعین ہیں۔ شاعری کی ایک قسم وہ ہے جو اچھی بھی ہو اور مشاعرے میں بھی پسند کی جائے۔ دوسری قسم وہ ہے جو اچھی ہو مگر مشاعرے میں داد حاصل نہ کر سکے۔ تیسری قسم وہ ہے جو بری ہو اور مشاعرے میں بھی بری قرار پائے اور چوتھی قسم وہ ہے جو بری ہو مگر مشاعرے میں بہت پسند کی جائے۔

بہر حال مشاعرہ ایک ایسا خطرناک ہنگامہ ہے جس میں شاعر کی عزت لحہ لحہ خطرے کی زد میں رہتی ہے۔ یہاں مجھے برادرِ عزیز معراج رسول نے ایک خاص معاملے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جو افراد یا ادارے مشاعرے منعقد کرتے ہیں وہ بلاشبہ قابلِ داد ہیں اس لیے کہ وہ ایسے ''ہنگامے'' بھی برپا کر سکتے ہیں جن سے عوام الناس کو مشاعروں سے کہیں زیادہ دلچسپی ہے اور جن کے ذریعے مشاعرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب بعض مثالیں ایسی بھی پائی جانے لگی ہیں کہ مشاعرے ادبی اور تہذیبی ذوق کی تسکین کے بجائے محض تجارتی مقصد کے پیشِ نظر برپا کیے جاتے ہیں اور ان میں ایسے ''شعرا'' اور ''شاعرات'' کو خاص الخاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے جو محض گویوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود کہتے ہیں اور بہت برا کہتے ہیں۔ مگر اپنی گائیکی کی وجہ سے مشاعرے کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خود نہیں کہتے بلکہ کسی ''مردِ غیب'' سے کہلوالاتے ہیں اور اپنے ٹینٹوے کے زور پر مشاعرے کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس قسم میں شاعرات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ صورتِ حال بہت عام ہے۔ ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ترنم سے پڑھنے والے شاعروں کی تنقیص کریں۔ ترنم سے پڑھنے والے بے شمار شاعر ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشاعرے کے عوام پسند اور خواص پسند تہذیبی ادارے کو اب آہستہ آہستہ محض ایک سطحی قسم کے تفریحی ہنگامے کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ذمے دار وہ افراد اور ادارے ہیں جو مشاعروں کو اپنا تجارتی مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ معاملہ ہے جس کی شدید ہمت شکنی کی جانی چاہیے۔ کیونکہ اب مشاعرہ ہی وہ سب سے بڑا ادبی اور معیاری ادارہ رہ گیا ہے جو اعلیٰ ذہنی فرحت بخشی اور تہذیبِ نفس کا فرض انجام دیتا ہے اور اس کی اس محترم اور اہم حیثیت کی حفاظت کرنا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔

٭٭٭

آپ کے خط

محترم قارئین
السلام علیکم!

جولائی 2012ء کا شمارہ اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ آپ کے ہاتھ میں ہے...... حالات و واقعات کی زنجیر حسبِ سابق اپنے تسلسل کے ساتھ دراز ہوتی جارہی ہے...... ملک میں دہشت گردی کے ساز پر رقصِ اجل جاری ہے۔ نام نہاد مذہبی و سماجی ٹھیکے داروں نے مقامی روایات کے ساتھ مذہب کو کچھ اس طرح گڈمڈ کردیا ہے کہ گھریلو تقریبات میں خوشی منانا بھی ایک جرم بن گیا ہے، خاص طور پر خواتین کے لیے۔ ایک خبر کے مطابق کوہستانی علاقے میں ایک جرگے کے فیصلے کے مطابق چند لڑکیوں کو نجی تقریب میں رقص پر صرف تالیاں بجانے پر سزا کے تحت مبینہ طور پر قتل کردینے کی خبر عام ہوئی جس پر عدلیہ نے فوری نوٹس لیتے ہوئے مقامی انتظامیہ سے باز پرس کی، انتظامیہ کا کہنا ہے کہ لڑکیوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ بہرحال عدالت نے ان لڑکیوں کو پیش کرنے کا حکم دیا مگر تادمِ تحریر اس پیشی کا انتظار ہے دوسری جانب لاہور کے ایک اسپتال میں شارٹ سرکٹ سے لگنے والی آگ اور عملے کی بے حسی و غیر ذمہ داری نے معصوم بچوں کی جان لے لی...... اس کے علاوہ بجٹ کے نام پر پیش ہونے والا ڈراما ''آفٹر شاکس'' کی کیفیت میں ڈھل کر اپنے کلائمکس کی جانب گامزن ہے۔ سی این جی مالکان کی ہڑتال بھی ان میں سے ایک ہے۔ بہرحال عام آدمی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان بری طرح پس رہا ہے اور شاید ان حکمرانوں کے لیے ہی غالب نے کہا ہے۔

''ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک''

اگرچہ جولائی کا مہینا ساون کا خوب صورت موسم لاتا ہے جس میں انواع و اقسام کے پکوان اور جھولوں کا تصور ابھرتا ہے مگر ان آفات اور حالات نے ہر خوب صورت یاد کو ذہنوں سے کھرچ ڈالا ہے لیکن اس حبس زدہ ماحول میں ایک خوش گوار جھونکا ہے ہمارے پاس... آپ کے چلبلے جملوں اور نوک جھوک سے سجا خطوط کا میلا... تو چلیے

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے تبصرہ کررہے ہیں ''بزم یاراں کے لیے ایک صفحہ از حد لازم ہوگیا ہے آپ یوں بھی کرسکتے ہیں کہ سلسلے وار کہانیوں کے آغاز میں ایک صفحہ تصویر نہ بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے وہی صفحہ آپ کے خط کے لیے مختص کردیں، ہم ہوں یا نہ ہوں لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ سسپنس میں بہت زیادہ لوگ ہوں۔ ان کی شمولیت سے سسپنس کی مقبولیت میں اضافہ جزو لازم ہوگا۔ ماشاءاللہ سسپنس کا معیار و وقار دن بہ دن ترقی کررہا ہے اس جدید اور سائنس کے دور میں بھی سسپنس کی اس قدر مقبولیت...... یہی معیار ہونا چاہیے...... اللہ اسے یونہی قائم و دائم رکھے۔ انکل معراج رسول کو صحت و تندرستی اور دیگر اسٹاف کو بالخصوص آنٹی عذرا رسول کو قائم و دائم و کامیاب و کامران رکھے، آمین۔ گزشتہ ماہ بھی...... در یار پر پلکوں سے...... دستک دی لیکن...... اذن باریابی نہ مل سکا۔ (آپ کا خط بہت دیر سے ملا تھا) وطن عزیز میں ایسا کون سا نظام ہے جسے درست یا قابل قبول کہا جاسکے۔ انسانیت ہمدردی، احساس اور مہر و محبت سے نا آشنا خود غرض و بے حس راہنما...... بے بس، لاچار اور چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستی ہوئی مجبور عوام...... غربت، مہنگائی، بے روزگاری، لاقانونیت اور لوڈشیڈنگ کا عذاب...... سنا ہے جنگل کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے۔ شیر ایک جانور کا شکار کرکے مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں تو وہ بھی نہیں ہے، لوٹ مار اور ظلم و جبر و بربریت کا ایسا بازار گرم ہے کہ...... کہیں بھی کوئی کنج زمین میسر نہیں ہے۔ گویا...... خیر چھوڑیں بحث لاحاصل ہے اب کی بار سسپنس نہایت تاب و تمکنت کے ساتھ 18 مئی کو شہر دل میں جلوہ گر ہوا۔ دلکش اور خوبرو...... مہ جبیں، دلنشیں دوشیزۂ سرورق نے یقیناً دل کے تخت طاؤس پر کسی کو بٹھا کر آنکھوں کے در بند کردیے ہیں اور یادِ عہد گزشتہ کی سنسان گلیوں میں تہی دست و تہی داماں بھٹک رہی ہے ویسے...... یوں آنکھیں بند کرلینے سے کوئی حادثہ بھی رونما ہوسکتا ہے، محترمہ، کسی بس یا ٹرک کے نیچے بھی آسکتی ہے اور کسی راہ گیر یا بچے کے اوپر بھی چڑھ سکتی ہیں۔ جون ایلیا نے حسبِ روایت سلولائیڈ پر انگاروں سے گردش ایام کا جگر فگار نوحہ لکھ کر...... دعوتِ فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ اس مرحوم و مغفور مرد قلندر کی حق گوئی و بے باکی...... بے شک کہ یہی آئین جواں مرداں ہے پر پتھر کے بے حس پہاڑوں پر...... کب کسی کی صدائیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ آپ کی باتوں میں حالات حاضرہ کی باتیں...... دل درد سے بھر جاتا ہے۔ مسند صدارت پر ایک دفعہ پھر علی پور سے محمد جاوید بلوچ...... قوم یاجوج ماجوج کو...... خالص لوہے کے چنے چبواتے نظر آئے یقیناً صنف ناقص العقل کو...... دال آٹے کا نرخ نامہ بخوبی یاد ہوگیا ہوگا۔ ناظم آباد سے محمد ادریس خان کا شریف سا تبصرہ...... بھائی صاحب بابرہ شریف اور نواز شریف سے کافی متاثر لگتے ہیں۔ اٹک سے سعدیہ بخاری...... عون انگلش میں AON یوں لکھا جاتا ہے اور اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ عون...... امام حسین علیہ السلام کے بھانجے اور بی بی زینب کے سات سالہ بیٹے تھے جو کہ واقعہ کربلا میں شہید ہوئے۔ ملکوال سے حجاب کنول خان...... اچھا تبصرہ پڑھنے اور سمجھنے کے لیے عقل کا ہونا جزو لازم ہے قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ اچھا نہیں تھا تو...... آپ لکھ کر بتادیں کہ اچھا تبصرہ کیا ہوتا ہے اور ماہا کی اندھی تقلید اور چاپلوسی سے پرہیز کریں یقیناً...... قاعدے میں رہوگی تو فائدے میں رہوگی۔ ماہا ایمان پر کاکوا اور کوے کا ہیلی کاپٹر بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے اور سر میں سات دن مسلسل اینٹی لائس کا ساشے استعمال کریں کیونکہ جوؤں اور لیکھوں نے آپ کے برائے نام دماغ پر...... جائز قبضہ کر رکھا ہے مرچوں کا لیپ بھی نہایت مؤثر ثابت ہوگا۔ جھنگ سے عمران علی...... ہم نے بدست خود اپنی کتاب انکل معراج رسول صاحب کو ارسال کی اور سرگزشت کے صفحات پر انہوں نے از حد محبت اور شکریے کے ساتھ اسے قبول کیا اور اب پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے؟ (وہ تو گئے زمانے کی بات ہے...... فی الحال کتاب کہاں ہے!) عرصہ دراز کے بعد لاہور سے بے حد پیاری بہن حمیرا رضا کی آمد...... تبصرہ نہایت مختصر مگر ان کے زندہ و بخیر و عافیت ہونے کی دلیل ہے۔ شکارپور سے ماریہ علی بھٹو...... میٹرک میں ہیٹ ٹرک کے اتنے سالوں بعد اب آپ اس عمر میں بی اے کررہی ہیں۔ بہاولپور سے ایپا انصاری نے کافی دنوں بعد منہ اور مسور کی دال کے ساتھ درشن دیے اور آپ اپنی بات کررہی ہیں یا کسی اور...... اسٹوڈنٹ بچی کی......؟ سرگودھا سے طاہرہ یاسمین...... آپ نے ڈاکٹر وسیم کو کہاں دیکھ لیا؟ اوکاڑہ سے تصویر العین کا بہترین تبصرہ بصد شوق ملاحظہ کیا، آپ کی جنرل نالج کے لیے تحریر کیا جاتا ہے کہ عون عباس بابر ہمارے دوسالہ بیٹے کا نام ہے 2005ء میں ہم نے پسند کی شادی کی۔ پہلی بیٹی زیست عباس بابر 4 سال کی، دوسرے نمبر عون عباس اور تیسرا بیٹا تقی عباس بابر ہے جس کی عمر 9 مہینے ہے۔ کافی معتبر لوگوں کو...... بلیک لسٹ میں دیکھ کر افسوس ہوا۔ آخری صفحات پر عائشہ فاطمہ کی دشت امکاں...... حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ دوست کو مت آزماؤ ہوسکتا ہے وہ کسی مجبوری کے باعث تمہاری آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور تمہارے درمیان فاصلے، غلط فہمیاں اور رنجشیں پیدا ہوجائیں۔ کاشف نے بہت غلط کیا جو ملکہ کی مجبوری اور محبت کا امتحان لیا اور خود ہار گیا۔ آغاز اچھا تھا لیکن...... اختتام خاصی عجلت میں کیا گیا۔ سلسلے وار کہانی مسافر...... ناصر ملک کا بہترین و منفرد انداز بیاں...... برجستہ و بے ساختہ جملوں کی بروقت ادائیگی...... ہلکا سا سرائیکی ٹچ...... محبتیں نفرتیں، سازشیں، وڈیرا سسٹم، وڈیروں کے چھوٹے ذہن اور کالے کرتوت...... راہ وفا کے مسافر جرم و نفرت کی دلدلوں تک جا پہنچے ہیں۔ میڈم شکیلہ نہایت پُرکشش اور پاورفل کردار ہے دیکھیے اس...... بند گوبھی کے پردوں سے کیا کچھ منظر عام پر آتا ہے۔ کشکول کی گیارہویں قسط بھی زبردست اور شاندار رہی۔ لیاقت حسین کی قدرتی صلاحیتیں قابل رشک ہیں یقیناً نیکی کے راستے پر اللہ اپنے نیک نیت بندوں کی مدد کرتا ہے اور بالآخر شیخ حامد جیسے بدی کے دیوتا...... نمونۂ عبرت بن کر پاش پاش اور صفحۂ ہستی سے نابود و ناپید ہوجاتے ہیں خیر و شر کی ازلی کشاکش یا یہ چشم کشا ماجرائے عبرت...... اپنی مثال آپ ہے۔ انوار صدیقی صاحب کے لیے دعا ہے کہ خدا کرے زور ذہن و قلم اور بھی زیادہ...... کافی دنوں بعد تلخ و سفاک لہجے کی منفرد رائٹر رجنی پٹیل کی کانچ کی چوڑی، دل کی آنکھوں سے پڑھی۔ دنیا انسانوں کا جنگل ہے، اور اس جنگل میں...... انسانوں اور درندوں کے بیچ...... ہوتے ہیں شب و روز تماشے کیا کیا...... ملک صفدر حیات کے تھانے سے ایک اور دلخراش واقعہ۔ سیدھی بات...... ہوس زر میں مبتلا، ایک شقی القلب انسان نما درندے کی درندگی نے ایک ماں کی ممتا کو لہولہو کردیا۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی نہایت مہارت و مشاقی کے ساتھ...... کتب تواریخ کی ورق گردانی...... اور حق ادا ہوگیا۔ شہاب الدین غوری...... تاریخ کی معتبر و نامور شخصیت کی سرگزشت نے معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ ایم اے راحت کی پُراثر و دلگداز تحریر...... وصال صنم کائنات کی سب سے خوبصورت پُرکشش مگر...... خطرناک چیز عورت...... راہ وفا پر گامزن ہے تو تصویر کائنات میں دلفریب رنگوں کا پیکر جمال ہے اور مائل بہ ستم ہے تو فساد ہے، فتنہ ہے، فسوں ہے۔ منفرد اور پسندیدہ مصنف منظر امام کا...... دلچسپ قصہ اپنا بچہ بھی خوب رہا۔ شرارتی نہایت دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ چور کا بھائی...... نے بھی بور نہیں کیا ہیکٹر کا ذہن شاطر تھا مگر دل کمزور...... کاشف زبیر کی بہترین تحریر جیسا تیسا بھی زبردست رہی۔ روپرٹ سیر تھا اور ہیری سوا سیر ثابت ہوا۔ تنویر ریاض کے خواب نے بھی متاثر کیا۔ نہلے پہ دہلا...... یونہی ہوتا ہے اکثر...... ایک عظیم و ذی مرتبت نبی حضرت سلیمانؑ کی ایمان افروز داستان، ایمان تازہ ہوگیا۔ ثمر عباس کی جیت...... حسن و عقل اکثر یکجا نہیں ہوتے اور آخر میں گھٹیا حرکت بھی اچھی لگی۔''

✠ **تراجا ثاقب نواز ثاقب**، رتی ٹبی، ساہیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''جون کا سسپنس مئی کے آخری عشرہ میں ملا۔ سرورق کی من موہنی صورت تو بہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے پلکوں کی چلمن گرادینے کو ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی نے ہمیں اس شعور سے آگاہ کیا، جس سے ہم برسوں پہلے بہت دور جاچکے ہیں۔ پورے ملک اور بالخصوص کراچی میں موت رقص کررہی ہے۔ امن فراہم کرنے والے نیٹو سپلائی کی بحالی میں الجھے ہوئے ہیں۔ اے کاش کہ وہ یہ بھی کردکھائیں کہ ملکِ خداداد کے باسیوں کے لیے زندگی کی سپلائی بحال کردی گئی ہے۔ سسپنس دستک میں محمد جاوید بلوچ کرسی صدارت پر موجود تھے۔ جناب صدر میرا مختصر تبصرہ دیدہ دانستہ ہوتا ہے تاکہ دیگر ساتھیوں اور خاص طور پر نئے آنے والوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ مل سکے۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے میں یہ محسوس کررہا ہوں کہ سسپنس کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے بہت سے نئے ساتھی بھی متوجہ ہورہے ہیں۔ دیگر اپنوں میں حجاب کنول اور تصویر العین نمایاں رہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے غزنی تا دہلی تک کھنکتی تلواروں کی جھنکار ہمیں سنوادی۔ وصال صنم قدرے طویل ہوئی۔ اپنا بچہ کے آخر میں لیا گیا فیصلہ ہی درست فیصلہ ہے۔ فریڈی اور لیوایر کی قسمت اچھی تھی کہ ان کی کی گئی شرارت انہیں مہنگی نہیں پڑی۔ سیدھی بات میں ملک صاحب مقتول یعقوب کے اصل قاتل کچے مجرم نواز تیلی عرف نواجا کو کیفر کردار پہنچانے میں کامیاب رہے۔ ہیکٹر کو چور کا بھائی میں کامیابی کے بہت نزدیک آکر اجل نے آن دبوچا۔ جیسا تیسا میں کامیاب جیب تراش ہیری کارٹر کو اس کی حسین منزل بنی مل گئی۔ رجنی پٹیل صاحبہ کی عرصہ دراز بعد کانچ کی چوڑی کی صورت میں واپسی ہوئی ہے۔ کہانی میں ان کا وہی پرانا انداز قائم و دائم ہے۔ نہلے پہ دہلا میں بے چارے میلکم کی محنت کا ثمر رابرٹا لے اڑی۔ اسلامی ایمان افروز داستان حضرت سلیمانؑ کے اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ گھٹیا حرکت میں پیٹر اور جونی کے ساتھ ان کی قسمت ہاتھ کرگئی۔ ملکہ اور کاشف کی ناکام محبت، دشت امکاں میں ان دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدائی کا زہر تحفے میں دے گئی۔ کترنیں خوب رہیں، شاعری کا معیار بلند رہا۔ خاکوں کی واپسی دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔'' (اتنے خوب صورت تبصرے کا شکریہ)

✠ **حسین عباس بلوچ**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''اس ماہ کا شمارہ حیران کن طور پر انیس کو ہی مل گیا کچھ گرمی کی وجہ اور اوپر سے غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ نے زندگی ان کال کوٹھریوں میں اجیرن کررکھی ہے اس وقت ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا ایئرکنڈیشن کی طرح سرد احساس لیے سسپنس آیا اور ٹائٹل پر لڑکی پینڈو لگی۔ انشائیہ میں انسانی شعور کے پہلو کو اجاگر کیا گیا۔ سعدیہ بخاری جی ماہا ایمان جی کو آپ نے ٹارزن کردیا اصل ٹارزن پھر کون ہوا۔ عون OWON اس طرح لکھا جاتا ہے۔ حجاب کنول خان جی آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہمایوں سعید راج فارغ ہیں۔ حمیرا رضا بہن جی، شادی کی ایک دفعہ پھر مبارک باد، دولہا بھائی کو بھی مبارک باد اور ہاں کیا دولہا بھائی اردو نہیں پڑھ سکتے جو آپ پڑھ کر سناتی ہیں۔ کہانیوں میں ابتدا کشکول سے کی سیون اسٹار کی بے وفائی نے ہاشم کو چھین لیا۔ لیاقت حسین ڈپٹی سراج کے ساتھ شامل ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ مسافر اپنی رفتار سے جاری وساری ہے۔ ملک صاحب کی اچھی تحریر ہے۔ کاشف زبیر انکل جیسا تیسا لائے۔ ہیری اور بنی آخر میں مل گئے۔''

✠ **طاہرہ یاسمین**، ضلع سرگودھا سے محفل میں چلی آرہی ہیں ''اس ماہ کا شمارہ 17 مئی کی دوپہر کو مل گیا تھا۔ شہزادو نے لاکر دیا۔ ٹائٹل گرل بہت سندر تھی بالکل اپنی سعدیہ بخاری جیسی۔ پھر محفل یاراں میں پہنچے تو کرسی صدارت پر محمد جاوید بلوچ بھائی کو پایا، مبارک ہو بھائی جان، آپ کا تبصرہ اس بار سب سے نمبر ون تھا۔ اس بار رجنی پٹیل جی نے ہم سب کی التجا آخر مان ہی لی۔ آپ کی کہانی بہت شاندار تھی اب ناراض مت ہونا اور لکھتی رہنا۔ سعدیہ بخاری جی آپ کے ان الفاظ سے بہت خوشی ہوئی سب گھر والوں کو بھی اور مجھے بھی معصوم سا تبصرہ والی بات پر آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ حجاب کنول خان آپ کا یہ اندازہ تو غلط ثابت ہوگیا کہ شیر علی خان کا اگلا خط چھپے گا۔ حجاب کنول جی آپ نے یہ کیوں کہا کہ قدرت اللہ کے تبصرے میں خاص بات نہ تھی ان کا تبصرہ تو

سب سے خاص ہوتا ہے۔ عمران حیدر بلوچ جیل سرگودھا ہمارے قیدی کزن کا نام محمد خان ہے کراچی جیل سے تبادلہ ہوکر سرگودھا آئے ہیں۔ ماہا جی آپ کی... بات پر بہت ہنسی آئی۔ شاہ زیب جٹ، بھئی موسٹ ویلکم محفل میں، تصویرالعین:... تم بڑی پیاری ہو۔ ماہا کی تعریف نہ کروں تو کیا کروں وہ ہے ہی تعریف کے قابل، کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی مسافر، بہت اچھی جارہی ہے۔ شہر یار بھی لیکھے پتر کی طرح ڈھیروں لڑکیوں کے پاس منڈلاتا ہے۔ چور کا بھائی، جیسا تیسا اچھی تحریریں تھیں دشتِ امکاں اس ماہ کی سب سے بیسٹ تحریر تھی۔ کشکول بھی بہت شاندار جارہی ہے آئندہ قسط کا بے صبری سے انتظار ہے اور سیدھی بات ملک صفدر حیات کی تحریر ہو اور شاندار نہ ہو یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آئندہ قسط کا شدت سے انتظار ہے۔"

✠ **عمران حیدر بلوچ،** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس ماہ بھی ہماری کوشش رنگ لائی اور سسپنس کا دیدار 19 تاریخ کو نصیب ہوا۔ سرورق بہت دلکش تھا۔ محفل دوستاں کی قیادت محمد جاوید بلوچ کررہے تھے، ان کو مبارک باد۔ سعدیہ بخاری بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو انگریزی میں عون لکھنا نہیں آتا نالائق، حجاب کنول خان ویلکم! ماہا جی شارقہ کی واپسی کے سیاسی بیان دینا چھوڑ دیں۔ حمیرا رضا جی حسنین عباس بلوچ کی بکری بیٹھ گئی ہے وہ غائب نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ ایہا انصاری میں آپ کو نئی کتابیں بھجوا سکتا ہوں۔ مدیرہ آنٹی اگر زرسالانہ میں بھجوادوں اور شمارہ ایہا کو مل جائے، ایسا ہوسکتا ہے (بالکل ہوسکتا ہے) طاہرہ یاسمین اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کو شفا دے اور آپ کی پریشانیاں دور کرے، آمین! تصویرالعین پریشان نہ ہوں۔ نانی، دادی بننے کی خواہش جلد پوری ہوجائے گی۔ تمام دوستوں کو بتاتا چلوں کہ 14 جولائی کو میری 24 ویں سالگرہ ہے اور قید خانے میں تیسری، تمام دوست دعا کریں کہ یہ میری قید خانے میں آخری سالگرہ ہو (آمین) سب سے پہلے مسافر پڑھی شہرے کا اعتماد تو کھالے پر بحال ہوگیا مگر نئی مصیبت 302 کی شکل میں گلے پڑ گئی۔ شکیلہ اور میرو شاہ نے جان تو چھڑوا دی مگر اس کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور اس کے گھر میں کیا واردات ہوئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کشکول میں ہاشم کی خودکشی اور سراج اور اورنگزیب کی رستم علی کی ملازمہ تک رسائی اور واپسی پر ان پر حملہ لیاقت کی غیبی قوت کہاں تک مدد کرتی ہے انتظار رہے گا۔ منظر امام کی اپنا بچہ زبردست کہانی تھی جس میں حکیم نے فوزیہ اور اس کے شوہر کو کتنی آسانی سے بے وقوف بنالیا اور خود انعام وصول کیا۔ ثمر عباس کی تحریر جیت ہار میں کیتھرین نے چالاکی کی مگر سب کچھ ہار دیا۔ انعام، کین اور میکس بھی۔ عبدالقیوم شادی کی کہانی گھٹیا حرکت میں پیٹر اور جوئی نے بڑی عقلمندی کا مظاہرہ کیا مگر پھر بھی پکڑے گئے۔ کاشف زبیر کی جیسا تیسا ہمیشہ کی طرح زبردست تحریر تھی۔ سلیم انور کی نہلے پہ دہلا میں رابرٹا نے میلکم کو خوب بے وقوف بنایا۔ محفل شعروسخن میں ماہا ایمان، ماریہ علی بھٹو، محمد اظہر کے اشعار اچھے تھے۔ مدیرہ آنٹی میں نے تو آپ کو اپنی سالگرہ پر پھول کا تحفہ دیا ہے آپ مجھ کو کیا تحفہ دیں گی؟" (ڈھیر ساری دعائیں)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی،** حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں "سرورق کی حسینہ امید و یاس کی کیفیت میں نظر آئی کہ اتنا انتظار تو کرلیا ہے پتا نہیں "نیازی" آتا بھی ہے یا نہیں؟ (واہ واہ..... کیا خوش فہمی ہے) جون ایلیا شعورِ انسانی پر لب کشا ملے۔ اداریہ میں گزشتہ ماہ ہونے والے حادثات کا ذکر تھا جس پر ہر پاکستانی افسردہ ہے۔ اتنے روز کی جدوجہد کے بعد بھی گیاری میں ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی (مگر اب کچھ پیش رفت نظر آرہی ہے) محمد جاوید بلوچ اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ اول نمبر پر تھے، بلاشبہ ایک بہترین تبصرہ تھا۔ سعدیہ بخاری وہ محاورہ ہے کہ "زبانِ خلق نقارہ خدا" تو اب مان ہی لیں کہ یادداشت کے معاملے میں آپ کے بارے میں تمام دوستوں کی رائے ایک ہی ہے..... ماہا کی واپسی کو آپ نے تارزن کی واپسی قرار دے کر بہت زیادتی کی ہے۔ حسنین عباس بلوچ! خیر مبارک اور دعا ہے کہ اللہ آپ کو پھر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع دے، آمین۔ ماہا ایمان! آخر آپ نے خود کو اندھا تسلیم کرہی لیا، عمر بھی تو بہت ہوگئی ہے۔ 1990ء کا ایک سسپنس پچھلے دنوں ہاتھ لگا تو آپ کا خط پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا باقی حساب کتاب دوست خود کرلیں اور ایک اور بات بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ آپ کی "شارقہ" اب کبھی نہیں آئے گی محفل میں۔ شاہ زیب جٹ! برادر، آپ نے تو سسپنس اور جاسوسی کو گڈمڈ کردیا ہے۔ عمران علی! بھئی آپ کو کس نے روکا ہے بونگیاں مارنے سے۔ ایہا انصاری! یہ بڈھے ویلے B.A. کرنے کی کیا سوجھی آپ کو؟ کتابیں تو ہیں لیکن دیں گے نہیں کیونکہ کورس Change ہوگیا ہے۔ بہتر ہے نئی کتابیں لے لیں۔ طاہرہ یاسمین! جیو، دل خوش کردیا، ہماری طرف سے ماہا کو جواب دے کر۔ احمد خان توحیدی! بھئی بادام کھانے کا مشورہ سعدیہ بخاری کو دیا گیا ہے آپ کی یادداشت تو ماشاء اللہ کافی اچھی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، شہر یار کا مطلوبہ بندہ یقیناً یارن خان ہی ہوگا۔ کشکول میں لیاقت حسین کے ہم زاد نے پھر کام دکھادیا اور جگا اور اس کے آدمیوں کو دھماکے والی جگہ سے نکال کرلے گیا۔ ہاشم کی خودکشی اچھی نہیں لگی جب مرنا ہی تھا تو شیخ حامد کو مار کر ہی مرجاتا اوروں کا تو بھلا ہوجاتا۔ ڈاکٹر ساجد امجد شہاب الدین کے دورِ حکومت کی تاریخ بیان کرتے نظر آئے اور اس کو بڑے دلچسپ پیرائے میں کہانی کے قالب میں ڈھالا جس سے تاریخ کے خشک واقعات بھی دلچسپ محسوس ہوئے۔ ایم اے راحت وصالِ صنم میں عورت کے مکروفریب سے آگاہ کرتے نظر آئے۔ شانہ خان کا طریقۂ واردات واقعی لاجواب تھا اس کا حسن اور دولت مل کر مرد حضرات کو بالکل ہی دیوانہ کردیتے تھے اور وہ اپنا کام دکھا جاتی۔ اپنا بچہ میں حکیم صاحب تو بڑے چالاک نکلے اور بے چارے میاں بیوی کو جل دے کر دس لاکھ ہڑپ کرگئے۔ ملک صفدر حیات سیدھی بات لے کر آئے، نواجا اور اس کے ساتھی نے رقم کے لالچ میں ایک ماں کو اس کے اکلوتے بیٹے سے محروم کردیا اور خود بھی سزا سے نہ بچ سکے۔ دوستوں کے اصرار پر آخرکار رجنی پٹیل کانچ کی چوڑی لے کر آہی گئیں۔ کانتا جب رمیش سے دھوکا کھا بیٹھی تو اسے راجن کمار اچھا لگنے لگا۔ راجن نے سب کچھ جانتے ہوئے جو اسے اپنایا وہ بہت عجیب لگا۔ نہلے پہ دہلا میں چور کو پڑ گئے مور، میلکم واقعی احمق نکلا، ذاتی اے، ٹی ایم رسید کو دھمکی نما پیغام کے لیے استعمال کیا اور پھر ادھ کھایا سینڈوچ لے کر بھاگ نکلا۔ رابرٹا نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اب بات ہوجائے آخری صفحات پر موجود کہانی دشت امکاں کی اگرچہ یہ ایک اچھی کہانی تھی لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑرہا ہے کہ یہ ایک نقل شدہ کہانی ہے۔ عائشہ فاطمہ نے اگرچہ ایک دو جگہ صورتِ حال میں تبدیلی کی ہے۔ تاہم آغاز و انجام سب وہی ہے (بعض اوقات کہانی میں مشابہت صرف اتفاقی ہوتی ہے) محفل شعروسخن میں بہت اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔ کمال انور اور محمد لطیف ساحل کا انتخاب سب سے بہترین تھا۔"

✠ **طاہر الدین بیگ،** میرپور خاص سے تشریف لائے ہیں۔ "محبوب نامہ جون، گرمیوں کی حشر سامانیوں کے ساتھ وقت پر ملا۔ غیر اعلانیہ

لوڈشیڈنگ نے میرپور خاص کے باسیوں کو دہرے عذاب میں مبتلا کررکھا ہے۔ جمہوریت پسندوں کو خلقِ خدا کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ عوام بلک رہے ہیں۔ تڑپ رہے ہیں لیکن حکمران ہیں کے کوالیفائیڈ اور ڈس کوالیفائیڈ کے چکر میں لگے ہوئے ہیں..... اللہ کی پناہ، اس قدر ظلم۔ نہ جانے ظالم یہ بات کیوں بھول گیا ہے کہ جب مظلوم کی آہ عرش سے ٹکرائے گی اور جب خالق کائنات کی پکڑ شروع ہوگی تو پھر کوئی نہیں بچے گا، کوئی نہیں...... آپ کے خط میں ماریہ بھٹو کو خوش آمدید، دعا ہے وہ B.A. میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کریں (آمین) طاہرہ گلزار صاحبہ سکھی رہا کریں، میری دلی دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے تمام دکھ درد دور کرے، آمین۔ عین صاحبہ آپ کا تبصرہ اچھا رہا آپ کو دیکھ کر حیرت نہیں، پڑھ کر خوشی ہوئی بس کہانیوں پر بھی تبصرہ کردیا کریں۔ حجاب کنول اور ماہا ایمان خوب صورت تحریروں کے ساتھ بہت خوب رہیں اور خوب تو جاوید بلوچ اور سعدیہ بخاری بھی رہے۔ کافی اچھے تبصرے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جون کے سسپنس میں خواتین اپنے دلچسپ اور خوب صورت تبصروں کے ساتھ چھائی رہیں ویلڈن۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سلطان شہاب الدین غوری کی سوانح حیات بڑی دلچسپی سے پڑھی یہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جو دہلی کے دروازے تک آیا اور 35 سال تک بہت شان سے حکومت کرگیا۔ مسافر اپنے سفر پر بڑے شاندار طریقے سے رواں دواں تھے۔ زیر مطالعہ قسط میں مسافر کے جوہر آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوگئے ہیں۔ یہ سونا مسافر کندن بننے کے سفر پر روانہ ہوچکا ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ انوار صدیقی صاحب کا کشکول نئے کرداروں سے بھرتا چلا جارہا ہے۔ ہر کردار اپنی چمک کے ساتھ سسپنس کی روشنی بڑھا رہا ہے۔ لیاقت حسین صاحب اسرار کے پردے میں چھپے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لیاقت حسین کے اسرار کے پردے کا راز کب آشکار ہوتا ہے۔ منظر امام کمال کرگئے، اپنا بچہ جیسی تحریر امام صاحب آپ ہی لکھ سکتے ہیں ابتدا سے انتہا تک ایک خوب صورت اور دلچسپ تحریر تھی۔ مختار آزاد صاحب کی شرارتی اور تنویر ریاض کی خواب بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ ذہنوں میں نقش چھوڑ دینے والی تحریریں تھیں۔ ویسے اس مرتبہ تمام بدیسی کہانیاں بہت ہی دلچسپ اور شاندار رہیں۔ رجنی پٹیل صاحبہ کافی عرصہ بعد آئیں مگر رنگ کچھ پھیکا پھیکا لگا۔ کانچ کی چوڑی یہ عنوان کتنوں کی سمجھ میں آتا ہے، دیکھتے ہیں۔ اب جناب ذکر ہوجائے ایک اور خوب صورت بدیسی کہانی کا، عنوان ہے نہلے پہ دہلا اور ایک اور کہانی گھٹیا حرکت۔ نہلے پہ دہلا میں تو چور کو پڑگئے مور اور گھٹیا حرکت کا انجام قہقہہ لگانے کو دل چاہتا ہے۔ اس گھٹے گھٹے ماحول میں یہ سب کہانیاں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئیں۔ زندہ باد سسپنس۔" (بہت شکریہ)

✠ **عمران علی،** جھنگ سے چلے آرہے ہیں "اس دفعہ سسپنس 18 تاریخ کو ملا۔ انکل ذاکر لگتا ہے اس بار آپ بڑی سادگی پہ اتر آئے ہیں۔ شاہکار بہت اچھا اور سادہ تھا۔ انشائیہ میں اس بار شعور کے موضوع پر بحث کی گئی تھی۔ شعور ہی کی وجہ سے انسان زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے اگر انسان میں شعور ہے تو منزلیں جلد طے کرلے گا ورنہ منزلیں بہت کٹھن، دشوار گزار راستوں کی طرح اس کو آگے نہ بڑھنے دیں گی۔ یاران محفل میں محمد جاوید بلوچ صاحب کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ سدا خوش رہیے جاوید صاحب۔ سب سے پہلے ایہا انصاری کے تبصرے پر بحث کروں گا۔ تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ کیا ایہا کو ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ سب دوست اگر مل کر یہ مسئلہ حل کردیں تو نیکی اور کارِ ثواب میں حصہ لینے کے مترادف ہوگا (آپ سب کا کیا خیال ہے) اس بار تبصرہ نہیں لکھنا تھا بالکل ٹائم نہیں تھا اگلے مہینے ایم اے کے امتحان ہیں اور ساتھ کلینک بھی، بڑی مشکل سے ٹائم نکالا ہے۔ شاید اگلی محفلوں میں کچھ غیر حاضری ہو، دعا کرنا رب تعالیٰ امتحانوں میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ ایہا اگر بی اے کا نصاب پنجاب اور بہاولپور یونیورسٹی کا ایک جیسا ہے تو کتابیں میرے پاس پڑی ہیں تو ایڈریس بتادیں میں بھیج دوں گا۔ جاوید صاحب، بہت خوب فرمایا۔ رجسٹر حاضری نہیں واقعی کھڈے لائن ہے۔ یہ تو تفسیر صاحب سے پوچھنا پڑے گا کہ تبصرہ کہاں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ جی تفسیر صاحب، بتائیں ذرا۔ سعدیہ بخاری یہ ماہا تارزن کب سے بنی ہیں۔ لگتا ہے آپ نے لیڈی پولیس جوائن کی ہوئی ہے۔ حسنین بھائی دعاؤں کا شکریہ۔ آپ جھنگ کس جگہ پر رہتے تھے۔ حجاب کنول جی، سویٹ ویلکم، جی آیاں نوں۔ عمران حیدر بلوچ رب تعالیٰ آپ کو رہائی نصیب فرمائے۔ واقعی ماہا کے آنے سے محفل سجی ہے۔ شاہ زیب جٹ، جی آیاں نو اللہ آپ کو کامیابی دے (آمین) آتے رہیے گا۔ کچھ پرانے چہروں سے شناسائی ہورہی ہے مثلاً حمیرا رضا، ایہا انصاری، سعدیہ بخاری جیسے اور چہرے بھی منظرِ عام پر آنے لگ گئے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ طاہرہ آج کل کے دور میں کوئی اچھی بات کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرتا، سنتا ہے عمل نہیں کرتا۔ سب کو سیدھے نام سے پکارنا چاہیے۔ شاید حدیث پاک پڑھی تھی کہ جب کوئی بندہ کسی دوسرے کا نام سیدھا نہیں بولتا اس بندے کی نیکی جس کا نام بولا اس کی طرف چلی جاتی ہے۔ تصویرالعین یہ کیا کہیں ماہا کو داد دے رہی ہو کہیں اس کی ٹانگ کھینچ رہی ہو خیر تو ہے۔ احمد خان توحیدی واقعی سسپنس و سرگزشت میں بہت اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو انسان کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ طاہرہ یاسمین، ماہا ایمان اور جاوید بلوچ کے تبصرے اچھے لگے۔ اب آتے ہیں خوبصورت کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے بڑی بے صبری سے مسافر اور کشکول پڑھی وہ بھی ایک ہی نشست میں ختم، بہت مزہ آیا۔ دونوں کہانیوں کا ایڈونچر اب بہت جاندار ہوگیا ہے۔ عائشہ فاطمہ کی کہانی دشت امکان زندگی میں حقیقت یہی ہے کہ تقدیر کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی جس کی زندگی میں جو کرنا ہو وہ بڑی سادگی سے کردیتی ہے۔ محبت میں بچھڑنا آزمانا اک ادا ہی ہے لیکن کبھی اتنی کٹھن آزمائش ملتی ہے کہ جو زندگی میں نہ بھولنے والا حصہ بن جاتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی سیدھی بات واقعی لالچ بری بلا ہے، ہر مجرم سے کوئی نہ کوئی بھول ہوجاتی ہے اور اللہ کی لاٹھی بھی بے آواز ہے۔ روحانیت کے موضوع پر رضوانہ ساجد کی کہانی حضرت سلیمانؑ، سبحان اللہ..... اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بہت اعلیٰ مقام عطا فرمایا۔ حضرت سلیمانؑ کی سوانح حیات میں کچھ نئے واقعات پڑھنے کو ملے۔ شکریہ۔"

✠ **جعفر حسین،** بھوآنہ ضلع چنیوٹ سے محفل میں تشریف لائے ہیں "گرد و پیش کے حالات و واقعات پہ غوروفکر اور ہر واقعے کے پیچھے چھپی حقیقت کو تلاش کرنے کی ازلی جستجو انسان کو پوری کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو جون صاحب نے بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے، مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کیا ہم واقعی شعور کی اس منزل پہ ہیں جہاں پر ہم اپنے حقوق اور آزادی کی بات کرسکیں۔ 21 مارچ کو پوسٹ کیے گئے خط کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی (کبھی کبھی رونے والی بات پر بھی ہنس لینا چاہیے۔ صحت کے لیے اچھا رہتا ہے) جاوید بلوچ صاحب اوسط درجے کے تبصرے پر اوسط سی مبارک باد قبول کریں۔ حجاب کنول صاحبہ کی اپنے بارے میں خیال آرائی پڑھ کر دو باتوں کی وجہ سے لبوں پہ بے اختیار ہنسی آگئی۔ پہلی بات تو یہ کہ محترمہ میرے طرزِ تحریر سے

متاثر ہیں اور میرے سسپنس کی نسبت جاسوسی میں شائع ہونے والے خطوط کو زیادہ توجہ سے پڑھتی ہیں اور دوسری یہ کہ میرا ہر خط پچھلے کا تسلسل ہوتا ہے سو اس لیے مجھے آپ کی طرح اردو لغت اور پرانے رسالے کھنگالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رمضان پاشا، سعدیہ بخاری اور ماہا ایمان صاحبہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ایبا انصاری آپ کا کام تو صرف ایک بندہ ہی کرسکتا ہے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ' تصویر العین صاحبہ آپ کے خاکے کب شائع ہو رہے ہیں؟ وصال صنم نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ اپنا بچہ سطحی مزاج کی حامل عام سی تحریر تھی۔ کھیل ہی کھیل میں جرائم پیشہ افراد تک رسائی کی روداد لیے شرارتی معیاری انتخاب تھا۔ چور کا بھائی ان لوگوں کو آئینہ دکھا رہی تھی جو زندگی کے ہر شعبے میں کھلی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کاشف صاحب کی تحریر ہمیشہ سے جداگانہ اور منفرد ہوتی ہے۔ جیسا تیسا بھی ان کا بہترین انتخاب تھا۔ ضرورت جب بڑھ کر حرص کی شکل اختیار کرجائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو خواب میں سونی ٹیلر کے ساتھ ہوا۔ ادب اپنے اظہار کے لیے کسی مخصوص ماحول، موضوع یا تخیل کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ رجنی پٹیل کی جتنی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، گستاخی معاف محترمہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی فکر سے متاثر لگیں، رجنی صاحبہ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ تحریروں میں تنوع، معاشرتی ناہمواریوں، مسائل، طبقاتی تقسیم اور برائیوں کے خلاف جدوجہد کا رنگ نمایاں ہونا چاہیے۔ ذہانت اور طاقت کے درمیان معمولی سا فرق ہوتا ہے، اسی فرق کو بیان کرتی نہلے پہ دہلا بہترین رہی۔ بدنصیبی اور بری قسمت کے گرد گھومتی جیت ہار متاثر کن رہی۔ محفل شعر و سخن میں محمد کامران اور ماریہ بھٹو کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی سلطان شہاب الدین غوری کے بارے میں تحریر پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس نمایاں تھا۔ حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ کشکول اپنے ابتدائی تاثر کے برعکس ثابت ہو رہی ہے۔ کہانی کچھ غیر حقیقی اور واپسی کی مانند کسی اور سمت میں رواں دواں ہے۔ مسافر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اپنے سابقہ انداز کے برعکس ناصر صاحب بڑی خوب صورتی سے مسافر کا سفر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور اتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے موثر انداز میں بیان کر رہے ہیں۔ ملک صفدر حیات صاحب کی سیدھی بات کافی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی۔ پتا نہیں کیوں یوں لگتا ہے کہ ملک صاحب کے کیسوں میں اب حقیقت کم اور افسانوی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ دشت امکاں ہماری تمام تر امیدوں کے برعکس عام سی تحریر رہی۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں "سب سے پہلے ٹائٹل کا تعریفی و تنقیدی جائزہ لیا جہاں ٹائٹل گرل آنکھیں بند کیے سہانے سپنے دیکھنے میں منہمک ہے۔ آگے بڑھ کر انشائیے کی دانش مندی کی گفتگو میں شامل ہوئے جہاں شعور اور بے شعوری کا ادراک کیا جارہا ہے۔ اداریے سے مستفید ہوئے پھر اپنی اور سب دوستوں کی سجی سنوری محفل میں قدم رنجہ فرمایا۔ پہلے نمبر پر آنے پر محمد جاوید بلوچ کو مبارک باد۔ دیگر ساتھیوں میں نرم گرم گفت و شنید جاری تھی۔ پانچ مہینوں کے بعد اپنا خط نظر آیا بہت بہت شکریہ۔ محفل کو گرما گرمی پر چھوڑ کر آگے بڑھے سب سے پہلے مسافر سے ابتدا کی۔ مسافر دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ بوریت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ کشکول بھی اچھی تحریر ہے اور دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ تاریخی کہانی غزنی تا دہلی ڈاکٹر ساجد امجد کی کہنہ مشقی کا ثبوت تھی۔ منظر امام کی اپنا بچہ بھی اچھی تحریر تھی، مختار آزاد کی شرارت جہاں دو بچوں نے شرارت کے دوران دو ڈاکوؤں کو پکڑوا دیا جوان کے لیے باعث فخر بن گیا۔ چور کا بھائی بھی ایک اچھی کہانی تھی جہاں چور کو مور پڑ گئے۔ جیسا تیسا، خواب، کانچ کی چوڑی اچھی کہانیاں تھیں۔ میلکم کی شاطر دماغی کے باوجود وہ رقم کے حصول میں ناکام ہوا اس کی محنت کا پھل کسی اور نے کھایا۔ خوب صورت روحانی سلسلہ حضرت سلیمان علیہ السلام پڑھ کر ایمان کو جلا ملی اور دل روشنی سے منور ہوا۔ دوسری قسط کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔ ثمر عباس کی جیت ہار اچھا تاثر لیے تھی جہاں کیتھرین نے اپنے شوہر کو مار کر ساری دولت کے لالچ میں آدمی سے بھی اپنے آپ سے محروم کرلیا۔ گھٹیا حرکت میں جونی اور پیٹر ایک بھاری دولت سے ناکامی سے دوچار ہوئے۔ حسبِ معمول و روایت صفحات کی آخری کہانی بہت خوب صورت اور معنوی اثر لیے تھی۔ جہاں محبت کے جذبات سے زیادہ ہوش اور تدبر سے کام لیا۔"

✠ **ساجدہ راجا**، ہندواں، سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "میں کافی عرصے سے سسپنس ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اناڑی میری پسندیدہ ترین کہانی تھی۔ پھر اناڑی کی کمی مسافر نے پوری کردی۔ ناصر ملک صاحب نے جب بھی لکھا، خوب لکھا۔ جنت کے بعد مسافر ان کی زبردست تحریر ہے۔ اگر میں کہوں کہ اناڑی کے بعد مسافر ہی میرے سسپنس پڑھنے کی وجہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ باقی رسالہ بھی بہت اچھا ہے بس ایک چیز کافی بور کردیتی ہے اور وہ ہے قارئین کے لمبے لمبے خطوط اور پھر ایک دوسرے پر حد سے زیادہ تعریف و تنقید۔ ویسے میں سرگودھا والوں کے خطوط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ پچھلے سال انٹر کیا ہے۔ اب بی اے کی طرف رواں دواں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ قارئین مجھے کوئی بوڑھی ٹائپ سمجھنے لگیں، ماہا ملک کی طرح۔ صنف نازک اور صنف کرخت کے درمیان جو جنگ لگی رہتی ہے کیا خیال ہے میں سیز فائر کروادوں؟ صرف اتنا کہوں گی کہ پلیز ایک دوسرے پر اتنی تنقید مت کیا کریں کہ اگلا بندہ شرمندہ ہوجائے۔" (آپ کی تحریر کو پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا)

✠ **انور یوسف زئی**، اسلام آباد سے محفل کی زینت بنے ہیں "برسوں سے سسپنس کا شیدائی ہوں پر لکھنے کی جسارت پہلی بار کررہا ہوں۔ (خوش آمدید) جون ایلیا کا شعور زبردست رہا۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر بس ٹھیک ہی رہی کیونکہ اس بار وہ سب رنگ ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے بازی گر کی نقل کرنے لگے ہیں۔ ان سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنی طرز برقرار رکھیں۔ انوار صدیقی کا اپنا ہی رنگ ہے جو وہ کشکول میں اپنانے میں کامیاب جارہے ہیں۔ عائشہ فاطمہ کی دشت امکاں خالص مستورات کے لیے ہے۔ غیر ملکی کہانیوں کے اصل مصنف کا نام بھی شائع ہو تو بہتر ہوگا۔ صفدر حیات صاحب کی سیدھی بات اچھی تحریر ہے۔ ایم اے راحت کی وصال صنم اس ماہ کی بہترین تحریر ہے۔"

✠ **حاجی عبدالحکیم**، خانیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "شکر ہے ذاکر صاحب نے اس دفعہ سرورق کو صنف کرخت سے محفوظ رکھا ہے۔ جون ایلیا صاحب کا انشائیہ انسانی شعور کُانس اور اُنس کے خوب صورت گلدستے سے سجا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس میں اُنس اور اُنس سے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ تخت طاؤس پر محمد جاوید بلوچ صاحب رونق افروز ہیں، بہترین تبصرے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ ماہا ایمان بیٹی کو عاشقانِ سسپنس میں

سرفہرست آنے پر بھی مبارک باد قبول ہو۔ حسنین بلوچ صاحب میں ہر روز نماز تہجد میں آپ کی رہائی کی دعا کرتا ہوں۔ آپ کی کتنی سزا باقی ہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب اور ماہا ایمان، ہمایوں سعید راج، شیر علی خاں (خانیوال سے) سب نے اپنے حکیم انکل کو بھلا دیا اور آپ نے بھی ماشاء اللہ ہمیں بلیک لسٹ میں شامل کرلیا ہے لیکن ہم اس پر بھی آپ کے مشکور ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف کشکول اور مسافر نے دل کو مسحور کردیا ہے۔ باقی کہانیوں میں غزنی تا دہلی سے لے کر دشت امکاں اور اچھوتی محبت تک تمام کہانیاں پھولوں کا ایک ایسا پیارا گلدستہ ہے جس کے ہر پھول کی خوشبو علیحدہ ہے میری طرف سے تمام قارئین کو تمام ادارتی اسٹاف کو بہت بہت دعائیں۔ جس شعر سے متاثر ہوکر میں نے ماہنامہ سسپنس کے قارئین میں شمولیت اختیار کی تھی ایک بار پھر آپ سب کو الوداع کہتے ہوئے وہی شعر آپ سب کی نذر کررہا ہوں کیونکہ اب میری زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزر رہی ہے۔ اس شعر کے ساتھ ہی آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں۔

سجدوں کے عوض مجھے بہشت ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

(اللہ آپ کی عبادت قبول فرمائے اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں لیکن ہم سے رشتہ نہ توڑیں اور محفل کے لوگوں کی دل آزاری نہ کریں کیونکہ دل توڑنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ محفل کے شرکا آپ کا انتظار کریں گے)

✠ **احسان سحر**، میانوالی سے محفل میں شرکت کررہے ہیں "شمارہ ہاتھ آتے ہی اس بار ٹائٹل گرل صنف نازک کوئی چھوٹی عمر کی کھلتی ہوئی محسوس ہوئی بالوں کا اسٹائل ہی بتا رہا تھا کہ شرارتی بھی بڑی ہوگی...... آغاز جون ایلیا صاحب سے کیا۔ شعور، یہ شعور ہی ہمیں حیوان سے انسان بناتا ہے۔ عقل و شعور سے ہی ہم ممکن کو ناممکن بنا دیتے ہیں...... آغاز محفلِ شگفتہ شگفتہ سے کیا جہاں پر اس مرتبہ محمد بلوچ صاحب تشریف آور تھے اور اس ماہ کی پتھر کی کرسی لے اڑے، مبارک ہو بھئی۔ سعدیہ بخاری سالولی سلونی محبوبہ کو یاد کرکے تبصرے کا آغاز کیا اور ماہا کی اتنی خوشامد بھی مت کرو، غرور میں مبتلا ہوگئی تو......؟ حسنین عباس آپ کے لیے اور آپ کے دوست کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ حجاب کنول اب تو خوش ہیں نا آپ......؟ ماہا جی عاشقان سسپنس میں سب ہی اس کے عاشق ہیں پر ہر کوئی دوسرے کی نسبت خود کو زیادہ تسلیم کرتا ہے۔ تصویر العین اس دفعہ اداس دل کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ طاہرہ یاسمین اللہ پاک آپ کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سب سے پہلے اپنا بچہ پڑھی مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ میاں بیوی کی حماقتوں نے خوب ہنسایا۔ وصال صنم میں ایم اے راحت صاحب بازی لے گئے۔ کالے راستے کے بعد یہ کہانی بھی شاہکار رہی۔ شبانہ خان کی عیاریوں نے حیران کیا اور مصنف کے ابتدائی ڈائیلاگ دل میں بس گئے۔ چور کا بھائی لالچ کے انجام پر مبنی تحریر رہی، دولت کی ہوس ہی آخر ہیکٹر کو لے ڈوبی...... جیت ہار ثمر عباس کی مختصر مگر چونکا دینے والی تحریر رہی۔ حضرت سلیمانؑ پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے لگے۔ قسط وار کہانی مسافر پڑھی، مسافر ناصر ملک کی اسٹوری ہر ماہ دل میں اترتی جارہی ہے۔ جس طرح کی یہ کہانی ہے، بہت جلد سسپنس کے قیمتی صفحات پر دل میں بس جانے والی خوشبو پیدا کردے گی...... انداز موثر ڈائیلاگ، کردار نگاری، منظر نگاری اور الفاظ کا چناؤ بہت شاندار ہے۔ سسپنس کی پوری ٹیم اور معراج انکل کا بہت بہت شکریہ کہ ایسی شاہکار کہانی کو سسپنس کے صفحات پر سجایا۔"

✠ **حسن نظامی**، قبولہ شریف سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں "پہلی بار اپنی محفل میں دستک دے رہا ہوں۔ پرچہ مختلف رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ دکھی سکھی اور واقعاتی سلسلوں کا انمول اور منفرد مجموعہ ہے جو ہر ماہ رستے ناسوروں پر مرہم کا کام دیتا ہے۔ جون ایلیا ہر ماہ اپنے انشائیے میں ہر موضوع پر طبع آزمائی خوب صورت انداز میں سجاتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایڈیٹر کی کامیابی و کامرانی کے مرہون منت ہے۔ سعدہ بخاری اٹک سے جلوہ گر تھیں جنہوں نے پرچے پر خوب صورتی سے اپنے جذبات کی عکاسی کی۔ حسین عباس بلوچ صاحب ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا نے جس پہلو سے پردہ اٹھایا۔ خداوند کریم انہیں باز یاب کرائے اور انہیں تندرستی سے نوازے۔ عمران علی شورکوٹ ضلع جھنگ، ماہا ایمان حافظ عباس، طاہر الدین بیگ میر پور خاص، طاہرہ یاسمین سرگودھا، حمیرا رضا لاہور سبھی ساتھیوں نے اپنے انداز میں پرچے پر خوب صورت تبصرے کیے۔ تاریخی تحریر ڈاکٹر ساجد امجد، غزنوی تا دہلی کا سفر اچھا معیاری اور منفرد انداز تحریر تھا۔ غزنوی اور شاہی خاندانوں اور مسلم مجاہدوں کی تاریخ سنہری حروف سے عبارت ہے۔ ایم اے راحت، وصال صنم کے ساتھ جلوہ گر تھے جو الفتوں، محبتوں اور وفاؤں کے بلاشبہ اچھے عکاس ظاہر ہوئے مگر خوابوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ انوار صدیقی صاحب ہمیشہ کی طرح کشکول میں اپنے لفظوں کا جادو جگا رہے تھے۔ لیاقت حسین کو خدائی عطا اور غیبی طاقت کا ساتھ تھا جو ہر قدم اور ہر مشکل گھڑی میں ساتھ دے جایا کرتی تھی۔ سیدھی بات میں حسام بٹ اپنے راوی ملک صفدر حیات کے سنگ قوانین اور واقعات کی روشنی میں اپنے قلم کا جادو جگا رہے تھے وہ زندگی کے مختلف چہروں کی حقیقتوں کو بہت کشادگی سے رقم کرتے ہیں اور آج کے نفسانفسی کے اس دور میں ایسے فرض شناس آفیسر تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دوسری سلسلہ وار تحریر ناصر ملک کی مسافر اچھی راہوں کی طرف گامزن تھی۔ ملک صاحب ہمیشہ سے انتھک قلم چلانے کے ماہر رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جذبے سچے ہوں تو راہیں آسان ہوجایا کرتی ہیں۔ ثمر عباس، جیت ہار مقدروں کی بازی پر قلم چلانے والے لکھاری نے اپنا انداز تحریر خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھا۔ تقدیر اور قسمت کے کھیل کو منفرد انداز میں بیان کیا جو مدت تک یاد رہے گا۔ عبدالقیوم شاد کی گھٹیا حرکت میں بدلتے ہوئے انداز زندگی بسر کرنے والوں کا انجام وہی ہوتا ہے جسے لکھاری نے اپنے خوب صورت لفظوں سے سنوارا۔ عائشہ فاطمہ دشت امکان کے ساتھ حاضر تھیں۔ وفاؤں کو ندیا کے کناروں کے مانند ٹھہرایا جو دور دور رہ کر بھی ساتھ ساتھ نہیں رہ پاتے مگر جذبے صادق ہوں تو کبھی کبھی قسمت مہربان ہو ہی جایا کرتی ہے۔ پرچے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔"

✠ **شبانہ حسن**، لاہور کینٹ سے تبصرہ کررہی ہیں "جون کا شمارہ 17 تاریخ کو ملا تو دل کو سکون سا آگیا۔ ٹائٹل گرل کچھ مغرور سی لگی۔ جون ایلیا کے انشائیے بہت اچھے اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ وصال صنم میں عورت کو روئے زمین پر خوفناک جاندار لکھا گیا لیکن آخر میں مرد نے مات دے دی عورت کو۔ کشکول اب کافی بہتر ہوگئی ہے، سیون اسٹار کی کرتا دھرتا میرا خیال ہے میڈم روبی ہے۔ مسافر کے کیا کہنے شروع سے زبردست جارہی ہے۔

کہانی اب گاؤں سے شہر جا پہنچی ہے شہر یار نے تو فرہاد تیمور علی کی یاد دلا دی کہ ہر لڑکی اس پر فدا ہو جاتی ہے۔ منظر امام کی کہانی اپنا بچہ پڑھی تو ایک محاورہ یاد آ گیا کہ بچہ اپنا اچھا لگتا ہے اور بیوی دوسرے کی۔ کالج کی چوڑی اچھی تھی کہ مرد عورت پر اعتبار کرے تو وہ ماضی کی غلطی نہیں دہراتی۔ دشت امکاں عائشہ فاطمہ کی کاوش اچھی ہے کہ محبت اور دوستی میں آزمانے سے دکھ اور جدائی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ ایک گزارش ہے کہ سکندر اعظم اور چنگیز خان کے بارے میں تفصیل سے دوبارہ شائع کریں۔ شرارتی میں بچوں کی ذہانت قابل دید تھی۔ محی الدین نواب اور ایم اے راحت میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ اشعار کی محفل میں افتخار احمد قادر، کوٹ قادر بخش، راجا افتخار علی انتی فرام چوآسدن شاہ، محمد اشفاق سیال فرام شورکوٹ کے اشعار اچھے تھے۔"

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے فرمار ہے ہیں "دیکھتے ہی سرورق آنکھوں کو بھا گیا، حسینہ کا درخت کی شاخ سے ٹیک لگا کر سوچنا بڑا جاذب نظر ہے۔ پچھلے دنوں دو بہت ہی اندوہناک حادثوں پر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک برف میں سیکڑوں مجاہدین کا دفن ہونا، دوسرا بھوجا ایئر کا حادثہ۔ خدا ہم کو معاف کر دے اور اب کسی ایسے سانحے کی اس قوم کو تاب نہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا شہاب الدین غوری پر تاریخی مضمون بہت شاندار رہا۔ شہاب الدین غوری کی شجاعت اور حوصلہ مندی کو سلام۔ ناصر ملک کا مسافر پچھلی قسط کے مقابلے میں اس دفعہ بہت معرکہ آرا رہا اور دلچسپ مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔ شہر یار اب بہت خوب ہیرو کا روپ دھار چکا ہے۔ ملک صفدر کی سیدھی بات اچھی کہانی رہی۔ لیکن مجرم تک رسائی بہت جلد اور بڑی آسان ہو گئی۔ بابر نعیم کی کہانی چور کا بھائی مختصر لیکن دل کو چھو لینے والی تھی۔ بہت سادگی سے لکھی تحریر میں ہیکڑ کو خوب سزا دلوائی۔ کاشف زبیر کا جیسا تیسا بہت دلچسپ رہا اور ہیری کا ٹر کو خوب دوڑ لگوائی۔ محفل شعر و سخن میں جو دیوی آپ نے بٹھا دی۔ اس سے اشعار پر لطف ہو گئے۔ یہ آئیڈیا قابل تعریف ہے۔ مبارک باد قبول ہو۔ رجنی پٹیل نے کالج کی چوڑی میں لڑکیوں کی کردار کشی کر کے کہانی کو چٹ پٹا بنانے کی کوشش کی مگر کہانی بے جان تھی۔ سلیم انور نے نہلے پہ دہلا میں تانے بانے خوب ملائے لیکن میلکم کو مکینک سے ہیرو نہ بنا سکے۔ رضوانہ ساجد کی تحقیق و ترتیب بہت معلوماتی رہتی ہے۔ ثمر عباس کی تحریر جیت ہار مختصر اور چونکا دینے والے انجام پر مبنی تھی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ کہانی گھٹیا حرکت میں تقدیر اور تدبیر کی جنگ دکھائی گئی۔ آخر میں میری دعا ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ کو اور ترقی اور مقبولیت عطا ہو تا کہ ہم جیسے اردو ادب کے دیوانوں کی پیاس بجھتی رہے۔" (شکریہ)

✠ **بابر عباس**، کلیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل کی زینت بنے ہیں "اس خالق کائنات سے امید کرتا ہوں کہ آپ اور سسپنس کے دیگر اراکین خیریت سے ہوں گے۔ سسپنس کا نیا شمارہ جو کہ ماہ جون کی شکل میں تھا، اٹھارہ مئی کو لاہور سے خریدا۔ سرورق کی حسینہ کا چہرہ کچھ کچھ بینائی کو متاثر کر رہا تھا، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ ارے یہ تو اپنی حجاب کنول خان ہے۔ سر جی پانچ چھ ماہ کے بعد ایک دھما کا خیز انٹری دے رہا ہوں کہ میں ڈیڑھ ماہ جیل میں رہ کر آیا ہوں اور مئی کا سسپنس میں نے جیل میں ہی وصول کیا تھا۔ حسنین عباس بلوچ کا ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے لکھا ہوا خط اکثر پڑھتا تھا تو بڑا دکھ ہوتا تھا مگر اب جبکہ خود ڈیڑھ ماہ جیل میں گزار کر آیا تو اس کرب کا احساس ہوا جس کرب سے حسنین عباس بلوچ اور عمران حیدر بلوچ گزر رہے ہیں اپنے جیل جانے کی تفصیل نہیں لکھ سکتا بس یوں سمجھ لیں اڈے پر پھڈا ہو گیا تھا (بہت افسوس ہوا یہ پڑھ کر) اس بار کرسی صدارت پر جناب عزت ماب تحصیل ہری پور کی شان محمد جاوید بلوچ صاحب شان تیموری کے ساتھ براجمان تھے۔ بھیا ایک ماہ کے لیے جی حضوری میرا مطلب ہے خوشامد، بادشاہی مبارک ہو، تبصرہ اچھا تھا مگر افسوس میرا ذکر آپ نے نہیں کیا۔ ادریس احمد خان صاحب اور سنائیں کیا حال ہے آپ کا، بھیا بڑا سادہ سا تبصرہ کیا ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ میری تھوڑی سی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر آپ بڑا پھدک رہی ہیں بی بی...... اور دوسری بات یہ کہ قدرت اللہ نیازی صاحب تبصرے ہی شاندار نہیں لکھتے بندے بھی بڑے شاندار ہیں۔ رمضان پاشا بھائی میں جب بھی آپ کا خط پڑھتا ہوں مجھے دیوتا کا ایک کردار پاشا یاد آ جاتا ہے۔ حسنین عباس بلوچ یار تمہارا خط پڑھ کر اکثر مجھے دکھ ہوتا تھا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جیل کی زندگی کیسی ہوتی ہوگی اور اب تو تمہاری اور عمران حیدر بلوچ کی تکلیف کو سمجھ سکتا ہوں خدا تم دوتوں کو رہائی نصیب فرمائے (آمین) حجاب کنول خان عزیزہ دل توڑنا اچھی بات نہیں، دل بڑی نازک سی چیز کا نام ہے بہرکیف تمہارا خط محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی خدا تمہیں خوش رکھے (آمین) عمران حیدر بلوچ بیٹا جیتے رہو خدا تمہاری مشکلات ختم کرے۔ (آمین) ماہا ایمان صاحبہ بلی جتنا بھی میاؤں میاؤں کرے بلی ہی رہتی ہے اور بلی کو خواب میں اکثر...... خوش آمدید شاہ زیب جٹ صاحب! آپ پہلی بار محفل میں آئے ہیں تو کیا پہلی کا قاعدہ بھی ساتھ لائے ہیں کہ نہیں۔ عمران علی صاحب آپ کہیں عمران سیریز کے علی عمران تو نہیں جو اکثر اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے قارئین کو ہنساتا تھا۔ واہ جی واہ حمیرا رضا صاحبہ بھی آئی ہیں، حمیرا جی یہ محفل ہی ایسی ہے ہر کوئی چڑھتے سورج کو سلام کرتا ہے محفل میں متواتر آ رہے ہیں تو ٹھیک ورنہ دوسروں کو کیا پڑی کسی کو یاد کرنے کی۔ انصاری صاحبہ پاگل لوگ اکثر الٹی سیدھی ہی باتیں کرتے ہیں اور آپ ماشاءاللہ کافی زیادہ...... عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے اور آپ یقیناً خود کو عقل مند سمجھتی ہوں گی۔ عزیزہ طاہرہ یاسمین دنیا میں کتنا غم ہے میرا غم کتنا کم ہے، لوگوں کا غم دیکھا تو میں اپنا غم بھول گیا۔ تصویر العین علی صاحبہ کیا بونگا تبصرہ لکھا ہے ذرا مزہ نہیں ہے جبکہ احمد خان توحیدی صاحب کا تبصرہ بھی بس سو سو ہی تھا۔ بلیک لسٹ میں آغا فرید احمد، طاہرہ گلزار، ہمایوں سعید راج، ڈاکٹر وسیم خالق کا نام دیکھ کر دکھ ہوا۔ (دکھ کیسا...... یہ تو کم فہمی والی بات ہو گئی) کبھی وہ وقت تھا سب سے پہلے دیوتا کو پڑھا کرتا تھا پھر یوں ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ دیوتا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور اب آج اس کی جگہ کشکول نے لے لی ہے آج کل دیوتا کی جگہ کشکول کو سب سے پہلے پڑھتا ہوں پھر مسافر! مسافر کے رائٹر ناصر ملک کے مقابلے میں انوار صدیقی صاحب کافی سینئر ہیں۔ بہرحال اس بار کشکول بھی اچھی جا رہی ہے اور مسافر بھی، دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں جبکہ صفدر حیات صاحب کی سیدھی بات بھی حسب معمول اچھی تھی۔ سسپنس والوں نے آج کل جو نئے لکھاریوں کو لکھنے کی دعوت دی ہوئی ہے۔ اس سے بہت ہی اچھے اچھے رائٹر سامنے آ رہے ہیں، اس بار آخری صفحات پر بالکل نئی رائٹر عائشہ فاطمہ کی تحریر دشت امکان پڑھی اور یہ بات میں اکثر کہتا ہوں کہ یہ سسپنس والوں کا ہی وصف ہے کہ آخری صفحات پر ایسی کہانی دیتے ہیں جو زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ مدتوں یاد رہتی ہے۔ دشت امکان بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✠ **محمد ہمایوں تنولی**، ضلع تناول سے تبصرہ کر رہے ہیں "ایک سال بعد حاضری دے رہا ہوں۔ اس دفعہ جون کا شمارہ 18 مئی کو مل گیا۔ لگتا ہے کہ آپ کے پاس واقعی جادو کا چراغ آ گیا کہ ٹائم سے دو دن پہلے پرچہ بازار میں آ گیا۔ کشکول ماہ جولائی میں ایک سال کا ہو جائے گا۔ لہٰذا بطور سالگرہ تحفہ اس کے صفحات بڑھا دیں۔ پہلے جس طرح دیوتا اور موت کے سوداگر کے بعد و اپسی انمول کہانیاں تھیں اس طرح اب کشکول اور مسافر بھی انہی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ باقی ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ تو سسپنس کی جان ہیں۔ ان کے بارے میں لکھنا تو چاند کو سورج دکھانے کے برابر ہے، شرارتی بھی نہایت اچھی کہانی تھی۔ نہلے پہ دہلا بھی ایک سبق آموز کہانی ہے کہ کسی پر اندھا اعتماد نہ کرنا چاہیے خواہ وہ کسی بینک کا کیشئر ہی کیوں نہ ہو۔ کالج کی چوڑی رجنی پٹیل کی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ گھٹیا حرکت عبدالقیوم شاد نے اپنے منفرد انداز میں پیش کی۔ ایچ اقبال کی طرح کا انداز لیے ہوئے تھی۔ اس شمارے میں ایچ اقبال کی کوئی کہانی نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ سوئٹزرلینڈ گئے ہیں کہانی کا پلاٹ تیار کرنے۔ باقی تحریروں میں دشت امکان اچھی لگی۔ مسافر کے شہرے کو کہاں گاؤں سے ملتان جیل اور پھر میڈم جیسی زمانہ شناس عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔"

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے محفل میں آئے ہیں "محترم جاوید بلوچ صاحب! کسی کی بے سرو پا بات کو اسی کے سر پر انڈیل دینا ایک اعلیٰ ادبی فن ہے۔ سعدیہ بخاری آپ کے شہر کے مرزا روڈ چونگی نمبر تین میں واقع فیڈریشن پبلک اسکول میں مسلسل پانچ بار پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس لیے بتا دیتے ہیں کہ عون کو انگریزی میں ٹرپل او این لکھا جاتا ہے۔ رمضان برادر! تمہارا خط ہمیشہ اتنا پرفیکٹ ہوتا ہے کہ میں باوجود کوشش کے کوئی ایسا پوائنٹ نہیں ڈھونڈ پاتا کہ جس کی وجہ سے آپ سے مخاطب ہو سکوں۔ حجاب کنول جی! میں تنہا غترغوں تھوڑی کر رہا تھا آپ بھی تو ساتھ تھیں۔ عمران علی! میں ناراض کبھی نہیں ہوتا۔ وہ کیا ہے کہ میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں اور اسی وجہ سے میرے مزاج اور انداز سے آوارہ پن جھلکتا ہے جس کا یہ چھٹی حس پہ نازاں مخلوق پتا نہیں کیا مطلب لے رہی ہے۔ حمیرا جی خیریت ہے آپ کے شوہر جی کو نہ صرف حسنین کے آنے جانے پہ کوئی اعتراض نہیں بلکہ اکثر اس کے نہ آنے پہ بے چین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ طاہر الدین بیگ صاحب محفل میں خواتین کی ڈھیر ساری آمد سے بے تحاشا خوش تھے اور کانوں کو چھوتی باچھوں کو مقام اصل پہ لانے کی ذرا کوشش بھی نہیں کی۔ ایبا انصاری آپ کے خط نے بڑا متاثر کیا قسم سے۔ کاش میں بہاولپور کا ہوتا۔ طاہرہ یاسمین! اتنے عرصے میں کبھی ہوا بھی لگنے نہیں دی کہ آپ میرڈ ہیں۔ اینی وے ہم آپ کے بیٹے کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ تصویر العین صاحبہ! میں لڑکی نہیں ہوں جو ہوش سنبھالتے ہی شادی کا سدا بہار سپنا آنکھوں میں سجا لیتی ہے اور دوسرا میرے والدین کو اشارے دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ نیک کام میں بہ قلم خود کروں گا۔ اس بار بالکل خلاف معمول حضرت سلیمانؑ کی داستان سے آغاز کیا۔ حضرت سلیمانؑ کی شان حکومت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا مگر آپؑ کی زندگی کا اتنا حیرت انگیز پہلو ہمارے لیے قطعی نیا تھا۔ ہم رضوانہ ساجد کے شکر گزار ہیں۔ مسافر حسب توقع نہایت شاندار رہی۔ شہر یار پر بھی فیکے کی طرح ہر لڑکی پوری جان سے فدا ہونے کو تیار نظر آتی ہے۔ میڈم کی انٹری یقیناً نئے ہنگاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ ملک صاحب بھی حسب معمول اپنی شاندار ذہانت اور انتھک محنت کی بنا پر ایک مشکل کیس حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بس یہ وضاحت نہیں ہوئی کہ صغرا اور رحمت علی میں سے کون سچا تھا۔ ایم اے راحت کی وصال صنم لاجواب ثابت ہوئی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی پرائیویٹ جاسوسوں کا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ منظر امام کی کہانی اپنا بچہ غیر متاثر کن رہی۔ کہانی کا میسج متاثر کن مگر منظر نگاری اور واقعات بے حد بھونڈے انداز میں پیش کیے گئے۔ مختار آزاد کی شرارتی سب سے زیادہ پسند آئی۔ دو شریروں نے نہایت زبردست انداز میں مشاق ڈاکوؤں کو ننگی کا ناچ نچایا۔ ثمر عباس کی جیت ہار مغرب کی مخصوص طرز زندگی کی عکاس نظر آئی۔ کیتھرین کی پلاننگ تو اچھی تھی مگر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور کین ایک عورت سے زیر ہو گیا۔ نہلے پہ دہلا میں میلکم کی عقل پر جی بھر کے غصہ آیا جس نے اے ٹی ایم کی رسید پر پیغام تحریر کیا۔ گھٹیا حرکت بھی اچھی رہی۔ پیٹر کی پلاننگ اور اس پر عمل درآمد یقیناً زبردست تھے مگر یہاں بھی بدقسمتی آڑے آئی۔ محفل شعر و سخن میں کمال انور اور ایم یوسف خان کے اشعار اچھے لگے۔"

✠ **رائے قیصر عباس کھرل**، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "جناب عالی شمارہ 22 تاریخ کو ملا۔ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے محفل یاراں میں چھلانگ لگائی لیکن کسی بھی جگہ پر اپنے خط کو موجود نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی۔ بہرحال صبر کر گئے۔ ماہا ایمان کا خط بھی کافی زوردار تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر کا مزہ لیا۔ بڑی زبردست جا رہی ہے۔ شہر یار اب نئے پنگوں میں پڑنے والا ہے۔ امید ہے کہانی اسی طرح چلے گی۔ اس کے بعد کشکول پڑھی۔ اس کے صفحات تھوڑے سے کم محسوس ہوئے۔ کہانی بہرحال بڑی زبردست جا رہی ہے۔ تاریخی کہانی بھی بڑی زبردست تھی، مسلمانوں نے واقعی ہندوستان کو بڑے برے طریقے سے روندا تھا اور اپنی بہادری کی لازوال داستانیں قائم کی تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ حافظ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں "مینگی" میں میرے پیارے چاچو ریاض سمیت سسپنس پڑھنے والے تمام افراد کو سلام۔ امید ہے میرا خط شامل محفل ہوگا۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

اسلم عارضی، گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور۔ رانا ادیب الرحمٰن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ احمد خان توحیدی پاکستان اسٹیل مل۔ مزمل خان، کبیر والا۔ رمضان پاشا، گلشن اقبال (کراچی)۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ صنوبر ادریس، کورنگی کراچی۔ شائستہ راحیل، ملتان۔

✤✤✤



چراغ افغان

ڈاکٹر ساجد امجد

وقت نے ثابت کیا ہے کہ تقدیر یاوری کرے تو رستے میں آنے والی ہر چٹان کو سر کیا جاسکتا ہے۔ قوموں کی ترقی اور پھر اقبال کو زوال کا سفاکانہ عمل ماضی کے اوراق میں نام بدل بدل کر رقم ہوتا رہا ہے مگر سبق حاصل کرنے والے عمل کرتے وقت پھر ایسی ہی کسی غلطی کو دہرا کر انہی حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سازشی دماغ رکھنے والے فتنہ گر لوگ ہر دور میں دنیا کو اپنا تابع رکھنا چاہتے ہیں مگر طاقت کے نشے میں مست و مخمور یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب زوال کا عمل شروع ہوتا ہے تو چٹانیں بھی دھیرے دھیرے جگہ چھوڑنے لگتی ہیں... پیدائش کے وقت جس بچے کی ماں نے ساتھ چھوڑا اسے مقدر میں لکھے گئے حالات و واقعات نے ایک عہد کا بادشاہ بنا دیا۔ بہلول لودھی، تاریخ کا ایک ایسا درخشاں ستارہ جس کی نیک خصلت اور بہادری نے سب کے دلوں کو مسخر کر دیا... مگر بدقسمتی سے حالات دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پھر اسی مرکز پر آگئے جہاں سلطنت میں موجود فتنہ گر اقتدار کے حصول کے لیے تمام حدود پھلانگنے کے لیے تیار کھڑے تھے... بادشاہ ہو یا ادنیٰ غلام... بہت آخر میں احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا تو فقط چند لمحوں کا پڑاؤ ہے... جہاں مسافر کچھ دیر ٹھہر کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے...

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



وہ بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا پیٹ ضرورت سے زیادہ ابھرا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف حاملہ تھی بلکہ ولادت کا وقت قریب آ گیا تھا۔ بس ایک دو روز ہی کی بات تھی۔ اسی لیے اسے بستر سے پاؤں نیچے رکھنے کو منع کر دیا گیا تھا۔ ایک بوڑھی ملازمہ تھی جو اس کی خدمت کے لیے مقرر تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے۔ زلزلے کا جھٹکا تھا یا کیا تھا مکان کی چھت اچانک گر گئی۔ چھت کا ملبا بستر پر لیٹی ہوئی حاملہ عورت پر آیا۔ محل نما مکان میں بھگدڑ مچ گئی۔ نوکر چاکر اس کمرے کی طرف بھاگے جس کی چھت منہدم ہوئی تھی۔ جلدی جلدی ملبا ہٹایا گیا بدقسمت حاملہ عورت مر چکی تھی۔ پیدائش کا وقت چونکہ قریب تھا لہٰذا عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا گیا۔

یہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ دوراله کے حاکم ملک کالا کی بیوی تھی اور یہ بچہ آنے والے دور میں تاریخ کے اوراق پر بہلول لودھی کے نام سے چمکا۔

اسلام خاں والی سرہند زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے وفادار افغان سردار اس بڑے کمرے میں جمع تھے جہاں اسلام خاں نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹا تھا۔ اس کے معالج کچھ دیر پہلے اس کے لیے نئی دوائیں تجویز کر کے گئے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں اندیشوں کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اسلام خاں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولتا اور اپنے بھتیجے بہلول خاں کے بارے میں پوچھتا تھا جو ابھی تک اسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔

''بہلول خاں کو آخر کیا ہوا ہے۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا؟'' بوڑھے اسلام خاں کی آواز نے افغان سرداروں کو پھر متوجہ کیا تھا۔

''خان، وہ سرہند میں نہیں ہے۔ قطب خاں کے ہمراہ سامانہ کی طرف گیا ہوا ہے۔''

''اسے بلانے کے لیے فوراً آدمی روانہ کرو۔ اسے دیکھے بغیر ہم مرنے والے نہیں۔'' اسلام خاں نے کہا۔ ''اور ہاں، ہمیں اٹھا کر بٹھا دو تا کہ ہم اسے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی دیکھ سکیں۔'' اسلام خاں کی پشت پر کئی تکیے رکھ کر بٹھا دیا گیا۔

ایک تیز رفتار گھڑسوار سرہند سے نکلا اور سامانہ کے راستے پر روانہ ہو گیا۔

اسلام خاں کا بھائی فیروز خاں چند سرداروں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کا ایک نوکر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور اسلام خاں کے کمرے میں جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں دہرانے لگا۔ اسے اسی مقصد کے لیے اسلام خاں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ فیروز خاں کو معلوم ہوا کہ بہلول کو بلانے کے لیے قاصد دوڑایا گیا ہے تو وہ فکرمند ہو گیا۔

''یہ تو ہمیں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ نوبت یہ بھی آ سکتی ہے۔ اس قاصد کو بہلول خاں تک نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''ملک فیروز، اب بھی کون سا وقت چلا گیا ہے۔'' ایک سردار نے اٹھ کر کہا۔

''اسی طرح باتیں ہوتی رہیں تو یہ وقت بھی چلا جائے گا۔ جانے والا گھوڑے پر گیا ہے اور اسے جلدی بھی ہے۔''

''آپ کا حکم ہو تو میں چند ساتھیوں کو لے کر اس کے پیچھے جاؤں؟''

''کیا اب بھی تمہیں اجازت کی ضرورت ہے۔ بہلول خاں اور قطب خان میں سے کسی کو بھی اسلام خاں کی حالت کے بارے میں کوئی علم نہیں ہونا چاہیے۔''

اس سردار نے فیروز خاں کی بات بھی مکمل نہیں ہونے دی تھی اور کمرے سے نکل گیا تھا۔ فیروز خاں کو اب اسلام خاں کے پاس جانا تھا جو موت و زیست کی کشمکش میں تھا۔

''اسلام خاں کی موت کے وقت مجھے اس کے پاس ہونا چاہیے۔'' فیروز خاں نے اپنے سرداروں سے کہا اور اسلام خاں کے پاس پہنچ گیا۔

''میرے بھائی ملک فیروز۔'' اسلام خاں کی نحیف آواز بلند ہوئی۔ ''تم سنتے رہے ہو گے کہ یہ سب برسوں پہلے افغانی گروہ کے گروہ ہندوستان میں تجارت کرنے آتے تھے میرا اور تمہارا باپ ملک بہرام اپنے بھائی سے ناراض ہو کر ملتان آ گیا تھا۔ اس نے ملتان کے حاکم کی ملازمت کر لی تھی۔ ملک بہرام کے بعد جب خضر خاں ملتان کا حاکم بنا تو میں اس کے مقربینِ خاص میں شامل ہو گیا۔ اس نے مجھے اسلام خاں کا لقب دیا اور سرہند کا حاکم بنا دیا۔ میں نے تم سمیت سب بھائیوں کا خیال رکھا۔ ملک کالا، بہلول کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس وقت سے اب تک بہلول میرے پاس ہے۔ اس کی نیک خصلت اور بہادری نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے۔ میں اپنے بیٹے قطب خاں سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ میں نے سرہند پر جس انداز کی حکومت کی ہے صرف بہلول ہی اس کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان جن حالات سے گزر رہا ہے بہلول ہی ان حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر اس کے آنے سے پہلے میری آنکھیں بند ہو جائیں تو بہلول کو میرا جانشین مقرر کرنا اور تمام افغانی متحد رہنا۔''

ملک فیروز خاں پر اسلام خاں کی ہیبت طاری تھی۔ اس وقت مخالفت نہ کر سکا لیکن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بہلول یہاں پہنچے گا تو جانشین بنے گا۔ اگر وہ اسلام خاں کے مرنے کے بعد یہاں پہنچا تو اسے میری تلوار روکے گی۔

اس نے اسلام خاں سے عہد کیا کہ اس کی وصیت پر عمل کیا جائے گا لیکن اس کے پاس سے ہٹتے ہی اپنے سرداروں کے پاس آیا۔

''مجھے جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ اسلام خاں نے بہلول کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ اب بہلول خاں کو یہاں نہیں پہنچنا چاہیے۔'' اس کے ساتھیوں نے قسم کھائی کہ بہلول کو یہاں نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ طے یہ پایا کہ بہلول خاں اور قطب خاں کو سرہند پہنچتے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

اسلام خاں کا بھیجا ہوا قاصد سامانہ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ اس نے کچھ افغانوں کو اپنے پیچھے آتا ہوا دیکھا۔ وہ یہ سمجھ کر رک گیا کہ یہ اپنے ہی بھائی بند ہیں، کوئی پیغام لے کر آئے ہوں گے۔

ان افغانوں نے آتے ہی اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب وہ سمجھا کہ کہیں کوئی غداری ہوئی ہے۔ اس نے بھی مقابلے کے لیے تلوار سونت لی لیکن وہ مرنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ آٹھ مسلح سواروں سے اس اکیلے کا کیا مقابلہ۔ کچھ دیر بعد اس کی لاش زمین پر پڑی تھی۔

بہلول اور قطب خاں سامانہ میں ایک مجذوب بزرگ کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ان بزرگ کے پاس آئے تھے کہ سامانہ چھوڑنے سے پہلے دعائیں لے کر رخصت ہوں (ان بزرگ کا نام سید ابن بتایا جاتا ہے۔ ضلع لدھیانہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ان بزرگ کا نام صدر جہاں یا صدرالدین تھا اور وہ بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے مرید تھے)

وہ بزرگ اس وقت حالتِ جذب میں تھے۔ دونوں کو دیکھ کر انہوں نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''کوئی شخص ہے جو دہلی کی حکومت کو دو ہزار تنکے میں خریدتا ہے؟''

نیلام کی یہ بولی سن کر قطب خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی لیکن بہلول خاں سنجیدہ تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس وقت اس کے پاس ایک ہزار چھ سو تنکے تھے۔ اس نے یہ تنکے بزرگ کے سامنے رکھ دیے۔۔۔

''میں دہلی کو خریدنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس ایک ہزار چھ سو تنکے ہیں۔ اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔''

بزرگ نے یہ نذرانہ قبول کر لیا۔ ''جا تجھے دہلی کی حکمرانی قبول ہو۔''

بہلول اور قطب خاں نے بزرگ کی خدمت میں سلام پیش کیا اور ان کے آستانے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی قطب خاں پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

''ہاں بھئی دہلی کے بادشاہ۔ اب تو تم سے ڈرنا چاہیے تم عنقریب دہلی کے بادشاہ بننے والے ہو۔''

''یوں مذاق مت بناؤ۔ خدا کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''دہلی کی حکومت اتنی سستی نہیں کہ ڈیڑھ ہزار تنکوں میں خریدتے پھرو۔ تم نے خواہ مخواہ اپنی رقم اس فقیر کے حوالے کر دی۔''

''میں پھر بھی گھاٹے میں نہیں ہوں۔ اگر فقیر کا قول سچا ہے تو مجھے کوڑیوں کے مول جواہرات ملیں گے۔ اگر سچا نہ بھی نکلا تو فقیر کی خدمت کرنا کارِ ثواب ہے۔ میں سمجھوں گا میں نے ثواب کما لیا۔''

''بس یہی سمجھو کہ تم نے ثواب کما لیا۔''

''اب ہمیں سرہند چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔''

''ہاں بھئی، وہاں سے تمہیں دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے لیے جانا بھی تو ہے۔'' قطب خاں ابھی تک مذاق اڑانے پر تلا ہوا تھا۔

وہ سامانہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ انہوں نے ایک لاش پڑی دیکھی۔ قطب خاں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا لیکن یہ سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ وہ یہاں کیوں ہے اور اسے کس نے قتل کر ڈالا۔ قطب خاں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن بہلول خاں کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

''قطب خاں سرہند میں ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

''اس لاش کا سرہند میں گڑبڑ سے کیا تعلق؟''

''یہ شخص یقیناً کوئی پیغام لے کر ہماری طرف آیا ہو گا۔''

''لیکن قتل کس نے کر دیا؟''

''ان لوگوں نے جو نہیں چاہتے ہوں گے کہ یہ ہم تک پہنچے۔''

''ایسا کون ہو سکتا ہے؟''

''کوئی بھی ہو سکتا ہے۔''

''چچا فیروز خاں کے علاوہ کوئی بھی وہاں اتنا با اثر نہیں

کہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکے۔" قطب خاں نے کہا۔

"بھائی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے خاں، اسلام خاں اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اسلام خاں کی موجودگی میں فیروز خاں یہ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے یا تو وہاں کوئی بغاوت ہوئی ہے یا بڑے خاں کی جان کو کچھ ہوا ہے۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر سرہند پہنچنا چاہیے۔"

"پہلے اس افغان بھائی کی لاش کو عزت کے ساتھ دفنا دیں۔" ان دونوں نے مل کر تلواروں سے مٹی ادھر ادھر کی اور اس افغان کو لٹا کر مٹی کا ڈھیر اس کے اوپر ڈال دیا اور سرہند کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے عام راستے سے ہٹ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا اور اسلام خاں کے محل کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ملک فیروز خاں کو ان کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس وقت اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا جو انہیں راستے میں روکنے سے ناکام رہے تھے۔

"وہ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر پہنچ گیا۔"

"ہم کیا کریں وہ دوسرے راستے سے آگیا۔ ہمارے آدمی معروف شاہراہ پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ وہاں سے گزرا ہی نہیں۔"

ملک فیروز سرہند پہنچنے کے بعد ان پر حملہ نہیں کرسکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب اسے یہ کوشش کرنی تھی کہ اسلام خاں کی وصیت پر عمل نہ ہو سکے۔

ملک بہلول اور قطب خاں اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں اسلام خاں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے دونوں کو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اسلام خاں کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا۔ اسلام خاں نے ملک فیروز کے سامنے بہلول خاں کو جانشین بنانے کی وصیت کی تھی۔ اس وقت وہ خاموش رہا تھا لیکن اب اس نے اس وصیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ قطب خاں کو بھی یہ وصیت قبول نہیں تھی۔

اسلام خاں کے بعد اس کے ماننے والے تین گروہوں میں بٹ گئے۔ عام افغانوں نے اسلام خاں کی وصیت کی پوری پوری پابندی کی اور ملک بہلول کے خیر خواہ رہے اور بعض لوگ فیروز خاں کی طرف داری کرتے تھے کچھ لوگ قطب خاں کی خیر خواہی کرنے لگے۔

قطب خاں ان تینوں میں سب سے مضبوط دعویدار تھا کیونکہ وہ اسلام خاں کا بیٹا تھا لیکن جن سرداروں کے سامنے اسلام خاں نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت کا اظہار کیا تھا وہ بہلول خاں کے حق میں تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ملک فیروز کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جس کے سامنے اسلام خاں نے جانشینی کے لیے بہلول لودھی کا نام لیا تھا۔ اس نے موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے بہلول لودھی کے حق میں چپ سادھ لی۔

"میں کھل کر بہلول کی حمایت کا اعلان نہیں کرسکتا۔ اس طرح میرے آدمی میرے خلاف ہو جائیں گے۔ میں اتنا کرسکتا ہوں کہ اس کی مخالفت بھی نہ کروں۔"

قطب خاں کو معلوم ہوا کہ ملک فیروز نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا ہے تو اس کی ہمت بھی ٹوٹ گئی کیونکہ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ وہ فیروز خاں کو اپنے حق میں ہموار کر کے بہلول کو سرہند سے نکال دے گا لیکن اب وہ یہ کام اکیلے نہیں کرسکتا تھا۔

بہلول خاں کا گروہ بہت مضبوط تھا لہٰذا کسی خون خرابے کے بغیر اس کے حریف پیچھے ہٹ گئے اور اسے سرہند کا حاکم بنا دیا گیا۔ اسلام خاں کا لشکر، خزانہ اور جتنے ہاتھی تھے بہلول لودھی نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب اس نے طاقت پکڑ لی تو حریف افغان بھی اس کا دم بھرنے لگے۔

قطب خاں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسلام خاں کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے حکمرانی کا حق اس کا تھا لیکن اب یہ حق تلوار ہی سے مل سکتا تھا۔ وہ اب اکیلا رہ گیا تھا اگر بہلول سے ٹکراتا تو ملک فیروز بھی بہلول کا ہی ساتھ دیتا۔ اس نے بہلول کا خیال چھوڑا اور سلطنت دہلی کی طرف دیکھنے لگا۔

دہلی میں اس وقت خاندانِ سادات کی حکومت تھی اور محمد شاہ بن فرید خاں یہاں کا بادشاہ تھا جو مبارک شاہ کے ناگہانی قتل کے بعد سریر آرائے.... سلطنت ہوا تھا۔

قطب خاں سرہند سے نکلا اور دہلی چلا گیا۔ اسلام خاں کا بیٹا تھا۔ دہلی میں اسے سب ہی جانتے تھے۔ امیر امرا ایسی سازشوں کے دلدادہ تھے جس کا منصوبہ قطب خاں لے کر آیا تھا۔ اس نے دہلی کے قیام میں ان امرا کے ذریعے دہلی کے سلطان محمد شاہ تک رسائی حاصل کرلی اور اسے سرہند کے واقعات سے آگاہ کیا۔ اسلام خاں کی وصیت سے تو اسے

آگاہ نہیں کیا صرف اپنی حق تلفی کا ذکر کیا۔

"میرے باپ کی وفات کے بعد اس کا جانشین مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن بہلول خاں لودھی نے جو میرے چچا کا لڑکا ہے میرے باپ کے خزانے اور حکومت پر زبردستی قبضہ جما لیا ہے اور اب وہاں ظلم کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ اس کے خوف سے کوئی کچھ نہیں بولتا۔ سرہند پٹھانوں کا مرکز ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔ ملک بہلول بڑی تیزی سے افغانوں کا لشکر جمع کر رہا ہے۔ اگر اس وقت اس کی سرکوبی نہیں ہوئی تو وہ بہت سے دیگر علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اگر حضور سرہند کا حاکم مجھے بنا دیں تو میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا اور افغان آپ کے مطیع ہو جائیں گے۔"

محمد شاہ کو اس سے تو کوئی سروکار نہیں تھا کہ قطب خاں کو اس کی وراثت ملتی ہے یا نہیں لیکن اس کی دیگر باتوں سے اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے کانوں تک یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ بہلول لودھی اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے۔ قطب خاں ابھی دہلی میں تھا کہ بادشاہ کو یہ خبر بھی مل گئی کہ بہلول لودھی نے بادشاہ کے علم میں لائے بغیر دیپالپور پر قبضہ کرلیا ہے اور پانی پت تک آنے کی منصوبہ سازی کر رہا ہے پھر دہلی کتنی دور رہ جاتی ہے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ بہلول خاں لودھی کو اس کی سرکشی کی سزا دے گا۔

اس نے اپنے ایک سالار ملک سکندر تحفہ کو ایک بڑی فوج دے کر ہدایت کی کہ وہ سرہند جا کر افغانوں کو دہلی بھیج دیں۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ ہوں تو ان سے جنگ کرو اور انہیں سرہند سے باہر نکال دو۔ قطب خاں کو بھی حکم دیا کہ وہ اس لشکر کے ہمراہ جائے۔ سکندر تحفہ کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ قطب خاں کے مشورے پر عمل کرتا رہے۔

بہلول خاں لودھی اس وقت سرہند میں موجود نہیں تھا۔ ملک فیروز خاں اس کی نیابت کر رہا تھا۔ اس نے جب دہلی کے لشکر کی آمد کی خبر سنی تو مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے تمام افغانوں کو لے کر کوہستانی سلسلوں میں جا کر چھپ گیا۔

ملک سکندر تحفہ سرہند پہنچا تو افغانوں کے پاس پیغام بھیجا۔ "تم لوگوں نے کوئی ایسا قصور نہیں کیا ہے جو ادھر ادھر خوفزدہ ہو کر پھرو اور گھر سے بے گھر ہو جاؤ۔ ہم تم سے جنگ کرنے نہیں آئے ہیں ہمیں تو صرف بہلول لودھی سے سروکار ہے۔ تمہیں امان دی جاتی ہے۔ تم اپنے گھروں میں آکر آباد ہو جاؤ۔"

فیروز خاں نے عہد نامہ مانگا۔ سکندر تحفہ اور ایک اور

کھٹی میٹھی

+ ایک آدمی میٹرنٹی ہوم میں تین بجے آیا تو نرس نے کہا۔ "مبارک ہو، آپ تین بجے آئے ہیں اور آپ کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔"

آدمی نے کہا۔ "شکر ہے کہ میں اپنے مقررہ وقت بارہ بجے نہیں آیا۔"

+ میاں بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ "شہزادی دس روپے دے دو میں اندھا ہوں۔"

شوہر نے کہا۔ "بیگم ضرور دے دو تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہی ہوگا۔"

+ فقیر نے صدا لگائی۔ "اللہ کے نام پر کچھ دے دو، گھر سے لڑکی بولی۔ کچھ نہیں ہے معاف کرو۔"

اپنا موبائل نمبر ہی دے دو۔ "بابا دعا بھی کرے گا اور میسج بھی۔"

+ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بیوی سے پیار بھری باتیں کرنے سے ٹینشن دور ہو جاتی ہے۔ ہارٹ اٹیک کا خطرہ 80 فیصد کم ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی پرلطف ہو جاتی ہے آدمی ہر وقت تروتازہ اور خوشگوار موڈ میں رہتا ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ بیوی اپنی نہ ہو۔

مراسلات: حسنین عباس بلوچ،
ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

امیر جیرت کھکر نے جو اس وقت موجود تھے ایمان اور خدا کی قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ اپنے قول میں سچے ہیں۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ فیروز خاں پھر بھی مطمئن نہیں ہوا لیکن اس خیال سے کہ ان لوگوں سے مزید بات چیت کی جائے اور اگر یہ دہلی لے جانا چاہیں تو دہلی جا کر بادشاہ کو مطمئن کرے، باہر نکل آیا۔ وہ اپنے بیٹے شاہین خاں کو اپنے بال بچوں اور دیگر افغانوں کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

فیروز خاں ان لوگوں کے ہمراہ جب ان کے خیمے میں پہنچا اور اپنے بھتیجے قطب خاں کو وہاں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''تو اس غداری کے پیچھے تو ہے قطب خاں۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔'' ملک سکندر اور جیرت کھکر نے اسے تسلی دی کہ تمہارے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے۔ تم اپنے دل میں کوئی اندیشہ نہ لاؤ۔

قطب خاں نے دیکھا کہ سارا کھیل ہی بگڑ گیا ہے۔ اس کی دشمنی فیروز خاں سے تھی جس نے بہلول لودھی سے مصالحت کر لی تھی اور بعد میں قطب خاں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ وہ اس باعزت معاہدے کے خلاف تھا جو سکندر تحفہ اس سے کر آیا تھا۔

قطب خاں نے سکندر تحفہ اور جیرت کھکر کے کچھ اس طرح کان بھرے کہ انہوں نے عہد کی پاس داری نہیں کی اور فیروز خاں کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لشکر کو پہاڑوں کی طرف بھیجا کہ وہ فیروز خاں کے بال بچوں اور دوسرے افغانوں کا قتل عام کریں۔

شاہین خاں نے اس ناگہانی افتاد کو دیکھا تو مقابلے پر ڈٹ گیا۔ شاہی لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا لیکن افغان اس بہادری سے لڑ رہے تھے کہ شاہی لشکر کئی مرتبہ پسپائی پر مجبور ہوا لیکن اپنی تعداد پر بھروسا کر کے پھر آگے بڑھا۔ شاہین خاں نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن ایک جگہ وہ بہت سے سپاہیوں کے درمیان گھر گیا اور مارا گیا۔ افغان پھر بھی لڑتے رہے تھے لیکن ان کی تعداد اتنی کم رہ گئی تھی کہ شاہی فوج نے ان پر غلبہ پا لیا۔ سیکڑوں افغان قتل ہوئے باقی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقتول افغانوں کی لاشیں سرہند لائی گئیں۔ ان لاشوں کو ایک بڑے میدان میں رکھ دیا گیا۔ فیروز خاں کو بھی زنداں سے نکال کر اس میدان میں لایا گیا۔

''اپنے بہادر افغانوں کا انجام دیکھو اور ان لاشوں میں اپنے بیٹے کو پہچانو تا کہ ہم اس کے مرتبے کے مطابق اسے دفن کر سکیں۔'' جیرت کھکر نے فیروز خاں سے کہا۔

فیروز خان ایک ایک مقتول کو دیکھتا رہا اور ان کے نام بتاتا رہا حتیٰ کہ اس کے بیٹے کی لاش اس کے سامنے آئی مگر اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ''میں اسے نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔''

''کمال ہے تم اسے نہیں جانتے۔'' جیرت کھکر نے کہا۔ ''یہ تو تمہارے قبیلے کا بہادر ترین نوجوان تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں غلبہ پانے میں اتنی دیر لگی۔ اس نے ہمارے کئی سپاہیوں کو قتل اور زخمی کیا ہے اور تم اس کا نام تک نہیں جانتے۔''

یہ سن کر فیروز خاں رونے لگا۔ ''یہ میرا بیٹا شاہین خاں ہے۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم اسے نہیں جانتے۔''

''مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس نے بزدلی نہ دکھائی ہو۔ اب جبکہ خود تمہاری زبانی معلوم ہو گیا کہ اس نے بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی ہے تو میں اسے پہچاننے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ یہی میرا بیٹا شاہین خاں ہے۔ خدا اس کی شہادت قبول فرمائے۔'' فیروز خاں کو پھر زنداں میں پہنچا دیا گیا۔

جیرت کھکر نے سکندر تحفہ کو سرہند میں چھوڑا اور خود تمام اسیروں کو لے کر پنجاب چلا گیا اور وہاں سے ان اسیروں کو دہلی بھیج دیا۔ ملک فیروز خاں لودھی بھی ان اسیروں میں شامل تھا۔

بہلول لودھی کے ہاتھ سے سرہند نکل چکا تھا۔ اب اس کے ساتھ چند ہمراہیوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ملک فیروز داخل زنداں ہو چکا تھا۔ قطب خاں نے غداری کی تھی۔ بہت سے رشتے دار مارے جا چکے تھے۔ ملک سکندر تحفہ سرہند پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ دولت پاس نہیں تھی کہ لشکر تیار کرتا۔ اس نے رہزنی کو اپنا شعار بنا لیا تا کہ دولت حاصل کرے اور بہادر افغانوں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔

وہ کوئی عام ڈاکو نہیں تھا جو غریبوں کو لوٹتا۔ اس نے اردگرد کے علاقوں کے حکمرانوں پر دھاوے بولنے شروع کر دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام ہیبت کا نشان بن گیا۔ وہ کئی مرتبہ سرہند بھی آیا اور سرکاری عمال کو لوٹ کر بڑی صفائی سے نکل گیا۔

اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ادھر ادھر کے افغان اس کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب منگول جوق در جوق اسلام قبول کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ لہٰذا منگولوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ تھوڑا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا۔

ملک فیروز دہلی میں قید تھا۔ سلطان محمد شاہ کے بہت سے امرا اس کی گرفتاری سے ناخوش تھے کیونکہ سکندر تحفہ نے عہد توڑ کر اسے گرفتار کیا تھا۔ اس لیے یہ امرا برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح اسے اس قید سے نجات دلا دیں۔ آخر ایک روز انہیں یہ موقع مل گیا۔ انہوں نے فیروز خاں کو قید سے رہائی دلا دی۔ فیروز خاں دہلی سے نکلا اور بہلول لودھی کے پاس پہنچ گیا جو کوہستانی علاقے میں قیام کیے ہوئے تھا۔

قطب خاں بھی دہلی میں تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ فیروز خاں فرار ہو گیا ہے اور یہ بھی سنا کہ وہ بہلول کے پاس پہنچ گیا ہے تو اس نے خود کو اکیلا محسوس کیا۔ اسے اپنی سابقہ حرکتوں پر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بھائی بندوں پر کیسی مصیبت ٹوٹی۔ اس نے سوچا اب اس کا کفارہ اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہلول خاں کے پاس چلا جائے اور اپنے گناہوں کی اس سے معافی طلب کرے۔ اگر وہ معاف کر دے تو اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ وہ ایک رات دہلی سے نکلا اور بہلول کے پاس پہنچ گیا۔

''بھائی، مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ میری وجہ سے آج افغان بے حکومت ہو گئے۔ اگر مجھے معافی مل جائے تو ہم سب مل کر سرہند کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔''

''میرے دل میں تمہاری طرف سے جو برائی تھی وہ نکل گئی۔ ہم دونوں کے چچا فیروز خاں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ تمہاری وجہ سے شاہین خاں مارا گیا۔ فیروز خاں کو قید کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ کیا وہ تمہیں معاف کر سکتے ہیں؟''

''ہم دونوں دوست رہے ہیں۔ اگر تمہاری سفارش ہو تو چچا میرا قصور معاف کر سکتے ہیں۔''

''لیکن اس معاملے میں نہیں پڑوں گا تم اپنا قصور خود معاف کراؤ۔''

قطب خاں چچا کے حضور حاضر ہوا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے چچا سے معافی مانگی۔ بہادروں کے دل بڑے ہوتے ہیں۔ فیروز خاں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''میرا بیٹا تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب بہلول اور تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں بہلول کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا لیکن میں جب اس سے ملا تو اس نے مجھے معاف کر دیا پھر میں تجھے کیوں معاف نہ کروں۔ ہمارا اتحاد ہی تو افغانوں کی طاقت ہے۔ ہم میں اتفاق ہو تو دہلی کے کمزور بادشاہ کی کیا مجال کہ ہماری طرف میلی

ایک پرانے ہیرو کو جو آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا، ایک نئی فلم میں کام کرنے کے لیے تین لاکھ روپے کی پیش کش کی گئی۔

''مناسب معاوضہ ہے۔'' اداکار نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فلم کا نام کیا ہے؟''

''لنگڑا عاشق۔'' ڈائریکٹر نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ لنگڑے عاشق کا رول تم ہی کو دیا جائے۔ اگر راضی ہو تو منگل کے دن سیٹ پر پہنچ جانا۔''

''تین لاکھ روپے کے لیے اگر تم کہو تو میں کل ہی سیٹ پر آنے کے لیے تیار ہوں۔''

''نہیں، کل نہیں۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔ ''کل تو ہم تمہاری ایک ٹانگ کٹوائیں گے۔''

دل برداشتہ

ان دنوں حکومت فحاشی کے بارے میں بے حد حساس تھی۔ چنانچہ اخبارات و رسائل پر سخت سنسر نافذ تھا۔ ایک روزنامے کے اداریے میں فقرہ لکھا تھا۔

''عوام کو موجودہ حالات میں دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اخبار سنسر کے لیے پیش ہوا تو افسرِ مجاز نے ''داشتہ'' کے گرد سرخ دائرہ کھینچ دیا۔ ''داشتہ'' فحش لفظ ہے، آپ یہ لفظ کاٹ دیں، ''دلبر'' بے شک رہنے دیں۔''

امجد محمود۔ کہوٹہ، راولپنڈی

آوارہ — میں کوئی کام نہیں کروں گا۔
کاہل — کر سکتا ہوں، کروں گا نہیں۔
بوڑھا — شاید کروں۔
ادھیڑ — کوشش کرتا ہوں۔
نوجوان — کر تو رہا ہوں۔
باہمت — میں نے ناکام ہونا نہیں سیکھا۔
سرمایہ دار — میں ہر کام کرا سکتا ہوں۔

آنکھ سے دیکھے۔" دونوں اٹھ کر بہلول خاں کے پاس آئے اور ایک مرتبہ پھر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ سرہند پر دوبارہ قبضے کے لیے مشورے کیے جانے لگے۔

بہلول نے لشکر آراستہ کیا اور سرہند پر چڑھائی کر دی۔ اب وہ فقط رہزن نہیں تھا۔ بارہ ہزار سے زیادہ لشکر کا مالک تھا۔ قطب خاں اور فیروز خاں کے آجانے کے بعد افغانوں کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا۔ سرہند میں تعینات شاہی فوج اس کا مقابلہ نہ کر سکی اور سرہند پر افغانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

بہلول لودھی کی سرکشی کا علم جب سلطان محمد شاہ کو ہوا تو اس نے وزیر الملک حسام خاں کو ایک لشکر جرار کے ہمراہ سرہند کی طرف بھیجا۔

بہلول لودھی نے بھی اپنے لشکر کو باہر نکالا۔ موضع گڑھ میں جو خضر آباد اور شاہ پور (رینالہ کے نزدیک) میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ اب نہ افغانوں کی تعداد کم تھی نہ شاہی فوج کی۔ ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ زمین کا سینہ کانپ اٹھا۔

کئی گھنٹوں کی لڑائی کے بعد حسام خاں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حسام خاں الٹے قدموں دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ بہلول لودھی کامران و بامراد سرہند واپس آیا۔ مال غنیمت کی ایک بڑی مقدار اس کے ساتھ تھی۔

اس فتح نے اس کے حوصلے بڑھا دیے۔ کیا وہ شاہی فوج سے مقابلہ کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے۔ یہ خیال ہی ایسا تھا کہ نوجوان بہلول کی رگوں میں نشہ سا اترنے لگا۔ اس وقت اچانک اسے وہ مجذوب یاد آگیا جس نے آواز لگائی تھی کہ ہے کوئی جو دو ہزار تنکوں میں دہلی کی حکومت خریدے۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اس فقیر کو ایک ہزار چھ سو تنکے دیے تھے۔ کیا مجھے دہلی کی بادشاہت ملنے والی ہے؟

یہ خیال پختہ ہونے لگا۔ بہلول لودھی دہلی پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس خواب کو تعبیر تک پہنچانے کے لیے صرف طاقت کی نہیں عقل اور مصلحت کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے سلطان محمد شاہ کی خدمت میں ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے لکھا..."میں صرف حسام خاں کی وجہ سے سلطنت سے دور ہوں۔ اگر حسام خاں کو قتل کر دیا جائے اور اس کی جگہ بادشاہ اپنے دوسرے سالار...... حمید خاں کو وزیر الملک کے عہدے پر سرفراز کرے تو بادشاہ مجھے اپنا فرزند تصور کرے۔ میں آپ کی فرماں برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔"

محمد شاہ کو یہ عریضہ ملا تو وہ کئی دن اس پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بہلول لودھی طاقتور اور بہادر آدمی ہے۔ پوری افغان قوم اس کے ساتھ ہے۔ اگر اس کی فرماں برداری خرید لی جائے تو میری سلطنت کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ بڑے دشمن کو دوست بنانے کے لیے چھوٹے دوست کو راہ سے ہٹا دینا ہی بہتر ہے۔ اس نے بہلول لودھی کی درخواست پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ حسام خاں کو قتل کرا دیا اور حمید خاں کو نیا وزیر مقرر کر دیا۔ بہلول لودھی وعدے کے مطابق دہلی آیا اور محمد شاہ کے روبرو پہنچ کر اپنی نیازمندی اور فرماں برداری کا عہد دہرایا۔ افغانوں کی جاگیریں از سر نو بحال ہوئیں اور بہلول لودھی کو حکم ہوا کہ وہ ایک وفادار کی حیثیت سے سرہند پر حکومت کرتا رہے۔

حسام خاں نے بڑی تدبیر سے انتظامی امور انجام دیے تھے۔ جب اسے قتل کرا دیا گیا تو گرد و نواح کے امرا بادشاہ کی قوت کو گھٹتے ہوئے دیکھ کر خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ زمینداروں نے مقررہ لگان اور خراج کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ محمد شاہ عیش پرستی میں ایسا مصروف تھا کہ اس افراتفری سے بالکل ہی غافل رہا۔ ان سرکشوں اور باغیوں کو ختم کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی۔ اس بے پروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ زہریلے عناصر سارے ملک میں پھیل گئے۔

مانڈو کا حکمران سلطان محمود خلجی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر دہلی پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ سلطان محمد شاہ تو خواب غفلت سے اس وقت بیدار ہوا جب دشمن شہر سے صرف دو کوس کے فاصلے پر خیمے ڈال کر ٹھہر گیا۔ محمد شاہ اس کا لشکر دیکھ کر گھبرا گیا۔ شہر کے دروازے بند کر لیے اور بہلول لودھی کے پاس قاصد دوڑا دیے۔ بہلول خاں تو ایسے کسی احسان کا موقع ڈھونڈ ہی رہا تھا۔ وہ پیغام ملتے ہی بیس ہزار ہتھیار بند فوجیوں کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔

محمد شاہ کے پاس اپنا لشکر بھی بہت تھا اور بہلول لودھی بھی جنگجو لے آیا تھا۔ اس کے باوجود محمد شاہ نے میدان جنگ میں جانا گوارا نہیں کیا بلکہ اپنے امرا کو میدان جنگ میں بھیجا۔ سلطان محمود خلجی کو جب معلوم ہوا کہ سلطان محمد شاہ جنگ میں شامل نہیں ہے تو وہ خود بھی نہیں گیا اور اپنے بیٹوں غیاث الدین اور قدر خاں کو مقابلے کے لیے بھیج دیا۔

شام تک معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ بہلول کے ساتھ آئے ہوئے مغل اور افغان تیر اندازوں نے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن کے حوصلے پست کر کے رکھ دیے۔ پھر اندھیرے کی وجہ سے یہ سوچ کر جنگ موقوف کر دی کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوگا تو فیصلہ کن معرکہ سرانجام دیا جائے گا۔

محمد شاہ بادشاہ نے اسی رات خوفناک خواب دیکھا۔ صبح ہوتے ہی توہمات کے شکار بادشاہ نے کسی امیر سے مشورہ کیے بغیر چند مذہبی لوگوں کو سلطان محمود کے پاس صلح کے لیے بھیج دیا۔ سلطان محمود پہلے دن کے معرکے کے بعد ہی یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے لیکن صلح کا لفظ اپنے منہ سے نکالنا شرمندگی کا باعث سمجھ رہا تھا۔ اس کے لیے تو غیب سے امداد آگئی۔ اس نے فوراً صلح کر لی۔

بہلول کو محمد شاہ کی بزدلی پر سخت غصہ آیا۔ یہ احساس بھی تھا کہ محمد شاہ نے اسے مشورے کے لائق بھی نہیں سمجھا۔ اس نے اس صلح کو تسلیم نہیں کیا۔ سلطان محمود خلجی جب میدان چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے تعاقب کیا۔ سلطان محمود کا لشکر بھی جاتے جاتے رک گیا۔ دونوں کے درمیان خوب مقابلہ ہوا۔ بپھرے ہوئے بہلول نے دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔

جب دشمن نے جائے پناہ نہ دیکھی تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بہلول نے بے شمار مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔

بہلول لودھی نے مال غنیمت بادشاہ کے قدموں میں رکھا تو بادشاہ اس کی بہادری اور دیانت داری سے بہت خوش ہوا۔ اسے خان خاناں کے لقب سے سرفراز کیا۔

بہلول نے اپنا فرض پورا کر دیا لیکن عوام اس بات کو نہ بھول سکے کہ بادشاہ نے محمود خلجی سے صلح کی درخواست کی تھی۔ اس کی تعظیم لوگوں کی نگاہوں سے جاتی رہی اور آہستہ آہستہ اس کے زوال کا باعث بنی۔

اب بہلول خاں کی طاقت اور اقتدار میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ اب اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔ خزانے میں دولت بھی اتنی تھی کہ بڑے سے بڑا... لشکر رکھ سکتا تھا۔ سرہند اس کے لیے مبارک بھی ثابت ہو رہا تھا لہٰذا اس شہر کو بابرکت سمجھتے ہوئے امرا کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ناموں سے الگ الگ محلے آباد کریں۔

ترقی کا سفر شروع ہو گیا۔ بہلول لودھی نے بھی قلعے کے باہر اپنے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی۔ جب یہ حویلی تعمیر ہو گئی، تزئین و آرائش ہو چکی تو وہ وہاں کبھی کبھی جا کر قیام کرنے لگا۔ ایک روز وہ اس حویلی کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر بنے ایک مکان پر نظر پڑی تو پھر نظریں اس مکان سے ہٹنا بھول گئیں۔ مکان کے صحن میں ایک لڑکی بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔ بال اتنے لمبے تھے کہ اس کی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس لڑکی نے بالوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ چہرہ کیا تھا، ایک چاند

عورت

عورت چاہے چھوٹی عمر کی ہو یا بڑی عمر کی۔ احساسِ مقبولیت اور محبوبیت سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز اس کے دل کو نہیں بہکاتی چاہے آپ خود اپنی زبان سے اظہارِ پسندیدگی کر دیں یا اُسے کسی اور طرح معلوم ہو جائے یا تشبیہات و استعارات سے کہیں کوئی اشارہ کر دے کہ آپ اُسے پسند کرتے ہیں یا اُن باتوں کو پسند کرتے ہیں جو اُس کے اندر موجود ہیں۔

تو پھر —— وہ دیوانی سی ہو جاتی ہے۔

از "مریم" —— سید حسن مثنیٰ ندوی

تھا جو بدلی سے نکل آیا تھا۔ بہلول کو فوراً احساس ہوا کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ پہلی نظر تو ٹھیک تھی لیکن وہ مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بے کلی تھی کہ اصرار کر رہی تھی۔ دل تقاضا کر رہا تھا کہ پھر اس طرف دیکھے۔ اس نے مجبور ہو کر پھر اس مکان کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی اٹھ کر اندر کی طرف جا رہی تھی۔ پھولوں سے بھری ایک شاخ تھی جو درخت سے جدا ہو کر چلنے لگی تھی۔ اس کے بعد صحن میں اندھیرا تھا۔ بہلول نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ نہ بات کی تھی نہ اس کا نام معلوم تھا۔ یہ نظارہ بھی دور کا نظارہ تھا لیکن وہ بے چین ہو گیا تھا۔ چھت سے نیچے اترا تو آنکھیں اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور سوچتا لیکن اسے بتایا گیا کہ مہمان خانے میں قطب خان، فیروز خاں، عیسیٰ خاں اور چند دوسرے امرا آئے بیٹھے ہیں۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ کسی اور طرف چلا گیا۔

وہ ان لوگوں سے ملاقات کے لیے مہمان خانے پہنچ گیا۔

"اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم آپ سے چند باتیں کرنے آئے ہیں۔" عیسیٰ خاں نے گزارش کی۔

"میرے پاس وقت نہیں بھی ہوگا بھی تو میں آپ لوگوں کی بات سنوں گا۔"

"اس وقت محمد شاہ کی کمزوری نے ہندوستان کی حالت کو ابتر کر دیا ہے۔" قطب خان نے کہا شروع کیا۔ "محمد

شاہ کی قوت کم ہوتے ہی طالع آزماؤں نے مختلف علاقوں پر قبضے کرلیے ہیں۔ دکن، گجرات، مالوہ، بنگالہ غرض ہر جگہ حکمران اپنا سکہ چلا رہے ہیں۔ جو جہاں بیٹھا تھا وہیں خود مختار بن گیا ہے۔ دریا خاں سنبھل پر حکمرانی کررہا ہے۔ مرک بچہ عیسیٰ خاں ''کول'' (علی گڑھ کا قدیم نام) پر قابض ہے۔ احمد خاں میواتی مہرولی سے سرائے لاڈر تک (جو دہلی سے نزدیک تھا) قابض ہوگیا ہے۔ وابڑی سے قصبہ، بھوئیگاؤں تک قطب خاں میر حسن خاں نے ہتھیالیا ہے۔ پٹیالی میں رائے پرتاپ اور بیانہ میں داؤد خاں اور حدی حکومت کررہا ہے۔ محمد شاہ تو بس دہلی تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔''

''ہاں یہ سب تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' بہلول لودھی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں محمد شاہ کے ملازم کی طرح ہوں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتا ہے لیکن میں اس کی عاقبت نا اندیشی اور بزدلی دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہوں ورنہ سارے علاقے اسے فتح کرکے دے دوں۔''

''ہم اس لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ اب وفاداری کا وقت نہیں رہا۔ اگر آپ خاموش بیٹھے رہے تو بادشاہ کی مخالف طاقتیں اتنی طاقت پکڑلیں گی کہ سرہند بھی ان کی دست برد سے بچ نہیں سکے گا۔''

''کیا تم لوگ یہ کہنے آئے ہو کہ بہلول کمزور ہوگیا ہے۔ میری طاقت تو تم لوگ ہو تمہارے ہوتے ہوئے کون ہے جو سرہند کی طرف بڑھے۔''

''اس طوائف الملوکی کے عالم میں ہم کیا صرف سرہند پر تکیہ کرکے بیٹھے رہیں گے؟''

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''آپ کی اجازت۔''

''کیسی اجازت؟''

''ہم جتنے علاقے فتح کرسکتے ہیں کرلیں۔ محمد شاہ سے اب کوئی توقع فضول ہے۔''

''تم کن علاقوں کی طرف بڑھنا چاہتے ہو؟''

''جیرت گھکر کو آپ بھولے تو نہیں ہوں گے جس نے عہد نامہ توڑا تھا اور افغانوں کو خاک وخون میں نہلا دیا تھا۔ یہ موقع اچھا ہے کہ اسے سبق پڑھایا جائے۔ پنجاب کے علاقے پر حملہ کرکے لاہور میں اپنی حکومت مستحکم کی جائے۔ دیپالپور بھی ہم سے دور نہیں۔ اگر ہم پانی پت تک چلے گئے تو دہلی کی طرف بڑھنے والے جتنے قدم ہوں گے ہماری زد میں ہوں گے۔''

بہلول لودھی نے اس مشورے کو پسند کیا اور ان امرا کو تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ لوگ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ بہلول پھر تنہا رہ گیا۔ تنہائی میں وہ لڑکی پھر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے ایک نوکر کو اپنے پاس بلایا اور اسے اس مکان کی شناخت کرانے کے بعد اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ مکان کس کا ہے۔ اس نوکر نے بتایا کہ وہاں کوئی زرگر رہتا ہے۔

''میں چاہوں گا کہ ایک اچھے ہمسائے کی طرح اس سے ملاقات کے لیے جاؤں۔''

''آپ فرمائیں تو میں اس زرگر کو یہاں بلوالوں؟''

''نہیں، اس طرح وہ یہ سمجھے گا کہ ہم نے اسے اپنی طاقت کے بل بوتے پر اسے بلوایا ہے۔''

''وہ آپ کی رعایا ہے سرکار۔''

''جو تم سے کہا جارہا ہے وہ کرو، اس شخص سے جاکر کہو کہ بہلول لودھی تمہارے گھر آکر تم سے ملاقات کا خواہاں ہے۔''

''جو آپ کا حکم۔''

وہ نوکر گیا اور کچھ ہی دیر میں پیغام پہنچا کر واپس آگیا۔ یہ جواب بھی لایا کہ زرگر کو کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس کی ضیافت کے انتظامات کے لیے کچھ وقت مانگ رہا ہے۔

''دوبارہ پھر جاؤ اور اسے کہو، بہلول کو تمہاری ضیافت سے غرض نہیں وہ صرف ملاقات چاہتا ہے لہٰذا کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ رہا ہے۔''

نوکر واپس آیا تو بہلول گھوڑے پر سوار ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے دو محافظوں کو ساتھ لیا اور زرگر کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہ بے چارہ دروازے پر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

چند قدم ہی کا تو فاصلہ تھا۔ گھوڑا اس کے دروازے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ زرگر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''سرکار نے مجھے طلب کرلیا ہوتا۔''

''ایک ہی بات ہے، میں چلا آیا۔''

''میرا گھر اس لائق تو نہیں بہرحال آپ اندر شریف لائیں۔''

وہ کوئی غریب آدمی نہیں تھا۔ گھر میں وہ سب کچھ تھا جو گھر کی آرائش وزیبائش کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسے ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک عورت سفید قیمتی ساڑی پہنے اندر داخل ہوئی۔ یہ اس زرگر کی بیوی تھی بہلول ان دونوں سے اچھی طرح ملا لیکن اس کی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے کسی اور کا بھی انتظار تھا۔ وہ لڑکی نہیں آئی تھی جس کو اس نے صحن میں دیکھا تھا۔

سوچ رہا تھا وہ کسی غلط گھر میں تو نہیں آگیا۔ کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے ایک ترکیب سجھائی دے گئی۔

''تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟''

''میری ایک ہی بیٹی ہے سرکار!''

''کہاں ہے وہ، نظر نہیں آئی؟''

''سرکار وہ بڑی شرمیلی ہے۔ آپ کے سامنے آتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ آپ سے کیا پردہ۔ آپ تو ہمارے بادشاہ ہیں۔ ٹھہریے میں پھر اسے بلاتا ہوں۔''

''رہنے دو، وہ نہیں آئی تو اسے مجبور مت کرو۔ مجھے تو تم سے ملنا تھا۔ تمہاری ضرورتوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔ اپنی رعایا کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔''

صاحب خانہ اس خیال سے کہ کہیں بہلول خفا نہ ہوجائے اٹھ کر گیا اور اپنی بیٹی کو بلا کر لے آیا۔

''یہ ہے میری بیٹی، ہیما۔''

کمرے میں روشنی سی ہوگئی۔ بہلول نے اسے بہت دور سے دیکھا تھا۔ اب جو قریب سے دیکھا تو روشنی اور خوشبو ہی دوسری تھی۔ انسانی حسن ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ لڑکی اس معمولی سے گھر کے لائق نہیں۔ اسے تو میرے محل میں ہونا چاہیے تھا۔

ہیما کا باپ اپنی بیٹی کے بارے میں اور نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا۔ بہلول کو اپنی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو بس یہ سن سکا تھا۔ ''یہ ہے میری بیٹی ہیما۔''

ہیما گڑیا سی سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

بہلول زرگر سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے سنا تھا تمہاری ایک بیٹی بھی ہے۔ میں اس کے لیے یہ کنگن لے کر آیا۔'' اس نے اپنی جیب سے کنگن نکالے اور زرگر کی طرف بڑھا دیے ''اگر یہ کنگن آپ اپنی بیٹی کو اسی وقت پہنا دیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''ہم اس کے بدلے میں آپ کو کچھ بھی دینے کے لائق نہیں ہیں۔''

''میں آپ سے صرف وہ مانگوں گا جو آپ دے سکتے ہیں اور وہ بھی ابھی نہیں۔ آپ یہ تحفہ قبول فرمائیں۔'' زرگر نے یہ کنگن اپنی بیوی کے ہاتھ میں دیے۔ بیوی نے بیٹی کے ہاتھوں میں ڈال دیے۔

بہلول اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ہیما کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے بھی اسی وقت بہلول کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اٹھائی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ایک کہانی شروع ہوئی جس کا آغاز دوسرے دن ہونا تھا۔

ہیما کا باپ بہلول کی حویلی میں آیا ہوا تھا۔ بہلول نے اسے صبح ہی صبح بلوالیا تھا۔ اس کے باجود کہ اس کا استقبال اس طرح ہوا تھا جیسے وہ کسی دوست ملک کا راجا ہو۔ بہلول نے اسے اپنے برابر بٹھایا تھا وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ بہلول اس کے گھر آیا تھا۔ یہ بھی عجیب سی بات تھی کہ بہلول نے اسے طلب کرلیا تھا۔

بہلول کے خاطر تواضع کے بعد گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہ مت سمجھئے گا کہ میں نے آپ کو طاقت کے بل پر بلوایا ہے یا آپ بہلول والی سرہند کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں جو کچھ پوچھوں اس کا بلا جھجک جواب دیجئے گا۔''

''آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ ڈرنا تو لازمی ہے لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ آپ کے سامنے اپنی زبان کھول سکوں۔''

''میں تمہاری بیٹی ہیما کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا غلطی ہوگئی اس معصوم سے؟''

''غلطی اس سے نہیں، ہم سے ہوئی ہے میں نے اسے دیکھنے کی جسارت کی۔''

''وہ تو آپ کی رعایا ہے۔ بادشاہ سے کیا پردہ۔''

''میں چاہتا ہوں اس کے وجود سے میری حویلی آباد ہو۔''

''آپ فرما دیتے میں اسے ساتھ لے آتا۔''

زرگر بہلول کے اشاروں کو سمجھ ہی نہیں پارہا تھا۔ اب بہلول نے کھل کر بات کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

''اگر آپ مجھے اس لائق سمجھیں تو میں آپ کی دامادی کا شرف حاصل کرسکتا ہوں۔ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''حضور، مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے؟''

''نہ میں مخمل ہوں نہ تم ٹاٹ ہو۔ سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ سب برابر ہیں۔''

''یہ بات کہنے کے لیے آپ کو میرے گھر آنا چاہیے تھا جیسا کہ قاعدہ ہے۔''

''جب وقت آئے گا تو میں پیدل چل کر تمہارے گھر آؤں گا۔ ابھی تو میں نے صرف یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہے تو مجھے بامراد کردیں ورنہ آپ انکار بھی کرسکتے ہیں۔ اس وقت میرے اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی۔''

''یہ تو میری بیٹی کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ والی سرہند کو بیاہی جائے۔''

”آپ کی اس اجازت کے بعد ہیما ہمارے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ میں ایک دو روز میں ایک مہم پر روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر تم سن لو کہ میں میدانِ جنگ میں مارا گیا تو تم آزاد ہوگے۔ ہیما کی شادی کہیں بھی کر دینا ورنہ میرا انتظار کرنا۔ میں واپس آکر تمہارے گھر آؤں گا۔“

بہلول نے اس سے وعدہ لیا اور نہایت عزت سے رخصت کیا۔

بہلول لودھی نے اپنے امرا کے مشورے پر عمل کیا۔ لشکر جرار لے کر سرہند سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب، دیپالپور، اور دیگر علاقوں پر قابض ہوتا ہوا پانی پت تک کے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس نے لاہور میں ایک مستحکم حکومت قائم کرلی۔ یہاں جیرت کھکر کی حکومت تھی جو اس نے لڑے بغیر بہلول کے حوالے کر دی اور مع خزانہ بہلول کی خدمت میں حاضر ہوا بہلول نے فراخدلی سے اس کے سابقہ قصور معاف کر دیے۔ جیرت کھکر محمد شاہ بادشاہ سے باغی ہوگیا تھا اسے یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ محمد شاہ کہیں بہلول کے ذریعے اس گرفتار یا قتل نہ کرادے۔ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ دونوں کے تعلقات میں رخنہ پڑ جائے۔ دوستی، دشمنی میں بدل جائے۔ اس نے بہلول کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہوئے اس کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ لبِ لباب یہ تھا کہ وہ تختِ دہلی کا حکمران بننے کی کوشش کرے۔

”اس وقت ہندوستان میں افغانوں کے سوا مجھے دوسری طاقت نظر نہیں آتی۔ محمد شاہ کا حال یہ ہے کہ وہ کمزوروں کے ہاتھوں میں اپنی کمزوریوں سے کھیل رہا ہے۔ پورا ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ کوئی بھی طاقت مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دہلی پر قابض ہوسکتی ہے۔ پھر آپ کیوں نہیں؟ ابھی تو محمد شاہ ہے جو آپ کو اپنا فرزند کہتا ہے۔ اگر کوئی اور تختِ دہلی پر براجمان ہوگیا تو معلوم نہیں آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ وہ وقت آنے سے پہلے دہلی پر حملہ کر دیں۔ میرا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔“

”آپ نے ابھی اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ محمد شاہ مجھے اپنا فرزند کہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ یہ سلوک کروں؟“

”معاف کیجیے گا۔ ذرا وہ وقت یاد کیجیے جب اس نے افغانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنا لشکر سرہند بھیجا تھا۔ آپ کا نام اس وقت بھی بہلول لودھی تھا۔ جب آپ کے پاس طاقت جمع ہوگئی تو آپ کو فرزند رکھنے لگا۔ وہ آپ سے خلوص نہیں رکھتا آپ سے ڈرتا ہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے تنہائی میں کہہ چکا ہے کہ افغان میری حکومت کے لیے سخت خطرہ ہیں۔ کوئی چال ایسی چلو کہ افغانوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ یہی بات اس نے دوسرے حکمرانوں سے بھی ضرور کہی ہوگی۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ فرزندی کا رشتہ نبھاتے رہیے۔“

وہ جب آتا تھا یہی بات کرتا تھا۔ بہلول کے سر میں بھی دارالسلطنت پر حملہ کرنے کا سودا سما گیا۔ اس فقیر کی پیش گوئی بھی اس کا تعاقب کرتی رہتی تھی جن سے وہ ابتدائی دنوں میں سامانہ میں مل چکا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ دہلی پر حملہ کر دے گا۔

اس نے قطب خاں اور فیروز خاں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس کے اس ارادے کی توثیق کی بلکہ قطب خاں نے اسے قبل از وقت مبارک باد بھی دے ڈالی۔

بہلول نے بڑے کروفر سے محمد شاہ کو نیچا دکھانے کے لیے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ ایک مدت تک محاصرہ کرنے کے بعد بھی کامیابی نہیں ہوئی تو وہ محاصرہ اٹھا کر سرحد پار آگیا۔

سرہند آکر اس نے خود کو سلطان بہلول لودھی کہلوایا البتہ خطبہ و سکہ کو دہلی کی فتح تک ملتوی کر دیا اور اپنی طاقت بڑھانے لگا تاکہ دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کرے۔

ابھی وہ اپنے لشکر میں اضافہ کرنے میں مشغول تھا کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا علاؤالدین تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔

ooo

دہلی کے سلطان علاؤالدین کو بدایوں کی آب و ہوا بہت پسند تھی۔ اس کا زیادہ قیام بدایوں ہی میں رہتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ وہیں مقیم تھا۔ اس کا وزیر حمید الدین خاں بھی اس کے ساتھ ہی بدایوں آیا تھا۔

مالوہ کا راجا، پرتاب دیو، حمید الدین خاں سے سخت عداوت رکھتا تھا کیونکہ کسی موقع پر اس کے باپ کو حمید الدین خاں نے قتل کر دیا تھا۔ سلطان محمد شاہ کی زندگی میں پرتاب دیو کو یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ حمید الدین خاں سے انتقام لیتا لیکن علاؤالدین جیسے کمزور بادشاہ کی موجودگی میں اسے یہ موقع مل گیا۔ اس نے ایک عرضداشت کے ساتھ تیز رفتار قاصد بدایوں کی طرف دوڑا دیے۔

اس عرضداشت میں لکھا گیا تھا۔

”آپ کا وزیر حمید خاں، مانڈو کے حکمران محمود خلجی کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کر رہا ہے اور عنقریب حمید خان اور محمود خلجی دونوں مل کر آپ کو تخت و تاج سے محروم کر دیں گے۔“ عرضداشت میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلطان محمود ایک بہت بڑا لشکر لے کر چڑھ آنے والا تھا۔ اس وقت تو میں نے اسے حیلے بہانے سے روک دیا ہے لیکن وہ کسی وقت حملہ ضرور کرے گا۔ سلطان محمود تو آپ کے اختیار میں نہیں لیکن آپ کا وزیر تو آپ کے پاس ہے۔ آپ فوراً اسے گرفتار کریں، تاکہ اس سازش کا قلع قمع ہوجائے۔“

بادشاہ ابھی اس عرضداشت پر غور کر ہی رہا تھا کہ پرتاب دیو کے قاصد ایک مرتبہ پھر آئے اور عرض کیا۔ ”اگر حمید خاں کو قتل کر دیا جائے تو ہم لوگ چالیس لاکھ کے پرگنہ بادشاہ کی سلطنت میں شامل کر دیں گے۔ ساری رعیت حمید خاں سے عاجز آچکی ہے لہٰذا کوئی آواز بلند نہ ہوگی۔“

علاؤالدین کے پاس اُس وقت دہلی اور اردگرد کے علاقے رہ گئے تھے۔ ایسے میں جب چالیس پرگنوں کی پیش کش کی گئی اُس کے منہ میں پانی بھر آیا وہ کانوں کا کچا بھی تھا اور ناعاقبت اندیش بھی۔ اس نے سوچ سمجھے بغیر حمید خاں کے قتل کے احکام جاری کر دیے۔

جس وقت یہ قاصد آئے بیٹھے تھے، حمید خاں کا ایک ساتھی دولت خاں بھی وہاں موجود تھا اس نے وفاداری نبھائی اور حمید خاں تک یہ خبر بروقت پہنچا دی۔ حمید خاں کو قاصدوں کی بار بار آمد سے پہلے ہی شک ہوگیا تھا، وہ تیار ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دولت خان کو ساتھ لیا اور ایک لشکر کے ساتھ بدایوں سے نکل گیا۔

جمال خاں جسے بادشاہ نے حمید خاں کی نگرانی پر مامور کیا تھا، اسے جب حمید خاں کے بھاگنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ حمید خاں اپنے گھر تک پہنچ گیا تھا کہ جمال خاں نے اسے جالیا۔ دونوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جھڑپ میں جمال خاں ایک تیر لگنے سے زخمی ہوا اور اس نے بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں نے اسی میں اپنی سلامتی سمجھی کہ حمید خاں کے ساتھ شامل ہوجائیں۔ حمید خاں نے ان لوگوں کو ساتھ لیا اور بادشاہ کی حرم سرا میں گھس گیا۔ سلطان کی بیگمات، لڑکیوں اور لڑکوں کو سر برہنہ کر کے قلعے سے نکال دیا اور سلطنت کے خزانے پر قابض ہوگیا۔ سلطان علاؤالدین ایسا نامقبول تھا کہ قلعے میں موجود سپاہیوں میں سے کسی نے بھی مزاحمت نہیں کی۔

وہ خود بادشاہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد وہ اس فکر میں ڈوب گیا کہ بادشاہ کسے بنایا جائے۔ اس کے ذہن میں دو آدمیوں کے نام گونجے۔ سلطان محمد شرقی جونپور کا حکمران تھا۔ مگر وہ علاؤالدین کا داماد

تھا اس لیے مناسب نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسرا نام سلطان محمود خلجی کا تھا لیکن وہ دور تھا۔ قریب تو پھر لودھی تھے۔ اسے ملک بہلول لودھی کا خیال آیا۔

حمید خاں کا مقصد یہ تھا کہ وہ برائے نام بہلول لودھی کو بادشاہ بنائے اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالے۔

حمید خاں نے بہلول لودھی کو طلب کیا۔ بہلول ایک فوج لے کر دہلی آگیا اور عہد و پیماں کے بعد حمید خاں نے قلعہ کی کنجیاں بہلول کے سپرد کیں اور اسے تخت نشیں کردیا۔

کچھ دن ہی گزرے تھے کہ بہلول اپنی بے بسی کو محسوس کرنے لگا۔ بادشاہ بہلول تھا لیکن قبضہ و اقتدار حمید خاں کا تھا۔ حکم اسی کا چلتا تھا۔ بہلول کو یہ صورت حال منظور نہیں تھی۔ وہ حمید خاں کو درمیان سے ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ حمید خاں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے۔ وہ حمید خاں کے گھر برابر جاتا رہا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ایک روز گیا تو افغانوں کی ایک جماعت کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اس نے انہیں پہلے ہی سمجھا دیا کہ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔

بہلول کے ساتھ یہ افغانی جماعت حمید خاں کے گھر پہنچی تو ان لوگوں نے عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکتیں کرنا شروع کردیں۔ بعض نے فرش پر آتے وقت جوتیاں کمر سے باندھ لیں۔ بعض نے اس طاق پر اپنے جوتے رکھ دیے جو حمید کے سر کے عین اوپر تھا۔ اس بے ہودگی کی وجہ ان لوگوں نے یہ بیان کی کہ جوتیاں چوری نہ ہوجائیں اس لیے ایسا کیا ہے۔

یہ ایسی بے ہودگی تھی کہ حمید خاں شکایت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''یہ کیا بے ہودگی ہے۔ ان لوگوں کو روکتے کیوں نہیں؟''

''یہ لوگ حد درجہ بے وقوف ہیں اور تہذیب سے ناواقف۔ آئندہ آیا تو ان لوگوں کو سمجھا کر لاؤں گا۔'' بہلول نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کردیا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چند افغان براہ راست حمید خاں سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ کا فرش تو مختلف رنگوں کے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ اگر آپ اس کمبل کا ایک ٹکڑا ہم لوگوں کو عنایت کریں تو ہم اس کی ٹوپیاں بنوا کر اپنے بال بچوں کو بھیج دیں تاکہ اس تحفے سے ہمارے گھر والوں کو یہ اندازہ ہوجائے کہ ہم خان والاشان کے ملازم ہیں۔''

حمید خاں نے ہنس کر کہا ''ٹوپیاں بنانے کے لیے تم لوگوں کو زربفت اور مخمل دے دیا جائے گا۔''

اس کے بعد عطر کی کشتیاں اور پان محفل میں آئے۔ اس موقع پر بھی ان افغانوں نے خوب بے ہودگی مچائی بعض نے عطر کی پھریری پان میں لگا کر چبانا شروع کی۔ بہتوں نے پان کا چونا نہ چھڑایا اور اسی طرح پان کھالیا بعض نے پان تو پھینک دیے اور چونا چھڑا کر کھانا شروع کردیا۔ چونے نے اپنا کام دکھایا۔ منہ کٹ گیا تو پاگلوں کی طرح رونا دھونا شروع کردیا۔

حمید خاں ..... ان بے وقوفوں پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور کہہ اٹھا ''بہلول خاں تمہاری قوم تو بالکل ہی اجڈ ہے۔''

بہلول نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''جاہل ہیں اچھا ماحول بھی انہیں نہیں ملا لہٰذا انہیں پیٹ بھرنے اور سونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔ عقل کی کوئی بات انہیں آتی ہی نہیں۔''

بہلول وہاں سے لوٹا تو حمید خاں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوچکا تھا کہ بہلول کے ساتھی سب کے سب ناکارہ اور بے وقوف ہیں۔ یہ عقل کی کوئی بات بہلول کو سکھا ہی نہیں سکتے لہٰذا بہلول کو بہ آسانی انگلیوں پر نچایا جاسکتا ہے۔ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہوگیا۔

بہلول کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔

چند روز کے بعد ملک بہلول پھر حمید خاں کے گھر گیا۔ اس کے افغان ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس مرتبہ قطب خاں بھی اس جماعت میں شامل ہوکر آیا تھا۔

پچھلی مرتبہ کا تجربہ شامل تھا لہٰذا دربانوں نے بہلول کو تو اندر جانے دیا مگر اس کے ساتھیوں کو باہر ہی روک لیا کہ تم لوگ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہو اس لیے باہر ہی کھڑے رہو۔ ان افغانوں نے زور زور سے چیخنا اور بہلول کو گالیاں دینی شروع کردیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے۔

''اگر بہلول خان اندر جاسکتا ہے تو ہمیں بھی یہ حق ہے کہ ہم اندر جائیں اور حمید خاں کو سلام کرکے آئیں۔''

شور کی آواز اندر آگئی اور حمید خاں کو معلوم ہوا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے کہلوا دیا۔ ان سب کو اندر آنے دیا جائے۔

یہ حکم پاتے ہی سب افغان اندر آگئے اور حمید خاں کو سلام کرکے اس کے محافظوں کو پاس دو دو کی تعداد میں کھڑے ہوگئے۔

اب قطب خاں کو اپنا کام شروع کرنا تھا۔ وہ زنجیر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس زنجیر کو نکالا اور حمید خاں کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے قطب خاں؟''

''اسے زنجیر کہتے ہیں جو کسی کو قید کرتے ہوئے پہنائی جاتی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم گوشہ نشیں ہوکر خدا کی عبادت کرو۔ تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے صرف اس لیے کہ تم وفادار رہے ہو۔ اب تم جب تک زندہ رہوگے یا جب تک خدا کو منظور ہوگا زنداں کی دھول چاٹو گے۔''

حمید خاں کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ بہلول نے اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کردیا۔

کسی خوں ریزی کے بغیر حمید خاں جیسا طاقتور وزیر راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اب صرف سلطان علاؤالدین رہ گیا تھا جو کسی بھی وقت تخت کا دعویٰ کرسکتا تھا۔ اس کے لیے بہلول نے یہ طریقہ سوچا کہ اسے عریضہ لکھ کر دہلی بلایا جائے اور حمید خاں کے ساتھ اسے بھی داخل زنداں کردیا جائے۔

اس نے علاؤالدین کو لکھا ''چونکہ میں آپ کے والد کا پروردہ ہوں لہٰذا حقیقت میں آپ کی طرف سے سلطنت کے کاموں کو انجام دے رہا ہوں۔ آپ کا نام بھی خطبے سے خارج نہیں کیا ہے۔ حمید خاں راستے سے ہٹ گیا ہے۔ آپ بلاخوف و خطر تشریف لائیں اور اپنی سلطنت سنبھالیں۔''

علاؤالدین ایسا دلبرداشتہ ہوا تھا کہ سلطنت کے کاموں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے لکھ بھیجا۔

''میرے والد نے چونکہ تجھ کو فرزند کہا ہے لہٰذا میں تجھ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور سلطنت تیرے لیے چھوڑتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کرتا ہوں۔''

اب بہلول کو کسی طرف سے خطرہ نہیں رہا تھا۔ دہلی میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سکہ بھی اس کے نام کا جاری ہوا۔ اب وہ بلاشرکت دہلی کا بادشاہ تھا۔

اس کے کانوں میں اس وقت یقیناً اس فقیر کی آواز گونجی ہوگی ''کوئی شخص ہے جو دو ہزار تنکوں کے عوض دہلی کی بادشاہت خریدے۔''

قطب خاں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''قطب خاں تمہیں وہ فقیر یاد ہے جو ہمیں سامانہ میں ملا تھا؟''

''ہاں یاد تو آرہا ہے۔'' قطب خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تمہیں یہ بھی یاد آگیا ہوگا کہ میں نے ایک ہزار چھ سو تنکے اس فقیر کو دیے تھے اور دہلی کی بادشاہت خرید لی تھی۔''

''ارے ہاں۔ آپ نے تو واقعی بادشاہت خرید لی اور وہ بھی کسی بڑی جنگ کے بغیر۔''

''تمہیں یاد ہے تم نے اس وقت میرا مذاق اڑایا تھا۔ یاد رکھو بزرگوں کی باتوں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔''

''مجھے تو سب کچھ یاد آگیا لیکن آپ کچھ بھول رہے ہیں۔''

''میں نے تمہیں یاد دلایا ہے، تم مجھے یاد دلا دو۔''

''آپ سرہند میں کسی سے کوئی وعدہ کرکے آئے تھے۔''

''کیسا وعدہ اور کس سے وعدہ کیا تھا؟''

''آپ کو وہ زرگر یاد ہے جس کی بیٹی آپ کے نام پر بیٹھی ہوئی ہے۔''

''مجھے یاد آگیا لیکن یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟''

''آپ کے ایک نوکر نے مجھے بتایا ہے۔ وہ زرگر اس نوکر سے ملا تھا اور اس سے کہا تھا کہ سلطان بہلول کو اس کا وعدہ یاد دلائے۔''

سلطان بہلول کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔ ''مہمات کے بکھیڑوں میں مجھے اپنی غرض یاد ہی نہیں رہی۔ واقعی یہ بڑی زیادتی ہوگئی۔ زرگر میرے خوف سے اس کی کہیں شادی بھی نہیں کرسکا ہوگا اور میں نے بھی پلٹ کر اسے نہیں پوچھا۔ اب اس کا ازالہ کروں گا۔''

بہلول لودھی اسلام خاں کا فقط بھتیجا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا داماد بھی تھا۔ اس وقت تک اس کے نو بیٹے پیدا ہوچکے تھے۔ اس نے قطب خاں سے جو اس کا چچازاد بھائی بھی تھا اور سالا بھی، معذرت کی کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر شادی کا وعدہ کر بیٹھا اور اب اس وعدے کو پورا کرنا اس کا فرض ہے۔

وہ اب سرہند کا والی نہیں دہلی کا بادشاہ تھا۔ نہایت شان و شوکت کے ساتھ عازم سفر ہوا اور سرہند جا کر اپنی حویلی میں مقیم ہوا۔

اسے اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے زرگر سے کہا تھا جب وہ وقت آئے گا تو پیدل زرگر کے گھر آئے گا۔ وہ اس روز گھوڑے .... پر سوار نہیں ہوا۔ چند محافظوں اور نکاح خواں کو ساتھ لے کر اپنی سسرال پہنچ گیا۔

دہلی کا بادشاہ معمولی زرگر کے مکان پر آیا تھا۔ زرگر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت اس کے سامنے ہے۔ بہر حال بہلول نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ہیما (تاریخ فرشتہ نے اس کا نام زیبا لکھا ہے) سے عقد کیا۔

کچھ دن اپنی حویلی میں رہا اور پھر دہلی آگیا۔

❁❁❁

علاؤالدین کی نااہلی نے حکومت بہلول لودھی کے حوالے کی تھی لیکن اس کے بعض امرا اس فیصلے کے خلاف تھے۔ انہیں یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ دہلی پر ایک اجڈ افغان حکومت کرے۔ ان امرا نے پہلے تو خود خفیہ طور پر یہ

طے کیا کہ وہ لشکر لے کر بدایوں سے نکلیں اور دہلی پر حملہ آور ہو جائیں لیکن ان کی کم ہمتی نے جلد ہی یہ فیصلہ واپس لے لیا۔ اس طرح تو وہ علاؤالدین کی نظروں میں بھی گر جاتے اور ناکامی کی صورت میں کہیں کے نہ رہتے۔ بہلول کی طاقت سے خوفزدہ بھی تھے۔ علاؤالدین کو سمجھانا بے سود تھا۔ اب اسے ایسی کسی مہم سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔

کئی دن کے غور و فکر کے بعد آخر ایک راستہ نکل ہی آیا ایک امیر نے اپنی رائے پیش کی۔

''ہمیں سلطان محمود شرقی والی جونپور کی مدد لینی چاہیے۔ وہ علاؤالدین کا داماد ہے۔ دہلی کی سلطنت پر اس کا حق بنتا ہے۔ اگر اس نے پس و پیش کی بھی تو علاؤالدین کی بیٹی جو اس کی بیوی ہے۔ وہ یہ ضرور چاہے گی کہ اس کے خاندان کی حکومت اس کے خاندان میں رہے۔ وہ اپنے شوہر کو اس مہم کے لیے ضرور تیار کر لے گی۔''

''اگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوا۔'' ایک امیر نے اسے بیچ میں ٹوکا۔

''پھر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے۔ فی الحال تو اس تجویز پر عمل کرتے ہیں۔''

وہاں موجود دوسرے امرا نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور اسی دن ایک تیز رفتار قاصد جون پور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

سلطان محمود شرقی اس وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی، ماں بی بی راجی، دونوں بیٹے محمود شاہ شرقی اور حسین شرقی اس گفتگو میں شامل تھے کہ اس کے چوبدار نے بدایوں سے قاصد کے آنے کی اطلاع دی۔ بدایوں کا نام سن کر سلطان محمود شرقی کی بیوی نے تشویش بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کا ذہن لامحالہ اپنے باپ سلطان علاؤالدین کی طرف گیا ہوگا۔

سلطان محمود شرقی نے دونوں خواتین کو وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا اور قاصد کو اذن باریابی دیا۔ قاصد نے اندر آکر اس کے دونوں بیٹوں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو' مجھے جو کچھ کہنا ہے کیا ان کے سامنے کہہ دوں۔

''یہ دونوں میرے بیٹے ہیں ان کی فکر مت کرو۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے ان کی موجودگی میں کہہ سکتے ہو۔''

''مجھے علاؤالدین کے دو سالاروں نے آپ کی جانب بھیجا ہے۔ راز داری کی غرض سے ان کے نام نہیں لے سکتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس میں دوسرے امرا کی رائے بھی شامل ہے۔''

''تو قاصد ہے وکیل نہیں۔ صفائیاں مت پیش کر، جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے صرف وہ بیان کر۔''

''سلطان علاؤالدین کی غیر ذمے داری اور عدم دلچسپی کی وجہ سے ہندوستان کا تاج و تخت بہلول لودھی کے پاس چلا گیا ہے۔ بدایوں کے سالاروں نے آپ سے استدعا کی ہے کہ آپ ایک لشکر لے کر اٹھیں۔ بدایوں میں جو لشکر ہے وہ بھی آپ کا ساتھ دے گا۔ دہلی پر حملہ کریں اور بہلول کو وہاں سے نکال دیں تاکہ دہلی کا تخت دوبارہ آپ کے سسر سلطان علاؤالدین کے قبضے میں آجائے۔''

''یہ پیغام تو سلطان علاؤالدین کی جانب سے آنا چاہیے تھا۔''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھ سے یہ ضرور کہا گیا تھا کہ سلطان اب ایسی کسی مہم میں دلچسپی نہیں رکھتا۔''

''ہم نے تمہاری پوری بات سن لی۔'' محمود شرقی نے قاصد سے کہا'' تم بہت لمبا سفر طے کر کے آئے ہو۔ آج کی رات آرام کرو۔ ہم اپنے سالار اعلیٰ سے مشورہ کر کے کل تمہیں اپنے جواب سے آگاہ کریں گے۔''

قاصد کے جانے کے بعد محمود شرقی کی بیوی اندر آگئی۔ اسے فکر لگی ہوئی تھی کہ قاصد بدایوں سے کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ سلطان علاؤالدین' اس کا باپ خیریت سے تو ہے؟

سلطان محمود شرقی نے اسے بتایا کہ سب خیریت ہے اور قاصد سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ اسے سنا دیا۔

وہ نیک بخت شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''سالاروں نے جو فیصلہ کیا ہے درست کیا ہے۔ دہلی میرے باپ دادا کا ملک ہے۔ بہلول لودھی کون ہوتا ہے وہاں حکومت کرنے والا۔ سلطان علاؤالدین کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے ورنہ اس کام کے لیے وہ نکلتے۔ آپ داماد ہیں۔ بیٹے کی جگہ ہیں میرے باپ کو اس کا حق دلائیں۔ بہلول کو نکال باہر کریں۔ اگر آپ نے پیٹھ دکھائی تو میں جونپور کا لشکر لے کر دہلی جاؤں گی۔''

''بیگم اتنی بے تاب کیوں ہوتی ہو۔ میں نے ان قاصدوں کو ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ فتح خاں (سالار اعلیٰ) سے مشورہ کرلوں گا۔ اس کے بعد کوئی جواب دوں گا۔''

سلطان نے فتح خان سے مشورہ کیا تو اس نے بھی وہی کچھ کہا جو اس کی بیوی کہہ چکی تھی۔ سلطان نے قاصد کے ذریعے اپنا پیغام بدایوں پہنچا دیا۔

''ہم ایک ہفتے بعد یہاں سے نکلیں گے اور دہلی کا رخ کریں گے۔ بدایوں کا لشکر ہمیں راستے میں ہی مل جانا

چاہیے۔“

قاصد کے جاتے ہی سلطان نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک لشکرِ جرار تیار کیا جس میں کم از کم ایک ہزار کوہ پیکر ہاتھی شامل تھے۔ سلطان اس لشکر عظیم کو لے کر سالارِ اعلیٰ فتح خاں کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہوا۔

ادھر دہلی کا احوال یہ تھا کہ بہلول لودھی اپنا لشکر لے کر پنجاب و ملتان کے امور سلطنت میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے دیپالپور چلا گیا تھا۔ حکومت اپنے بڑے بیٹے بایزید کے سپرد کی تھی۔ چند امرا تھے جو دہلی میں رہ گئے تھے اور معمولی سا لشکر تھا جو اپنا دفاع تو کر سکتا تھا لیکن باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔

سلطان محمود شرقی طوفان کی طرح بڑھا چلا آ رہا تھا کہ اسے ایک اور تقویت ملی۔ دریا خاں جو ذات کا لودھی تھا اور سنبھل کا حکمران تھا ایک لشکر لے کر سلطان شرقی سے آن ملا سلطان محمود کے لشکر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ سلطان کا لشکر دہلی پہنچا اور محاصرہ کر لیا بایزید پسر بہلول لودھی قلعہ بند ہو گیا اور بہلول کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ قلعے میں مرد کم تھے لہٰذا اسلام خاں مرحوم کی زوجہ بی بی... عورتوں کو مردوں کے کپڑے پہنا کر قلعے کے کنگروں پر بھیجتی رہی تاکہ دشمن کو یہ تاثر ملے کہ قلعے میں لڑنے والے مرد موجود ہیں۔ اس تاثر کو مزید تقویت ایک دن کے اس واقعے سے مل گئی۔

بہلول کا ایک سالار سکندر سروانی قلعے کے کنگرے پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان محمود کا سقہ کنگرے کی باؤلی سے پانی لے کر جا رہا ہے۔ شاہ سکندر نے تاک کر ایسا تیر چھوڑا مشکیزے کے آر پار ہو گیا۔ اس دن کے بعد قلعے کے آس پاس کوئی نہ آیا۔

شہر کا محاصرہ اب بھی جاری تھا۔ اس محاصرے کی نگرانی دریا خاں لودھی کر رہا تھا۔ بہلول لودھی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ شہر کے اندر جو حفاظتی لشکر تھا وہ بددل ہوتا جا رہا تھا۔

دریا خان نے محاصرے میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے منجنیقوں کے ذریعے شہر کے اندر سنگ باری شروع کر دی۔ بڑے بڑے پتھر شہر میں آ کر گر رہے تھے۔ ان سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ آخر لشکری عاجز ہو کر صلح پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ شہر کی کنجیاں سلطان محمود شرقی کے سالاروں کی حوالے کر دیں گے۔ اس کام کے لیے دہلی کے ایک امیر شمس الدین کو تیار کیا گیا کہ وہ جائیں اور شہر پناہ کی چابیاں دریا خان کے حوالے کر دیں۔

سید شمس الدین قلعے کی کنجیاں لے کر سلطان کے لشکر میں گئے اور دریا خان سے ملاقات کی جس نے محاصرہ کر رکھا تھا۔

شمس الدین نے اس سے کہا۔ ”میں دو ایک باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ تخلیہ فرمائیں۔“

دریا خان نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہٹا دیا۔

”سید صاحب، اب فرمائیے۔“

”آپ کو سلطان محمود شرقی سے کیا نسبت ہے؟“ شمس الدین نے پوچھا۔

”کوئی خاص نسبت نہیں۔ بس سلطان محمود کا نوکر ہوں۔“ دریا خاں نے کہا۔

”اور سلطان بہلول سے آپ کو کیا نسبت ہے؟“

”ہم بھی لودھی ہیں اور بہلول بھی لودھی ہے۔“ دریا خان یہ نسبت بتاتے ہوئے ہچکچایا۔

سید شمس الدین نے قلعے کی کنجیاں اس کے آگے رکھ دیں اور کہا۔ ”اب یا تو اپنی ماؤں بہنوں کو پردے میں رکھ لیجیے یا دشمن کے سپرد کر دیجیے تاکہ وہ انہیں بے عزت کریں۔“

دریا خاں کو یہ سن کر سخت شرمندگی ہوئی۔ اس نے اب تک یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہی ہم قوموں کے خلاف لڑائی کو نکلا ہے شمس الدین نے یاد دلایا تو اسے یاد آیا۔

دریا خاں نے کہا۔ ”اب میں کیا کروں۔ میں تو خود اس بھائی چارے کی وجہ سے جان بوجھ کر قلعے پر قبضہ کرتے وقت ڈھیل دے رہا تھا۔ لیکن سلطان بہلول نے آنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ تم فی الحال کنجیاں اپنے پاس رکھو اور دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔“ اس نے کنجیاں تو شمس الدین کو واپس کیں اور خود سلطان محمود کے پاس آیا۔

”کنجیاں کیوں نہیں لائے؟“ سلطان نے دریافت کیا۔

”سنا ہے بہلول خان ایک لشکر لے کر پہنچ رہا ہے بہتر یہ ہے کہ اول اس کی فکر کریں۔ اس پر فتح پائی تو دہلی ہماری ہو گی۔“

”اگر تمہاری اطلاع درست ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”مجھے اور فتح خاں کو حکم دیجیے کہ ہم آگے جائیں اور بہلول کو پانی پت کے قریب ہی روک لیں۔ ادھر نہ آنے دیں۔“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مخبر یہ خبریں لے آئے ”سلطان نے دیپال پور سے واپسی کر دی ہے۔ اس کے ساتھ چودہ ہزار کا لشکر ہے۔ وہ دہلی سے پندرہ کوس کے

فاصلے پر ایک قصبہ میں اتر چکا ہے۔“

سلطان محمود شرقی نے فتح خاں اور دریا خاں کو تیس ہزار سوار اور چالیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ روانہ کیا۔ سلطان محمود باقی ماندہ فوج کے ساتھ وہیں رکا رہا۔

یہ دونوں امیر سلطان بہلول سے دو کوس ادھر خیمہ زن ہو گئے۔

دوسرے روز دونوں لشکروں نے لڑائی کے لیے صف آرائی کی۔ دشمن کے لشکر کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ تھی لیکن لودھی جم کر لڑ رہے تھے۔ تعداد کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شرقی کے لشکر کا پلہ بھاری ہے۔ پھر یہ تاثر بھی ختم ہو گیا۔ قطب خاں نے ایک ہاتھی کے ماتھے پر ایسا تیر مارا کہ اندر تک دھنس گیا۔ ضرب ایسی شدید تھی کہ ہاتھی پلٹ کر اپنی ہی فوج پر پل پڑا۔ صفیں تتر بتر ہوئیں تو قطب خاں نے کچھ چابک دست افغانوں کے ساتھ دشمن کا قتل عام شروع کر دیا۔

اسی قتل عام میں قطب خاں لودھی کا سامنا دریا خاں لودھی سے ہو گیا۔ قطب خاں نے بھی اسے وہی طعنہ دیا جو وہ شمس الدین کی زبانی سن چکا تھا۔

”تو ہمارا ہم قوم ہے۔ تیری مائیں اور بہنیں دشمن کی قید میں ہیں اور تو غیروں کی فتح مندی کے لیے کوشاں ہے تجھ ایسے باحمیت انسان کو یہ فعل زیب نہیں دیتا۔“

دریا خاں یہ سن کر غیرت سے زمین میں گڑ گیا۔ اس نے قطب خاں کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں ”میں جا رہا ہوں مگر میرا تعاقب نہ کرنا۔“

دریا خاں نے میدان جنگ سے منہ موڑ لیا۔

اس کے جاتے ہی شکست کا بازار سج گیا۔ سلطان شرقی کا سالارِ اعلیٰ فتح خاں قتل ہوا۔ اس کا سر کاٹ کر بہلول لودھی کے پاس بھیج دیا گیا۔

سلطان کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہاتھی گھوڑے اور دوسرا مال غنیمت بہلول کے ہاتھ لگا۔

سلطان محمود قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ اس نے قلعے کے اندر سے شاد.... نے بجائے جانے کی آوازیں سنیں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”معلوم کرو قلعے میں شادیانے کیوں بج رہے ہیں؟“ محمود نے اپنے آدمیوں کو قلعے کے قریب بھیجا۔

ان کے آدمیوں نے آ کر بتایا۔ ”قلعے کے لوگ آج بہت خوش ہیں۔ مبارک سلامت کی آوازیں سننے میں آ رہی ہیں، ماجرا کیا ہے یہ نہیں معلوم۔“

”کم بختو! کوئی جائے اور معلوم کر کے آئے کہ پانی پت میں میرے لشکر پر کیا گزری؟“

اس کی نوبت ہی نہیں آئی، دریا خاں شکست کی بدخبر لے کر پہنچ گیا۔ اس پیچھے پیچھے لٹا پٹا بے ترتیب لشکر بھی پہنچ گیا۔

دریا خاں نے اپنے لشکر کی پراگندگی کا حال اس طرح بیان کی کیا کہ مایوسی پھیل گئی۔ سلطان محمود کو اس حد تک ڈرا دیا کہ وہ فرار کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس اثنا میں بہلول بھی آن پہنچا۔ اس نے بیس کوس تک بھاگتے ہوئے لشکر کا پیچھا کیا۔

سلطان محمود شکست کی شرمندگی اٹھا کر جونپور واپس چلا گیا۔

اس عظیم الشان فتح کے بعد سلطان بہلول کی سلطنت مستحکم ہو گئی اور رعب سلطانی کا چرچا دور دور تک پھیل گیا اب وہ وسعت سلطنت کے لیے علاقوں کی فتح کو روانہ ہوا۔ پہلے میوات کی طرف گیا۔ احمد خان میواتی نے استقبال کر کے اس کی اطاعت کر لی۔ سلطان نے سات پرگنے اس کے قبضے سے نکال کر باقی اس کے پاس چھوڑ دیے۔ احمد خاں نے اپنے چچا مبارک خاں کو مستقل طور پر سلطان کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سلطان بہلو برن (بلند شہر) گیا۔ سنبھل کا حاکم دریا خاں لودھی بھی مطیع ہو گیا اور سات پرگنے پیش کیے۔ وہ وہاں سے کول آیا پھر برہان آباد پہنچا۔ پھر کئی دوسرے علاقوں سے ہوتا ہوا راپری کے قلعے پر پہنچا۔ سلطان علاؤالدین کا ایک امیر قطب خاں بن حسن خاں یہاں کا حکم تھا۔ وہ قلعہ بند ہو گیا۔ بہلول نے اس کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ قطب خاں معافی کا طلب گار ہوا۔ بہلوں نے اس کی جاگیر برقرار رکھی۔ اٹاوہ کے حاکم نے بھی اطاعت قبول کر لی۔

بہلول لودھی کی نئی بیوی ہیما نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ چاند آسمان سے جدا ہو کر اس کی آغوش میں آ گرا ہے۔

یہ خواب ایسا نہیں تھا کہ نظر انداز کر دیا جاتا بلکہ تعبیر بھی مبارک ہی معلوم ہو رہی تھی۔ بہلول نے منجموں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا۔

ان منجموں نے بتایا کہ اس ملکہ کے بطن سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہو گا جو تخت گیر اور تاجور ہو گا اور اس کی ذات بابرکت سے نشانات سلطنت اور آثار ولایت آشکار ہوں گے۔

سلطان بے حد مسرور ہوا۔ مستحقوں کو صدقات دیئے گئے۔

جلوس کے ساتویں برس اس خواب کی تعبیر سنے چہرہ

دکھایا۔ پسر فرخندہ فال اور ہمایوں بخت متولد ہوا جب یہ اختر ہمایوں طلوع ہوا تو نجومیوں نے ایک مرتبہ پھر بہ حکم سلطانی پیدائش کے وقت اور بروج سماوی کی کیفیت پر نظر ڈالی۔

عرض کیا ''یہ شہزادہ'' بلند اقبال ایک ایسا ستارہ لیے دنیا میں آیا ہے کہ بادشاہت کا باغ اس سے سرسبز و شاداب ہو جائے گا۔''

جب کام میں نظام دیکھا تو ''میاں نظام'' کے خطاب والا سے مخاطب کیا۔ بچپن ہی سے اسے گھر بار سے الگ کرتے ہوئے سنبھل کی سرکار پر تعینات کیا اور خان خاناں قرملی خاں کے سپرد کرتے ہوئے اسے اس کا اتالیق مقرر کیا۔

جب یہ شہزادہ ابھی پانچ برس کا تھا ایک روز تیر کمان لیے بہلول کے سامنے سے گزرا سلطان نے اسے بلایا اور اپنے دل میں سوچا کہ مجھے رانا داود پور کی مہم درپیش ہے۔ ذرا اس کے سر سے فال تو نکالوں، اگر اس کا تیر نشان پر بیٹھا ہے تو مجھے فتح کی امید رکھنی چاہیے۔ بہلول نے اسے پودے پر لگے ایک پھول کو نشانہ بنانے کے لیے کہا شہزادے نے کمان سنبھالی اور تیر چلا دیا۔ نشانہ ایسا درست تھا کہ پودے کو جنبش نہیں ہوئی اور پھول پودے سے الگ ہو گیا۔

سلطان ایسا خوش ہوا کہ سرہند کی سرکار بھی اس کو بخش دی۔

رانا کے خلاف فتح کی نوید مل چکی تھی۔ بہلول لودھی نے اسی وقت امرا کا اجلاس طلب کیا۔ جب تمام امراء جمع ہو چکے تو بہلول ان سے مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اودھے پور، مالوہ اور گوالیار کے واراجگان کا اک مثلث ہے جس نے کبھی ہماری حکومت کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ ہمارے سلطان بننے سے پہلے ہمارے مخالف تھے لیکن جب ہم نے حمید خاں کو زیر کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تو ان کا ہر خواب ٹوٹ گیا۔ اب وہ کھسیانی بلی بن کر کھمبا نوچ رہے ہیں۔ ان میں اودھے پور کا رانا سب سے زیادہ سرکش ہے۔ اب اس نے اپنے بھانجے چتر سال کو دس ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا ہے۔ جو اردگرد کارروائیاں اور رانا دہلی کا بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

میں رانا پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جو خواب دیکھ رہا ہے وہ حماقت پر مبنی ہے اگر وہ یہ خیال کیے ہوئے ہے کہ اودھے پور سے نکل کر دہلی آئے گا تو ہم اسے اودھے پور سے باہر ہی نہیں نکلنے دیں گے۔

اس کے لیے میں ایک لشکر روانہ کر رہا ہوں۔ اس لشکر کی کمانداری قطب خاں کے ہاتھوں ہوگی۔

رانا کا بھانجا چتر سال اپنے لشکر کے ساتھ اودھے پور سے کئی میل باہر پڑاؤ کر چکا تھا۔

سلطان بہلول جاہ و جلال کے ساتھ اجمیر پہنچا اور فوج کو قطب خاں کے ہمراہ اودھے پور کی طرف بھیجا۔

دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ چتر سال اپنے علاقے کے قریب تھا۔ دوسرے اس جنگ میں فتح کے بعد اسے رانا کی دامادی کا شرف بھی ملنے والا تھا۔ لشکر کو بھی یقین دلا دیا تھا کہ یہ جنگ اودھے پور میں لڑی جا رہی ہے لیکن دراصل دہلی کی فتح کے لیے ہے۔ اس لیے یہ لشکر بڑی دل جمعی سے لڑ رہا تھا۔

کافروں کی شدید جنگ کے باعث سلطانی فوج نے پہلے تو منہ پھیر لیا اور بہت سے تجربہ کار افغان اس جنگ میں شہید ہو گئے لیکن تھوڑی دیر بعد جنگ کے حالات نے پلٹا کھانا شروع کر دیا چتر سال کے لشکری جنگ سے جی چرانے لگے۔

قطب خاں اور خان خاناں قرملی جان ہتھیلی پر رکھے تلواریں لیے آگے بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

چتر سال کے مارے جاتے ہی لشکری بھاگ کھڑے ہوئے۔

رانا اودھے پور میں تھا اور چتر سال کے بھاگتے ہوئے لشکر کی آوازیں تصور سماعت سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے سنا کہ بہلول کا لشکر اودھے پور کی دیواروں کے پاس آ گیا ہے۔ اس کے پاس صلح کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے صلح کر لی۔ شرط کے مطابق سلطان کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔

⬮⬮⬮

سلطان محمود شرقی پہلی شکست کے بعد انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ نئے لشکر کی بھرتی کے لیے سرگرداں رہا تھا۔ اسلحے کے ڈھیر لگا تا رہا تھا۔ اب وہ اتنی تیاری کر چکا تھا کہ بہلول لودھی سے ٹکرا سکے۔ اس نے اپنے امرا اور سالاروں کو جمع کر کے انہیں اپنے ارادے سے واقف کیا۔

''مجھے ماضی کی شکست اب تک یاد ہے لیکن وہ شکست ہماری کمزوری سے نہیں دریا خاں لودھی کی غداری کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ وہ اندر ہی اندر بہلول لودھی کے لیے کام کر رہا ہے۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے اور بہلول لودھی کا مطیع ہو گیا ہے۔

میرے مخبروں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ بہلول نے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا ہے لیکن ہماری عسکری طاقت اب بھی اس سے زیادہ ہے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جون پور سے کوچ کیا جائے اور بہلول پر ضرب لگانے کے لیے دہلی کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

میں اب بھی کہتا ہوں کہ دہلی کے تخت و تاج اور حکمرانی کا مالک بننے کا حق دار میں ہوں اس لیے کہ دہلی کے شاہی خاندان سے میرا تعلق ہے بہلول لودھی کا نہیں۔''

اس کی رائے سے تمام امرا متفق تھے۔ اس نے صرف دو دن لشکر کی تیاری میں گزارے اور لشکر جرار لے کر جونپور سے نکل گیا۔

اس سفر میں سلطان محمود شرقی کے دونوں بیٹے حسین شرقی اور بھیکن خاں (جو بعد میں محمد شاہ شرقی کے نام سے مشہور ہوا) بھی شامل تھے۔

بہلول لودھی ان دنوں علاقوں کی فتح کے لیے نکلا ہوا تھا اور اس وقت اٹاوہ میں تھا۔ اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کا ایک امیر جونا خاں سلطان شرقی سے جا ملا ہے اور سلطان نے اسے شمس آباد کا حاکم بنا دیا ہے۔

بہلول لودھی نہایت ذہین سلطان تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں بہت جلد سلطان محمود شرقی سے ٹکرانے کا موقع ملے گا۔ اس لیے کہ سلطان، جونا خاں کا سہارا لے کر اپنا دیرینہ خواب پورا کرنے کے لیے نکلے گا بلکہ نکل چکا ہوگا۔''

بہلول نے اسی وقت مخبروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ ''جاؤ خبر لاؤ، کسی لشکر کی آمد تو نہیں ہے؟''

دوسرے دن یہ مخبر تیز رفتار پرندوں کی طرح دوڑتے ہوئے آئے اور یہ خبر لائے کہ سلطان محمود کا لشکر شمس آباد کے قریب آ کر ٹھہر گیا ہے۔

بہلول کا اندازہ درست نکلا تھا۔

سلطان کو راستے میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ بہلول اپنے لشکر کے ساتھ اٹاوہ میں ہے۔ اس نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور شمس آباد کے قریب ٹھہر گیا۔

بہلول لودھی نے بھی اپنے لشکر کو روانگی کی اجازت دی۔

دونوں لشکر آمنے سامنے جنگ کی ابتدا کی صفیں درست کرنے لگے۔ بہلول کے ساتھ اس وقت نہایت جہاندیدہ اور بڑے نامور سالار تھے۔ عمر خاں، علی خاں، مبارز خاں، قطب خاں یہ سب اگلی صفوں میں تھے۔

عیسیٰ خاں اور قرملی خاں دہلی کی حفاظت کے لیے ایک لشکر کے ساتھ پیچھے رہ گئے تھے۔

پہلے دن طرفین کی فوجوں میں زوردار معرکہ آرائی ہوئی لیکن دوسرے روز قطب خاں اور رائے پرتاب نے صلح کی گفتگو کر کے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ مبارک شاہ بادشاہ دہلی کے قبضے میں تھا وہ سلطان بہلول کے قبضے میں رہے گا اور جو کچھ سلطان ابراہیم بادشاہ جونپور کے قبضے میں تھا وہ سلطان محمود کے قبضے میں رہے گا اور سلطان محمود کے جو سات ہاتھی سلطان کے قبضے میں آ گئے تھے ان کو سلطان بہلول نے واپس کر دیا اور یہ طے پایا کہ شمس آباد کو موسم برسات کے بعد سلطان اپنے قبضے میں لے لے گا کیونکہ وہ اسے فتح کر چکا تھا اور جونا خاں کو وہاں کا حاکم بنایا تھا۔ جونا خاں سلطان محمود سے مل گیا تھا۔ اس طرح شمس آباد سے اس کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔

سلطان محمود جونپور چلا گیا۔

برسات کا موسم گزرا تو بہلول نے جونا خاں کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ وہ معاہدے کے مطابق شمس آباد اس کے حوالے کر دے۔

جونا خاں یہ سمجھا تھا کہ برسات کا پانی اس معاہدے پر بھی پڑ چکا ہے۔ اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ بہلول کے قاصد کو کئی دن اپنے پاس روک لینے کے بعد بڑی ذلت کے ساتھ واپس کیا۔ اس عرصے میں وہ سلطان محمود کو بھی لکھ چکا تھا کہ وہ اس کی مدد کو پہنچے۔

سلطان بہلول نے سنا تو شمس آباد پر چڑھ دوڑا۔ جونا خاں تو سلطان محمود کا منتظر تھا۔ جب وہ بروقت نہیں پہنچا اور بہلول سر پر آ گیا تو فرار ہو گیا۔

بہلول نے شمس آباد کی حکومت رائے کرن کے حوالے کی اور گرد و نواح کے علاقوں کو اچھی طرح مستحکم کر لیا۔

محمود شرقی اپنے قصر میں اطمینان سے بیٹھا تھا کہ مفرور جونا خاں جونپور پہنچ گیا اور محمود شرقی سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ اس کا گرد آلود چہرہ دیکھ کر محمود شرقی اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جونا خاں، اس حال میں اور یہاں۔''

''آپ کی دوستی کا مجھے یہ صلہ ملا ہے۔ بہلول نے میرے علاقے پر قبضہ کر کے رائے کرن کو وہاں کا حاکم بنا دیا ہے۔''

''جونا خاں معاہدے میں یہی طے ہوا تھا کہ شمس آباد بہلول کے پاس رہے گا۔''

''شمس آباد اس کے پاس رہے گا لیکن یہ طے نہیں ہوا تھا کہ حاکم میں نہیں رائے کرن ہوگا۔ مجھے یہ سزا آپ کا ساتھ دینے کی وجہ سے ملی ہے ورنہ بہلول نے خود مجھے وہاں کا حاکم

بنایا تھا۔''

''اس کے لیے اس سے بات کی جاسکتی ہے۔''

''باتوں کا وقت اب گزر گیا۔ اسی لیے بہلول کے آنے سے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے قاصد کو بھی میں ٹال مٹول سے روکے ہوئے تھا لیکن آپ تشریف ہی نہیں لائے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو جونا خاں، تمہارا کوئی خط ہم تک نہیں پہنچا۔'' محمود شرقی کہتے کہتے کچھ دیر کے لیے رکا پھر خود ہی بول پڑا۔ ''اس کا مطلب ہے کوئی سازش جونپور میں بھی جگہ بنا رہی ہے۔''

''سلطان معظم! کیسی سازش۔''

''کوئی تو ہے جس نے وہ خط ہم تک نہیں پہنچنے دیا۔''

جونا خاں اس کا کیا جواب دیتا خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد سلطان محمود نے اسے مہمان خانے میں جانے کا حکم دیا اور خود یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ خط کو اس تک پہنچنے سے روکنے والا کون ہوسکتا ہے۔ اس کا دھیان اپنی بیوی کی طرف گیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اس خیال کو ٹھکرا دیا۔ وہ تو خود یہ چاہتی ہے کہ میں بہلول سے ٹکرا جاؤں۔ وہ کیوں اس خط کو مجھ تک نہیں پہنچنے دے گی۔ پھر اس کا گمان اپنی والدہ بی بی راجی کی طرف گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ماں کے پاس پہنچ گیا۔

''جونا خاں کی طرف سے کوئی قاصد آیا تھا؟''

''آیا تو تھا۔''

''آپ نے اسے مجھ سے ملنے نہیں دیا۔''

''وہ جو پیغام لایا تھا وہ ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ تم تک پہنچایا جاتا۔''

''وہ کیا پیغام لایا تھا ؟''

''معاہدے کے مطابق شمس آباد پر بہلول کا حق ہے۔ تمہیں اس معاہدے سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔''

''وہ میرے حاکم کو نکال دے پھر میرا کیا رعب رہ جائے گا۔''

''جس علاقے پر اس کا قبضہ ہے اس پر وہ جس کو چاہے حاکم مقرر کرے۔''

''معاہدے میں یہ طے نہیں ہوا تھا۔''

''ہر بات معاہدے میں نہیں لکھی جاتی۔''

''میں جونا خاں کو اس کا حق دلاؤں گا۔''

''میرا کہنا مان لو اور اس قصے کو یہیں رہنے دو۔''

''آپ خاتون ہیں۔ مملکت کے امور کو میں بہتر جانتا ہوں۔''

''میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ اب تم جانو۔''

جونپور میں جنگ کی تیاریاں پھر شروع ہوگئی تھیں۔ وہ لشکر لے کر نکلا اور شمس آباد کے آس پاس پڑاؤ ڈالا۔ بہلول لودھی شمس آباد ہی میں تھا۔ اسے خبر مل چکی تھی کہ سلطان جونپور ایک بڑے لشکر کے ساتھ شمس آباد پر قبضہ کرنے کے لیے آرہا ہے۔ اس لیے وہ پوری تیاری سے تیار بیٹھا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان محمود پہنچ چکا ہے اور پڑاؤ ڈال کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے تو اس نے بھی اپنے سالاروں کو طلب کیا اور جنگی حکمت عملی پر مشورے کرنے لگا۔

اس موقعے پر قطب خاں اور دریا خاں نے تجویز پیش کی۔

''سلطان محمود ابھی اپنی تھکن اتار رہا ہے۔ وہ کوشش کرے گا کہ دو تین دن کا وقفہ دے کر جنگ کا آغاز کرے۔ ہم بھی جنگ کا آغاز نہیں کرتے۔ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر شب خون مارتے ہیں۔ ممکن ہے اس شب خون ہی سے ہمیں اتنی کامیابی مل جائے کہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔''

جنگوں میں یہ ہوتا ہی ہے۔ بہلول نے شب خون مارنے کی اجازت دے دی۔

رات کی تاریکی میں قطب خاں ایک چھوٹے سے لشکر کو لے کر شب خون مارنے کے لیے نکلا۔ سلطان محمود، بہلول لودھی کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے پڑاؤ سے کچھ پہلے اپنے کچھ سپاہیوں کو چھپا رکھا تھا کہ اگر شب خون مارا جائے تو یہ سپاہی حملہ آوروں کو پڑاؤ تک نہ پہنچنے دیں۔

قطب خاں اس خطرے سے بے خبر اپنے آدمیوں کو لے کر نکلا اور اس مقام تک پہنچ گیا جہاں یہ سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ قطب خاں اندھیرے میں انہیں دیکھ نہ سکا اور نرغے میں آگیا لیکن وہ قطب خاں تھا۔ اس نے تلوار کے وہ ہاتھ دکھائے کہ مٹھی بھر سپاہی اس کے حملوں کی تاب نہ لاسکے۔ بے تحاشا اپنے پڑاؤ کی طرف بھاگے۔ قطب خاں کو لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے پڑاؤ کے بہت قریب پہنچ گیا۔ سلطان محمود کا لشکر اس وقت تک بیدار ہوچکا تھا وہ مقابلے پر آگیا۔ قطب خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ اتنے آدمی نہیں تھے کہ وہ مقابلہ کرسکتا۔ اس نے واپسی کے لیے گھوڑے کو تیزی سے موڑنا چاہا۔ اسی دم گھوڑے کو ٹھوکر لگی۔ گھوڑا نیچے گرا اور اس سے پہلے قطب خاں زمین پر آگیا۔ محمود شرقی کے سالار تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے گرتے ہی اس پر جھپٹے اور قطب خاں گرفتار ہوگیا۔

اندھیرے میں انہیں یہ معلوم نہ ہوسکا تھا کہ انہوں نے کس کو گرفتار کیا ہے لیکن جب اسے لشکر میں لایا گیا اور مشعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا تو پورے لشکر میں فتح کے نعرے بلند ہونے لگے۔ قطب خاں کو فوراً سلطان محمود کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

قطب خاں کے آدمیوں نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قطب خاں گرفتار ہوگیا تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ لشکر شمس آباد پہنچا تو باقی لشکر میں بددلی پھیل گئی۔ یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ قطب خان گرفتار نہیں ہوا بلکہ سلطان محمود کے ساتھ مل گیا ہے۔

سلطان محمود شرقی کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قطب خاں بہلول لودھی کا سالا بھی ہے، چچا زاد بھائی بھی اور ایک بہادر سالار بھی۔ وہ اس کی رہائی کے لیے کڑی سے کڑی شرط قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا پھر جونا خاں کی خاطر جنگ کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ اس وقت جونپور واپس چلا جائے اور بہلول لودھی کی پیشکش کا انتظار کرے۔ وہ دریائے گنگا کو پار کرتا ہوا اپنے علاقوں کی طرف چلا گیا۔ فتح کی کنجی قطب خاں پابہ جولاں اس کے ساتھ تھا۔

بہلول خاں کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ اب اسے سلطان محمود کا تعاقب کرنے کا یارا نہیں تھا۔ اس نے اپنی فوج سمیٹی اور دہلی واپس آگیا۔

قطب خاں کی بہن شمس خاتون کو جب یہ معلوم ہوا کہ لشکر واپس آگیا لیکن قطب خاں اس لشکر کے ساتھ نہیں بلکہ یہاں سے میلوں دور جونپور کے کسی زنداں میں ہے تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔

بہلول اس وقت اپنی بیوی ہیما کے پاس تھا کہ شمس خاتون کا پیغام اس کے پاس پہنچا۔ اس نے کہلا بھیجا تھا بلکہ سوال کیا تھا۔ ''قطب خاں دشمن کی قید میں ہے۔ اس حالت میں تمہیں نیند کیسے آتی ہے۔ تم پر تو کھانا پینا حرام ہوجانا چاہیے تھا۔''

اس پیغام کو سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''آپ کہاں جارہے ہیں ؟'' ہیما نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''تم نے سنا نہیں، شمس خاتون نے کیا کہلوایا ہے۔''

''میں نے سن لیا ہے۔ جنگوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔''

''یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ شمس خاتون اس کی بہن ہے۔ غلطی میری ہے۔ مجھے اس کے پاس جاکر اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ اسے بتانا چاہیے تھا کہ میں قطب خاں کی طرف سے غافل نہیں ہوگیا ہوں۔''

''ابھی تو آپ آئے ہیں، کیا پھر کسی معرکے کے لیے نکلیں گے''

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ابھی تو مجھے شمس خاتون کے پاس جانا چاہیے۔''

وہ شمس خاتون کے پاس پہنچا تو اس نے ایک ایسی عورت کو اپنے سامنے دیکھا، جو کئی دن برابر روتی رہی ہو۔

''شمس خاتون، آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمیں قطب خاں کی فکر نہیں۔ وہ ہمارا دایاں ہاتھ تھا۔ اس کے بغیر تو ہم معذور ہوجائیں گے۔''

''آپ نے اس کی رہائی کے لیے کچھ کیا بھی تو نہیں۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں کہ سلطان شرقی اس کی رہائی کے لیے کیا شرائط پیش کرتا ہے۔''

''آپ خود بھی تو اس سے رجوع کرسکتے ہیں۔''

''بات میں نے آگے بڑھائی تو وہ اسے میری کمزوری سمجھے گا۔ اس کی شرائط میں سختی آجائے گی۔ میں چاہتا ہوں وہ پہل کرے۔''

''آپ کی یہ ضد میرے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔''

''یہ میری ضد نہیں مصلحت ہے۔ رہی یہ بات کہ قطب

جواب

تین بجے رات کو اچانک فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ گہری نیند سویا ہوا زاہد اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا ٹیلیفون تک پہنچا۔

''میں تمہارا پڑوسی حامد بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے غضب ناک آواز آئی۔ ''تمہارا کتا سرِ شام سے گلا پھاڑ پھاڑ کر میرے باغ میں بھونکے جارہا ہے۔ ابھی تک مجھے ایک منٹ بھی سکون کی نیند میسر نہیں ہوسکی ہے۔ اگر تم اپنے کتے کو یہاں سے نہیں لے گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

دوسری رات کو ڈھائی تین بجے کے درمیان زاہد نے حامد کو فون کیا اور بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا پڑوسی زاہد بول رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے آج تک کبھی کوئی کتا پالنے کی غلطی نہیں کی۔''

خاں کو نقصان پہنچے گا۔ اس سے آپ بے فکر رہیں۔ سلطان محمود اسے زندہ رکھنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ قطب خاں کو مار دے گا تو مجھ سے کیا لے سکے گا۔ ابھی محض ایک ہفتہ ہوا ہے۔ میں لشکر کی تیاری میں مشغول ہوں۔ بہت جلد اس کی رہائی کے لیے جونپور جاؤں گا۔"

شمس خاتون مطمئن ہوگئی لیکن بہلول کی نیند واقعی اڑ گئی۔ اس کی یہ نیند اس خبر نے اڑا دی تھی کہ سلطان محمود کا انتقال ہوگیا۔ اب اسے یہ دیکھنا تھا کہ سلطان محمود کا جانشین کس کو مقرر کیا جاتا ہے اور نئے بادشاہ کے کیا عزائم سامنے آتے ہیں۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کی ماں بی بی راجی نے امرا کے مشورے سے بھیکن خاں کو محمد شاہ کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

کئی مہینے ان انتظامات میں گزر گئے۔ بہلول نے اب ضروری سمجھا کہ نئے بادشاہ سے سلسلۂ مراسلت شروع کیا جائے۔ اس نے محمد شاہ کو لکھا۔

"آپ کے بھائی کے دور میں میرے چچا زاد قطب خاں کو گرفتار کرلیا گیا تھا لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ قطب خاں کو رہا کر دیا جائے تاکہ دونوں حکمرانوں کے درمیان اچھے اور پائیدار تعلقات قائم ہوسکیں۔"

محمد شاہ نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

جب بہلول لودھی کی طرف سے کئی خط پہنچ چکے تو اس کا بھائی حسن خاں اسے بہلول لودھی کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ محمد شاہ نے اپنے بھائی کو زنداں میں ڈالنے کا حکم جاری کر دیا۔

اس کو بھی اسی زنداں میں ڈال دو جہاں قطب خاں ہے۔ یہ اس کا بڑا حمایتی ہے اچھا ہے اس کا بھی وہی انجام ہو جو قطب خاں کا ہوا ہے۔"

محمد شاہ دراصل دہلی پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا اور اپنی عسکری قوت میں اتنا اضافہ کرلیا تھا کہ بہلول کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے رویے سے بہلول کو جنگ پر آمادہ کرے۔

بہلول لودھی، محمد شاہ کے رویے سے مایوس ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے سالاروں کو بلایا۔ وہ ہر معرکے سے پہلے اپنے سالاروں سے مشورہ ضرور کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ انہیں حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"میں جونپور کے نئے حکمراں سے مایوس ہوچکا ہوں۔ وہ کسی طرح بھی صلح پر آمادہ نہیں بلکہ میرے کسی خط کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو زنداں میں ڈال رکھا ہے۔ ایسے ظالم بادشاہ سے کچھ بعید نہیں۔ وہ قطب خاں کو قتل بھی کرا سکتا ہے۔ اس لیے مزید دیر کرنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ اس کے خلاف لشکر کشی کی جائے گی۔"

"آپ جب اور جس وقت چاہیں گے ہم محمد شاہ کے خلاف لشکر کشی کے لیے تیار ہیں۔" تمام امرا نے بہ یک آواز کہا۔

اس کا ایک امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ "مجھے لشکر کشی پر اعتراض نہیں لیکن معاملہ قطب خاں کی رہائی کا ہے اس لیے میری ایک تجویز ہے۔"

"کہو کیا تجویز ہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔"

"سلطان محترم! میں چاہتا ہوں اس جنگ میں فتح یا شکست سے زیادہ ہماری توجہ اس پر ہو کہ ہم جنگ کے دوران محمد شاہ کے کسی عزیز ترین رشتہ دار یا کسی ہر دل عزیز سالار کو گرفتار کرلیں تاکہ اس کی رہائی کے بدلے میں قطب خاں کی رہائی کا مطالبہ کرسکیں۔"

اس تجویز کی تمام امرا نے حمایت کی۔ بہلول لودھی نے بھی توصیفی کلمات ادا کیے۔

سلطان محمد شاہ کو اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ بہلول لودھی ایک لشکر کے ساتھ دہلی سے جون پور کی طرف کوچ کر چکا ہے۔ اب تک وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ بہلول لودھی اتنی ہمت نہیں کرے گا لیکن اس اطلاع کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ بہلول کو جونپور تک نہ پہنچنے دے اور آگے بڑھ کر راستے ہی میں اسے روکے۔

محمد شاہ شرقی منزلیں مارتا ہوا سرستی آیا۔ سلطان بہلول نے سرستی کے نزدیک ہی راپری میں قیام کیا۔ سرستی تک آکر محمد شاہ کی شکی طبیعت نے ایک عجیب خیال کو جنم دیا۔ اس نے سوچا میں تو یہاں جنگ کے عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرے پیچھے کہیں کوئی حسن خاں کو قید سے نکال کر تخت پر نہ بٹھا دے۔ یہ خوف اسے اپنی والدہ بی بی راجی سے بھی تھا جو اسے اب ناپسند کرنے لگی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جونپور کے کوتوال کو حکم بھیجا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد حسن خاں کو زنداں سے نکال کر قتل کر دو۔ فوراً حرکت میں آؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی سازش جنم لے۔ میں کسی وقت بہت مجبور ہوگیا تو قطب خاں کے قتل کے احکام بھی بھیجوں گا۔ فی الحال تم حسن خاں کا کام تمام کردو۔

کوتوال کی طرف سے عرضداشت آئی۔ ”بی بی راجی ان دونوں کی اسی طرح حفاظت کر رہی ہیں کہ ان کا قتل کرنا میری قوت سے باہر ہے۔ اگر بی بی راجی جونپور سے باہر چلی جائیں تو میں یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہوں۔“

یہ عریضہ پڑھتے ہی اس نے والدہ کے نام خط لکھا۔

”میں سرستی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے بھائی حسن خاں کے ساتھ زیادتی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس سے صلح کرلوں اور ملک کا کچھ حصہ حسن خاں کو دے دوں۔ میں نے کوتوال کو لکھ دیا ہے وہ حسن خاں کو میرے پاس پہنچا دے گا۔ آپ بھی تشریف لے آئیں۔ حسن خان کے دل میں میری طرف سے یقیناً کدورت ہوگی آپ یہاں ہوں گی تو اسے سمجھا لیں گی۔“

بی بی راجی نہایت جہاندیدہ اور ذہین خاتون تھیں لیکن بیٹے کی اس چال کو نہ سمجھ سکیں۔ خط ملتے ہی جونپور سے نکل آئیں۔

ان کے نکلتے ہی کوتوال حرکت میں آیا اور حسن خاں کو قتل کر دیا۔ بی بی راجی کے وفادار امرا نے یہ خبر انہیں راستے ہی میں پہنچا دی۔ بی بی راجی قنوج پہنچ کر رک گئیں، محمد شاہ کے پاس نہیں آئیں۔

محمد شاہ نے بی بی راجی کو لکھا۔

”میں حسن خاں کی تعزیت کے لیے آپ کے پاس ضرور آتا لیکن سوچتا ہوں جب تمام شہزادوں کا یہی حال ہو جائے گا تو آپ سے تعزیت ایک ساتھ کروں گا۔“

ابھی جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ محمد شاہ کا دوسرا بھائی حسین خاں، محمد شاہ کی خلوت میں آیا اور اس سے عرض کرنے لگا۔

”میرے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ سلطان بہلول کا لشکر ہم پر شب خون مارنا چاہتا ہے۔ مجھے ایک لشکر دیں تاکہ میں اس کا راستہ روکوں۔“

محمد شاہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ حسین خاں نے تیس ہزار سوار اور تیس ہاتھی ساتھ لیے اور محمد شاہ کے لشکر سے الگ ہو گیا۔

وہ بہلول لودھی سے لڑنے کے لیے نہیں نکلا تھا بلکہ اپنے بھائی حسن خاں کے انجام سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور قنوج کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں اس کی والدہ تھیں۔ کچھ دور چل کر جب وہ جھرنے کے کنارے پہنچا تو اسے خیال آیا کہ اپنے بھائی جلال خاں کو بھی ساتھ لے چلے۔ وہ وہیں رک گیا اور کسی کو اسے بلانے کے لیے بھیجا۔ کچھ دیر بعد اس نے سوچا رکنے کا کیا فائدہ۔ جلال خاں پیچھے آ ہی جائے گا۔ وہ قنوج کی طرف چل دیا۔

سلطان بہلول کا گشتی دستہ اتفاق سے وہاں آیا اور جھرنے کے کنارے ٹھہر گیا۔ جلال خاں، حسین خاں کی طلبی کے بموجب محمد شاہ کے لشکر سے نکل کر جھرنے کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں اس نے فوج کو دیکھا۔ یہی سمجھا کہ حسین خاں کے آدمی ہیں جو اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ لاعلمی میں گرفتار ہو گیا۔

سلطان کے امرا نے یہی طے کیا تھا کہ جنگ کے دوران یہ کوشش کی جائے گی کہ محمد شاہ کا کوئی عزیز گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ موقع جنگ سے پہلے ہی ہاتھ آ گیا۔ بہلول نے اسے عنایت خداوندی سمجھا اور سجدۂ شکر بجا لایا۔

محمد شاہ کو جب معلوم ہوا کہ حسین خاں اور جلال خاں دونوں اس کا لشکر چھوڑ کر چلے گئے تو اسے بہلول سے زیادہ جونپور کے دفاع کی فکر ہوئی۔ اب اس کا لشکر لڑنے کے قابل رہا ہی کہاں تھا۔ دوسرے اسے یہ بھی فکر ہوئی کہ حسین خاں اسے برطرف کر کے ضرور اس کے تخت پر بیٹھے گا۔ اب اسے والدہ بی بی راجی کی حمایت کا یقین بھی نہیں رہا تھا۔

محمد شاہ نے پسپائی اختیار کی اور قنوج کی طرف چل دیا۔

محمد شاہ شرقی قنوج کے قریب تین کوس کے فاصلے پر راجگیر گھاٹ پر پہنچ کر رک گیا کیونکہ یہاں سے معلوم ہوا کہ بی بی راجی نے دولت شرقیہ کے امرا کی حمایت سے حسین خاں کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔

محمد شاہ کے لشکر میں جب یہ خبر پھیلی کہ حسین خاں نے جونپور کے تخت پر قبضہ کر لیا ہے تو لشکری بھی محمد شاہ سے بدظن ہونے لگے۔ چوری چھپے اس سے الگ ہو کر سلطان حسین کے پاس پہنچنے لگے۔

محمد شاہ کے پاس بہت کم لشکری رہ گئے تھے۔ یہ صورت حال اس کے لیے حوصلہ شکن تھی۔

سلطان حسین نے ایک لشکر محمد شاہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ محمد شاہ اس وقت تک قریب کے ایک باغ میں چھپ گیا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ یہاں چھپ کر حالات پر نظر رکھے گا اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن سلطان حسین کے لشکر نے اس باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

محمد شاہ نہایت ماہر تیر انداز تھا اور پھر باغ کے اندر گھنے پیڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ اگر اندر سے تیر چلاتا رہتا تو سلطان حسین کے لشکر کا کوئی بھی فرد زندہ نہ بچ پاتا۔ اس نے

یہی کیا بھی لیکن اس کا لشکر اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ اس کے سلاخ دار نے تیروں سے پیکان جدا کر دیے تھے۔ وہ ترکش سے جو تیر نکالتا تھا بغیر پیکان کے نکلتا تھا۔ آخرکار تلوار ہاتھ میں لی اور باغ سے نکل آیا۔ چند آدمیوں کو قتل کیا۔ اچانک ایک تیر کسی طرف سے آیا اور اس کے گلے میں پیوست ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے گرا اور ختم ہو گیا۔

سلطان حسین شرقی نے اس دباؤ کے تحت کہ جلال خاں، بہلول لودھی کی قید میں تھا صلح کر لی۔ قطب خاں کو سات ماہ کی قید کے بعد آزاد کر کے دہلی بھیج دیا۔ اس کے معاوضے میں سلطان بہلول نے شہزادہ جلال خاں کو بھی قید سے رہا کر کے حسین شرقی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

⁂

سلطان بہلول پنجاب کی مہمات کے انتظامات اور ملتان کے حاکم کی بغاوت کی وجہ سے ملتان جا رہا تھا۔ اس نے قطب خاں لودھی اور خان جہاں کو اپنی نیابت میں دہلی چھوڑا اور خود بھی دہلی چھوڑ دی۔

جون پور کے حکمرانوں کے ساتھ بہلول لودھی کی صلح ہو گئی تھی۔ چند ماہ خاموشی سے گزر بھی گئے تھے لیکن دراصل حسین شرقی نے یہ صلح اپنی عسکری طاقت کو بڑھانے کے لیے کی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا تھا۔ اب اس کے لشکر میں ستر ہزار سوار اور ایک ہزار مست ہاتھی تھے۔ اس کے بقول وہ بہلول لودھی کو چیونٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔

سلطان لودھی ابھی راستے میں تھا کہ اسے خبر ملی۔

”سلطان حسین ایک بڑا لشکر اور مست ہاتھیوں کو لے کر دہلی کی طرف آ رہا ہے۔“

سلطان بہلول فوراً واپس ہوا اور دہلی آ گیا۔ اپنے سالاروں کو جمع کیا اور حسب سابق ان سے ضروری مشوروں کے بعد مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ چندوار کے مقام پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔

سلطان بہلول اپنے حریف لشکر کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ایسا عظیم لشکر اس کے مقابلے پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے امرا کے مشورے سے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے جنگ کا آغاز کر دیا۔ سلطان حسین نے بھی اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصے کی کمان وہ خود کر رہا تھا۔ دوسرا حصہ اپنے بھائی جلال خاں کے سپرد کیا تھا۔

فوجوں کے تمام حصے بہ یک وقت آپس میں ٹکرائے تو تلواروں کی جھنکار آسمان تک پہنچی۔ مست ہاتھیوں کی دوڑ بھاگ سے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ دن گزر گیا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح معرکہ آرائی نے زور باندھا۔

سات دن گزر گئے تھے مگر کسی لشکر میں کمزوری کے کوئی آثار نہیں تھے البتہ سلطان حسین کی فوج کو کثرت اسلحہ وسپاہ کی بدولت غلبہ حاصل تھا اور یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ بالآخر سلطان حسین کو فتح حاصل ہو جائے گی۔

اس موقعے پر قطب خاں نے اپنی کمزوری کو دیکھتے ہوئے سلطان حسین شرقی کے پاس پیغام بھیجا۔

”جس وقت میں قید میں پڑا ہوا تھا اس وقت آپ کی والدہ بی بی راجی کے مجھ پر بے حد احسانات ہیں ان کی وجہ سے میری جان بچی رہی۔ اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے جنگ کروں لہٰذا آپ اسی وقت میدان سے واپس چلے جائیں۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ دریائے گنگا کے اس پار کا ملک اپنے قبضے میں رکھیے اور گنگا کے دوسری طرف کے علاقوں پر بہلول لودھی کو قابض رہنے دیں۔“

سلطان حسین صلح کی اس پیش کش کو شاید ٹھکرا دیتا لیکن جب اس کے پاس یہ خبریں پہنچیں کہ اس کے لشکر کے دو حصوں کو عمر خاں اور بہاؤالدین نے تباہ و برباد کر دیا ہے تب وہ صلح پر تیار ہو گیا۔

سلطان حسین نے اس صلح پر بھروسا کیا اور اپنا مال و اسباب چھوڑ کر چلا گیا۔

سلطان بہلول نے سلطان حسین کے اعتماد کو دھوکا دیا اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس کا قیمتی مال و متاع جو اونٹوں پر لدا ہوا جا رہا تھا اپنے قبضے میں لے لیا اور بہت سے امرا کو پکڑ لیا۔ سلطان حسین کے بہت سے پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنے حاکم مقرر کر دیے۔

سلطان حسین تیزی سے جونپور کی طرف جا رہا تھا لیکن سلطان بہلول شکاری چیتے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ سلطان حسین نقصان اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق سفر ملتوی کیا اور لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس لڑائی کا انجام بھی صلح پر ہوا۔

حسین شاہ رایری چلا گیا اور بہلول دہلی آ گیا۔

جنگوں کا یہ سلسلہ تھمنے والا نہیں تھا۔

ایک عرصے بعد پھر سلطان حسین نے فوج جمع کر کے سلطان بہلول پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد سلطان حسین کو پھر شکست ہوئی۔ سلطان حسین رایری کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان بہلول بھی رایری پہنچ کر حسین شرقی سے ٹکرا

گیا۔ اس جنگ میں بھی اسے فتح حاصل ہوئی۔

اس مرتبہ سلطان حسین بھاگا تو گوالیار پہنچ کر دم لیا۔

○○○

گوالیار کا راجا کرت سنگھ اپنے راج محل میں بیٹھا تھا کہ اس کے محافظ دستوں کا سالار اس کے پاس آیا اور سلطان حسین شرقی کے آنے کی خبر اسے سنائی۔

وہ بہت دن سے سن رہا تھا کہ سلطان حسین، بہلول لودھی سے الجھا ہوا ہے۔ اسے ان جنگوں سے خاطر خواہ اطمینان حاصل ہو رہا تھا کیونکہ جب تک یہ جنگیں جاری تھیں بہلول ہندو ریاستوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان حسین کی اپنے علاقے میں آمد کا سن کر اس کا دل کانپ گیا۔ میں تو بہلول لودھی سے خائف تھا اب کیا سلطان حسین بھی میرے علاقے پر چڑھ آیا ہے۔

''اس کے آنے کے عزائم کیا ہیں۔''

''وہ بہلول سے شکست کھا کر ہمارے علاقے کی طرف آیا ہے۔ ہم سے جنگ کرنا مقصود نہیں ؟''

''ہم اس کے استقبال کے لیے خود شہر سے باہر جائیں گے۔''

اس نے اپنے محافظ دستوں کو ساتھ لیا اور سلطان شرقی کے استقبال کے لیے آیا۔ کئی لاکھ تنکے، خیمہ، سراپردہ کئی سو ہاتھی، گھوڑے بہ طور نذرانہ پیش کیے۔

رات کو جب دونوں حکمران گفتگو کے لیے بیٹھے تو سلطان حسین حرف مطلب زبان پر لایا۔

''میں ایک بار پھر بہلول لودھی کے خلاف حرکت میں آنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اور اودھے پور کا رانا مل کر بہلول کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کریں تو وہ ان حملوں کو روکنے کے لیے اپنا لشکر بھیجے گا۔ بس وہی موقع ہوگا جب میں اس پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔ اس کی طاقت تقسیم ہو جائے گی اور میں اسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

راجا صاحب! اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑنا بہت ضروری ہے۔ اسی میں جونپور کی بھی بھلائی ہے اور گوالیار کی بھی ورنہ وہ مجھے ختم کر کے آپ لوگوں کو آنکھیں دکھائے گا۔''

راجا نے اس سے اتفاق کیا اور اپنا لشکر بہلول لودھی کے علاقوں کی طرف بھیج دیا۔ اودھے پور کا لشکر بھی اس کی مدد کو آ گیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب سلطان حسین حرکت میں آیا اور کالپی پہنچ گیا۔ سلطان بہلول نے ایک لشکر اودھے پور اور گوالیار کی فوجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ باقی لشکر لے کر کالپی کے نواح میں پہنچ گیا۔

سلطان حسین کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ اس نے فوراً جنگ کا آغاز کر دیا۔

اس کے مخبروں نے یہ اطلاع تو دے دی تھی کہ سلطان بہلول نے لشکر کا بڑا حصہ راجا گوالیار کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا ہے لیکن اسے یہ اطلاع نہیں مل سکی تھی کہ اس لشکر نے راجا گوالیار کو مار بھگایا ہے اور اب کسی بھی وقت بہلول کی مدد کے لیے نمودار ہو سکتا ہے۔

جنگ اپنی گرمی پر تھی۔ سلطان شرقی کا لشکر غلبہ پانے کے قریب تھا کہ میدان اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجنے لگا۔ سلطان نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک لشکر گرد اڑاتا طوفان اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ یہ وہ لشکر تھا جو راجا گوالیار کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس لشکر کے آ جانے کے بعد پانسا پلٹنے لگا تھا کہ میدان ایک مرتبہ پھر اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجنے لگا۔ ایک لشکر اور آ گیا تھا۔ یہ لشکر وہ تھا جو اودھے پور کے رانا کے خلاف بھیجا گیا تھا۔

سلطان حسین کے لیے اب میدان میں قدم جمائے رکھنا مشکل تھا۔ اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ بہلول کے لشکروں نے دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ سلطان اس دباؤ کو برداشت نہ کر سکا۔ اور پسپائی اختیار کر کے جونپور کی طرف بھاگا۔ بہلول لودھی نے بھی تعاقب کے لیے قدم بڑھائے۔

سلطان حسین نے یہ سوچ کر راستہ بدل دیا کہ اگر وہ جونپور گیا تو بہلول بھی اس کے تعاقب میں وہاں پہنچے گا اور جونپور کو تباہ و برباد کرے گا کم از کم اس وقت تو جونپور کو بچا لیا جائے۔

اب سلطان حسین کا رخ قنوج کی طرف تھا۔ بہلول اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دریائے رہب (کالی ندی) کے ساحل پر دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔

شکست اٹھانا اور بھاگنا سلطان حسین کا مقدر ہو گیا تھا۔ اس جنگ میں بھی اسے شکست ہوئی۔ حسین شرقی کا سارا مال و متاع لودھیوں کے قبضے میں آ گیا۔

بہلول اب بھاگتے بھاگتے تھک چکا تھا۔ اس نے جونپور کی مہم کسی اور وقت پر چھوڑی اور پلٹ کر دہلی آ گیا۔

دہلی آنے کے بعد بھی جونپور کا خیال اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ وہ اس قضیے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا اس نے ایک مرتبہ پھر لشکر جمع کیا اور فیصلہ کن جنگ کے ارادے سے جونپور کی طرف چلا۔

بہلول نے حملہ کر کے جونپور پر قبضہ کر لیا۔ سلطان

حسین ایک مرتبہ پھر بھاگ نکلا۔

بہلول نے یہاں چند روز قیام کر کے انتظام مملکت کو درست کیا۔ حکومت اپنے ایک امیر مبارک خاں لوہانی کے سپرد کی۔ قطب خاں اور دیگر امرا کو گورکھپور کے ایک گاؤں قصبہ مچھولی میں چھوڑ کر خود بدایوں چلا گیا۔

سلطان حسین کو جب معلوم ہوا کہ بہلول جونپور میں نہیں رہا تو اس نے لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔

اس عرصے میں بہلول گوالیار اور اودھے پور راجاؤں کو شکست دینے میں مشغول رہا۔ پھر وہ لاہور چلا گیا۔

جونپور پر قبضے کو دو سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں سلطان شرقی نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا اور آندھی طوفان کی طرف جون پور پر ٹوٹ پڑا۔ سلطان بہلول کے امرا اس مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور بھاگ کر قطب خاں کے پاس مچھولی چلے گئے۔

سلطان حسین کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ اس نے بہلول لودھی کے مقبوضہ علاقوں پر بھی حملے کرنے شروع کر دیے۔ قطب خاں کے پاس اتنا لشکر نہیں تھا کہ وہ سلطان شرقی کو روک سکتا۔ بہلول لاہور میں تھا اور اس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔

بہلول نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو اس کی مدد کے لیے بھیجا اور خود بھی اس کے جانے کے بعد جونپور کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان حسین مقابلے کی تاب نہ لا کر بہار کی طرف چلا گیا۔

ابھی بہلول دریا گنگا کے دائیں کنارے پر واقع قصبہ ہلدی پہنچا تھا کہ اسے قطب خاں کی وفات کی خبر ملی۔ چند روز تک مراسم تعزیت ادا کر کے جونپور گیا اور باربک شاہ کو سلطنت شرقیہ کے تخت پر بٹھایا اور خود کالپی پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ کالپی کی حکومت اپنے پوتے اعظم ہمایوں کے سپرد کی اور خود چندوار ہوتا ہوا ہندو ریاست دھولپور پہنچا۔ یہاں کے راجا نے خوفزدہ ہو کر کئی من سونا اس کی خدمت میں پیش کیا اور اطاعت گزاروں میں شامل ہوا۔

یہاں سے وہ الہ پور پہنچا۔ یہ شہر رن تھنبور کے نواح میں واقع تھا۔ بہلول نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور کامیاب حکمران کی طرح دہلی واپس آیا۔

اب وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ زندگی بھر کی کمائی اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے لیے احکام صادر کیے۔ جونپور کی حکمرانی اپنے فرزند باربک شاہ کو دی۔ الہ پور

کی حکمرانی اپنے ایک اور شہزادے عالم خاں کو دی، لکھنو اور کالپی اپنے پوتے اعظم ہمایوں کو دی۔ نظام خاں (سکندر لودھی) کو دوآبہ کے درمیان کے بہت سے ممالک عطا کیے اور اس کو اپنا جانشین بنایا۔

اب اس نے بادشاہت کی طرف سے بالکل ہاتھ اٹھالیا تھا اور باقی عمر دہلی یا لاہور میں گزارنا چاہتا تھا۔ لاہور اس کا پسندیدہ شہر تھا۔

انہی دنوں گوالیار کے راجا کی طرف سے سرکشی کی خبریں آنے لگی تھیں۔

اس کی بیوی ہیما اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا سالار عیسیٰ خاں اور امیر قرملی خاں ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے۔ غالباً وہی یہ خبر لے کر آئے تھے کہ راجا گوالیار نے اطلاعت سے روگردانی کی ہے اور خراج دینے سے انکار کر دیا ہے۔

''ہیما، میری پوری زندگی میدان جنگ میں بسر ہوگئی ہے۔ تمہیں بھی کوئی سکھ نہیں دے سکا ہوں۔ اب سوچا تھا زندگی کے جتنے دن رہ گئے ہیں تمہارے پاس رہ کر بسر کروں گا لیکن راجا گوالیار نے سرکشی دکھائی ہے۔ مجھے گوالیار کی طرف جانا پڑے گا۔''

''آپ خود کیوں جاتے ہیں۔ معمولی سی مہم ہے کسی سالار کے سپرد کر دیجیے۔''

''میں نے اپنے ملک کے تمام حصے اپنی اولادوں میں تقسیم کر دیے ہیں۔ میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ اب میرے قویٰ کمزور ہوگئے ہیں۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ بہلول تو اب کمزور ہو چکا ہے اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے ملک پر چڑھ دوڑے۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی میرے ہاتھوں میں دم ہے۔''

''میں تو خوش ہوگئی تھی کہ اب آپ میرے پاس رہیں گے۔''

''اس سفر میں تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔''

''بھلا جنگوں میں کوئی عورتیں بھی جاتی ہیں۔''

''یہ جنگ نہیں ہے۔ راجا نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ اب میرے ہاتھ تلوار اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ وہ مجھے دیکھے گا تو جنگ کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔''

اس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ گوالیار پہنچا تو گوالیار کا حاکم راجا مان مطیع ہوگیا۔ اس نے اسی لاکھ تنکے بہلول کی خدمت میں پیش کیے۔ بہلول نے اسے گوالیار پر قابض رہنے دیا۔ یہاں سے وہ اٹاوہ گیا۔ اٹاوہ کو سکت سنگھ سے لے لیا اور پھر واپس آگیا۔

وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ سفر روک دیا گیا۔ خیمے لگا دیے گئے۔ اطبا جو لشکر کے ساتھ چل رہے تھے بادشاہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے۔

جب حالت زیادہ بگڑنے لگی تو امرائے سلطنت جو اس وقت موجود تھے، آپس میں یہ مشورے کرنے لگے کہ بادشاہ کا جانشین کسے بنایا جائے۔

بادشاہ نے نظام خاں (سکندر لودھی) کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا لیکن اس وقت جو امرا وہاں موجود تھے وہ بادشاہ کے پوتے اعظم ہمایوں کے حق میں تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور چپکے چپکے بہلول کو سکندر لودھی کی طرف سے بدظن کرنے لگے۔ بہلول اس وقت مردہ بدست زندہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے قویٰ میں اتنی طاقت نہیں پاتا تھا کہ امرا کی مخالفت کرتا۔ کسی بڑھتی ہوئی بے چینی کے لیے ضروری تھا کہ امرا کی بات مان لی جائے لیکن سکندر لودھی کی دلداری بھی عزیز تھی۔ اس نے سکندر لودھی کو لکھ بھیجا کہ وہ فوراً اس سے آکر ملے۔

سکندر لودھی کی ماں ہیما اپنے خیمے میں بیٹھی تھی کہ بہلول کا سالار عمر خاں دروازے پر حاضر ہوا۔ ہیما کی لونڈی نے پردہ کرا کے عمر خاں کو اندر بلا لیا۔

''کہو عمر خاں، کیسی خبر لائے ہو۔ اچھی خبر ہو تو ضرور سنانا۔''

''بی بی صاحبہ، سلطان معظم خیریت سے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ میں کہنے والا ہوں اسے غور سے سن لیں۔ ولی عہدی کے لیے مشورے ہو رہے ہیں۔ بعض امرا اعظم ہمایوں کے حق میں ہیں جبکہ کچھ دوسرے باربک شاہ (بہلول کا بڑا بیٹا) کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔''

''سلطان تو میرے بیٹے کے حق میں فیصلہ دے چکے ہیں اور سلطان ابھی زندہ ہیں۔ پھر ان سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔''

''بی بی صاحبہ، ان امرا نے سلطان کو شہزادہ سکندر کی طرف سے بدظن کر دیا ہے.... اب تو سلطان اور سازشی امرا نے یہ طے کیا ہے کہ شہزادے کو دہلی سے یہاں بلا کر قید کر لیا جائے تاکہ وہ کسی اور کو ولی عہد مقرر کرنے پر ہنگامہ نہ کھڑا کر سکے۔ میں اس وقت آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ شہزادے کو کہلوا بھیجیں کہ اسے نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے لہٰذا وہ ہرگز یہاں نہ آئے۔''

''ایک قاصد آپ ہی دہلی کی طرف دوڑا دیجیے۔''

''مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ شہزادے کو روکنا میرا کام ہے۔''

عمر خاں نے سکندر لودھی کو پیغام بھجوا دیا کہ اپنی روانگی معرض التوا میں رکھے۔ اس پیغام کے بعد وہ روانگی میں تاخیر کرنے لگا۔

عیسیٰ خاں نے بہلول کی خدمت میں عرض کیا۔ ''آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ شہزادہ نظام خاں کی نظروں میں آپ کے پیغام کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اس تاخیر سے تو اس کی سرکشی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر آپ نے اسے اس وقت نظر بند نہیں کر دیا تو ہم معمولی نوکروں کی اس کے سامنے ایک نہیں چلے گی۔''

بہلول، شہزادہ سکندر کی طرف سے اتنا بدگمان ہو چکا تھا کہ عیسیٰ خاں کی اس دلیل کو فوراً تسلیم کر لیا اور شہزادے کو کہلوا بھیجا کہ اگر تم نے آنے میں دیر کی تو میں خود وہاں آؤں گا۔ تمہاری اس جسارت پر میں تم سے سخت برہم ہوں کہ میرا حکم تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس پیغام کے ایک ایک لفظ سے بہلول کی برہمی ظاہر ہو رہی تھی۔ سکندر لودھی کو باپ کی حکم عدولی گوارا نہیں تھی۔ وہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اراکین سلطنت جو اس وقت دہلی میں تھے اور اس کی طرفدار تھے، اسے روکنے کی اب بھی کوشش کر رہے تھے لیکن مزید تاخیر کا کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

سلطان حسین شرقی کا وزیر قتلغ خاں قید میں پڑا ہوا تھا۔ اس کو مناسب مواقع پر مناسب رائے دینے میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کی اس خوبی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اراکین سلطنت دہلی نے اسے قید سے نکالا اور اس سے رائے طلب کی۔

اس نے کہا۔ ''سراپردہ نصب کر کے کوچ کا اعلان کر دیا جائے اور سامان سفر کی درستی میں تاخیر کی جائے تاکہ کچھ عرصہ اس طرح مل جائے۔''

شہزادہ سکندر نے اس مشورے پر عمل کیا۔

اس تاخیر کا ممکن ہے کچھ فائدہ ہو جاتا لیکن ہوا یہ کہ اس عرصے میں سلطان بہلول کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ وہ کچھ بولنے یا سننے سے قاصر تھا۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ابھی جانشینی کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ سلطان بہلول اڑتیس سال نہایت کروفر سے حکومت کرنے کے بعد 894ھ میں قضائے الٰہی سے رحلت کر گیا۔

ابھی اس کا جنازہ اٹھا نہیں تھا کہ جانشینی کے مسئلے پر امرا آپس میں الجھنے لگے۔ عمر خاں اور قرملی کے سوا تمام لوگ باربک یا اعظم ہمایوں کے حق میں تھے۔

''میرے بیٹے سکندر کے سامنے ان دونوں ناموں کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرا بیٹا ہر طرح تخت حکومت کے لائق ہے۔ اس کا برتاؤ بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا رہے گا۔'' ہیما نے امرا کو مخاطب کر کے کہا۔

عیسیٰ خاں قریب ہی کھڑا تھا۔ سکندر لودھی کی ماں ہیما کی بات سن کر برہم ہو گیا۔

''سنار کا بیٹا دہلی کا تاجدار کیسے بن سکتا ہے؟'' عیسیٰ خاں نے چیخ کر کہا تاکہ اس کی ماں ہیما بھی سن لے۔

''اسی سنار کی بیٹی کے گھر تمہارا سلطان پیدل چل کر آیا تھا۔ اسی سنار کے نواسے کو سلطان بہلول نے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی تم لوگوں نے سب کچھ بھلا دیا۔''

یہ تکرار ہو رہی تھی کہ قرملی خاں نے دخل اندازی کی۔

''ابھی کل ہی تو بادشاہ کا انتقال ہوا ہے اور آج ہی سے ہم ان کی بیوی اور بیٹے کی یوں بے حرمتی کریں یہ کسی طرح ٹھیک نہیں۔''

عیسیٰ خاں نے اسے بھی ڈانٹ دیا۔ ''تمہاری حیثیت فقط ایک ملازم کی ہے۔ ہم رشتہ داروں کے معاملات میں تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔''

عیسیٰ خاں سلطان بہلول کا... چچازاد بھائی تھا۔ اسی لیے وہ رشتے داری کی بات کر رہا تھا۔

قرملی خاں طیش میں آ گیا۔

''سلطان سکندر کے سوا میں کسی کا ملازم نہیں۔'' قرملی خاں نے کہا اور مجلس سے اٹھ گیا۔ بہلول کا جنازہ لے کر قصبہ جلالی (علی گڑھ کے قریب) میں جا پہنچا۔ شہزادہ سکندر بھی وہاں آ گیا۔ قرملی خاں اسے لے کر ایک بلند جگہ جو بیاس کے ساحل پر واقع ہے، آیا اور تخت پر بٹھا دیا۔

سکندر لودھی نے بہلول کی لاش کو دہلی بھیجا اور خود عیسیٰ خاں پر حملہ کرنے پہنچا لیکن عیسیٰ خاں نے معافی مانگ لینے میں عافیت سمجھی۔ سکندر نے اس کو بخش دیا اور دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

زرگر کی بیٹی ہیما اس کے ساتھ تھی۔

ماخذات

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد۔ تاریخ شاہی، احمد یادگار۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی۔ خلاصۃ التواریخ، سبحان رائے

دوسری جنگِ عظیم کے آخری ایام پوری دنیا کے لیے بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوئے، جب نازی جنگ ہار چکے تھے اور سوشلسٹ روسی افواج جرمنی میں داخل ہو چکی تھیں۔ امریکا کی قیادت میں تمام طاقتوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ برلن کو شکنجے میں جکڑ لیا جائے... جگہیں بدل بدل کر اقتدار کی یہ جنگ صدیوں سے جاری ہے اور صدیوں تک جاری رہے گی... چہروں کی تبدیلی کے سوا کوئی اور خوشگوار بدلاؤ محض دیوانے کا ایک خواب بن کر رہ گیا ہے... مگر یہ ہی اچھی بات ہے کہ خواب دیکھنے پر آج بھی کوئی پابندی نہیں۔

کاشف زبیر

راکھ کے پھول

رقص اجل کے درمیان صنف نازک کے عزائم کی پختگی

لولیتا ایک طرف زمین سے سبزی توڑ رہی تھی۔ وہ ایک نوجوان اور دلکش لڑکی تھی اس کی عمر تقریباً چوبیس برس تھی۔ اس نے سفید لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا جو اس کی پنڈلیوں تک آ رہا تھا۔ اوپر اس نے بھورے رنگ کا بھدا سا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ مگر کمر سے بیلٹ باندھ کر اس نے اسے کسی قدر بہتر کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سبزی چنتے ہوئے بار بار سر اٹھا کر جولٹی فارم کی عمارتوں کی طرف دیکھتی جاتی تھی جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی اس طرف سے نہ آ جائے۔ اس کا خوف بجا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آتا اور وہ دیکھ لیتا کہ لولیتا کیا کر رہی ہے تو اسے فوراً گولی ماردی جاتی۔

جیڈ اس وقت جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان چھپی ہوئی ایک لانگ رینج ٹرانسمیٹر سے پیغام دے رہی تھی اور یہ پیغام وہ مورس کوڈ میں دے رہی تھی۔ صرف مورس کوڈ نہیں تھا بلکہ پیغام بھی کوڈ میں تھا اور اگر کوئی سنتا تب بھی وہ نہیں جان



سکتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ جیڈ تقریباً تیس بتیس برس کی سخت جان نظر آنے والی عورت تھی مگر اس میں دل کشی بھی تھی لیکن یہ اس کے سخت تاثرات میں چھپ گئی تھی۔ اس نے بھی لولیتا کی طرح سفید اسکرٹ اور بھورا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس نے بال کس کر چوٹی کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ پیغام بھیجتے ہوئے وہ پوری طرح محتاط تھی اگر کوئی اس طرف آجاتا تو وہ ایک منٹ سے بھی پہلے سب چھپا دیتی۔

اسے معلوم تھا اس کا پیغام نہ صرف برطانیہ بلکہ فرانس اور امریکا میں بھی سنا اور سمجھا جا رہا تھا، یہ مخصوص کوڈز تھے جو صرف برٹش اور امریکن انٹیلی جنس والے جانتے تھے۔ پیغام بھی ان کے لیے تھا۔ اپنا کام مکمل کر کے جیڈ نے نہایت پھرتی سے ٹرانسمیٹر کی بیٹری الگ کی اور اس کے تار سمیٹ کر اس بکس میں ڈالے جس میں ٹرانسمیٹر پہلے سے موجود تھا۔ پھر ایریل کا تار بھی سمیٹ کر اسی بکس میں ڈالا اور اسے بند کر دیا۔ بکس پہلے سے زمین میں بنے گڑھے میں رکھا تھا۔ یہ واٹر پروف تھا۔ جیڈ نے اس پر ایک کپڑا ڈالا اور پھر آس پاس موجود پتوں کا ڈھیر اس پر بکھیر دیا۔ ایک منٹ بعد پتا بھی نہیں چل رہا تھا کہ یہاں کوئی ایسی چیز ہے۔ جیڈ کی ٹوکری پاس ہی رکھی تھی جس میں توڑی ہوئی اسٹرابیری موجود تھی۔ وہ درختوں سے برآمد ہوئی تو لولیتا نے سکون کا سانس لیا لیکن وہ جیڈ کی طرف آنے کے بجائے جولٹی فارم کے ساتھ بہنے والی نہر کے پل کی طرف بڑھ گئی، اسے اطمینان تھا کہ جیڈ نے اپنا کام کر لیا ہے اور جلد وہ بھی آجائے گی۔

انیس سو پینتالیس کے مارچ کا آخری ہفتہ یورپ اور مغربی دنیا کے لیے نہایت ہنگامہ خیز تھا۔ نازی جنگ ہار چکے تھے لیکن وہ آخری دم تک لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔ ایک طرف سے سوشلسٹ روسی جرمنی میں داخل ہو چکے تھے تو دوسری اطراف امریکا کی قیادت میں اتحادی افواج جرمنی میں گھس آئی تھیں۔ روسی فوج بیک وقت شمالی اور جنوبی جرمنی سے اندر داخل ہوئی تھی اور اب برلن کو کسی شکنجے کی طرح کسنے کے لیے دو طرف سے بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد برلن فتح کر کے اس جنگ کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی اس لیے باقی جرمنی پر ان کی خاص توجہ نہیں تھی۔

مشرقی جرمنی میں دریا کے کنارے آباد ڈریسڈن شہر کے شمال مغرب میں گھنے جنگلوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ اس میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور فارم ہاؤس تھے۔ روسی فوج شدید لڑائی کے بعد ڈریسڈن پر قابض ہو گئی لیکن اب بھی کہیں کہیں جرمن دستے مزاحمت کر رہے تھے۔ ان کا مرکزی کمان سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا لیکن وہ اپنے طور پر لڑائی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کمان جنرل ویسنر کے ہاتھ میں تھی جو کبھی ہٹلر کے قریبی حلقے میں شامل نہیں رہا۔ فوج میں وہ منہ پھٹ اور سچ بات کہنے کے لیے مشہور تھا اس لیے وہ ترقی نہیں کر سکا۔ جنرل بھی وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے بنا تھا۔ اسے شاذ ہی برلن میں رہنے کا موقع ملا تھا ورنہ زیادہ تر اسے جرمنی سے باہر تعینات کیا گیا، جب دشمن جرمنی میں گھس آئے تو اسے ڈریسڈن اور اس کے آس پاس کا دفاع سونپ دیا گیا تھا۔

جنرل ویسنر حیران تھا کہ اس علاقے کی کیا اہمیت تھی جو اسے یہاں بھیج دیا گیا، اس کا خیال تھا کہ اسے کسی اہم شہر یا علاقے کا دفاع سونپا جائے گا مگر برلن سے روانگی کے وقت اسے بتا دیا گیا کہ اس علاقے کی کیا اہمیت ہے۔ جرمنوں نے پورے یورپ اور روس میں نوادرات اور قیمتی اشیا کی جو لوٹ مار کی تھی اس کا ایک حصہ ڈریسڈن کے شمال مغرب میں واقع جولٹی فارم میں محفوظ تھا اور اسے اسی خزانے کی حفاظت کرنی تھی مگر ویسنر کے نزدیک اس خزانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ حیران تھا کہ جب جرمنی شکست کے دہانے پر تھا تو ہٹلر کا ٹولہ احمقانہ فیصلے کر رہا تھا۔ جو توانائی وہ جرمنی کے دفاع پر لگا کر اتحادیوں کو جنگ بندی پر مجبور کر سکتے تھے، وہ اس قسم کے فیصلوں کی وجہ سے ضائع جا رہی تھی۔

مگر حکم تو حکم تھا اور فوج کے ڈسپلن میں حکم ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جنرل ویسنر کو جانا پڑا تھا لیکن جب وہ ڈریسڈن پہنچا تو روسی شہر کو تقریباً فتح کر چکے تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ جرمن قبضے میں رہ گیا تھا۔ جنرل ویسنر نے اسے ہی اپنا مرکز بنا کر روسیوں کے خلاف مزاحمت شروع کر دی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ روسی فوج بلا روک ٹوک برلن کی طرف جا رہی تھی۔ جولٹی فارم کے بارے میں اتحادی تو کیا خود جرمن فوج بھی بہت کم جانتی تھی یہاں آنے سے پہلے جنرل ویسنر بھی اس بارے میں نہیں جانتا تھا اس لیے وہ جولٹی فارم کے آس پاس کے علاقے کا دفاع کر رہا تھا لیکن اس نے جولٹی فارم کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ کہیں روسی بھی اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔

جولٹی فارم میں جرمنوں کا ایک چھوٹا سا دستہ تھا جس کا انچارج کارپول ہینس تھا۔ اس کے ماتحت ایک درجن سپاہی یہاں پہرا دیتے تھے۔ فارم کے عقب میں ایک بڑی سی ورکشاپ تھی لیکن یہ مقفل تھی اور کارپول ہینس کو سختی سے حکم تھا کہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی کسی اور کو اس طرف جانے دے۔ ان ایک درجن افراد کے علاوہ یہاں صرف دو عورتیں تھیں۔ لولیتا اور جیڈ یہاں کھانا بنانے اور دوسرے کاموں کی ذمے دار تھیں۔ ان کے لیے جولٹی فارم کا مرکزی حصہ مخصوص تھا وہ وہیں رہتی تھیں۔ اس حصے میں کسی جرمن سپاہی کو بغیر اجازت آنا منع تھا بلکہ وہ صرف کھانے کے وقت وہاں آسکتے تھے۔

لولیتا پولش تھی، جب جرمن افواج نے پولینڈ فتح کیا تو وہ اس وقت ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی۔ جرمنوں کے حملے میں اس کا گاؤں مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور وہ صرف اس لیے بچ گئی کہ ایک دن پہلے ہی اس کے ماں باپ نے اسے برابر والے گاؤں بھیج دیا تھا جہاں اس کی خالہ رہتی تھی۔ اگلے دن یہ گاؤں جرمنوں کا نشانہ بنا۔ اس کے بیشتر مکین موت کے گھاٹ اتر گئے لیکن لولیتا بچ گئی، وہ اور اس جیسی چند عورتوں نے چرچ میں پناہ لے لی تھی۔ یہاں سے جرمنوں نے انہیں گرفتار کر کے جنگی قیدی کیمپ بھیج دیا۔ لولیتا کی ماں روسی نژاد یہودی تھی اور باپ پولش کیتھولک تھا مگر اس نے جھوٹ بول دیا کہ اس کے ماں باپ دونوں پولش تھے۔ اس جھوٹ نے اسے بچا لیا ورنہ گرفتار ہونے والوں میں جو ماں باپ یا کسی ایک کی طرف سے بھی یہودی ثابت ہوتا اسے فوراً آشوٹز برگ روانہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ ہولناک قید خانہ بعد میں لاکھوں انسانوں کی قتل گاہ بنا۔

لولیتا کو ڈریسڈن بھیج دیا گیا جہاں وہ دو سال تک قید خانے میں رہی۔ جرمن ان قیدی عورتوں سے کام لیتے تھے اور انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ نازک عورتیں تھیں۔ وہ ان سے سخت ترین جسمانی مشقت بھی لیتے تھے۔ بہت سی عورتیں یہ مشقت برداشت نہیں کر سکی تھیں، کچھ پاگل ہو گئیں، کچھ نے خودکشی کر لی اور کچھ بھاگنے کی کوشش میں ماری گئیں۔ ان میں سے چند ایک ہی بچی تھیں۔ بچ جانے والی عورتوں کو پوپ کی درخواست پر مقامی چرچ کے حوالے کر دیا گیا۔ ان میں لولیتا بھی شامل تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چرچ کی پناہ میں آنے سے اس کی زندگی کا مشکل دور ختم ہو جائے گا مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ چرچ کا سربراہ پادری جیکس ایک بد کردار آدمی تھا اور اس نے ان عورتوں کے لیے اذیت کا نیا سامان پیدا کر دیا تھا۔ جو اس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے راضی ہو گئیں ان کے لیے زندگی آسان ہو گئی تھی اور جو ماننے سے انکاری تھیں ان کے لیے سوائے مشکلات کے اور کچھ نہیں تھا۔ انکار کرنے والوں میں لولیتا بھی شامل تھی۔

دو سال لولیتا نے بہت مشکل میں بسر کیے، کئی بار جیکس نے اسے جاسوس ہونے کا الزام لگا کر جرمنوں کے حوالے کرنے کی دھمکی دی لیکن لولیتا نے جوابی دھمکی دے کر اسے باز رکھا کہ اگر اس نے اسے جرمنوں کے حوالے کیا تو وہ ان سے کہہ دے گی کہ وہ بھی اتحادیوں کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ یہ سن کر جیکس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اتحادیوں کے لیے کیتھولک چرچ کی ہمدردی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور جرمنی میں یا اس کے مقبوضہ علاقوں میں بہت سارے چرچ اس وجہ سے تباہ کر دیے گئے تھے کہ ان پر اتحادیوں کا ساتھ دینے کا الزام آ رہا تھا۔ اس لیے جیکس نے اسے جرمنوں کے حوالے نہیں کیا لیکن چرچ میں وہ اس کی زندگی جس قدر مشکل بنا سکتا تھا بناتا رہا۔ دو سال بعد چرچ کی عمارت اتحادی بمباری کا نشانہ بنی جب ایک بم گرا اور اس نے پورے چرچ کی عمارت کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس حملے میں جیکس سمیت چرچ کے کئی افراد مارے گئے تھے۔

لولیتا اور دوسری عورتیں بچ گئی تھیں۔ انہیں ایک بار پھر جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا گیا لیکن اس بار ان سے نرم مشقت لی جا رہی تھی اور یہ نرم مشقت کھیتوں میں کام کرنا تھا۔ اکثر نوجوان مرد فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور باقی فوج کی ضرورت پوری کرنے والے کارخانوں میں کام کر رہے تھے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے کوئی بچا نہیں تھا۔ شروع میں مقبوضہ ممالک سے خوراک کے ذخائر جرمنی منتقل کیے جاتے رہے لیکن جلد وہاں بھی خوراک کی قلت ہو گئی۔ تب جرمنوں نے قیدی مرد اور عورتوں کو زمین پر لگا دیا۔ اب وہ فصلیں اگاتے، سبزیاں کاشت کرتے، ڈیری اور پولٹری فارم چلاتے تھے لیکن ان لوگوں کو اس میں سے بہت کم ملتا تھا، خوراک تمام کی تمام اٹھا کر گوداموں میں پہنچا دی جاتی تھی۔

لولیتا اور اس کی ساتھی عورتوں کو بس اتنا ملتا تھا کہ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لیے وہ چوری چھپے کچی پکی سبزیاں کھا لیتی تھیں۔ جب سبزیاں توڑ لی جاتیں تو وہ ان کے بچے کھچے حصے تک ابال کر یا بھون کر کھا لیتی تھیں۔ ان تمام عورتوں کو بیرک نما عمارتوں میں رکھا جاتا تھا۔ صبح سورج طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک وہ کھیتوں میں کام کرتی اور اس دوران میں جرمن فوجی کتوں کے ساتھ ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ یہیں لولیتا کی ملاقات جیڈ سے ہوئی جب آئی اسے لولیتا کے برابر والا بستر ملا تھا۔

”میں لولیتا ہوں۔“ اس نے جیڈ سے ہاتھ ملایا۔ ”تم کون ہو؟“

”یہ لوگ مجھے جیڈ کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔ اس کی صحت بہت خراب تھی اور جسم پر زخموں کے نشانات تھے۔

”یہ لوگ...؟“

”میں نہیں جانتی میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں دو مہینے پہلے مجھے ایک جنگی قیدی کیمپ میں ہوش آیا مگر اس سے پہلے کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے میرے سر پر چوٹ لگی جس نے میری یادداشت ختم کر دی ہے۔“ اس نے بال ہٹا کر سر کی چوٹ دکھائی جو اب مندمل ہو چکی تھی۔

لولیتا کو انجانے میں اس عورت سے ہمدردی ہو گئی تھی جو اپنا ماضی تک بھول گئی تھی اس کے مقابلے میں لولیتا کو اپنا ماضی تو یاد تھا۔ اسے ایک امید تھی کہ جب جنگ ختم ہو گی تو وہ واپس اپنے گاؤں جا سکے گی۔ لولیتا نے نگران سے کہہ کر جیڈ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اس کی مدد کرتی اور اس کا دل بھی بہلاتی تھی لیکن کچھ عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ جیڈ خود بھی ایک مضبوط عورت ہے۔ وہ اس سے زیادہ محنت کرتی اور کسی بھی صورت حال میں نہیں گھبراتی تھی۔ لولیتا نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا تھا جب کہ ان کی بیرک میں موجود ہر عورت رات سونے سے پہلے رو دھو کر اپنے دل کا غبار نکالتیں خود لولیتا بھی اکثر رو جاتی تھی۔

”تم مضبوط عورت ہو۔“ لولیتا نے اس کی تعریف کی۔

”پتا نہیں، وہاں جنگی قیدی کیمپ میں بھی سب یہی کہتے تھے۔“ جیڈ بولی۔ ”شاید میں بھی فوج میں تھی۔“

لولیتا نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر سرگوشی میں بولی۔ ”خدا کے لیے آئندہ یہ بات منہ سے مت نکالنا ورنہ یہ تمہیں سیدھا فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیں گے۔“

جیڈ خوف زدہ نہیں ہوئی لیکن اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ وہ اب دوبارہ یہ بات نہیں کرے گی۔ لولیتا نے شکر ادا کیا کہ دوسری عورتیں اس وقت سو رہی تھیں ورنہ اسے یقین تھا کہ جرمنوں نے ان عورتوں کے درمیان جاسوس بھی چھوڑ رکھی ہوں گی جو ان پر نظر رکھتی تھیں۔ اگر کسی عورت پر شک ہو جاتا تو اسے جرمن پولیس گسٹاپو کے حوالے کر دیا جاتا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس لیے لولیتا اس کی بات سن کر گھبرا گئی تھی۔ ویسے تو جیڈ بہت ذہین تھی لیکن کبھی کبھی وہ بہت سادہ انداز میں کوئی ایسی بات کہہ جاتی جس کا کہنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باتیں کرتے ہوئے سو گئیں۔ صبح اٹھ کر وہ حسب معمول ناشتا کرتے ہی کھیتوں میں کام کرنے لگیں۔

اکتوبر کا آخر تھا اور آلو کی فصل تیار تھی۔ عورتیں زمین کھود کھود کر آلو نکال رہی تھیں کہ ایک جیپ اور ایک بڑی گاڑی آ کر وہاں رکی۔ جیپ سے ایک کرنل برآمد ہوا۔ اس نے عورتوں کا جائزہ لیا اور پھر لولیتا اور جیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اشارے کی دیر تھی کہ سپاہی انہیں دھکیلتے ہوئے کرنل کے سامنے لے آئے۔ کرنل نے ان کا جائزہ لیا۔ لولیتا کا خوف کے مارے برا حال تھا، اسے یقین تھا کہ رات ان کی گفتگو کسی جرمن جاسوس عورت نے سن لی ہو گی اور اب انہیں گرفتار کر کے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کرنل نے انہیں گاڑی میں بٹھانے کا اشارہ کیا اور انہیں دھکیل کر اس چھوٹے ٹرک کے عقبی حصے میں بٹھا دیا، نصف درجن سپاہی پہلے وہاں موجود تھے لیکن نہ تو ان کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور نہ سپاہیوں نے ان پر رائفلیں تانیں۔

جیپ اور ٹرک روانہ ہوئے اور کوئی تین گھنٹے بعد وہ جولٹی فارم پہنچ گئے تھے۔ فارم تین عمارتوں اور ایک ہوائی چکی کے ٹاور پر مشتمل تھا، ان کے چاروں طرف زمین تھی اور جنگل تھا۔ فارم کی حالت سے لگتا تھا کہ اس کی برسوں سے دیکھ بھال نہیں ہوئی تھی۔ لولیتا حیران تھی، اگر وہ انہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے تو اتنی دور لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا، یہ کام تو وہاں بھی ہو سکتا تھا اور یہ نازیوں کا کوئی جنگی کیمپ یا اذیت خانہ بھی نہیں لگ رہا تھا جہاں اتحادی جاسوسوں سے تفتیش کی جاتی ہو۔ اس کے برعکس وہاں کا ماحول بہت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ کرنل نے انہیں کارپول ہینس کے حوالے کیا اور اپنے قافلے سمیت واپس چلا گیا۔ کارپول ہینس ایک ادھیڑ عمر جرمن تھا جس کا جسم کسی قدر بھاری تھا شاید اسی لیے اسے سرگرم دستے میں رکھنے کے بجائے یہاں نگرانی کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ جرمن ہونے کے باوجود وہ نرم مزاج شخص تھا۔ اس نے پہلے تعارف حاصل کیا اور بولا۔

”تم دونوں کو یہاں کچن چلانا ہے۔ ویسے تو سپلائی آتی ہے لیکن سبزیاں اور مرغیوں سے انڈے حاصل کرنا تمہارا کام ہے۔“

”یہاں سبزیاں کاشت ہیں اور مرغیاں کہاں ہیں؟“

”نہیں، سبزیاں خودرو ہیں اور مرغیاں بھی جنگل میں بھاگ گئی ہیں۔ سپاہی انڈے جمع کر کے لے آتے ہیں، اب یہ کام تمہیں کرنا ہے۔“

لولیتا اور جیڈ حیران تھیں کیونکہ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا اور پھر ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایک درجن افراد یہاں کیا کر رہے ہیں کیونکہ بہ ظاہر نہ تو یہ کوئی فوجی تنصیب تھی اور نہ ہی یہاں کوئی ایسی چیز نظر آ رہی تھی جس کی حفاظت کی جاتی۔ بند ورکشاپ کے بارے میں انہیں پتا چل گیا تھا کہ یہاں کبھی لوہے کا کام ہوتا تھا جو اب بند پڑی تھی۔ اس کے سامنے

والے فولادی دروازے پر تالا تھا۔ انہیں رہائش کے لیے کچن والی عمارت کے اوپر ایک کمرا دیا گیا تھا۔ عمارت بہت اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن اس بیرک سے بہت بہتر تھی جہاں وہ اب تک رہتی آئی تھیں۔ انہیں روزانہ کچھ خودرو سبزی اور مرغیوں کے انڈے چن کر سپاہیوں کے لیے تین وقت کا کھانا بنانا تھا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا۔ دوسری رات جب وہ سونے کے لیے اوپر آئیں تو جیڈ کمرے کی کھڑکیوں سے فارم کا جائزہ لے رہی تھی، انہیں بتایا گیا تھا کہ اس جگہ کو جولٹی فارم کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی یہ فوجی دستہ بھی چند مہینے پہلے اس جگہ تعینات کیا گیا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ لولیتا نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ کمرے میں کم روشنی والا بلب جل رہا تھا اس لیے روشنی کم تھی اور چیزوں کے تاریک سائے زیادہ تھے۔ لولیتا اس لیے خوفزدہ تھی کہ کہیں جرمن جان نہ جائیں کہ جیڈ اس طرح چھپ کر انہیں دیکھ رہی ہے۔ جیڈ کچھ دیر بعد اپنے بیڈ کی طرف لوٹ آئی، انہوں نے معمول کا لباس اتار دیا اور سونے کا لباس پہن لیا۔

”میرا خیال ہے اس فارم کی کوئی خاص اہمیت ہے۔“

”کیا اہمیت ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتی لیکن تم خود سوچو یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی حفاظت کی جائے اور درجن بھر جرمن فوجی یہاں تعینات ہیں۔“

”ممکن ہے یہ کسی بڑے سیاست دان یا فوجی جنرل کی ذاتی رہائش ہو؟“ لولیتا نے خیال پیش کیا۔

”اس صورت میں اسے بہت شاندار ہونا چاہیے تھا اس جگہ کی حالت سے نہیں لگتا کہ یہ کسی بڑے آدمی کی ملکیت ہے۔“

واقعی پورا فارم ہی خستہ حالی کا شکار تھا، عمارتوں کا رنگ روغن کب کا اتر چکا تھا اور اب ان کے تختے بھی اکھڑ رہے تھے۔ کسی امیر کی رہائش سے زیادہ یہ جگہ ورکشاپ لگتی تھی... مگر ورکشاپ صرف ایک عمارت میں تھی۔ کچن والی عمارت بہ ظاہر کوئی ہال تھا اور اس کے اوپر چند کمرے تھے۔ دوسری عمارت جس میں درجن بھر کمرے تھے، وہ جرمنوں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ جبکہ تیسری عمارت خالی پڑی تھی۔ یہ شاید کسی زمانے میں عبادت کے لیے مخصوص تھی یا یہاں لکڑی کا کام کیا جاتا تھا کیونکہ یہاں بے شمار تختے رکھے تھے جیسے چرچ کے ہال میں رکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک ہی دن میں سارے فارم کا جائزہ لے لیا تھا کیونکہ یہاں ان کے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ انہوں نے سبزی اور انڈے جمع کرنے، سپاہیوں کو کھانا دینے، نہر اور تالاب کے کنارے کپڑے اور نہانے کے لیے وہ تقریباً پورا فارم ہی گھوم لیا تھا۔

لولیتا اٹھ بیٹھی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے اس جگہ کی اہمیت کیوں ہے؟“

”میرا خیال ہے جرمنوں نے یہاں کوئی اہم چیز چھپا رکھی ہے۔“

”اگر وہ کوئی اہم چیز ہے تو سیکیورٹی اس لحاظ سے ناکافی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ کیموفلاج ہے۔“ جیڈ نے کہا۔ ”جرمنوں نے یہاں بہت کم لوگ رکھے ہیں تاکہ کسی کو احساس نہ ہو کہ اس جگہ کی بھی کوئی اہمیت ہے لیکن دوسری طرف ایک ویران فارم کی حفاظت کا انتظام معنی خیز بات ہے۔“

”سنو ہم غیر جرمن ہیں۔“ لولیتا نے کہا۔ ”اگر انہیں اس جگہ کو چھپانا ہوتا تو یہاں کسی غیر جرمن کو نہیں آنے دیتے۔“

جیڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں یہاں لانے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، ہمارے بارے میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اگر ہمیں مار دیا جائے تو جرمنوں کو کسی وضاحت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”انہیں کسی سے کیا خوف...؟“

جیڈ اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور پھر سرگوشی میں بولی۔ ”لولیتا تم نہیں جانتیں جرمن جنگ ہار رہے ہیں، ان کی فوجیں ہر طرف سے پسپا ہو رہی ہیں۔“

لولیتا کے لیے یہ ناقابل یقین بات تھی۔ جرمن شکست سے ناآشنا تھے، کم سے کم انہوں نے اپنے قیدیوں اور محکوموں کو ایسا ہی تاثر دے رکھا تھا۔ اس لیے لولیتا کو جیڈ کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”تم کیسے جانتی ہو؟“

”میں جانتی ہوں کیونکہ میں اپنے کان کھلے رکھتی ہوں۔ میں نے سپاہیوں کو اس بارے میں بات کرتے سنا تھا۔“ جیڈ نے اعتماد سے کہا۔ ”اس وقت جرمنوں کو ایک ایک سپاہی کی اشد ضرورت ہے اور وہ کسی فضول جگہ کی سیکیورٹی پر اتنے سپاہی نہیں لگا سکتے ہیں۔“

لولیتا نے کروٹ لی۔ ”اگر یہ بات درست ہے تب بھی ہمیں اس معاملے سے دور رہنا چاہیے۔“

”نہیں، اس کے برعکس ہمیں جاننے کی کوشش کرنی

چاہیے لیکن بہت محتاط رہ کر۔"

لولیتا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جیڈ کس قسم کی باتیں کررہی تھی، انہیں بھلا جرمنوں کی ٹوہ میں رہنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اگر جرمنوں نے انہیں اپنی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑلیا۔ ان کے لیے تو شک ہی کافی ہوتا تھا اور لولیتا نے ان پانچ سالوں میں بے شمار انسانوں کو صرف شک کی وجہ سے مرتے دیکھا تھا۔ جرمن اس معاملے میں زیادہ تردد میں نہیں پڑتے تھے، اگر انہیں کسی قیدی پر شک ہوجاتا تو بلا تکلف اسے فائرنگ اسکواڈ یا گستاپو کے حوالے کردیتے تھے ان میں سے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیے جانے والے خوش قسمت شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ چند سیکنڈ کی اذیت میں زندگی سے نجات پا جاتے تھے جبکہ گستاپو کے ہاتھ میں جانے والے بہت اذیت سے جان دیتے تھے۔ جرمن جنگی کیمپوں میں رہنے والے قیدی جرمنوں سے موت سے بھی زیادہ ڈرتے تھے۔

شروع میں انہیں اپنی ذمے داریاں بانٹنے میں کچھ دشواری پیش آئی تھی لیکن جلد انہوں نے طے کرلیا کہ کھانا لولیتا بنائے گی۔ وہ یہ کام اچھا کرتی تھی جبکہ جیڈ برتن اور کپڑے دھوئے گی۔ سبزی اور انڈے چن کر لانے کے لیے وہ دونوں جاتی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی جب پہلے دن وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئیں تو کسی سپاہی نے ان کی نگرانی کی کوشش نہیں کی۔ وہ اکیلے ہی گھومتی رہیں۔ کارپول ہینس کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں ملی تھی کہ انہیں کب اور کہاں تک جانا ہے یعنی ان کے لیے حدود اور وقت کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ لولیتا تشویش زدہ ہوگئی تھی۔ اس نے سبزی چننے کے دوران جیڈ سے کہا۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ چھپ کر ہماری نگرانی کررہے ہیں تاکہ ہم فرار کی کوشش کریں تو یہ ہمیں شوٹ کردیں۔"

"ہمیں شوٹ کرنے کے لیے انہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ زمین سے کھمبیاں توڑتے ہوئے بولی۔

"تب یہ نگرانی کیوں نہیں کررہے، ہمیں آزاد کیوں چھوڑا ہوا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ یہاں سے فرار ہوکر ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ جگہ جرمنی کے اندر ہے اگر ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تب بھی جرمنی سے نہیں نکل سکیں گے۔"

ان کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ جیڈ کو کہیں سے ایک پرانی سلائی مشین مل گئی۔ کپڑا انہوں نے پرانے بینرز سے لیا اور اسے اچھی طرح دھوکر انہوں نے اپنے لیے چند لباس تیار کر لیے تھے۔ اسکرٹ سفید کپڑے سے بنایا تھا اور بلاؤز بھورے کپڑے سے تیار کیا تھا۔ سلائی دونوں کو نہیں آتی تھی مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی سر کرلی۔ قیدیوں کے کیمپ کے مقابلے میں یہاں کام بہت کم تھا اور انہیں اپنے لیے وقت مل جاتا تھا۔ انہیں ایک فائدہ اور ہوا تھا۔ یہاں خوراک اچھی تھی۔ جرمن سپاہیوں کے لیے ڈبل روٹی، گوشت، پنیر اور مکھن آتا تھا۔ سبزی اور انڈے یہاں سے مل جاتے تھے۔ بہتر خوراک سے چند دنوں میں ان کی صحت نکھر آئی تھی۔ جسم بھر گئے تھے اور رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جن جرمن سپاہیوں نے انہیں شروع میں کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ چند ہفتے بعد وہ بھی انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔

ابھی تک کسی سپاہی نے انہیں... ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اعلیٰ حکام کی طرف سے جرمن سپاہیوں اور افسروں کو غیر جرمن عورتوں سے میل جول پر پابندی تھی اور جو اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے تھے انہیں سزا بھی دی جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود جنگی قیدی کیمپ میں کوئی عورت محفوظ نہیں تھی، خود لولیتا کو کئی بار اپنے جرمن آقاؤں کی خواہشات کو پورا کرنا پڑا تھا۔ صرف چرچ میں وہ سمجھوتا نہیں کرسکی تھی کیونکہ اس کے خیال میں خدا کے گھر میں گناہ کسی صورت جائز نہیں تھا۔ البتہ یہاں سپاہیوں کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ وہ دونوں عورتیں تھیں اور اگر جرمن دست درازی پر اتر آتے تو ان کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر کارپول ہینس سمیت تمام جرمن ان سے اچھے طریقے سے پیش آتے تھے۔ کسی نے ان سے بدتمیزی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب لولیتا یہاں آئی تو اس کا خیال تھا کہ اب ان دونوں کی خیر نہیں ہے، یہاں اس ویرانے میں یہ درجن بھر جرمن سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑیں گے، مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ لولیتا اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ جنگی قیدی کیمپ میں اسے مجبوری کے عالم میں دوبار جرمن افسروں کے ساتھ رات گزارنا پڑی تھی اور وہ اس کی اذیت ابھی تک محسوس کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خود سے نفرت ہونے لگتی تھی اور اس کا دل چاہتا کہ وہ خودکشی کرلے۔ اس نے یہ بات جیڈ سے کہی تو وہ بولی۔ "تم زیادہ ہی حساس ہو ورنہ جنگوں میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ دشمن عورتوں کو بے عزت کرنا فاتحین کا سب سے پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو

تمہارے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ میں ایسی عورتوں اور کنواری لڑکیوں کو بھی دیکھ چکی ہوں جن کے ساتھ چوبیس گھنٹے میں درجنوں بار زیادتی ہوئی۔"

"میں جانتی ہوں لیکن میں آج تک اپنی بے عزتی سے سمجھوتا نہیں کرپائی ہوں۔"

جیڈ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میری پیاری، بعض اوقات آدمی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم یاد رکھو ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی ہے اور جب تک جنگ ختم نہ ہوجائے، ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

لولیتا سہم گئی۔ "کچھ بھی ہوسکتا ہے؟"

جیڈ نے سر ہلایا۔ "ہمیں حوصلے کے ساتھ اس کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم زندہ رہیں۔ یاد رکھو جنگ میں واحد کامیابی زندہ رہنا ہے۔"

لولیتا نے محسوس کیا کہ یہاں آنے کے بعد جیڈ کی شخصیت خاصی بدل گئی تھی۔ وہ تجربہ کار لگنے لگی تھی جیسے اسے جنگ سے متعلق ہر چیز کا پتا ہو اور وہ جانتی ہو کہ کس صورت حال میں کیا کرنا ہے۔ دن میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب وہ سبزی اور انڈے جمع کرنے کے لیے نکلنے لگتیں تو جیڈ اسے روک دیتی اور کہتی کہ لولیتا کچن دیکھ لے اس دوران میں وہ جاکر سبزی اور انڈے لے آتی ہے۔ اگر اسے دیر ہوجائے تب بھی لولیتا پریشان نہ ہو اور نہ ہی اس کی تلاش میں نکلے، وہ جلد واپس آجائے گی۔ لولیتا بھی اس کی بات مان لیتی تھی۔ ایک دن جب وہ اسی طرح باہر نکلی تو اس کے جانے کے بعد لولیتا کو یاد آیا کہ وہ اسے ایک قسم کی پھلی کے لیے کہنا تو بھول ہی گئی تھی۔ یہ پھلی سبزیوں اور گوشت کے سوپ میں ڈالتے تھے، اس کا ذائقہ جرمن سپاہیوں کو پسند تھا۔ پھلی شروع میں ڈالتے تھے کیونکہ وہ دیر سے گلتی تھی۔ لولیتا نے سوچا کہ وہ خود جاکر لے آئے گی۔ اس نے سبزی جمع کرنے والی ٹوکری اٹھائی اور جنگل کی طرف روانہ ہوگئی۔

عام طور سے وہ اور جیڈ الگ الگ جاتے اور آتے تھے۔ جرمنوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ نہر کے پاس جنگل بہت گھنا تھا اور خودرو سبزی ملتی تھی۔ فرار ہونے والی مرغیوں نے وہیں اپنا ٹھکانا بنایا ہوا تھا۔ جیڈ نے بڑی ہوشیاری سے ان کے گھونسلے تلاش کرلیے تھے جہاں وہ انڈے دیتی تھیں۔ روز انہیں ایک ڈیڑھ درجن انڈے مل جاتے تھے۔ لولیتا جنگل میں داخل ہوئی اور اس طرف بڑھی جہاں پھلی کی بیلیں لگی تھیں۔ اچانک اسے سناٹے میں ہلکی سی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی مستقل ٹائپ رائٹر پر انگلی مار رہا ہو۔ لولیتا پہلے تو ڈر گئی پھر ہمت کرکے اس طرف بڑھی۔ تب اس نے جیڈ کو دیکھا، وہ جھاڑیوں میں گھسی کچھ کررہی تھی۔ لولیتا نے ایریل کا تار بھی دیکھ لیا اور جب ذرا آگے آئی تو اسے ٹرانسمیٹر اور مورس کوڈ والی مشین بھی نظر آگئی۔ جیڈ نہایت مہارت اور پھرتی سے اس پر پیغام بھیج رہی تھی۔ لولیتا اس مشین سے بخوبی واقف تھی اور جیڈ جو کررہی تھی اس سے بھی۔

مارے دہشت کے لولیتا کے ہاتھ سے ٹوکری چھوٹ گئی۔ ہلکی سی آواز آئی تو کام میں مگن جیڈ نہایت پھرتی سے گھومی اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا ٹریگر بس دبتے دبتے رہ گیا۔ لولیتا کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔ "میرے خدا... تم یہاں کیوں آئیں... میں نے منع کیا تھا تمہیں... تمہارے پیچھے کوئی اور تو نہیں آیا ہے؟"

لولیتا کانپ رہی تھی۔ "میرے پیچھے کوئی نہیں ہے... یہ تم کیا کررہی ہو؟"

"وہی جو تم دیکھ رہی ہو۔" جیڈ نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم اتحادیوں کے لیے جاسوسی کررہی ہو۔"

جیڈ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مشین پر اپنا کام مکمل کیا اور پھر اسے نہایت تیزی اور مہارت سے پیک کرکے جھاڑیوں اور پتوں کے ڈھیر میں اس طرح چھپا دیا کہ کسی کو ایک فیصد بھی شبہ نہ ہو کہ یہاں ایک ٹرانسمیٹر چھپا ہوا ہے۔ اپنا کام کرکے جیڈ نے ٹوکری اٹھائی جس میں ساری چیزیں موجود تھیں۔ پھر اس نے لولیتا کا بازو تھاما۔ "تم کس لیے آئی تھیں؟"

"پھلی لینے۔" لولیتا نے بیل کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے لے لی ہے چلو میرے ساتھ..." وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے پستول نہ جانے کہاں چھپالیا تھا۔

"سنو..." لولیتا نے کچھ کہنا چاہا۔

"اس بارے میں رات کو بات ہوگی، اب تم اپنے تاثرات درست کرلو، ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔"

لولیتا کوئی بھوت دیکھ لیتی تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو جیڈ کو ایک جاسوس کا کردار ادا کرتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر کسی کو ذرا بھی شک ہوگیا تو جرمن انہیں ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اس لیے ان سے نرمی سے پیش آرہے تھے کہ انہیں فی الحال ان پر کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ لولیتا نہایت بے چینی سے رات کا انتظار کررہی تھی۔ خدا خدا کرکے دن ڈھلا اور رات

ہوئی۔ وہ عام طور سے آٹھ بجے جرمنوں کو ڈنر کرا کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد خود کھانے اور صفائی کرنے میں نو بج جاتے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ اوپر اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ لولیتا نے کھانا بھی مشکل سے کھایا تھا، کمرے میں گھستے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور جیڈ کو گھسیٹ کر اپنے بیڈ پر لے آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''پلیز مجھے سب بتادو۔''

''کیا بتادوں تم نے سب دیکھ لیا ہے اور سمجھ بھی لیا ہے۔'' وہ بولی۔

''نہیں میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیسے کیا؟''

جیڈ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ لولیتا اس سے محبت کرتی ہے اور کبھی اس سے دغا نہیں کرے گی مگر وہ ایک کمزور سی لڑکی تھی اگر کبھی اس پر برا وقت آتا اور اسے جرمن جلادوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ مزاحمت نہیں کر سکے گی۔ اس لیے اس کا کم سے کم جاننا ٹھیک تھا۔ جیڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے بولی۔ ''یہ مت سمجھنا مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ لیکن تمہارے لیے ہر چیز جاننا ضروری نہیں ہے بعد میں کبھی ایسا موقع آیا کہ جب تم سے پوچھ گچھ کی جائے گی تو تم پورے اعتماد سے انکار کر سکتی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

لولیتا نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی؟''

''بس اتنا سمجھ لو کہ میں شروع سے یہی کام کرتی آئی ہوں اور زخمی قیدی کا روپ دھارا تاکہ مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔''

''یہ سامان تمہارے پاس کہاں سے آیا؟'' لولیتا کا اشارہ ٹرانسمیٹر اور پستول کی طرف تھا۔

''بس آ گیا۔'' جیڈ نے اسے ٹال دیا۔ ''اب غور سے سنو، تم جان گئی ہو اس لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑے گی۔''

''کیسی مدد؟''

''بعض اوقات تمہیں جرمنوں کی توجہ ہٹانی ہوگی اور اس بات کو چھپانا ہوگا کہ میں فارم میں نہیں ہوں۔ بعض اوقات مجھے کچھ دیر کے لیے جانا ہوتا ہے اور میں بڑی مشکل سے چھپ کر جاتی ہوں۔''

''ہم سبزی اور انڈے لینے بھی تو جاتے ہیں۔''

''لیکن زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آتے ہیں ان سے زیادہ دیر ہو جائے تو جرمن یقیناً ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ مجھے اس سے زیادہ دیر کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔''

لولیتا سوچ رہی تھی۔ ''اس کا مطلب ہے یہاں دوسرے اتحادی جاسوس یا ان کے ہمدرد ہیں اور تم ان سے ملنے جاتی ہو؟''

جیڈ کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''پلیز اب اس موضوع پر کوئی بات مت کرنا یہ بہت رسکی ہے۔ کوشش کرو اسے ذہن سے نکال دو اگر غلطی سے بھی تمہارے منہ سے اس بارے میں کچھ نکل گیا تو ہماری موت بہت دردناک ہوگی۔''

یہ سن کر لولیتا سہم گئی تھی۔ اس نے جیڈ سے وعدہ کیا کہ وہ اب پوری طرح محتاط رہے گی اور اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالے گی۔ آنے والے چند ہفتوں میں لولیتا کو اندازہ ہو گیا کہ جیڈ کس طرح کام کرتی تھی۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار رپورٹ دیتی تھی۔ اس کے علاوہ کم سے کم ایک بار وہ کئی گھنٹے کے لیے کہیں غائب ہو جاتی تھی، اس میں دن رات کا فرق نہیں تھا۔ دن میں جب وہ جاتی تو لولیتا کو اس کی پردہ پوشی کرنا پڑتی تھی۔ اس وقت لولیتا کی جان پر بن آتی تھی۔ جب تک جیڈ واپس نہیں لوٹ آتی تھی وہ جاگتی رہتی اور ڈرتی رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا اگر جیڈ پکڑی گئی تو شریک جرم کی حیثیت سے اسے بھی وہی سزا دی جائے گی جو جیڈ کا مقدر بنے گی۔ ایک رات جیڈ باہر گئی اور صبح سے کچھ پہلے واپس آئی تھی۔ اس رات وہ چھ گھنٹے سے بھی زیادہ باہر رہی تھی۔ لولیتا نے اس سے آتے ہی پوچھا۔ ''تم کہاں رہ گئی تھیں کچھ دیر میں روشنی ہو جاتی۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' لولیتا نے سیاہ اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ یہ دسمبر کا مہینا تھا اور باہر شدید سردی تھی۔ جیڈ بہت خوش نظر آ رہی تھی اس نے لولیتا سے کہا۔ ''آج میں فارم سے باہر نہیں گئی تھی۔''

''تم اتنی دیر باہر کیا کرتی رہی تھیں؟''

''آج میں نے جان لیا ہے کہ اس فارم کی کیا اہمیت ہے۔'' جیڈ نے جوش سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہاں نازیوں نے لوٹے ہوئے نوادرات چھپا رکھے ہیں۔ ان میں تصاویر اور مجسمے ہیں۔ قدیم زیورات اور سونے چاندی سے بنے نوادرات ہیں۔ قدیم سکے ہیں جن کی مالیت لاکھوں میں ہے۔''

لولیتا حیران ہوئی تھی۔ ''یہ سب کہاں رکھا ہے اور تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''یہ سب آئرن ورکشاپ کے تہ خانے میں رکھا ہے اور مجھے یوں پتا چلا کہ ابھی یہاں کچھ سامان اور آیا ہے۔''

جیڈ بولی اور پھر نفرت سے کہا۔ ''نازی جنگ ہار رہے ہیں لیکن چوروں کی طرح مال سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔''

''اب تم کیا کرو گی؟''

''میں اس کی اطلاع اتحادیوں کو دوں گی۔ یہ یورپ کا تاریخی ورثہ ہے، اس کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔'' جیڈ نے فیصلہ کیا۔ ''میں کل ہی یہ کام کرتی ہوں۔''

اگلے دن جب جیڈ پہلے ٹوکری اٹھا کر روانہ ہوئی تو اس نے لولیتا سے کہا۔ ''اگر مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ جائے تو تم بھی ٹوکری لے کر آ جانا اور اس کے بعد جنگل کے کنارے رہ کر نگرانی کرنا، اگر کوئی جرمن اس طرف آنے لگے تو مجھے خبردار کر دینا۔ تم جانتی ہو میں کہاں ہوتی ہوں۔''

جیڈ چلی گئی اور لولیتا کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ خود بھی جنگل جانے کے لیے باہر نکلی تو اس نے ایک جیپ اور ایک چھوٹا فوجی ٹرک فارم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا دل جیسے رک گیا تھا۔ آنے والا وہی کرنل اور اس کا محافظ دستہ تھا جو انہیں یہاں لایا تھا۔ لولیتا نے جانے کی کوشش کی لیکن کارپول ہینس نے اسے روک لیا۔ ''ابھی کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔ اندر جاؤ... جیڈ کہاں ہے؟''

''وہ سبزی لینے گئی ہے۔''

ہینس نے ایک سپاہی کو اشارے سے بلا کر حکم دیا۔ ''جنگل سے جیڈ کو لے آؤ فوراً...''

سپاہی روانہ ہو گیا اور لولیتا واپس عمارت میں آ گئی اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ کرنل ورکشاپ میں جا رہا تھا پھر اس کے پیچھے جرمن سپاہی ڈائنامائٹ.... سے بھرے بکس اندر لے جانے لگے۔ سیاہ وردیوں میں کچھ لوگ تھے جو اندر گئے۔ لولیتا کی بے چین نظریں بار بار جنگل کی طرف جاتی تھیں، اسے خوف تھا کہ آج کہیں جیڈ پکڑی نہ جائے لیکن کچھ دیر بعد وہ جانے والے سپاہی کے ساتھ ہنستے اور اٹھلاتے ہوئے واپس آئی تو لولیتا کی جان میں جان آئی تھی اس نے اندر آتے ہی جیڈ سے کہا۔

''بال بال بچے ہیں، میں نکل رہی تھی کہ کرنل آ گیا۔ وہی جو ہمیں یہاں لایا تھا۔''

جیڈ نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور تشویش سے بولی۔ ''وہ ورکشاپ میں گیا ہے۔''

''صرف وہی نہیں ہے بلکہ سپاہی ڈائنامائٹ کے بکس لے گئے ہیں اور کچھ افراد ٹیکنیشنز کی وردیوں میں بھی اندر گئے ہیں۔'' لولیتا نے سبزی کاٹتے ہوئے کہا۔

جیڈ خاموش رہی، اس نے ٹوکری سے انڈے اور سبزی نکال کر میز پر رکھی پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ''مجھے لگ رہا ہے جرمنوں کو بھی احساس ہو گیا ہے وہ جنگ ہارنے والے ہیں اس لیے وہ سب تباہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

لولیتا چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''ڈائنامائٹ کے بکس۔'' جیڈ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ان کا اس جگہ کیا کام ہو سکتا ہے؟''

''یعنی اگر جرمن اس جگہ سے پسپا ہونے لگے تو سب تباہ کر دیں گے؟''

''امکان یہی ہے۔'' جیڈ بولی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ''یہ بھی ممکن ہے انہوں نے ٹریپ لگایا ہو۔''

''کوئی اور اندر جانے کی کوشش کرے تو دھماکا ہو جائے؟''

''بالکل اس طرح یہاں آنے والے جرمنوں کے دشمن بھی ہلاک ہو جائیں گے۔''

''تم نے پیغام دیدیا ہے؟''

''ہاں اور کل مجھے نیا پیغام بھی دینا ہوگا۔ اسی کی بنیاد پر اتحادی کوئی فیصلہ کریں گے۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''یہی کہ ان نوادرات کو بچانے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ یہاں حملہ کریں گے؟''

''ظاہر ہے اس کے بغیر وہ ان چیزوں اور ہمیں کیسے بچائیں گے؟ جرمن جاتے ہوئے سب تباہ کر جائیں گے جن میں ہم بھی شامل ہیں۔'' جیڈ انڈے توڑ کر پیالے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اس میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ روسی یہاں سے صرف تیس میل دور ڈریسڈن پر قابض ہو چکے ہیں جبکہ امریکی اور برطانوی دستے بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔''

لولیتا زیادہ سمجھدار نہیں تھی لیکن اس وقت اسے صورت حال سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے جرمن کبھی بھی یہاں سے جانے اور ہمیں مارنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔''

''بالکل، یہ بھی ممکن ہے یہ کام آج ہی ہو جائے۔'' جیڈ باہر دیکھ رہی تھی جہاں جرمن سپاہی اور ٹیکنیشنز ورکشاپ سے باہر آ رہے تھے۔ جب سب باہر آ گئے تو اس کے دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ کرنل اور اس کے آدمی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لولیتا نے اطمینان کا سانس لیا۔

''آج بچ گئے۔''

جیڈ نے سر ہلایا۔ ''ہاں لیکن کسی بھی صورت حال کے

لیے تیار رہو۔“

”سنو۔“ لولیتا نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمیں آج رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

جیڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہم کیسے جا سکتے ہیں؟ ہمیں یہاں رہ کر آنے والوں کی مدد کرنی ہے، ان کی رہنمائی کرنی ہے۔“

”جب تک وہ آئیں گے یہاں ہماری لاشیں رہ جائیں گی۔“

”اس پر بعد میں بات کریں گے۔“ جیڈ نے کارپول ہینس کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”تم دونوں کے لیے حکم ہے، اب تم بغیر اجازت اس عمارت سے باہر نہیں جاؤ گی؟“

”اپنے کام سے بھی نہیں؟“ جیڈ نے سوال کیا۔

”کسی بھی کام سے نہیں۔“ ہینس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم پہلے اجازت لوگی اور پھر باہر جاؤ گی۔“

”ٹھیک ہے لنچ ایک گھنٹے بعد تیار ملے گا۔“

”ایک آدمی کا لنچ ونڈ ٹاور میں پہنچانا ہے۔“

یہ نئی بات تھی اس سے پہلے ونڈ ٹاور میں کسی کو نہیں رکھا گیا تھا۔ ہینس کے جانے کے بعد انہوں نے اس بارے میں بات کی۔ جیڈ کا خیال تھا کہ اب یہاں کی سیکیورٹی سخت کر دی گئی۔ ونڈ ٹاور میں گارڈ اسی مقصد کے تحت رکھا گیا تھا۔ لیکن جب لولیتا اس کے لیے کھانا لے کر گئی تو اس نے وہاں عام کپڑوں میں ایک نوجوان شخص کو موجود پایا۔ اس نے سیاہ ایس ایس جیکٹ ضرور پہن رکھی تھی لیکن نیچے عام پتلون اور قمیص تھی۔ اس کے پیروں میں لیدر شوز تھے اور ایک طرف اسٹینڈ پر جدید اسنائپر رائفل تھی جس پر دوربین بھی ہوتی تھی۔ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی سیاہ آنکھوں میں بہت پختگی تھی۔ اس نے لولیتا کا تفصیل سے جائزہ لیا اور پھر مسکرانے لگا مگر اس نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ ہی لولیتا کو روکا۔ واپس آکر لولیتا نے جیڈ کو اس کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔

”وہ نشانچی ہے... جب جرمن کسی علاقے سے پسپا ہونے والے ہوتے ہیں یا روایتی جنگ نہیں لڑ پاتے تو وہ ایسے نشانچی بھیج دیتے ہیں جو کہیں چھپ کر دور مار رائفلوں سے دشمن سپاہیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یہ عام طور سے غیر فوجی لوگ ہوتے ہیں اور ان کا تعلق ہٹلر یوتھ سے ہوتا ہے۔ انہیں صرف نشانے بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے یہ بالآخر مارے جاتے ہوں گے؟“

”ہاں، یہ دشمن کے دس بارہ افراد کو مار دیتے ہیں اور اس کے بعد خود مارے جاتے ہیں۔“

لولیتا لرز گئی، اسے اس خوب صورت نوجوان کا خیال آیا جسے وہ ابھی کھانا دے کر آئی تھی۔ ”یہ تو خودکشی ہے؟“

”پوری جرمن قوم خودکشی کر رہی ہے۔“ جیڈ نے حقیقت بیان کی۔ ”ایک پاگل آمر پوری قوم کو مروا دے رہا ہے۔“

لولیتا اس سے متفق تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس اسنائپر جیسے نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے۔ ”وہ اس لیے یہاں آیا ہے کہ اگر اتحادی فارم پر حملہ کریں تو وہ انہیں دور سے شوٹ کر دے؟“

”بالکل، ورنہ وہ فوجی نہیں ہے۔“ جیڈ فکرمند ہو گئی تھی۔

اگلے دن جیڈ اور لولیتا نے جنگل میں جانے کی اجازت طلب کی تو کارپول ہینس نے ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا جو مستقل ان کے سر پر سوار رہا تھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر اس طرح موجود رہتا تھا کہ ان پر نظر رکھ سکے۔ اگر کبھی لولیتا اور جیڈ پاس آتیں تو انہیں دھیمی آواز میں بات کرنے کا موقع مل جاتا تھا، وہ اتنی آہستہ بول رہی تھیں کہ سپاہی سن نہیں پا رہا تھا اسے ویسے بھی ان کی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بےزاری کے عالم میں ڈیوٹی بھگتا رہا تھا اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ رمی کھیلنا چاہتا تھا۔ واپس آنے کے بعد جیڈ نے لولیتا سے کہا۔ ”اب مجھے رات کو جانا پڑے گا۔“

”پیغام دینے کے لیے؟“

”شش...“ جیڈ نے سرگوشی میں کہا۔ ”اب یہاں ایسی کوئی بات مت کرنا، ممکن ہے انہوں نے ہماری باتیں سننے کا بندوبست کر لیا ہو۔“

اس کے بعد وہ محتاط ہو گئیں کیونکہ جرمنوں نے ان کی نگرانی سخت کر دی تھی۔ رات کسی وقت جیڈ خاموشی سے باہر گئی۔ عمارت میں آنے جانے کا ایک ہی دروازہ تھا لیکن جیڈ نے ایک عقبی کھڑکی کو اس طرح کھلنے کے قابل بنا لیا تھا کہ بظاہر اس پر لگے تختے اپنی جگہ موجود ہوتے تھے۔ جب اسے خاموشی سے باہر جانا ہوتا تو وہ اسی کھڑکی سے نکل جاتی اور سامنے موجود جرمن سپاہی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ جیڈ ایک گھنٹے میں لوٹ آئی۔ اس نے لولیتا کو بتایا۔ ”ممکن ہے کل مجھے زیادہ دیر کے لیے جانا پڑے کیونکہ مجھے ہدایات بھی حاصل کرنی ہیں۔“

وہ بستر میں گھسی اور کمبل میں سر دیے آہستہ بات کر رہی تھیں جو ان کے کان بھی بہ مشکل سن پا رہے تھے۔ آج پہلی بار جیڈ اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ جیڈ کا تعلق فرانس سے تھا لیکن اس نے جرمنی کے ایک سائنس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے جرمن اور فرانسیسی زبانیں ایک جیسی مہارت سے بولتی تھی۔ ابھی وہ واپس فرانس گئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ جرمنی نے فرانس پر حملہ کر دیا اور پھر اس پر قابض ہو گیا۔ جیڈ اس وقت فرانسیسی انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ محب وطن تھی اور اسے اپنے ملک پر جرمنوں کا قبضہ گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے حریت پسندوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ جعلی کاغذات کی بنیاد پر وہ اور اس کے ساتھی جرمنی میں داخل ہوئے اور وہاں اتحادیوں کے لیے جاسوسی کرنے لگے۔

لولیتا نے پوچھا۔ ”تم کن کے لیے کام کر رہی ہو؟“

”اتحادیوں کے لیے۔“

”میرا مطلب ہے امریکا کے لیے یا برطانیہ کے لیے؟“

”دونوں کے لیے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے ہائر فرانس کی انٹیلی جنس نے کیا تھا لیکن جب جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو میں برٹش انٹیلی جنس کے لیے کام کرنے لگی۔ بعد میں امریکن نے بھی مجھ سے رابطہ کر لیا۔“

لولیتا حیران رہ گئی تھی۔ ”تم اتنے عرصے سے کامیابی سے جرمنوں کے درمیان رہ رہی ہو؟“

”پہلے ہمارا پورا گروپ تھا لیکن وہ جرمنوں کے ہاتھ لگ گیا میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگی تھی، اسی کوشش میں زخمی بھی ہو گئی تھی۔ پھر میں نے یادداشت کھونے کی اداکاری کی۔“

لولیتا نے اسے رشک سے دیکھا۔ ”تم نے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ میں اتنی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔“

”ایسا نہیں ہے جب وقت آتا ہے اور انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے ہر تکلیف برداشت کر لیتا ہے۔“

”تمہارا مقصد کیا ہے؟“

”یہی کہ میں بہر صورت جرمنوں کی شکست چاہتی ہوں اور اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک میرا کردار بہت چھوٹا سا ہے لیکن مجھے فخر ہے جب جرمنی ہتھیار ڈالے گا تو اس میں میرا بھی ایک حصہ ہوگا۔“

”کاش میں بھی تمہاری جتنی بہادر ہوتی۔“

جیڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم بہادر ہو، اگر تم بہادر نہ ہوتیں تو اب تک زندہ نہ ہوتیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا ہے؟“

لولیتا جانتی تھی۔ ”تم اس مشن میں میرا ساتھ چاہتی ہو؟“

جیڈ نے سر ہلایا۔ ”ہمارے لیے آسان کام یہ ہے کہ ایک رات چپکے سے یہاں سے فرار ہو جائیں۔ لیکن اس طرح جرمن اس خزانے کو کہیں اور لے جانے یا تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس میں بہت ساری چیزیں فرانس سے لائی گئی ہیں۔“

لولیتا افسردہ ہو گئی۔ ”ایسی ہی لوٹ مار انہوں نے میرے وطن میں بھی کی ہے، صرف تاریخی نوادرات نہیں چرائے بلکہ عام لوگوں سے ان کی دولت اور جمع پونجی بھی چھین لی۔ چن چن کر جوہریوں اور سناروں کو لوٹا ہے۔“

”میں نے سنا ہے جرمن اب شکست کو سامنے دیکھ کر ہیرے جواہرات اور سونے کے ذخائر چھپا رہے ہیں تاکہ یہ اتحادیوں کے ہاتھ بھی نہ لگ سکیں۔“

”ممکن ہے اس خزانے کے لیے بھی ان کا کوئی منصوبہ ہو۔“ لولیتا نے ورکشاپ میں موجود نوادرات کی طرف اشارہ کیا۔

”مشکل نوادرات کی منتقلی آسان نہیں ہوتی۔ پھر بہ حیثیت قوم اب جرمنوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ جنگ جیت جاتے تو فاتح کے طور پر ان نوادرات کو اپنے میوزیمز میں رکھتے لیکن وہ جنگ ہار رہے ہیں اس لیے وہ انہیں تباہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ یہ فاتحین کے ہاتھ بھی نہ لگ سکیں۔“

سن پینتالیس کے آغاز سے ہی واضح ہو گیا تھا کہ جرمن جنگ ہار چکے ہیں۔ اتحادی افواج چاروں طرف سے جرمنی میں داخل ہونے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ مسلسل بمباری نے جرمنی کے تمام بڑے شہروں، تنصیبات اور کارخانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ جرمنی کے تمام مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ آنے والے وقت کی گھبراہٹ جولٹی فارم میں موجود جرمنوں کے چہروں سے جھلکنے لگی تھی۔ لولیتا اور جیڈ کے خدشات بڑھ رہے تھے، سب سے بڑا خطرہ تو اس بات کا تھا کہ اچانک ہی جرمن اس جگہ کو تباہ کرنے کا فیصلہ نہ کر لیں، اس صورت میں ان کی ضرورت بھی ختم ہو جاتی اور انہیں گولی ماردی جاتی۔ جرمن آخری دنوں میں اپنے قیدیوں

کے ساتھ یہی سلوک کر رہے تھے۔ بنا کسی وجہ کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔

جیڈ کا مسلسل اتحادی انٹیلی جنس سے رابطہ تھا۔ مارچ کے آخر میں اسے بتایا گیا کہ کسی وقت بھی اتحادی دستہ فارم کی طرف روانہ کر دیا جائے گا اور وہ آنے والوں کی رہنمائی کریں۔ جیڈ فارم سے متعلق ضروری معلومات بھیج رہی تھی اور جیسے ہی کوئی تبدیلی آتی وہ فوراً ٹرانسمیٹر سے اطلاع آگے پہنچا دیتی تھی۔ یہ کام وہ اتنی مہارت اور چابکدستی سے کرتی کہ جرمن ابھی تک اس کی نشریات پکڑنے کے باوجود یہ نہیں جان سکے تھے کہ ٹرانسمیٹر کہاں سے استعمال ہو رہا ہے۔ مارچ تک اس علاقے میں بیشتر جرمن تنصیبات بمباری سے تباہ ہو چکی تھیں اور اب جرمن اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہاں موجود جاسوسوں پر نظر رکھ سکیں۔ اس کے باوجود جیڈ بہت محتاط تھی اسے معلوم تھا کہ اس موقع پر وہ پکڑی گئیں تو ان کے ساتھ جو ہونا ہے وہ تو ہوگا لیکن جرمن اس خزانے کو بھی فوراً تباہ کر دیں گے۔

مارچ کے آغاز میں اچانک جرمنوں کے رویے میں ان کے لیے تبدیلی آئی تھی، کارپول ہینس نے ان پر سے نگرانی ختم کر دی تھی اور اب وہ اکیلے بھی جنگل کی طرف جا سکتی تھیں۔ لولیتا کا خیال تھا کہ جرمن ان پر اعتماد کرنے لگے تھے جبکہ جیڈ کی سوچ یہ تھی کہ جرمن شاید ان پر شک کرنے لگے ہیں اور وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جب وہ جنگل میں جاتیں اور جیڈ ٹرانسمیٹر استعمال کرتی تو لولیتا مستقل آس پاس کی نگرانی کرتی تھی۔ اگر اسے کوئی جرمن سپاہی جنگل کی طرف آتا دکھائی دیتا تو جیڈ کو خبردار کر دیتی۔ مگر اس کا موقع کم ہی آتا تھا۔ جب سے جرمنوں نے نگرانی ختم کی تھی سپاہی جنگل کی طرف بھی کم ہی آتے تھے بلکہ وہ فارم میں بھی کم سے کم نظر آتے تھے اور زیادہ تر اس عمارت میں رہتے تھے جو ان کے لیے مخصوص تھی۔

لولیتا فکرمند تھی۔ ”جرمن اتنے بے پروا کیوں ہو رہے ہیں؟“

”شاید اس لیے کہ انہوں نے ورکشاپ میں کوئی ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ ان کے سوا کوئی اور اگر اندر جانے کی کوشش کرے گا تو سب تباہ ہو جائے گا۔“ جیڈ نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کرنل اسی کام کے لیے آیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جرمن پورے ملک میں ہر اس تنصیب یا کام کی جگہ کو ڈائنامائٹ کر رہے ہیں تاکہ وہ بعد میں فاتحین کے ہاتھ نہ آسکیں۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، نازی خود کہاں باقی رہیں گے جو ان چیزوں کی فکر کر رہے ہیں۔“

”یہ جنگ کرنے والوں کی نفسیات ہوتی ہے جو چیز ان کے کام نہ آسکے اور ان کے قبضے میں نہ رہ سکے وہ اسے تباہ کر دیتے ہیں۔“

مارچ کے آخر تک موسم سرما تقریباً رخصت ہو گیا تھا اور برف پگھل رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں پر نئے پتے اور کونپلیں نمودار ہو رہی تھیں۔ سرما کے دوران میں سبزی بہت کم ملتی تھی اور زیادہ تر جڑیں ہی ملتی تھیں۔ پیچھے سے سپلائی کم ہوتی جا رہی تھی اور اس میں سے گوشت اور مکھن جیسی چیزیں تو نایاب ہی ہو گئی تھیں۔ انہیں زیادہ تر ڈبل روٹی اور سبزیوں یا دالوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ سپلائی میں کمی ظاہر کر رہی تھی کہ علاقے پر جرمنوں کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے اور وہ شاید برلن کی طرف پسپا ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔

جیڈ جنگل سے ذرا دیر سے آئی، لولیتا پہلے آگئی تھی۔ لولیتا بے تاب تھی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ جیڈ نے کیا پیغام دیا ہے اور اسے کیا جوابی پیغام ملا ہے۔ پہلے اتحادی انٹیلی جنس دوسرے طریقوں سے ان تک پیغام پہنچاتی تھی لیکن جب سے جرمنوں کی گرفت کمزور ہوئی تھی وہ اسی ٹرانسمیٹر پر اپنے پیغام بھی بھیجنے لگے تھے۔ اس طرح جیڈ کو بروقت ہدایات مل جاتی تھیں۔ انہوں نے سپاہیوں کو لنچ دیا ونڈ ٹاور میں موجود اسنائپر کا لنچ حسب معمول لولیتا لے کر گئی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ لولیتا سے مانوس ہو گیا تھا لیکن ان میں صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا کیونکہ اسے جرمن کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی اور لولیتا کو جرمن زبان بہت معمولی سی آتی تھی۔ پھر کارپول ہینس کی طرف سے انہیں سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی جرمن سپاہی سے بلا ضرورت بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔

جیسے ہی وہ کچن کے کاموں سے فارغ ہوئیں اور اوپر آئیں۔ لولیتا نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”وہ آرہے ہیں۔“ جیڈ نے سنسنی خیز لہجے میں سرگوشی کی۔ ”کل وہ رات کے وقت یہاں اتار دیے جائیں گے اور شاید پرسوں رات وہ فارم پر حملہ کریں گے۔“

”حملہ؟“ لولیتا سہم گئی۔ ”تو کیا وہ ہمیں بھی مار دیں گے؟“

”اس کا بھی امکان ہے کیونکہ وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ جیڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے اور بہت ضروری ہے کہ وہ جرمنوں کے علم میں آئے بغیر یہاں پہنچ جائیں۔“

"یہ ممکن نہیں ہے۔" لولیتا نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسنائپر ہمہ وقت چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔"

"وہ سوتا تو ہوگا؟"

"وہ دن میں دو بار سوتا ہے لیکن ساری رات جاگتا رہتا ہے اس کے پاس رات میں دیکھنے والی دوربین ہے۔ کوئی اس کی نظروں میں آئے بغیر فارم میں داخل نہیں ہوسکتا۔" لولیتا نے اسے آگاہ کیا۔ "دن میں جب وہ سوتا ہے تو کوئی دوسرا جرمن اس کی جگہ نگرانی کرتا ہے۔"

جیڈ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ "اسے کسی صورت وہاں سے ہٹانا ہوگا ورنہ اس نے پہلے دیکھ لیا تو جرمن شدید مزاحمت کریں گے اور ممکن ہے انہیں خزانہ تباہ کرنے کا موقع مل جائے۔"

"اسے نہیں ہٹایا جاسکتا۔" لولیتا بولی۔ "آنے والے ہی جرمنوں سے نمٹ سکتے ہیں، ہم دونوں ان کے خلاف کیا کرسکتے ہیں؟"

"ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔" جیڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "لیکن یہ تمہیں کل بتاؤں گی کہ ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

لولیتا جیڈ کی طرح مضبوط اعصاب نہیں رکھتی تھی اور نہ اس کے پاس تربیت تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح جیڈ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ جیڈ کے پاس پستول تھا اور وہ اسے چلانا جانتی تھی، لولیتا کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار تھا اور نہ وہ آتشیں اسلحہ استعمال کرنا جانتی تھی۔ اس نے کچن سے ایک چھوٹی چھری لے کر اپنے لباس میں چھپالی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اسے استعمال کرسکتی تھی۔ اگرچہ اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی ایسا موقع آیا تو وہ چھری بھی استعمال کرسکے گی۔ وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ رات ہوئی تو جیڈ پھر باہر گئی وہ لولیتا سے زیادہ مضطرب تھی لیکن ظاہر نہیں کررہی تھی۔ یہ اس کے کیریئر کا سب سے بڑا مشن تھا جو اس کی ناکامی یا کامیابی کی داستان رقم کرتا۔ اسے عزت اور مان دلواتا یا ہمیشہ کے لیے کسی نامعلوم قبر میں دفن کرادیتا۔ جب تک جیڈ نہیں آئی لولیتا جاگتی رہی تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟" لولیتا نے کوٹ اتارتی جیڈ سے پوچھا۔

"میں دیکھنے گئی تھی۔ وہ شمال میں واقع ایک چھوٹے سفیدے کے جنگل میں اتریں گے۔ اگر اس طرف جرمن ہوئے تو وہ انہیں وہیں گھیر کر ماردیں گے۔"

"جرمنوں کو ان کی آمد کا پتا چل جائے گا۔" لولیتا نے یقین سے کہا۔

"نہیں، انہیں دھوکا دینے کے لیے وہ باقاعدہ فضائی حملہ کریں گے اور اس کی آڑ میں اس دستے کو جنگل میں اتار دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ تیس میل کا فاصلہ طے کریں گے اور آنے والی رات یہاں پہنچ جائیں گے۔"

لولیتا حیران رہ گئی۔ "تم تیس میل دور گئیں... کیسے؟"

"یہاں سے کچھ دور میں نے ایک موٹر سائیکل چھپا رکھی ہے جب مجھے کہیں دور جانا ہوتا ہے تو میں یہ موٹر سائیکل استعمال کرتی ہوں۔"

لولیتا نے پوچھا نہیں لیکن ظاہر تھا اسے یہ موٹر سائیکل اتحادیوں کے مقامی ایجنٹوں نے فراہم کی ہوگی۔ جیڈ تھکی ہوئی تھی وہ لیٹ گئی۔ "ابھی تک اس علاقے میں کہیں جرمن نہیں ہیں۔"

"وہ ہوں گے لیکن چھپے ہوں گے۔" لولیتا نے کہا۔ "میرا خیال ہے اب جرمن کھل کر جنگ کرنے کے بجائے چھپ کر حملے کریں گے کیونکہ وہ کھلے میدان میں آنے والی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے جرمن ایسا ہی کریں گے۔ یہاں بھی وہ انتظار کررہے ہیں کہ دشمن آئے تو وہ اس پر حملہ کریں۔" جیڈ نے کہا اور کہتے ہی سوگئی کچھ دیر بعد اس کے ہلکے سے خراٹے گونجے تو لولیتا کو اندازہ ہوا۔ اسے جیڈ پر رشک آتا تھا وہ مشکل ترین حالات میں بھی پرسکون رہتی تھی اور بستر پر لیٹ کر جب چاہتی سو جاتی تھی۔ وہ دو دن بھی جاگتی رہی تھی اور کبھی صرف دو گھنٹے سو کر بھی تازہ دم ہوجاتی تھی۔ اگلا دن انہوں نے معمول کے مطابق گزارا تھا۔ کچن سپلائی ایک ہفتے سے نہیں آئی تھی اس لیے لولیتا کو کھانا بنانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ضرورت کی معمولی سی اشیا بھی ختم ہوتی جارہی تھیں البتہ سپاہیوں کے لیے شراب اور سگریٹوں کا کوٹا باقاعدگی سے آرہا تھا اور شاید اسی لیے انہیں اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ انہیں کھانے میں کیا دیا جارہا ہے۔ وہ اپنے حال میں مگن تھے۔

رات انہوں نے اپنے کام جلد نمٹا لیے تھے۔ جیڈ کمرے میں جاتے ہی سوگئی تھی لیکن اس نے لباس نہیں بدلا تھا۔ اس نے جوتے تک پہن رکھے تھے۔ لولیتا جان گئی کہ اسے باہر جانا ہے۔ لولیتا نے سیڑھیوں کا دروازہ بند کرلیا تھا نیچے کچن میں آنے والا دروازہ کھلا رہتا تھا کیونکہ سپاہیوں کو کبھی پانی یا کافی کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ کچن تک چلے آتے تھے۔ اس سے آگے آنے کی انہیں اجازت نہیں تھی مگر لولیتا اور جیڈ خطرہ مول نہیں لیتی تھیں، وہ سیڑھیوں والا دروازہ بند کرلیتی تھیں۔ جیڈ دو بجے اٹھی اس نے کوٹ پہنا اور لولیتا کی

طرف دیکھا۔

"میں جارہی ہوں اگر میں روشنی ہونے تک نہ آؤں تو تم بھی یہاں سے نکل جانا اور شمال مغرب کی طرف جانا، تیس میل کے دائرے میں تمہیں امریکی یا برٹش فوجی مل جائیں گے لیکن میرا حوالہ مت دینا۔ اپنے بارے میں سچ بتادینا اور اس فارم کے بارے میں بھی بتادینا۔"

"تب مجھے تمہارے بارے میں بھی بتانا پڑے گا۔"

"تم میرے بارے میں بتاسکتی ہو لیکن میری اصل شخصیت کے بارے میں مت بتانا۔"

"تم کہاں جارہی ہو؟"

"کام سے۔" اس نے مختصر جواب دیا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد لولیتا لیٹ گئی۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ وہ بھی یہاں سے نکل جائے لیکن وہ جیڈ کی ہدایت کے مطابق صبح سے پہلے نہیں جاسکتی تھی۔ اسے روشنی ہونے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ صبح چھ بجے تک روشنی ہوجاتی تھی۔ لولیتا نے پانچ بجے لباس تبدیل کرنا شروع کیا تھا کہ جیڈ آگئی وہ کل کی طرح پرجوش لگ رہی تھی اس نے آتے ہی لولیتا کو گلے لگا کر کہا۔

"مبارک ہو وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔"

"یعنی جنگل میں اتر گئے ہیں؟"

جیڈ نے سر ہلایا۔ "کل رات وہ یہاں ہوں گے۔ چار بجے وہ فارم کی حدود میں داخل ہوجائیں گے۔"

رات کے وقت صرف دو جرمن سپاہی پہرے پر ہوتے تھے۔ ہر چار گھنٹے بعد پہریدار بدل جاتے تھے۔ یہ پہرے دار مسئلہ نہیں تھے کیونکہ جب اتحادی دستہ فارم میں داخل ہوجاتا تب انہیں معلوم ہوتا، اصل مسئلہ ونڈ ٹاور میں موجود اسنائپر تھا۔ وہ وہاں سے چاروں طرف نظر رکھتا تھا اور اس کے پاس رات میں دیکھنے والی دوربین بھی تھی، وہ لازمی اتحادیوں کو فارم میں داخل ہونے سے پہلے دیکھ لیتا اور پھر وہ دور سے انہیں نشانہ بھی بنا سکتا تھا۔ جیڈ مسلسل سوچ رہی تھی پھر اس نے لولیتا سے کہا۔ "ہمیں اس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔"

لولیتا دہل گئی تھی۔ "خاتمہ... مگر کیوں... میرا مطلب ہے کیسے؟"

"کبھی کبھی ہم انہیں رات گئے کافی دیتے ہیں۔ آنے والی رات میں اس کے لیے کافی لے کر جاؤں گی اور اسے موت کی نیند سلادوں گی۔"

لولیتا بے چین ہوگئی۔ "لیکن پستول کی آواز سے باقی ہوشیار ہوجائیں گے۔"

"میں چاقو استعمال کروں گی۔"

"وہ چست اور طاقتور مرد ہے اگر ہوشیار ہوگیا تو تم کسی طرح اس پر قابو نہیں پاسکوگی۔"

"تم فکر مت کرو۔" جیڈ کا لہجہ سرد ہوگیا تھا۔ "مرد پر کس طرح قابو پایا جاتا ہے یہ مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ چھ سال میں، میں نے کم سے کم ایک درجن جرمن سپاہیوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا ہے۔"

لولیتا کے تصور میں بار بار... اسنائپر کی صورت آرہی تھی۔ بے شک وہ دشمن تھا اور ان کے مشن میں رکاوٹ تھا لیکن اسے اس طرح ہلاک کیا جانا لولیتا کو منظور نہیں تھا۔ جیڈ کچھ دیر بعد سوگئی لیکن لولیتا جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ صبح وہ جلدی اٹھی اس روز ڈبل روٹی اور دوسرے سامان کی سپلائی آنی تھی، سپلائی لینا اس کا کام تھا۔ وہ تیار ہو کر نیچے آئی۔ ڈبل روٹی کے آخری ٹکڑے بچے تھے اور ان سے ہلکی سی بساند آنے لگی تھی بہرحال مکھن کے ساتھ یہ اب بھی کھانے کے قابل تھے۔ جب سات بجے تک سپلائی لانے والے کی موٹر سائیکل نمودار نہیں ہوئی تو اس نے اسی باسی ڈبل روٹی سے سپاہیوں کو ناشتا فراہم کردیا۔

جیڈ اوپر سے آئی، اس نے صرف کافی لی اور ٹوکری اٹھالی۔ اس نے لولیتا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم یہیں رکنا میں چیزیں لے آتی ہوں۔"

لولیتا خود بھی یہی چاہتی تھی۔ جیڈ کے جانے کے بعد اس نے ناشتے کی ٹرے اٹھائی اور ونڈ ٹاور کی طرف چل پڑی۔ اسنائپر تینوں وقت کا کھانا وہیں کھاتا تھا اور سوائے ضرورت کے وہاں سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔ لولیتا سیڑھیاں چڑھ کر ٹاور کے اوپری حصے میں آئی جہاں اسنائپر دوربین لیے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لولیتا نے ناشتا اس کے سامنے رکھا اور واپس جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گئی۔ اسنائپر اس کی طرف متوجہ ہوا تو لولیتا نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے کیا۔ "میں لولیتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے پہلی بار لولیتا سے کچھ کہا۔ "میں کارل بائر فوخ ہوں۔"

"تم کھانے پینے کے شوقین نہیں ہو؟ تم نے کبھی کچھ خود سے نہیں مانگا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں مجھے شوق نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

لولیتا نے اس سے ماں کے بارے میں پوچھا تو وہ اس سے ذرا کھل گیا۔ کارل کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور وہ اس کا

ایک ہی بیٹا تھا۔ اسکول سے وہ ہٹلر یوتھ میں شامل تھا اور چند سال پہلے اسے لازمی خدمت کے قانون کے تحت بھرتی کرلیا گیا۔ لیکن اسے فوج میں نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ اسے نشانے بازی کی تربیت دی گئی اور پھر اسے اور اس کے گروپ کو مقبوضہ علاقوں میں بھیج دیا گیا جہاں وہ محاذ کے پاس رہ کر دشمن سپاہیوں کو نشانہ بناتے تھے۔ جواب میں اتحادی فوج نے بھی یہی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ جب جنگ کا دائرہ جرمنی کی طرف سمٹنے لگا تو کارل اور اس کے ساتھیوں کو بھی واپس بلالیا گیا اور انہیں جرمنی میں ہی مختلف جگہوں پر بھیجا جانے لگا۔ پانچ مہینے پہلے کارل کو بویریا سے بلاکر جولٹی فارم بھیج دیا گیا اور وہ حیران تھا کہ اس کا یہاں کیا کام تھا کیونکہ دور دور تک کوئی دشمن نظر نہیں آرہا تھا اور پانچ مہینے سے اس نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔ لولیتا، جیڈ کے آنے سے پہلے وہاں سے اٹھ گئی۔

جیڈ کے آتے ہی اس نے کھانا تیار کیا، سپاہی اصل میں دن میں کھاتے تھے اور رات کو بھی انہیں یہی کھانا گرم کرکے دیا جاتا تھا۔ یعنی انہیں ایک ہی وقت کھانا بنانا پڑتا تھا۔ مگر دن میں برتن بہت جمع ہوجاتے تھے۔ انہیں بار بار دھونے کے لیے لے جانا پڑتا تھا۔ یہاں کچن میں برتن دھونے کا بندوبست نہیں تھا پھر انہیں روزانہ ایک دو وردیاں بھی دھونی پڑتی تھیں۔ کچن کے لیے پانی بھر کر لانا پڑتا تھا۔ کام کم نہیں تھے۔ وہ صبح سے شام تک مصروف ہی رہتی تھیں۔ اس روز بھی انہیں اکٹھی چار وردیاں مل گئیں۔ انہوں نے طے کیا کہ جب جیڈ برتن دھونے جائے گی تو لولیتا اس کے ساتھ ہی یہ وردیاں بھی دھولے گی۔ ونڈ ٹاور نہر کے کنارے ہی تھا۔ جیڈ نے کہا۔

''یہ نوجوان ہے اور آسانی سے قابو میں آجائے گا۔''

لولیتا نے سر ہلایا، اس نے کچھ کہا نہیں تھا، اسے لگ رہا تھا کہ جیڈ اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھی اور بار بار اسی لیے یہ ذکر چھیڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لولیتا نے کہا۔ ''فرض کرو اگر تم نے اسے ماردیا اور اتحادی پھر بھی یہاں نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا؟''

''اس صورت میں ہمیں صبح سے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' جیڈ بولی۔ ''لیکن ایسا ہوگا نہیں، وہ دستہ یہاں پہنچ جائے گا اس طرف جرمن نہیں ہیں، وہ زیادہ تر روسیوں سے لڑنے میں مصروف ہیں۔ ان کے خیال میں ابھی امریکی اور برٹش یہاں نہیں آئے ہیں۔''

رات کے کھانے کے بعد جیڈ نے کارپول ہینس سے کہا۔ ''آج بہت تھک گئے ہیں اس لیے کافی دیر سے بنائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں تم لوگ آرام کرو، ہم خود بنالیں گے۔''

''نہیں... نہیں ہم بنادیں گے۔'' جیڈ نے جلدی سے کہا۔ ''بس کچھ دیر آرام کریں گے۔''

کارپول ہینس مان گیا تو جیڈ نے سکون کا سانس لیا اگر وہ انہیں منع کردیتا تو ان کے لیے باہر نکلنا اور ونڈ ٹاور تک جانا ممکن نہ رہتا۔ وہ اوپر آئیں۔ جیڈ نے کہا۔ ''دستہ فارم کے پاس پہنچ گیا ہوگا لیکن وہ اندر اس وقت آئیں گا جب انہیں ونڈ ٹاور سے اشارہ ملے گا۔''

''کیسا اشارہ؟''

''ٹارچ سے روشنی کرکے اشارہ دینا ہوگا۔''

''اور یہ اشارہ سپاہیوں نے دیکھ لیا تو...؟''

''یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔'' جیڈ بولی۔ ''میں اپنا کام کرکے وہیں رک جاؤں گی۔ چار بجے اشارہ دوں گی۔''

''سنو میری ایک بات مانو گی؟'' لولیتا نے اچانک کہا۔ ''یہ کام مجھے دیدو۔''

جیڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں... تم کرلو گی؟''

''ہاں میں کرلوں گی۔'' لولیتا نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہوگا تم جاکر دستے کی رہنمائی کرو، میری طرف سے اشارہ ملتے ہی تم انہیں فارم تک لے آؤ گی۔ تمہاری رہنمائی میں وہ زیادہ آسانی سے اپنا کام کرسکیں گے۔''

لولیتا کی دلیل نے جیڈ کو قائل کرلیا لیکن اس کو شبہ تھا کہ وہ اسنائپر کو قتل کرسکے گی۔ لولیتا نے کہا۔ ''میں یہ کام زیادہ آسانی سے کرسکوں گی کیونکہ وہ مجھ سے مانوس ہے اور شاید مجھے پسند بھی کرتا ہے۔''

جیڈ نے سر ہلایا اور چھوٹا سا تیز دھار چاقو اس کے حوالے کردیا۔ ''ٹھیک ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر وہ بچ گیا تو ہمارا مشن ناکام ہوجائے گا اور ہم سب ہی مارے جائیں گے۔''

لولیتا اور جیڈ بارہ بجے کے قریب نیچے آئیں۔ انہوں نے کافی تیار کی۔ جیڈ نے جاکر سپاہیوں کو کافی دی جبکہ لولیتا کارل کے لیے کافی لے کر جانے لگی۔ جیڈ اس وقت واپس آرہی تھی، اس نے لولیتا کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ کچن والی عمارت کے سامنے موجود سپاہی بھی کافی نوشی کے لیے چلا گیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی تھی اب اس کی جگہ دوسرا سپاہی آتا۔ اس دوسرے سپاہی کو معلوم نہیں تھا کہ لولیتا اور جیڈ واپس آئی ہیں یا نہیں۔ لولیتا اوپر ٹاور میں آئی۔ کارل حسب معمول اپنی

ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے کافی لے کر لولیتا کی طرف دیکھا مگر وہ واپس نہیں گئی تھی۔ وہ آج کسی اور ہی ارادے سے آئی تھی۔

☆☆☆

جیڈ محتاط قدموں سے جنگل میں گھوم رہی تھی۔ اس نے خود کو نمایاں رکھا تھا تاکہ وہاں کوئی موجود ہو تو اسے دیکھ لے لیکن وہ آہٹ پیدا کرنے سے گریز کررہی تھی۔ ایک جگہ اچانک تین مسلح فوجیوں نے اسے گھیر لیا، اس نے ہاتھ سر پر رکھ لیے، وہ اتحادی فوجی تھے۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی اور پستول برآمد کرلیا پھر اس کی شناخت پوچھی۔ جیڈ نے اپنی شناخت بتائی اور جب اس سے مخصوص کوڈ ورڈز کہے گئے تو اس نے جوابی کوڈ ورڈ دہرائے۔ اسے گرفتار کرنے والے مطمئن ہوگئے، ان کے کمانڈر نے جیڈ سے کہا۔

''تم یہاں کیوں آئیں، تمہیں فارم میں ملنا تھا؟''

''میں تمہاری رہنمائی کے لیے آئی ہوں اس جگہ کو میں بہتر جانتی ہوں، میری ساتھی ونڈ ٹاور میں موجود اسنائپر کو قتل کرکے سگنل دے گی، اس کی بعد ہمیں فارم میں داخل ہونا ہے۔''

کمانڈر کو منصوبے کا علم تھا۔ اس کے ساتھ درجن بھر کمانڈوز تھے اور یہ سب اسپیشل گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جنگل میں داخل ہوکر خود کو چھپالیا تھا۔ چار بجے سے ذرا پہلے جیڈ اکیلی اس جگہ تک آئی جہاں سے ونڈ ٹاور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے روشنی کے سگنل کا انتظار تھا۔ ٹھیک چار بجے ٹاور سے ٹارچ کی روشنی جلتی بجھتی دکھائی دی۔ تین بار جل کر وہ بجھ گئی۔ جیڈ فوراً دستے کے پاس آئی۔ ''تیار ہوجاؤ، ہمیں فارم میں داخل ہونا ہے سب سے پہلے سپاہیوں پر قابو پانا ہے۔''

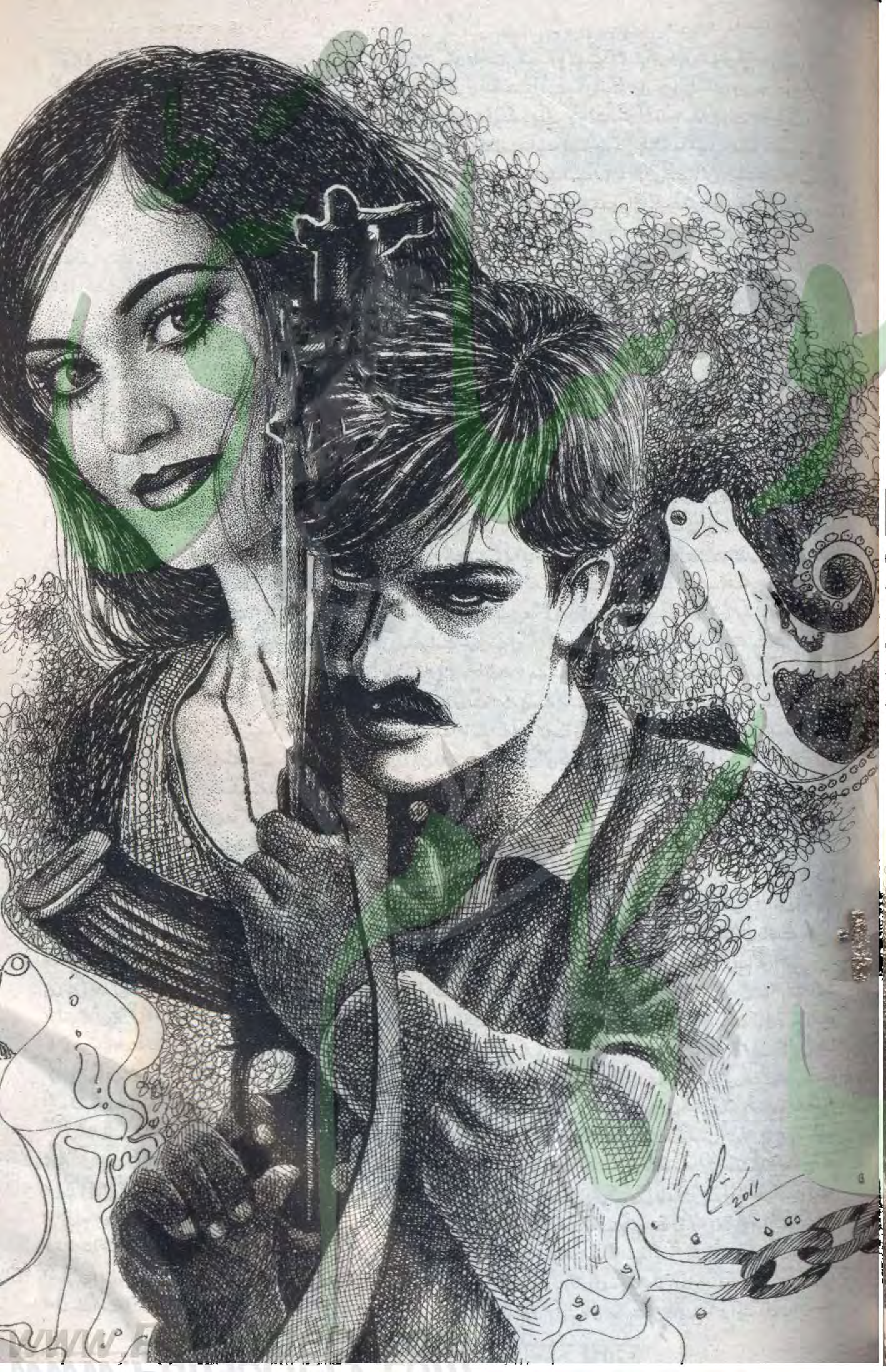
کمانڈوز کے پاس سائلنسر لگے ہتھیار تھے، انہوں نے جیڈ کی رہنمائی میں اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پہرے پر موجود سپاہیوں کو نشانہ بنایا۔ یہ کام خاموشی سے ہوگیا۔ جیڈ نے سپاہیوں کی رہائش کی نشان دہی کی اور خود ونڈ ٹاور کی طرف آئی۔ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آئی تو لولیتا ایک طرف دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور سامنے کارل چت لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ شراب کی خالی بوتل بتارہی تھی کہ اس کے سر پر ڈھول بھی بجایا جاتا تو اس کی نیند نہ ٹوٹتی۔ جیڈ نے لولیتا کا جائزہ لیا اور سمجھ گئی کہ اس نے کس طرح کارل کو اپنی ڈیوٹی سے غافل کردیا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال بعد جیڈ اپنے برطانوی شوہر کے ساتھ جولٹی فارم میں داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اسی دستے کا کمانڈر تھا جس نے جولٹی فارم پر حملہ کرکے نوادرات کے خزانے کو محفوظ رکھا تھا۔ مشن نہایت کامیابی سے مکمل ہوا تھا اور اس کے تمام سپاہی محفوظ رہے تھے۔ انہوں نے کارل کو گرفتار کرلیا تھا۔ جیڈ اور لولیتا اتحادیوں کے قائم کیے ہوئے پناہ گزین کیمپ میں بھیج دی گئی تھیں جہاں سے جیڈ برطانیہ روانہ ہوگئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جب جاسوسوں کے اعزاز میں تقریب ہوئی انہیں انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا تو جیڈ کا نام بھی اعزاز پانے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔ برطانیہ میں کمانڈر کیل برنگھم اس کا میزبان تھا اور بعد میں انہوں نے شادی کرلی۔ جیڈ نے برطانیہ میں رہائش اختیار کرلی۔

پانچ سال بعد اسے جرمنی سے ایک دعوت نامہ ملا جس میں اسے جولٹی فارم میں آکر گرمیاں گزارنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن دعوت دینے والے کا نام نہیں لکھا تھا۔ کیل سے مشورہ کرکے جیڈ نے دعوت نامہ قبول کرلیا اور جوابی خط سے مطلع کردیا کہ وہ کس تاریخ کو وہاں آرہے تھے لیکن جب وہ جولٹی فارم میں داخل ہوئے تو جیڈ دنگ رہ گئی تھی۔ یہ پانچ سال پہلے والے تباہ حال فارم سے بالکل مختلف تھا اور اس کے داخلی راستے پر لولیتا فارم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ فارم کی پرانی عمارتیں اور ورکشاپ مسمار کردی گئی تھی اب ان کی جگہ ایک خوب صورت دو منزلہ مکان اور نہر کے کنارے جدید قسم کا ونڈ ٹاور لگا تھا جو نہر سے پانی اٹھا کر کھیتوں کو فراہم کررہا تھا۔ نہر کے پاس والا جنگل پہلے کی طرح بے ترتیب نہیں رہا تھا، اس میں اضافی درخت اور جھاڑیاں کاٹ کر اسے باقاعدہ شکل دی گئی تھی اور اس کے درمیان میں راستے بنادیے گئے تھے۔ نہروں کے کنارے پختہ تھے اور مکان کے ڈرائیو وے میں ایک کار اور ایک پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ ان کی گاڑی وہاں رکی تو اندر سے لولیتا بھاگتی ہوئی آئی اور جیڈ کے گلے لگ گئی۔ پھر اندر سے ایک جوان مرد نکلا جس نے دو جڑواں بچوں کو اٹھا رکھا تھا۔ جیڈ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا وہ کارل تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔

چند سال پہلے کی جنگ اور دشمنی اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ چار مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اب ایک تھے۔ وہ رشتوں اور دوستی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ جنگ نے ان سے ان کے پرانے رشتے اور گھر چھین لیے تھے لیکن اب انہیں نئے رشتے اور نئے گھر مل گئے تھے۔ ان کا ماضی ضرور بدصورت تھا لیکن حال اور آنے والا مستقبل یقیناً خوب صورت تھا۔



اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

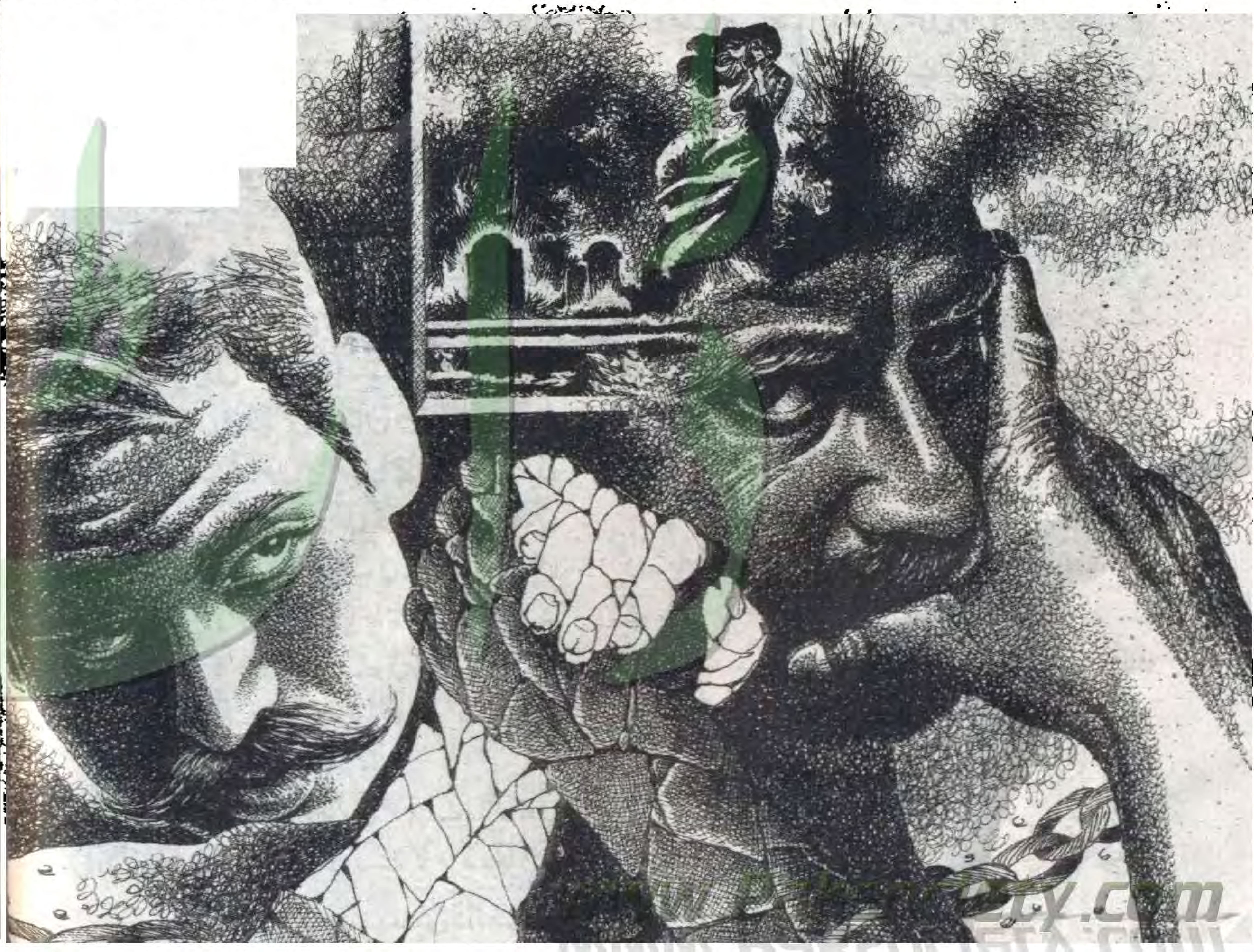
انوار صدیقی

بارھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پُراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے



کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے مخالفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بنتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے اثر و رسوخ مرکز تک تھے جس کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غنڈے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچالیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ "بلیک ٹائیگر" کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھٹکا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکتا ہے جو اس کمرے تک آگیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نو وارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شیخ حامد نے پوش علاقے کے اس ون یونٹ بنگلے تک پہنچنے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔ بنگلے پر پہنچنے کے بعد ہی اس نے قاضی اور دو گواہوں کو بھی طلب کر لیا۔ کنول سے اس کی شادی کی رسم محض تین آدمیوں کی موجودگی میں ادا ہوئی پھر وہ تینوں رخصت ہو گئے۔ کنول کو اس کی ماں نے دعاؤں سے نواز کر پہلی منزل پر اس کے حجلۂ عروسی تک پہنچا دیا۔ اس خوشی کے موقعے پر بھی اس کے ممتا بھرے دل میں لاکھوں حسرتیں تڑپ رہی تھیں۔ وہ بیٹی کو صدق دل سے دعا دے رہی تھی۔

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم و آباد رکھے۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ اللہ تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں نصیب کرے۔"

"ماں......" کنول نے ماں کی پلکوں پر لرزتے آنسو دیکھے، ان میں خوشی کی جگہ ایک عورت کی بے بسی اور بے چارگی شامل تھی۔ "کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں باقاعدہ نکاح میں آنے کے بعد......" وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

"جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کی مدد اوپر والا کرتا ہے میری بچی۔ خدا تمہارے نصیب اچھے کرے۔"

ایک طرف ماں بیٹی خوشیوں کی آس میں ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں، دوسری جانب شیخ حامد موبائل پر کسی کو مدھم لہجے میں ہدایت دے رہا تھا۔

"کام ہوش سے کرنا۔ تینوں میں سے کسی ایک کا زندہ رہنا بھی تمہاری موت ہوگا لیکن...... حادثہ اس طرح پیش آئے کہ کسی کو شک نہ ہو اور ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا باس۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ "ہم کچا کام نہیں کریں گے۔"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟"

"ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ کرید کرنا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔"

"گڈ......" شیخ حامد نے کہا پھر احتیاطاً اس گاڑی کا نمبر، ماڈل اور کلر بھی بتا دیا جو اس نے کسی ذریعے سے کرائے پر حاصل کرائی تھی۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ اوپر جانے والا زینہ طے کر رہا تھا جب اس نے کنول کی ماں کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔

"مجھے بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" اس نے کنول کی ماں کا راستہ روک کر ڈھٹائی سے درخواست کی۔

"خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔" کنول کی ماں نے مٹھی میں بند ایک مردانہ انگوٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کنول کے علاوہ یہ انگوٹھی بھی میرے مرحوم شوہر کی یادگار ہے جو میں اس خوشی کے موقعے پر آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔"

"ایک درخواست مجھے بھی کرنی ہے۔" شیخ حامد نے انگوٹھی کو حقارت سے جیب میں ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "فی الحال میں اس شادی کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ کاروباری وجوہات درپیش ہیں۔"

"کنول مجھے بتا چکی ہے۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔" وہ کترا کر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی نیچے آگئی۔

شیخ حامد فاتحانہ انداز میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا جہاں کنول سمٹی سمٹائی بیٹھی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کنول کے قریب آکر اس کا گھونگٹ پلٹتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"میں نے جو کہا تھا وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔"

کنول نے نظریں اٹھا کر شیخ حامد کو دیکھا۔ نشے کے خمار سے اس کی آنکھیں بھی نشیلی ہو رہی تھیں۔ "میں آپ کی شکر گزار ہوں جو آپ مجھے عزت سے حاصل کر رہے ہیں۔"

"یہ عزت تمہیں اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک تم مجھ سے وفادار رہو گی۔"

"وفاداری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" شیخ حامد نے کنول کے اور قریب ہو کر کہا۔ بیڈ سوئچ کے ذریعے اس نے تیز روشنیاں گل کیں تو کمرے کا ماحول اور بھی خواب ناک ہو گیا، وہ تکلفات کا عادی نہیں تھا اس لیے کنول نے بھی کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا، خود کو پوری طرح اس کے حسب منشا اس کے حوالے کر دیا۔ شیخ حامد کھل کھیلنے کا عادی تھا اس لیے بہت جلد اپنے اصلی رنگ میں آگیا۔

شیخ حامد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس وقت کوئی کمرے کی چھت پر اوندھا لیٹا روشن دان کے ذریعے نائٹ لینس والے پاورفل اور حساس مختصر سے مووی کیمرے کے ذریعے اس ہیجانی کھیل کے ایک ایک لمحے کی منظر کشی کررہا ہوگا جس نے وہاں تک پہنچنے کے لیے اپنے کئی ساتھیوں سے مدد لی تھی جو تھوڑی دور تک شیخ حامد کی گاڑی کا تعاقب اپنی کار اور موٹر سائیکلوں پر کرتے رہے تھے اور حجلۂ عروسی کی اس چھت تک پہنچنے والا کتنے مکانوں کی چھتوں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا۔ جو زیرو، زیرو، ون فور کے کوڈ کے حوالے سے ملٹری کمانڈوز کا سب سے ذہین آدمی سمجھا جاتا تھا۔

☠☠☠

جگا اس وقت کچی آبادی کے ایک مکان میں اپنے دو خاص آدمیوں کے ساتھ بیٹھا گفتگو کررہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی دوسرے کمروں میں تھے۔ اس وقت رات کے دو پہر گزر چکے تھے، اس مکان میں آئے انہیں بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا تھا۔ تینوں افراد کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی مسلط تھی۔

''استاد......'' ایک ساتھی نے جگا کو مخاطب کیا۔ ''آخر ہم کب تک اس طرح ٹھکانے بدلتے رہیں گے۔ ہماری روپوشی کو دشمن ہماری کمزوری اور بزدلی سمجھ کر اور شیر ہوسکتا ہے۔''

''تمہارے پاس جاں نثاروں کی کمی بھی نہیں ہے۔'' دوسرے نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ایک اشارہ بھی کافی ہے۔ ہم دشمن کو اس کے گھر میں گھس کر بھی جہنم رسید کرنے میں دریغ نہیں کریں گے۔''

''سب ہی تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔'' پہلے نے بے جگری سے دوسرے کی تائید کی۔ ''تم صرف دشمن کا نام اور ٹھکانا بتا دو۔ باقی کام ہم نمٹا دیں گے۔ ایسا چوکھا کام کریں گے کہ رہے نام اللہ کا......''

''مجھے تم لوگوں کی زندگی اپنے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے علاوہ میں زیادہ کشت وخون کا بھی عادی نہیں ہوں۔'' جگا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل آئے تو......''

''تم مثال دینے میں غلطی کررہے ہو استاد۔'' دوسرے نے تصحیح کی۔ ''سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا، انگلی ٹیڑھی کیے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ خالی پیلی انگلی گھی میں ڈبونے سے گناہ بے لذت والی بات ہوتی ہے۔''

''ہم ہمیشہ کھرا کھیلتے آئے ہیں استاد...... اس بار تمہاری مصلحت ہمارے پلے نہیں پڑرہی...... ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں صرف تخت یا تختے کی بات کی جاتی ہے......''

''گھٹنے ٹیک دینے والی بات پھیلی تو دوسرے اڈے پاڑے والے بھی چھاتی نکالنے کی کوشش کریں گے۔''

''ٹھنڈا کرکے کھانے کی عادت ڈالو......'' جگا کسمسا کر بولا۔ ''گرم گرم نوالے لینے سے منہ بھی جل سکتا ہے۔ میں نے جو خاموشی اختیار کی ہے اس کی کچھ وجہ ہے...... بات کھل کر صاف ہوجائے تو میں دیر بھی نہیں کروں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی...... ہم نے تمہارے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا ہے تو پھر تمہاری کسی مصلحت کے آڑے آنے کی غلطی بھی نہیں کریں گے۔''

جگا کوئی معقول جواب سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر وائبریشن ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کرکے کان سے لگالیا۔

''کوئی نئی خبر......؟''

''اس وقت کہاں ہو......؟'' دوسری جانب سے امداد علی کی آواز ابھری۔

''کچی آبادی نمبر تین کے ٹھکانے پر...... اس وقت کیسے فون کیا؟'' جگا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''کچھ اچھی بری خبریں ملی ہیں۔'' سنجیدگی سے کہا گیا۔ ''خودکشی کرنے والے کا نام ہاشم تھا۔ پوسٹ مارٹم کے وقت اس کے چہرے کے میک اپ کا بھرم بھی کھل گیا۔''

''وہ...... وہ خودکشی نہیں کرسکتا۔'' جگا نے بڑے یقین وحیرت سے کہا۔ ''بڑا مرد آدمی تھا۔ کسی نہ کسی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کردیا ہوگا۔''

''تمہارا دھیان کدھر جاتا ہے؟''

''وہی حرام کا بیج جس کا نمبر ون گولی مار کر جہنم رسید کردیا گیا تھا۔ میں نے تم سے اسی پر شبہے کا اظہار بھی کیا تھا۔''

''ہوسکتا ہے تمہارا اندازہ ٹھیک ہو...... میرے مخبر نے بتایا ہے کہ کمرے سے سوائے اس کے اور جن لوگوں کے فنگر پرنٹ ملے ہیں وہ سب پرانے ہیں اور گیسٹ ہاؤس میں کام کرنے والوں ہی کے ہیں۔''

''اور کیا خبر ہے؟''

''ایک گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔ ایک اسپتال کے قریب والی سڑک پر تیرے سراج صاحب کی کار اڑتے اڑتے رہ گئی۔'' امداد علی نے بات جاری رکھی۔ ''شکر ہے کہ دھماکا کچھ دور ہوا ورنہ گاڑی بھی لپیٹ میں آجاتی۔''

''سراج صاحب تو خیریت سے ہیں۔'' جگا نے بے چینی سے سوال کیا۔

''گاڑی میں سراج صاحب کے ساتھ ایس پی اورنگ

زیب بھی تھے، وہ بال بال بچ گئے۔ سراج صاحب کی بھی قسمت اچھی تھی کہ بعد میں کی جانے والی دھواں دھار فائرنگ سے ان کا ایک بازو معمولی زخمی ہوا ہے، فی الحال انہیں پولیس اسپتال میں رکھا گیا ہے۔''

''اس واردات میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟'' جگا نے تملا کر دریافت کیا، اس کے چہرے پر خون کی گردش بتدریج بڑھ رہی تھی۔

''ابھی اس کا کھوج نہیں ملا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نشانہ کون تھا۔'' امداد علی نے وضاحت سے کہا۔ ''اطلاع کے مطابق دو پارٹیاں ٹکرا گئی تھیں، ایک کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ پولیس کے سادہ لباس والے بھی ہوسکتے ہیں۔ نیا ایس پی بھی اونچی پہنچ والا بندہ ہے، اس کی بڑے شیخ سے اسی دن ٹھن گئی تھی جب اس نے شیخ کی بیگم کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اسی کو ٹھکانے لگانے کی خاطر جال بنا گیا ہو۔ سراج صاحب مفت میں لپیٹے میں آگئے ہوں۔''

''پانی اب سر سے اونچا ہونے لگا ہے میرے یار۔'' جگا نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شیخ کو اب بغدادی قاعدہ پڑھانا ضروری ہوگیا ہے۔ تو نے نہ روکا ہوتا تو شاید میں......''

''ابھی جلدی مت کرنا......'' امداد علی نے بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک دو دن اور صبر کرلے۔ میں اندر کی خبریں نکال رہا ہوں، کچھ اور حال احوال معلوم ہو تو پھر دھڑنگ تختے کا پروگرام بھی بنا لیں گے۔ میں بھی تیرے ساتھ ہوں گا۔''

''کتے کی دم کی کیا خبر ہے......؟'' جگا نے نفرت سے دریافت کیا۔

''جب تک نلکی نہ فٹ کی گئی ٹیڑھی ہی رہے گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ سراج صاحب کو پولیس اسپتال میں کب تک رکھا جائے گا؟''

''یقین سے نہیں کچھ کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے ضروری مرہم پٹی کے بعد کسی بڑے اسپتال میں داخل کرادیا جائے لیکن تو خاص طور پر سراج صاحب کے لیے کیوں بے چین ہے؟''

''ان کا ایک احسان ہے ہمارے اوپر...... وہ چکتا کرنا ہے۔'' جگا نے کہا پھر بات بدل کر پوچھا۔ ''دونوں افراد کہاں گئے تھے...... میرا مطلب ہے کہ حادثے سے پہلے کہیں نہ کہیں تو گئے ہوں گے۔''

''سنا ہے وہ ایک نجی اسپتال ہی گئے تھے لیکن بڑے

باہر موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ اندر پروفیسر صاحب ایک کتاب پڑھنے میں مستغرق تھے۔ اچانک بیوی نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بلی تو یہیں گھوم رہی ہے۔''

''ایں؟'' انھوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کہ بلی کو باہر پھینک آیئے معلوم ہوتا ہے آپ نے میری بات نہیں سنی۔ بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔''

''بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے؟ تعجب ہے۔ میں تو اسے باہر پھینک آیا تھا۔'' پھر یکا یک گھبرا کر بولے ''ذرا دیکھنا تو بے بی پنگھوڑے میں ہے یا نہیں؟''

ڈاکٹر سے ملنے کے بعد ہی واپس بھی آگئے۔ کوئی نہ کوئی اہم بات تو ضرور ہوگی۔''

''بہت صبر کرلیا امداد علی۔'' جگا نے بل کھا کر کہا۔ ''اب منہ چھپا کر بیٹھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ کتے زیادہ بھونکنے لگیں تو ان کے گلے میں کمیٹی والے بھی آنکڑا فٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔''

''بس میرے کہنے سے دو دن اور صبر کرلے۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی مل کر ایک اور ایک گیارہ ہوجائیں گے۔''

امداد علی نے رابطہ منقطع کردیا تو جگا بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سراج سے مل کر اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بے چین ہوگیا تھا۔ ذہن کے ایک گوشے میں شیخ حامد کی مناسب گوشمالی کا دھیان بھی کلبلا رہا تھا۔

''تمہارے یار نے کیا خبریں سنائی ہیں استاد......؟'' جگا کے ساتھیوں نے دریافت کیا۔ جواب میں جگا نے مختصر تفصیل دہرائی تو ایک ساتھی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''استاد اگر برا نہ مانو تو ایک مثال میں بھی سنا دوں؟''

''کیا......'' جگا نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔

''جب تک تم کسی کی ماں کے ساتھ یارانہ نہیں گانٹھو گے وہ تمہیں باپ بھی کبھی نہیں بولے گا۔''

جگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی خیریت معلوم کرنے کی دھن اسے بہ دستور بے چین کررہی تھی۔

☠☠☠

دارا اس وقت ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد دفتر جانے کے لیے تیار ہورہا تھا جب اسے میجر عاطف کی کال ریسیو ہوئی۔ کمرے میں دارا کے سوا روشا بھی تھی اس لیے دارا نے چونکے بغیر دوستانہ انداز میں کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''خیریت...... آج صبح ہی صبح کیسے یاد آ گئی؟''

''آئی سی......'' دارا کا جواب سن کر عاطف نے سوال کیا۔ ''کیا روشا بھی کہیں قریب موجود ہے؟''

''ہاں...... وہ شکایت بھی کر رہی تھی کہ تم نے بہت عرصے سے آؤٹنگ کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔'' دارا نے پھر بے تکلفی سے بات بنائی۔

''اوکے۔ تم دفتر پہنچ کر فون کر لینا، تمہارے مطلوبہ شخص کے بارے میں کچھ اہم بات سامنے آئی ہے۔''

''یہ تمہارا اور روشا کا معاملہ ہے۔ ہاں، وہ میرے قریب ہی موجود ہے، میں فون اسی کو دے رہا ہوں۔'' دارا نے روشا کو قریب بلاتے ہوئے کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''عاطف کا فون ہے۔ کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنا لو۔ حالات کے سبب گھٹن ہونے لگی ہے۔''

''اوکے۔'' روشا نے مسکرا کر کہا پھر ریسیور لے کر اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''میں نے سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ ملٹری والے بات کے دھنی ہوتے ہیں لیکن آپ بہت دنوں سے پکنک کے سلسلے میں ٹال مٹول کر رہے ہیں...... جی نہیں، اب یہ ایکسکیوز نہیں چلے گا...... لوگوں کو سوچنے دیں لیکن آپ کو بہرحال حالات سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ فوجی ہونے کے ناتے آپ کو ہمت سے کام لینا چاہیے۔ محاذ جنگ پر بھی بہت سے عزیز ساتھی اچانک بچھڑ جاتے ہیں لیکن جو بچ رہتے ہیں ان کے حوصلے پست ہونے کے بجائے اور بلند ہو جاتے ہیں۔ گھٹن کا احساس بھی جنگ جیتنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے...... فائن...... یہ ہوئی نا بات...... میں دارا سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گی۔''

''کیا کہہ رہا تھا......؟'' دارا نے اپنی بے چینی ٹالتے ہوئے روشا کو پیار سے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ فی الحال وہ روشا کو میجر عاطف سے اپنی ملاقات کا نہیں بتانا چاہتا تھا۔

''عاطف نے میری بات مان لی ہے۔'' روشا نے شوہر کی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''کل ہمیں ڈنر پر بلایا ہے۔ وہیں آؤٹنگ کا پروگرام بھی سیٹ ہو جائے گا۔''

''گڈ...... وہ کبھی تمہاری بات نہیں ٹالتا، کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں......'' دارا نے شوخی سے شروع کیا جانے والا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ روشا کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟''

''ڈونٹ بی جیلس۔'' روشا نے شوہر کو پیار سے دیکھا۔ ''میں جرمن دومن ہوں، ایک دم اوریجنل اور جرمن عورت زندگی میں کبھی اپنے ہسبینڈ سے بے وفائی نہیں کرتی۔''

''آئی نو دیٹ ہنی...... اینڈ پراؤڈ آف یو۔'' دارا نے روشا کے یاقوتی ہونٹ چومے پھر بیگ اٹھا کر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ میجر عاطف کی کال کے سلسلے میں ہی سوچتا رہا...... دفتر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اسی کو موبائل پر کال کیا۔ رابطہ ہونے پر بے چینی سے بولا۔ ''اب سناؤ کیا خبر ہے؟''

''ایک شرط پر...... اب کل کے ڈنر کے اخراجات تمہیں برداشت کرنے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے......'' دارا نے ہامی بھرنے میں دیر نہیں کی۔

''تم نے جس پر شبہے کا اظہار کیا تھا وہ رنگین مزاج ہونے کے علاوہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔'' عاطف نے موڈ بنانے والی اطلاع کو مصلحتاً چھپاتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں اس نے دانا چگنے کے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے ہیں، کل رات بھی وہ ایک پوش علاقے میں کسی کے ساتھ پوری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک قابل غور اطلاع اور بھی ہے۔ جس بنگلے میں اس نے رات گزاری ہے وہاں اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی تین افراد ایک سیاہ رنگ کی پرانی کرولا میں نکلے تھے لیکن انہیں اپنی منزل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟......''

''بنگلے سے روانگی کے تقریباً بیس منٹ بعد وہ ایک ویران علاقے سے گزر رہے تھے جب عقب سے آنے والی ایک بند وین نے قریب آ کر اس پر فائر کھول دیے تھے۔ کرولا قابو سے باہر ہو کر ایک بنگلے کی باؤنڈری وال سے ٹکرا کر الٹی تو اس سے آگ بھڑک اٹھی۔ علاقہ پولیس کو حادثے کی اطلاع شاید اسی بنگلے کے مکینوں نے دی ہوگی، بہرحال کوئی مدد بروقت پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی جل کر تباہ ہو چکی تھی۔ اندر موجود تینوں افراد کوئلہ بن چکے تھے۔ پولیس کو فوری طور پر کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''کیوں؟'' دارا نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''جس وین سے فائرنگ ہوئی تھی وہ تمہارے ایجنٹ کے کسی ساتھی نے تو دیکھی ہوگی؟''

''تم نے ایک عقلمندی کی بات کے ساتھ ہی ایک اہم بات کو نظرانداز بھی کر دیا۔''

''وہ کیا......؟''

''وہ کمانڈوز میرے کہنے پر ون فور کے لیے کام کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں وہ کوئی دردسر پالنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری شکل میں بھی وہ صرف اپنے کمانڈنگ آفیسر کو مطلع کرتے۔''

''تمہارا اندازہ کیا ہے؟'' دارا نے پوچھا۔ ''مرنے والے کون تھے؟ کیا میرے مطلوبہ شخص نے انہیں کسی رقابت کی بنیاد پر راستے سے ہٹایا ہوگا۔''

''آم کھانے سے مطلب رکھو۔'' عاطف نے کہا۔ ''دوسری اطلاع یہ ہے کہ تمہاری ملازمہ کو خود انکل کی سفارش پر اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انچارج نے تحریری طور پر یہی بیان دیا ہے۔''

''گلابو نے کیا تفصیل بیان کی؟''

''میرے کہنے پر جن افسران نے ڈاکٹر سے ملاقات کی انہوں نے گلابو سے ملنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کی گاڑی پر بھی پلاسٹک بم پھینکا گیا تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر بچ گئے۔ حادثے کے بعد موقع واردات پر دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا تھا لیکن کوئی لاش نہیں ملی۔ ممکن ہے مرنے والے کے ساتھی اسے اٹھا لے گئے ہوں۔''

''آئی۔ سی۔'' دارا نے کسمسا کر سوال کیا۔ ''اس حادثے کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟''

''تفتیش بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ ایسے میں ذاتی خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی گلابو سے ملنے جلنے والوں کی نگرانی بھی ضرور کر رہا ہوگا۔'' عاطف نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ جن دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ ہوئی تھی ان میں سے ایک تمہارے مطلوبہ شخص کی ہو۔''

''پھر...... اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

''تم سامنے نہیں آنا چاہتے تو فی الحال صرف دور رہ کر تماشا دیکھتے رہو۔ میرے جن دوستوں کو ذمے داری سونپی ہے وہ انتہائی فرض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ بکنے والے بھی نہیں ہیں۔''

''لیکن ایک پریشانی اور بھی ممکن ہے۔'' دارا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جو دیدہ دلیر جیالے ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ سکتے ہیں وہ انہیں دفتر یا کہیں راستے سے بھی اٹھا کر ہم پر دباؤ ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے۔''

''فارگٹ اٹ...... وہ تمہارے ڈیڈ ہونے کے علاوہ میرے انکل بھی ہیں۔'' عاطف نے بے پروائی سے جواب دیا پھر ڈنر کے اخراجات ادا کرنے کا وعدہ یاد دلا کر رابطہ

منقطع کردیا۔

دارا کے ذہن میں بہت سارے سوالات کلبلا رہے تھے لیکن...... میجر عاطف نے ازخود ان کی وضاحت نہیں کی تھی اس لیے دارا نے اسے کریدنا بھی مناسب نہیں سمجھا، اسے اس بات کا اطمینان ضرور ہوگیا کہ عاطف نے رستم علی آغاخانی کے تحفظ کے خیال کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔

☠☠☠

سراج کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ گولی اس کے بازو کا کچھ گوشت ہی ادھیڑ سکی تھی۔ کچھ معمولی خراشیں اورنگ زیب کو بھی آئی تھیں لیکن وہ رات بھر ایک لمحے کے لیے بھی سراج کے پاس سے نہیں ہٹا تھا۔ سراج کے پراسرار انکار کے باوجود اس کے قریب ہی رہا تھا۔ پولیس سرجن نے ضروری مرہم پٹی کے بعد مشورہ دیا تھا کہ سراج کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کردیا جائے لیکن اورنگ زیب نے کسی وجہ سے وہ رات پولیس اسپتال ہی کے ایک سائڈروم میں گزارنا مناسب سمجھا۔ صبح وہ وجہ سراج کی سمجھ میں بھی آگئی جب ڈی آئی جی کرائمز آغا منظور وہاں سادے لباس ہی میں صبح دس بجے آگئے جبکہ اورنگ زیب نے سرجن کے علاوہ وہاں کے عملے کو بھی سختی سے ہدایت کردی تھی کہ اس حادثے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ سراج سے بھی اس نے یہی گزارش کی تھی کہ وہ حتی الامکان زبان بند ہی رکھے۔

''یہ حادثہ کب اور کہاں ہوا؟'' ڈی آئی جی نے باری باری اورنگ زیب اور سراج کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ایک بلاسٹ ہونے کے علاوہ شدید فائرنگ بھی ہوئی تھی؟''

''آپ کو کس نے اطلاع دی؟'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ملحقہ تھانے کے ایس ایچ او نے کچھ دیر قبل خبر دی ہے لیکن آپ لوگ......''

''مسٹر سراج کل رات میرے گھر پر ڈنر کرنے آئے تھے۔'' اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے انہیں مدعو کیا تھا۔ ڈنر کے بعد میں مسٹر سراج کے ہمراہ اسپتال ایک مریض کی مزاج پرسی کو گیا تھا۔ وہاں سے واپس ہوتے وقت گھات لگائے ہوئے لوگوں نے ہم دونوں کو بیک وقت ٹھکانے لگانے کی کوشش تھی لیکن...... کامیاب نہیں ہوسکے۔ فائرنگ کا تبادلہ میرے پرائیویٹ محافظوں اور مجرموں کے درمیان ہوا تھا۔ اگر میں نے حسب ضرورت اس کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید کسی کو سکون میسر آتا۔''

''آپ کا اشارہ......؟''

''اسی باسٹرڈ کی طرف ہے جو اب کم ازکم میرے لیے ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔'' اس بار اورنگ زیب نے کھل کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

''اوہ......'' آغا منظور نے ہونٹ چباتے ہوئے کچھ توقف سے کہا۔ ''اگر آپ دونوں کو یقین ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔''

''شکریہ سر......''

''میرا خیال ہے کہ مسٹر سراج کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کردیا جائے۔ کم ازکم کچھ دن آرام کرنا ضروری ہے۔'' آغا منظور نے کہا۔

''میں نے اسپتال کا آئیڈیا ڈراپ کردیا ہے۔'' اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ''سراج کو ان ہی کے گھر پر شفٹ کیا جائے گا جہاں ان کی نگرانی کی ذمّے داری بھی میں اپنے مخصوص لوگوں کو سونپوں گا۔''

''گڈ آئیڈیا......'' آغا منظور نے تائید کی پھر اس نے گزشتہ رات جلنے والی کرولا اور ان تین لاشوں کی تفصیل دہرا دی جو ناقابل شناخت ہوچکی تھیں...... فی الحال انہیں سرد خانے میں رکھوادیا گیا تھا۔

''سر......'' سراج نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''کیا ابھی تک کہیں کسی نے گمشدگی کی اطلاع بھی درج نہیں کرائی؟''

''میں نے ہدایت جاری کردی ہے، جہاں بھی اطلاع درج ہوئی مجھے فوری باخبر کیا جائے گا۔''

''گاڑی کی اونرشپ کسی نہ کسی کے نام تو ضرور ہوگی؟'' اورنگ زیب نے کہا۔

''جو نمبر پلیٹ ملی ہے وہ جعلی ثابت ہوئی ہے...... بہرحال، کچھ دوسرے ٹیکنیکل اندراجات سے کوشش کی جارہی ہے۔''

ڈی آئی جی نے جاتے جاتے بھی اورنگ زیب اور سراج کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔ اس وقت اس کے کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آغا منظور کے جانے کے دو گھنٹے بعد اورنگ زیب نے اپنے ذرائع سے ایک پرائیویٹ ایمبولینس کے ذریعے سراج کو اس کے گھر منتقل کرادیا۔ الماس نے اورنگ زیب کا شکریہ ادا کیا تو اس نے عجیب انداز میں مگر بڑی اپنایت سے کہا تھا۔

''ابھی نہیں مسز سراج...... بادل پوری طرح چھٹ جائیں تو پھر صرف شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو باقاعدہ لنگر تقسیم کرنا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد الماس کسی کام سے اندر گئی تو اورنگ زیب نے کمرے کو اندر سے بولٹ کرلیا۔ سراج کے قریب ایک ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر سراج...... آج میں آپ سے کھل کر ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتادوں کہ آپ نے لیاقت حسین کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ پراسرار...... واحد حاضر جمع غائب ثابت ہورہا ہے۔''

''کوئی خاص بات......؟''

''گاڑی کو بلاسٹ ہونے سے قبل اچانک اس نے خطرناک انداز میں اسٹیئرنگ کاٹا تھا اور فائرنگ کا تبادلہ شروع ہونے کے بعد وہ آپ کے روکنے کے باوجود باہر نکل گیا تھا لیکن اب...... وہ ان دونوں باتوں کو ماننے پر مطلق آمادہ نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے جو کچھ ہوا اس میں خدا کی مہربانی شامل تھی۔''

''اس بات کو میں پہلے بھی کئی موقعوں پر آزما چکا ہوں...... سب کچھ کرتے اور خطروں میں بلاسوچے سمجھے کود پڑنے کے باوجود اس کو بیتی ہوئی ایسی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔''

''اس سے پیشتر ایسے جو واقعات ہوچکے ہیں کیا آپ مجھے اس کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟'' اورنگ زیب نے خاص انداز میں سراج کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو سراج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ کھل کر زبان تک نہیں لانا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کی تو بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

''مسٹر نہیں...... صرف سراج...... اگر تم مجھے اپنا دوست ہمدرد یا بھائی سمجھتے ہو تو آج کچھ چھپانے کی غلطی نہ کرو، پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے، اب سوائے ٹٹ فارٹیٹ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہیں کوئی تکلف ہے تو میں مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن...... میں نے اب ایک آخری فیصلہ کرلیا ہے، اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

سراج نے اورنگ زیب کا وہ رنگ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی باتوں میں آہنی چٹانوں کی سختی موجود تھی۔ وہ شیخ حامد کی خصلت اور اس کے اثرورسوخ سے بھی واقف تھا۔ کل رات جو ہوسکتا تھا وہی اس بات کی دلیل تھی کہ دشمن پوری طرح گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ممکن ہے اس کا نشانہ صرف اورنگ زیب ہوتا مگر...... اورنگ زیب کے نہ ہونے کے بعد بھی بگ باس کسی قیمت پر رنگ ڈھنگ نہیں بدل سکتا تھا۔ سراج اکیلا ہوجانے کے بعد پھر بے بس ہوجاتا۔ صرف ایک رہ جاتا۔ ایک اور ایک گیارہ نہیں ہوسکتا تھا۔

''اوکے...... تم اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔'' اورنگ زیب نے سراج کی خاموشی محسوس کرکے بے پروائی سے کہا۔ ''میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔''

''سر...... کچھ باتیں ایسی ہیں جو......''

''سر نہیں......'' اورنگ زیب نے ٹوکا۔ ''جو بھی کہنا ہے دوست سمجھ کر کہو، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔''

سراج نے اورنگ زیب کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے لب و لہجے کی گرمی اور سچائی کو محسوس کیا تو چپ نہ رہ سکا۔ ایک ہی سانس میں اس نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دیں۔ جو کچھ اس کے علم میں تھا وہ تفصیل سے بیان کرتا چلا گیا۔ اورنگ زیب خاموش بیٹھا پوری توجہ سے ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔ میڈم روبی اور جگا کی باتیں اس حد تک نئی تھیں کہ اس نے اتنی گہرائی تک ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سراج چپ ہوا تو اورنگ زیب کچھ دیر غوروفکر میں ڈوبا رہا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتبار کرلیا۔ میں کبھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ جو باتیں اس وقت میرے علم میں آئی ہیں ان میں سے جگا میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ میڈم روبی نے اسے تحفظ دینے والی بات کچھ غوروفکر کے بعد ہی کہی ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے لیکن قانون کی نظروں میں وہ بہرحال ایک سزا یافتہ مجرم ہے۔''

''جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن یہ بھی نہ بھولو کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ آکٹوپس جن لوگوں کو مہروں کی طرح استعمال کررہا ہے وہ بھی سب قانون کو کسی نہ کسی صورت میں مطلوب ہیں۔''

''میری ذاتی اطلاع یہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے جگا بھی کہیں روپوش ہے۔'' سراج نے دبی زبان میں کہا۔

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے سوچتا رہا پھر پہلو بدل کر خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے گیسٹ ہاؤس میں ملنے والی غیرملکی کی لاش کو دیکھنے کے بعد ایک سوال کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی تعلق اسپورٹس کار میں مرنے والے سے ہوسکتا ہے؟ میڈم روبی نے بھی ان ہی خطوط پر کوئی نتیجہ اخذ کیا ہوگا۔ جگا کی روپوشی بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ ہاشم کی موت میں بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا اور...... ون منٹ۔'' اورنگ زیب نے بولتے بولتے چونک کر سراج کو دیکھا۔ ''کیا تمہیں اس بات پر شبہ

نہیں ہے کہ آکٹوپس کے مکان پر ہونے والے حملے میں میڈم روبی کا ہاتھ بھی ہوسکتا ہے؟''

''میڈم نے کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔'' سراج نے دبی زبان میں جواب دیا۔

''اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اتنی ہی دانش مندی کا ثبوت دیتا جتنا میڈم نے دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہاشم بھی میڈم ہی کا کوئی نمائندہ ہو۔''

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''پہلے ایک وعدہ کرو۔'' اورنگ زیب نے اٹھ کر سراج کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اس وقت جو باتیں کی ہیں اس کی بھنک بھی ڈی آئی جی کرائمز کو نہیں ملنی چاہیے۔ اس نے ہمارے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا ہے لیکن اسے یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کی ترقی میں آکٹوپس کی سفارش کو خاص دخل تھا۔''

''آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی درخواست کرتا۔'' سراج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''کل رات جلنے والی سیاہ کرولا اور اس میں سے برآمد ہونے والی تین ناقابل شناخت لاشوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟......'' اورنگ زیب کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''آج کل اس قسم کی وارداتیں آئے دن ہو رہی ہیں...... مقصد یہی ہوتا ہے کہ مرنے والوں کی فوری شناخت نہ ہوسکے، جب تک پولیس کوئی آخری نتیجہ اخذ کرے مجرم اس کی دسترس سے دور نکل جائے۔''

اورنگ زیب کچھ جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر سگنل ملے، اس نے کال ریسیور کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔ جو نمبر اسکرین پر ابھرا وہ یقیناً اس کے لیے اہم ہوگا۔ ''کیا خبر ہے......؟'' اس نے موبائل آن کرکے سنجیدگی سے سوال کیا، کچھ دیر دوسری جانب سے دیے جانے والے جواب کو پوری توجہ سے سنتا رہا پھر پرجوش انداز میں بولا۔ ''میں اسی پرانے ریفرنس پر اپنے ایک اعتماد کے آدمی کو بھیجتا ہوں، وہ تم سے مطلوبہ چیز پک اپ کرلے گا...... گڈ...... اس اہم ثبوت کے بعد ہمارے لیے کچھ مزید آسانیاں ہوجائیں گی...... ریسٹ ایشور، سب کچھ میری ذات تک محدود رہے گا۔ ہاں، ہاں سمجھ رہا ہوں...... ڈیمٹ، تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری دوستی کی خاطر میں نے بھی وہی کیا جو تم چاہتے تھے...... یس...... فائن...... میں تمہیں دو گھنٹے بعد تفصیل سے بتاؤں گا۔ ڈونٹ وری مائی ڈارلنگ......'' گفتگو ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب نے موبائل آف کیا تو اس کی آنکھوں میں بالکل ایسی ہی چمک ابھری تھی جیسی کسی شیر یا چیتے کی آنکھ میں اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے ابھرتی ہے۔ سراج نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''کس کا فون تھا......؟''

''اسی پرانے دوست کا جس کے کہنے پر ہم کل رات اسپتال گئے تھے۔''

''لیکن اس وقت تو آپ نے......''

''جو بھی کہا تھا وہ رازداری کا تقاضا تھا جو اب باقی نہیں رہا۔'' اورنگ زیب نے سراج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر اس نے میجر عاطف کا نام ظاہر کیے بغیر گلابو کے زخمی ہونے اور دارا رستم علی کے جن شبہات کی کہانی سنائی وہ بھی سراج کے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔

''آپ کا شبہ کس پر ہے......؟'' سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔

''کل کیا ثابت ہوگا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن فی الحال میرے شبہات کے تمام پہلو اور زاویے ایک ہی نام پر جاکر ختم ہوجاتے ہیں...... آکٹوپس۔''

آکٹوپس کہتے وقت اورنگ کی نگاہوں میں جو نفرت انگیز چمک ابھری، وہ بھی بے حد خوفناک تھی۔

''تم ریسٹ کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ شام تک دوبارہ واپس آؤں گا اور ہاں...... اپنے پراسرار لیاقت حسین کو بلا کر اس سے مل لو، وہ کل رات سے تمہارے آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ کسی سچے جاں نثار کی طرح۔'' اورنگ زیب نے ایک بار پھر سراج کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا پھر اسے وش کرتا ہوا دروازہ کھول کر چلا گیا۔

اورنگ زیب کے جانے کے بعد الماس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی جھلک رہی تھی۔ سراج نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ''بری بات ہے...... بہادر بچے اور بچیاں رویا نہیں کرتے۔''

''آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔'' اس نے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ ''آج آپ کے ایس پی صاحب نے جاتے جاتے جو حرکت کی اس سے میری

آنکھیں چھلک اٹھیں۔''

''کیا ہوا......؟''

''آج انہوں نے جاتے وقت کسی بزرگ کی طرف میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ اب آپ کا ایک بڑا بھائی اور زندہ ہوگیا ہے اس لیے کسی بات کی فکر نہ کریں۔''

''ہاں...... آج وہ مجھے بھی مسٹر سراج کے بجائے صرف سراج کہہ کر بڑی محبت سے بات کررہے تھے۔''

''اورنگ زیب صاحب کی بات اور ہے لیکن......'' اس نے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔ ''میرے علاوہ کوئی دوسری عورت اگر آپ کے خاطر زیادہ بے چینی کا اظہار کرے تو وہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ میں اسپتال نہیں گیا ورنہ وہاں پولیس افسروں کو خوش رکھنے کی خاطر عام طور سے کسی خوبصورت نرس ہی تعینات کی جاتی ہے۔''

''میں نرس کی نہیں آپ کی روبی صاحبہ کی بات کررہی ہوں جو آپ کے گھر آنے سے اب تک تین بار آپ سے بات کرنے میں بے چینی کا اظہار کرچکی ہیں۔'' الماس نے مسکرا کر کہا۔ پھر شوخی سے پوچھا۔ ''کیا مجھے دکھانے کی خاطر یہ خفگی والا ڈراما تیار کیا گیا ہے یا آپ کا روبی سے......''

''اسے میری ایک کھری بات بری لگی ہے۔'' سراج نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے اپنی سرکاری حیثیت کا احساس دلانے کے بعد کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی جس کا اس نے غلط مطلب نکال لیا۔ بات اسی کے بھلے کی تھی لیکن......''

اسی وقت الماس کا فون پھر گنگنایا تو اس نے سراج کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ان ہی چہیتی کا فون ہے۔'' پھر موبائل آن کرکے سنجیدگی سے بولی۔ ''آئی ایم سوری روبی لیکن ڈاکٹروں نے سراج کو ایک ہفتے مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا ہے۔ بات چیت کرنے سے بھی منع کیا ہے۔''

''انہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟'' دوسری طرف سے میڈم نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ پولیس سرجن نے گولی لگنے کے بعد خدشے کا اظہار تو نہیں کیا؟...... گھر آنے کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ صورت حال کا علم تو ضرور ہوا ہوگا؟''

''ابھی تک ایس پی اورنگ زیب سختی سے اندر سے کمرا بند کیے بیٹھے ہیں۔ میں بھی اندر نہیں گئی۔'' الماس نے شرارتاً سنجیدگی برقرار رکھی۔ ''میں بھی دعا کررہی ہوں۔ آپ سے بھی یہی درخواست کروں گی۔'' الماس نے جملہ مکمل کرکے موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں آپ کے گھر آکر انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔'' روبی کی آواز ابھری۔ ''میں صرف دعا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ان لوگوں کے خلاف کرسکتی ہوں جنہوں نے چھپ کر ایک ایماندار افسر کو ہدف بنانے کی بزدلانہ حرکت کی ہے لیکن پلیز...... یہ بات آپ مسٹر سراج سے نہ کہیے گا ورنہ وہ......''

''اب بھی آفیشل حیثیت میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔'' سراج نے سرسراتے لہجے میں جملہ مکمل کردیا۔

''اوہ......'' دوسری جانب سے سراج کی آواز سن کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ''الماس کی اس وقت کی شرارت تو میرے ذمے ادھار رہی بہرحال، آپ کی آواز سن کر خوشی ہوئی۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''

''خدا کا شکر ہے کہ ڈیتھ وارنٹ ایشو ہوتے ہوتے رہ گیا، معمولی زخم آیا ہے، دو چار روز لوٹ پوٹ کر دوبارہ کھڑا ہوجاؤں گا۔''

''کیا میں عیادت کے لیے حاضر ہونے کی درخواست کرسکتی ہوں؟'' بڑی انکساری سے پوچھا گیا۔

''فی الحال مناسب نہیں ہوگا۔'' سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''کچھ اہم واقعات اور بھی رونما ہوئے ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں لیکن دشمن اس وقت پوری طرح محتاط ہوگا۔ آپ کا براہ راست مجھ سے ملنا شاید اسے گوارا ابھی نہ ہو۔ یہ بات بھی آپ سے سرکاری حیثیت میں نہیں بلکہ الماس کی بہن سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔''

''شکریہ سراج صاحب، میں اس نئے رشتے میں زیادہ فائدہ میں رہوں گی۔'' میڈم نے شوخی سے کہا۔ ''اب آپ ذرا موبائل الماس کو دے دیں تاکہ میں اس کی خیریت بھی دریافت کرلوں۔''

سراج نے موبائل الماس کی طرف بڑھا دیا جو بڑی دیر تک اس نئے رشتے پر کھل کر ہنستی بولتی رہی۔ سراج کے ذہن میں ایک بار پھر ایس پی اورنگ زیب کے کچھ آخری فیصلے ابھرنے لگے جو قانونی اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ جب تک الماس فون پر بات کرتی رہی اس کا ذہن ان ہی خطوط پر سوچتا رہا جس پر اورنگ زیب نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ الماس فارغ ہوئی تو سراج نے لیاقت حسین کو اندر بلوالیا جس کے چہرے کی اداسی اور آنکھوں کی ویرانی اس بات کی غماز تھی کہ وہ سراج کے لیے کس قدر پریشان تھا۔

''پریشان مت ہو لیاقت حسین۔'' سراج نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''تمہاری ہی دعا کا نتیجہ ہے کہ گولی زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئی ورنہ......''

''ایسی بات بھی زبان سے نہ نکالیے صاحب۔'' لیاقت حسین نے رندھی ہوئی آواز میں تیزی سے کہا۔ ''خدا ان کو غارت کرے جو آپ جیسے نیک لوگوں کے دشمن بن گئے ہیں۔''

''تمہاری بروقت ذہانت کام آگئی۔ اگر تم نے گاڑی کو فوری طور پر نہ موڑا ہوتا تو شاید ہم پلاسٹک بم کی زد میں آجاتے۔''

لیاقت حسین نے جواب میں کچھ نہیں کہا، اس کے چہرے پر ابھرنے والا اضطراب بتا رہا تھا کہ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں جس کا ذکر سراج سے پیشتر اورنگ زیب بھی کر چکا تھا۔ سراج نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے لیاقت حسین، تم کس سوچ میں گم ہوگئے؟''

''صاحب......وہ آپ کے ایس پی صاحب......'' اس نے رک رک کر اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ ''وہ بھی کچھ ایسی ہی باتیں بتا رہے تھے جو مجھے یاد نہیں۔ خدا جانے مجھے کیا بیماری ہوگئی ہے؟ کیا روگ ہے جو میری جان سے چمٹ گیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تم کو فرحین سے بہت زیادہ پیار ہے۔'' الماس نے لیاقت حسین کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''تم ایسا کرو، جب تک سراج گھر پر نہیں تم دو چار روز کے لیے فرحین کے پاس چلے جاؤ اس کے بعد پھر آجانا۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بیگم صاحب؟ میں اپنے محسن کو ایسی حالت میں ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

''کہو تو میں بیگم عثمان سے بات کر کے فرحین کو یہاں بلوا لوں۔'' الماس نے نئی پیشکش کی۔

''میں سمجھ رہا ہوں بیگم صاحب کہ آپ بھی مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن میں خدا کو گواہ بنا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں...ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟'' اس نے آخری جملہ کہتے وقت سراج کی طرف غور سے دیکھا۔

''میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ اوپر والا تمہاری کسی نیکی کی وجہ سے تمہیں نواز رہا ہے۔ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ جو بات تمہیں یاد نہیں رہتی اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔'' سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آئندہ تم ایسی کسی بات پر غور بھی نہ کرنا۔ اسی میں بہتری ہے۔''

لیاقت حسین نے سر کی جنبش سے اقرار کیا لیکن ذہنی طور پر وہ الجھا الجھا ہی رہا۔ الماس اور سراج دونوں خاصی دیر تک اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ لیاقت حسین کے جانے کے بعد الماس نے سراج سے کہا۔

''آپ کا کیا مشورہ ہے...... میں راحیلہ سے کہہ کر فرحین کو دو تین روز کے لیے اپنے پاس نہ بلا لوں؟''

''اس سے بات نہیں بنے گی۔ ہمیں لیاقت حسین کے معاملے میں اب درگزر سے کام لینا ہوگا۔'' سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ ''میں شام کو اورنگ زیب صاحب سے یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر وہ بھی زیادہ کرید نہ کریں۔''

کچھ دیر بعد الماس سراج کو آرام کا مشورہ دے کر گھریلو کام میں مصروف ہوگئی لیکن سراج کا ذہن بدستور لیاقت حسین کے بارے میں الجھا رہا۔ خاص طور پر وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ دفتر سے دس پندرہ منٹ میں واپسی کا کہہ کر لیاقت حسین ڈیڑھ پونے دو گھنٹے تک کہاں غائب رہا تھا؟ واپسی پر بھی اس نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہا مگر...... دفتر کی گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد خود وہ بھی حیرت کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ عرصہ اس نے کہاں گزارا؟ یہ سوال لیاقت حسین سے زیادہ سراج کے لیے اہم ترین تھا۔

☠☠☠

دو تین راتوں کا خمار اس وقت بھی شیخ حامد پر ایک نشہ سا طاری کر رہا تھا۔ کنول کے ساتھ وہ خوب صورت اور حسین لمحے گزار چکا تھا جو بڑے یادگار تھے۔ وہ سیل بند بوتل کی ایسی چھلکتی شراب تھی جس کا تیز نشہ شیخ حامد کو ڈھلتی عمر میں بھی جوانی کی یاد دلا رہا تھا۔ اگر حالات اور گردوپیش کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کے قرب کو مہینوں ایک پل کے لیے بھی خود سے دور نہ رکھتا لیکن بیوی کی خودکشی کے بعد وہ اپنی چھت کے نیچے کنول کو بحیثیت بیوی بھی جگہ دیتا، تو اس کے حریف اور قانون اس کا جینا حرام کر دیتے۔ وہ موجودہ حالات میں بھی خوش تھا۔ کنول سے اس نے جو سودا کیا تھا وہ زیادہ مہنگا نہ تھا۔ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے رہا تھا کہ جو لطف کچی کیری کو چوری چھپے، درخت سے توڑ کر کھانے میں ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کہاں؟ وہ اس کا خریدا ہوا کھرا سودا تھی پھر بھی وہ اسے چوری چھپے کھانے پر مجبور تھا۔

عام طور سے وہ ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جانے کا عادی تھا لیکن اس وقت گیارہ بجے بھی اپنی خواب گاہ میں بیٹھا کنول کے پیچ وخم کے خیالی تصور سے دل بہلا رہا تھا جب اس کے مخصوص موبائل نے وائبریٹ کیا۔ اس نے روشن اسکرین پر نظر ڈالی تو کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ نمبر ٹو کا فون تھا جسے شیخ حامد نے وقتی طور پر بلیک ٹائیگر کی ذمے داریاں بھی سونپ رکھی تھیں۔

''کیسے فون کیا؟'' اس نے موبائل آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔

''کچھ اہم خبریں دینی تھیں۔''

''کہو......''

''مطلوبہ گاڑی کو مع لوڈ سفر پر روانہ کر دیا گیا ہے۔ ابھی تک کسی نے نہ اپنا سامان کلیم کیا ہے نہ گاڑی کے بارے میں کوئی تفتیش نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے۔'' جواب بڑے اعتماد سے دیا گیا۔ ''آئندہ بھی نتیجہ صفر ہی رہے گا، میں نے اس کی ساری شناختیں پہلے ہی کھرچ کر مٹا دی تھیں۔''

''رینٹ اے کار والوں کو کس طرح مطمئن کیا؟''

''ان کو واجبی قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ وہ زبان کھولنے کی غلطی کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔''

''گڈ......'' شیخ حامد نے تعریف کی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ اسپتال کے قریب ہونے والے بلاسٹ میں دو آدمی بھی ضائع ہوگئے ہیں۔''

''اپنے ہی بندے تھے۔'' فوری جواب ملا۔ ''ہم نے لاشیں اسی وقت اٹھالی تھیں جن کو رات ہی دفنا دیا گیا۔''

''فائرنگ کی حماقت کیوں کی گئی تھی؟ میں نے صرف ایک وارننگ دینے کو کہا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ نئے ایس پی کے سادہ لباس والے تھے۔ ابتدا ان ہی کی طرف سے کی گئی۔ ایک آدمی کام آگیا تو ہمیں بھی جوابی کارروائی کرنی پڑی، ایسا نہ کرتے تو زیادہ نقصان بھی ہوسکتا تھا۔''

''تمہاری کارکردگی ابھی تک اطمینان بخش ہے لیکن جگا کا کیا بنا......؟''

''اس کی تلاش جاری ہے۔ آخری ٹھکانا ہم نے بروقت اڑا دیا تھا لیکن وہ نہ جانے اپنے آدمیوں سمیت......''

''یہ کہانی پہلے بھی سن چکا ہوں۔'' اسے خشک لہجے میں وارننگ دی گئی۔ ''جگا کی روپوشی ہمارے لیے اہم ہے اسے کسی طرح بھی ٹریس کرو۔''

''رائٹ سر......''

''سراج کو نئے باسٹرڈ نے اسپتال کے بجائے گھر پہنچا دیا ہے۔'' شیخ حامد ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اسی کی وجہ سے سراج بھی پر نکالنے کی پوزیشن میں آگیا ہے۔''

''آپ صرف اشارہ کر دیں۔ ہم پورا نشیمن پھونک کر راکھ کر دیں گے۔''

''حماقت کی باتیں مجھے پسند نہیں...... دشمن کی دکھتی رگ اگر قابو میں آجائے تو پھر وہ اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک کوشش ہوچکی تھی جسے سراج نے بروقت ناکام بنا دیا ورنہ...... اس وقت وہ میرے قدموں میں پڑا ہوتا۔''

''اب کیا حکم ہے......؟''

''اسی قیمتی ہیرے (الماس) کو دوبارہ قابو کرنے کا پلان بناؤ لیکن میں اب دوسری بار ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔''

''رائٹ باس......کام ہوجائے گا۔''

''نہ ہو تو تم بھی مجھے اطلاع دینے کے بجائے وہی راستہ اختیار کرنا جو گیسٹ ہاؤس میں مرنے والے نے اختیار کیا تھا۔ انتہائی سرد لہجے میں جملہ مکمل کرنے کے بعد شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا۔ کچھ دیر وہ کسی خیال میں گم رہا پھر اس نے سراج کی خیریت دریافت کرنے کا ارادہ کر کے موبائل دوبارہ آن کر لیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں کسی کوڑیالے سانپ ہی کی طرح چمک رہی تھیں۔

☠☠☠

کالے رنگ کی وین اس عمارت سے تقریباً پانچ گز دور جا کر روک دی گئی جس میں افضل خان کا اپارٹمنٹ تھا، وین سے اترنے والے دونوں افراد خوش لباس تھے، صورت شکل سے بھی وہ مہذب ہی نظر آرہے تھے لیکن مذکورہ بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ایک مسلح گارڈ نکل کر ان کے راستے میں حائل ہوگیا۔

''کہاں جانا ہے جناب......؟'' اس نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

''کیا مطلب......؟'' ایک نوجوان نے گارڈ سے وضاحت طلب نظروں سے کہا۔ ''کیا اس عمارت میں بغیر اجازت داخل ہونا بھی منع ہے؟''

''پہلے نہیں تھا سر، لیکن اب تمام اپارٹمنٹ کے مکینوں کا یہی حکم ہے کہ کسی بھی نئے آنے والوں کو بغیر معلومات کیے لفٹ یا سیڑھیوں تک نہ جانے دیا جائے...... میں ان کا ملازم ہوں صاحب اس لیے اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔''

''گڈ......'' دوسرے نوجوان نے گارڈ کی فرض شناسی کو

سراہا۔ ''ہمیں افضل خان سے ملنا ہے جو آج ہی دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں آگئے ہیں۔ شاید ان کے ساتھ جو حادثہ گزر چکا تھا اسی کی بنیاد پر تمہاری خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے سر......'' گارڈ نے کہا۔ ''آپ اپنا نام بتا دیں، میں انٹرکام کے ذریعے ان سے معلوم کیے لیتا ہوں۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم خود انٹرکام پر اپنے دوست سے بات کرلیں۔''

''تشریف لائیں صاحب......'' گارڈ انہیں لفٹ کے قریب بنے ایک مختصر کمرے میں لے گیا جہاں سے عمارت کے تمام اپارٹمنٹ والوں سے گفتگو کی جاسکتی تھی۔ یہی اس کی غلطی بھی تھی۔ وہ آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ پھر اس سے پیشتر کہ گارڈ انٹرکام پر رابطہ قائم کرتا پشت پر موجود نوجوان نے نہایت مہارت سے جیب میں رکھا ہوا رومال نکال کر گارڈ کے منہ اور ناک پر جما دیا۔ رومال میں لگی مہک خاصی زود اثر تھی، گارڈ نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن خود کو نوجوان کی آہنی گرفت سے آزاد نہ کرا سکا۔ اسے بے ہوش ہونے میں بہ مشکل تیس سیکنڈ لگے تھے۔ دوسرے نوجوان نے باہر نکل کر ادھر ادھر جھانکا پھر دونوں نے مل کر گارڈ کو اس کی کرسی تک لے جا کر اس طرح ٹکا دیا کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر دونوں لفٹ میں داخل ہوئے پھر مطلوبہ منزل کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ کے حرکت میں آتے ہی ایک نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمیں حتی الامکان دنگا فساد سے پرہیز کرنا ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

لفٹ کے رکنے اور خودکار دروازے کے کھلنے کے بعد وہ اس راہداری میں آگئے جس میں خوبصورت کارپٹ ڈلا ہوا تھا، ہر دو اپارٹمنٹ کے درمیان پیتل کے جگمگاتے گملوں میں منی پلانٹ نظر آرہے تھے۔ دونوں خاموشی سے قدم اٹھاتے افضل خان کے فلیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے، ایک کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں رینگ گئے، دوسرے نے جیب سے ایک تار کا ٹکڑا نکال کر چابی کے سوراخ میں ڈالا، پل بھر میں کلک کی آواز سنائی دی، دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ ایک نے جیب سے جرمن ساخت کا آٹومیٹک پستول نکال کر افضل خان اور شبنم پر تان لیا جو سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے انہیں بھی ششدر کر دیا تھا اور اب وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دونوں نوجوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ شبنم نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی سامنے میز پر کافی کے دو مگ نظر آرہے تھے۔

''کون ہو تم......؟'' افضل خان نے دونوں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''اس وقت تک دوست ہی سمجھو جب تک تم کوئی حماقت کا ثبوت نہیں پیش کرو گے۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' شبنم نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''پلیز میڈم......'' پستول والے نے شبنم کو وارننگ دی۔ ''اپنا خوب صورت ہاتھ جیب سے دور ہی رکھیں، ہم کوئی رسک لینے کے عادی نہیں ہیں۔''

شبنم کا ہاتھ رک گیا، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ موبائل آن کرنے کی کوشش کی تھی جس کی آوازیں غالباً کہیں دور بھی سنی جاتی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ آگئے ہو؟'' افضل خان نے بے جگری سے کہا۔

''یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ تم اپنی چونچ بند ہی رکھو ورنہ بلاوجہ لپیٹے میں آجاؤ گے۔'' دوسرے نے افضل خان کو وارننگ دی۔ ''پہلے ہی تم ایک لمبی سزا بھگت چکے ہو۔''

''تم......'' شبنم کسمسانے لگی۔ ''ہم سے کیا چاہتے ہو؟......ہم......آج ہی اس اپارٹمنٹ میں آئے ہیں۔''

''معلوم ہے......'' پستول والے نے مطلب کی بات کی۔ ''تمہیں اب خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔ انکار کی صورت میں ہم دوسرا راستہ بھی اختیار کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔''

''ون منٹ......'' افضل خان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ باہر ہمارے بھی کچھ آدمی ہوسکتے ہیں۔''

''وقت مت ضائع کرو۔'' پستول والے نے بہ دستور شبنم کو گھورتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ہم تمہیں صرف دو منٹ اور دے سکتے ہیں۔''

شبنم ہونٹ چباتے ہوئے صوفے سے اٹھی، اسی لمحے افضل خان نے جو اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا، نہایت پھرتی سے دوسرے نوجوان پر چھلانگ لگا دی اور اسے اپنی جھونک میں رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا، پستول والے نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، وہ بہ دستور شبنم پر نظر جمائے کھڑا تھا۔

دوسرا نوجوان جو افضل خان کے اچانک حملے سے وقتی طور پر لڑکھڑا گیا تھا اچانک ایکشن میں آگیا۔ اس نے افضل خان کو زور لگا کر جھکائی دی پھر تیزی سے مارشل آرٹ کا

مظاہرہ کرتے ہوئے فلائنگ کک لگائی تو افضل خان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، اس کے ہونٹ سے خون کی دھار نکلی تو وہ بھی وحشی بن گیا۔ ایک بار پھر اس نے جوابی حملہ کیا پھر دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جوش میں زور آزمائی کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے، افضل خان نوجوان کے اوپر تھا وہ ریوالور والے کی پروا کیے بغیر اپنے مقابل کے ساتھ موت اور زندگی کی بازی کھیلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے نوجوان کے فرش پر گرتے ہی تابڑتوڑ اس کے چہرے پر دو چار پنچ مارے پھر اس کی گردن پر ہاتھ کا شکنجہ لگا کر پوری قوت صرف کرنے لگا۔

شبنم پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ پستول والے نے افضل خان اور اپنے دوسرے ساتھی کے درمیان آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ایک منٹ دس سیکنڈ گزر چکے ہیں میڈم۔'' اس نے شبنم کو مطلع کیا۔ ''تمہارے پاس فیصلہ کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تمہارا ساتھی......''

''اس کی فکر مت کرو......'' وہ شبنم کو لاحق پریشانی کو ٹالتے ہوئے بہ دستور سفاک لہجے میں غرایا۔ ''ہم ون ٹو ون کے اصول کے قائل ہیں۔ ون بائی ٹو کا مظاہرہ نامردوں کا شیوہ ہے۔ تم اپنی فکر کرو......''

شبنم نے بے بسی سے افضل خان کی طرف دیکھا، اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید آنے والوں کی خوداعتمادی افضل خان کے ہاتھوں قائم نہیں رہ سکے گی لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ حیرت انگیز ہی تھا۔ دوسرا نوجوان جو افضل کے نیچے دبا ہوا تھا اس نے اپنے گھٹنے جوڑ کر دوبارہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے افضل خان کی پیٹھ پر ضرب لگائی تو وہ قلابازی کھاتا ہوا دوسری جانب گرا۔ اس کے بعد دوسرا نوجوان ربر کی گیند کی طرح حیرت انگیز پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے اپنے بوٹ کی ٹھوکر افضل خان کے چہرے پر ماری تو افضل خان کے منہ سے گاڑھا گاڑھا خون ابلنے لگا۔ پے در پے تین چار ٹھوکروں نے افضل خان کو دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر کر دیا، شبنم کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

''اب تمہارا کیا فیصلہ ہے......جو وقت دیا گیا تھا وہ بھی گزر چکا۔'' ریوالور والے نے شبنم کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تت......تت......تم نقصان میں رہو گے۔'' اس نے ایک آخری کوشش کی۔ ''ہمارے ساتھی بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔''

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ جو چوہے کے بل میں چھپے بیٹھے ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں۔''

ریوالور والے نے دوسرا قدم بڑھایا تو دوسرا نوجوان اس کے اور شبنم کے درمیان آگیا۔ اس نے شبنم کے جسمانی نشیب و فراز پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

''تم نے اس خوبصورت بوجھ کو اٹھانے کی ذمے داری مجھے سونپی تھی۔''

''مم......مجھ......مجھے ہاتھ مت لگانا ورنہ بڑے نقصان میں رہو گے۔'' شبنم نے بوکھلا کر کہا۔

''ہاتھ نہیں خوب صورت فاختہ......میں تمہیں گلے لگا کر لے جاؤں گا۔''

شبنم نے وحشت زدہ انداز میں بچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی، دوسرے نوجوان نے لپک کر دونوں ہاتھ اس کی کنپٹیوں پر جمائے پھر کسی ایسی رگ کو مسلا کہ وہ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے گرتے بوجھ کو سنبھالا پھر اس حسین بوجھ کو کاندھے پر ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دوسرے نوجوان نے پستول واپس جیب میں ڈال لیا۔

واپسی کے وقت دونوں ہی پرسکون تھے، شبنم کو ساتھ لے جانے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے ایمرجنسی کی حالت میں کسی قریبی اسپتال میں طبی امداد کے لیے لے جا رہے ہوں۔ وین تک پہنچنے کے دوران انہیں کسی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔

وہ کتنی دیر بے ہوشی سے دوچار رہی اسے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہوش آنے پر اس نے خود کو ایک نرم و گرم بستر پر پڑا پایا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو یہ تصور بھی اس کے وجود کو ڈسنے کے لیے کافی تھا وہ رات بھر کسی دوسرے کی دسترس میں گزار چکی ہے۔ اس نے اردگرد نظر ڈالی۔ وہ ایک مختصر کمرا تھا جہاں ایک بیڈ، دو ایزی چیئر اور ایک میز کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہیں تھا، بستر سے اتر کر کمرے کے واحد دروازے کو آزمایا جو حسب توقع باہر سے بند تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چارپائی چار کا باتھ روم بھی موجود تھا۔ کمرے کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بنگلے کا بیسمنٹ ہے یا پھر تہ خانہ بھی ہوسکتا تھا۔

اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے مختلف سوال گردش

کرنے لگے۔" وہ اس وقت کس کی قید میں تھی......؟ کیا اس کی کوئی ذاتی پلاننگ کسی طور بگ باس تک پہنچ گئی جس نے اسے زیرِعتاب کر دیا تھا...... اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اسے اغوا کرنے والے کون تھے......؟ ان کا مقصد کیا تھا اور افضل خان کو چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا گیا تھا۔ ہوش آنے پر وہ بگ باس کو ان دو آدمیوں کی تفصیل مع حلیہ بتا سکتا تھا جنہوں نے شبنم کو اغوا کیا تھا۔ کیا اغوا کرنے والوں کو اس کا کوئی خدشہ نہیں تھا؟ کیا اغوا کرنے والوں کو اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے اور افضل کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوتے ہی کارروائی عمل میں لائی جائے؟"

بڑی دیر تک وہ خود اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتی رہی پھر دروازے پر ابھرنے والی آہٹ محسوس کر کے دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ فوری طور پر وہ اس بات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی ذہنی کشمکش سے دوچار ہے۔ دروازہ تیزی سے کھولا گیا، ایک درمیانہ قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک بڑی ہوشیاری سے سامنے آیا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا، اس کا کوئی ساتھی بھی پیچھے موجود تھا جس نے اندر داخل ہونے والے کے اشارے پر دروازہ دوبارہ باہر سے بند کر لیا۔

"مجھے توقع تھی کہ تم اب تک پوری طرح ہوش میں آ چکی ہوگی۔" آنے والے نے اطمینان سے کہا پھر ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں فی الحال کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"مجھے یہاں کیوں اور کس مقصد سے لایا گیا ہے؟" شبنم نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"مقصد نیک ہی ہے...... برا ہوتا تو تم اس حال میں نہ ہوتیں۔" سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب ملا۔

"تم کون ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارا کیا اندازہ ہے......؟"

"میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے مجھے اغوا کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔" شبنم نے اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر کہا۔ "اب تک میرے واقف کاروں کو بھی اطلاع مل چکی ہوگی۔"

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔" نووارد نے بڑے سکون سے مگر معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "جو موبائل تمہیں دیا گیا تھا اس پر کچھ دیر پہلے تھوڑے تھوڑے وقفے سے سگنل موصول ہوئے پھر دوسری جانب کسی نے مخصوص ڈیوائس کو استعمال کیا جس کے نتیجے میں موبائل جل کر ناکارہ ہو گیا۔"

"اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ ہمارے آدمیوں کو بھی حالات کی بھنک مل چکی ہے۔"

"ہم بھی یہی چاہتے تھے......" نووارد نے مسکرا کر کہا پھر یکلخت بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم بلاوجہ تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک بھی نہیں کریں گے۔"

"کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"فی الحال تمہیں ایک تصویر دیکھ کر یہ بتانا ہے کہ وہ کون ہے؟" نووارد محتاط انداز میں اٹھا پھر اس نے ایک بند لفافہ شبنم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم لفافے میں موجود تصویر کو دیکھ کر کوئی اداکاری نہیں کرو گی۔"

شبنم نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا، وہ بہ دستور خود کو پرسکون ظاہر کر رہی تھی لیکن لفافے سے برآمد ہونے والی تصویر کو ایک نظر دیکھتے ہی اس طرح چونکی جیسے کسی زہریلے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تصویر کنول کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ بگ باس کی منظورِ نظر، جس کے ملازمت چھوڑنے کے بعد سب ہی کے ذہنوں میں مختلف سوالات ابھر رہے تھے، کسی نے زبان کھولنے کی جرأت تک نہیں کی تھی۔ اب اسی کنول کی تصویر اسے شناخت کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ آخر کیوں؟...... کیا تصویر حاصل کرنے والے اس کی حقیقت سے واقعی ناواقف تھے یا اس میں بھی "ٹریپ" کی کوئی صورت شامل تھی۔ تصویر میں کنول کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس چہرے کو غالباً کسی گروپ وغیرہ سے علیحدہ کیا گیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو......؟" نووارد نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ جب تم لوگوں نے یہ تصویر حاصل کی ہے تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات بھی ضرور رکھتے ہو گے۔ پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق چاہتے ہو؟"

"میں اپنا سوال ایک بار پھر دہرا رہا ہوں۔" نووارد کے لہجے میں پہلے سے زیادہ کرختگی آ گئی تھی۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"

"میری معلومات کے مطابق اس کا نام کنول ہے۔" شبنم نے محتاط انداز اختیار کر لیا۔ "ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے لیکن کچھ دنوں پیشتر اس لڑکی نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی ذاتی پرابلم ہو۔"

"اب یہ کہاں ہے......؟"

"مجھے نہیں معلوم......"

"ہمیں علم ہے کہ تمہارے بگ باس کا نام شیخ حامد ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ کسی خوب صورت اور حسین لڑکی کے لیے وہ کسی درندے سے کم بھی نہیں ہے، پھر یہ لڑکی اس کے چنگل سے کس طرح نکل گئی؟"

"اس کا جواب بگ باس یا پھر یہ لڑکی ہی دے سکتی ہے۔" شبنم نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے اندر بھی جنس مخالف کے لیے خاصی کشش موجود ہے۔" نووارد نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم کو بگ باس کی طرف سے خاص مراعات حاصل نہیں ہیں؟"

"یہ...... یہ میرا قطعی نجی اور ذاتی معاملہ ہے......"

"ہے نہیں...... بلکہ اس وقت تک تھا جب تک تم اپنے فلیٹ میں تنہا رہتی تھیں اور اب...... تم افضل خان کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو چکی ہو...... کیا تمہیں افضل خان کی سابقہ ہسٹری اور چال چلن کا علم نہیں ہے؟"

"میں غیر ضروری سوالات کے جواب دینا پسند نہیں کرتی۔" شبنم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"فی الحال میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔" نووارد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "مگر، اتنا بتا دوں کہ تمہاری یہاں سے رہائی کی صرف ایک ہی صورت ہے...... یا تم اپنی پسند کے مطابق خودکشی کر لو...... یا جو پوچھا جائے اس کا کھل کر جواب دو۔ بگ باس یا اس کے شکاری کتے تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے؟ یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔"

نووارد نے اپنا جملہ مکمل کر کے تصویر شبنم کے ہاتھ سے واپس لی پھر دروازہ کھلوا کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شبنم کی کھوپڑی میں پھر سوالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

☠☠☠

راحیلہ خاتون اس وقت فرحین کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب سیٹھ عثمان باہر سے آئے اور خاموشی سے فرحین کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ راحیلہ خاتون نے شوہر کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے اس لیے وہ فرحین کو کچھ دیر میں واپس آنے کا کہہ کر شوہر کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"خیریت تو ہے؟" کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے شوہر سے پوچھا۔ "سراج بھائی کیسے ہیں؟ ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟"

"سراج کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن دوسرے حالات مجھے خاصے گمبھیر نظر آ رہے ہیں۔"

"دوسرے حالات...... میں سمجھی نہیں؟" راحیلہ بیگم شوہر کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

"ایس پی اورنگ زیب نے سراج کو اسپتال میں داخل کرانے کی تجویز مسترد کر کے اسے گھر پر منتقل کرنا زیادہ مناسب خیال کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا وہ دوبارہ پھر کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ایک دو واقعات اور بھی ایسے رونما ہوئے ہیں جو پولیس کے لیے سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔" سیٹھ عثمان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کل شیخ حامد نے بھی فون کر کے سراج کی خیریت دریافت کی تھی۔ اورنگ زیب اسے منافقانہ کال قرار دے رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان کی کار پر ہونے والا حملہ بھی شیخ حامد ہی کے اشارے پر ہوا ہوگا۔"

"ان حالات میں ... سراج کا بھی الماس کو ساتھ لے کر دو تین مہینوں کے لیے باہر چلے جانا مناسب نہ ہوگا۔"

"میں نے اس کی تجویز دی تھی لیکن سراج کے علاوہ اورنگ زیب نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ معاملات میں ایس پی اورنگ زیب کی ذاتی شخصیت کو زیادہ دخل ہے۔"

"کیا مطلب؟" راحیلہ بیگم نے چونک کر شوہر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ جواب میں سیٹھ عثمان نے اورنگ زیب کے اثر و رسوخ کے حوالے سے جو تفصیل بتائی وہ بھی اس خیال کی تائید کرتی تھی کہ شیخ حامد نئے ایس پی کو پسند نہیں کرتا تھا اور سراج ان کی رسہ کشی کے درمیان لپیٹ میں آ گیا تھا۔

"اب کیا ہوگا......؟"

"قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے سراج اور اورنگ زیب کی باتوں سے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں نے کسی مشترکہ فیصلے پر پہنچ کر اس پار یا اس پار کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔" سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ گاڑی پر کیا جانے والا بلاسٹ بھی لیاقت حسین کی وجہ سے زیادہ موثر نہیں ثابت ہوا۔ اس نے بروقت اسٹیئرنگ کو اس عجلت میں گھمایا تھا کہ وہ الٹتے الٹتے رہ گئی لیکن...... حسبِ دستور لیاقت حسین کو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔"

راحیلہ بیگم پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی۔ شوہر کے اشارے پر وہ کال ریسیو کرنے کی خاطر اٹھ گئیں۔ ایک منٹ کی مختصر کال سننے کے بعد ان کے چہرے پر...... کچھ نئی پریشانیاں ابھرنے لگیں۔

''کس کا فون تھا......؟''

''فرحین کے گھر والوں کا......'' راحیلہ بیگم نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ''فرحین کی ایک قریبی عزیزہ کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''اناللہ واناالیہ راجعون۔'' سیٹھ عثمان نے کہا۔ ''ہمیں لیاقت حسین کی فوری روانگی کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''کیا لیاقت حسین کا جانا مناسب ہوگا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کئی موقعوں پر حیرت انگیز طور پر ہماری جان بچا چکا ہے۔ سراج بھی اسی خیال سے اسے دس بارہ روز کے لیے لے گیا تھا، آپ ابھی بتارہے ہیں کہ گاڑی پر ہونے والا حملہ بھی لیاقت حسین کی کسی غیبی مدد پر بروقت حرکت سے جان لیوا ثابت نہیں ہوا، ایسی صورت میں......''

''بہرحال، ہمیں لیاقت حسین کو اطلاع تو دینی ہے۔ ہم اتنی اہم خبر کو چھپا کر کسی خودغرضی کا ثبوت بھی نہیں دے سکتے۔'' سیٹھ عثمان نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں سراج سے بات کرتا ہوں۔''

''میں فرحین کو......''

''ابھی اتنی جلدی نہ کریں۔ لیاقت حسین کو آلینے دیں، وہ ہوگا تو فرحین کو زیادہ مناسب طریقے سے دلاسا بھی دے سکے گا۔''

سیٹھ عمان نے پہلے سراج کو اطلاع دی پھر لیاقت حسین سے بھی براہ راست بات کی۔ آدھے گھنٹے کے اندر لیاقت حسین بھی آگیا۔ سیٹھ عثمان اسے پرسہ دینے کی خاطر باہر گئے تو لیاقت حسین نے بڑی متانت سے درخواست کی۔

''صاحب...... آپ یا بیگم صاحب میرے فرحین کے ساتھ جانے پر اصرار نہ کریں تو مہربانی ہوگی۔ میں سراج صاحب کو ان حالات میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''تم پہلے بھی نہیں گئے تھے۔'' سیٹھ عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''فرحین کے علاوہ تمہارے گھر والے بھی کیا سوچیں گے؟''

''آپ پریشان نہ ہوں صاحب، میں فرحین کو ساری باتیں سمجھادوں گا۔'' لیاقت حسین نے بڑی خوب صورتی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ بعد میں فرحین کو لینے چلا جاؤں تو باقی سب کے گلے شکوے بھی دور کردوں۔''

''میں زبردستی نہیں کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے موقع پر تمہاری وہاں فرحین کے ساتھ موجودگی زیادہ مناسب ہوگی۔''

''ٹھیک ہے...... میں فرحین سے بات کرتا ہوں۔ جیسا وہ مشورہ دے گی ایسا ہی کروں گا۔''

راحیلہ بیگم نے فرحین کو لیاقت حسین کی آمد کی اطلاع دی تو وہ کسی پھول کی طرح خوشی سے کھل اٹھی۔ اسی وقت لیاقت حسین کے ساتھ اپنی انیکسی میں چلی گئی لیکن اس کے کچھ دیر بعد لیاقت حسین نے دوبارہ سیٹھ عثمان سے مل کر بتادیا کہ فی الحال فرحین تنہا جائے گی۔ بعد میں وہ ہوسکتا ہے کہ اسے لینے چلا جائے۔ سیٹھ عثمان نے زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا، فوری طور پر فرحین کو روانہ کرنے کا سارا بندوبست کرادیا لیکن ...... ان کے ذہن میں ایک بار پھر یہ خیال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ لیاقت حسین نے کسی وجہ سے اپنے پورے گھریلو حالات کھل کر پہلے بھی نہیں بتائے تھے۔ اب بھی اس نے فرحین کو میت میں تنہا شرکت کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ مگر کیوں؟ آخر وہ کیا راز تھا جو لیاقت حسین کھل کر صاف صاف بیان کرنے سے گریز کررہا تھا؟

☠☠☠

شیخ حامد نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے والی نرس کو بھوکی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت یونیفارم میں نہیں تھی، غیر ملکی ہونے کے سبب اس نے جو سادہ لباس پہن رکھا تھا وہ بھی اتنا تنگ تھا کہ بے لباس ہونے کی صورت میں شاید وہ اتنی پرکشش نظر نہ آتی جتنی اس وقت نظر آرہی تھی۔ منی اسکرٹ نے نچلے جسم کی ٹھوس ساخت کو بھی اجاگر کررکھا تھا۔

کنول سے شادی کرنے کے بعد شیخ حامد کا پرانا واقف کار ڈاکٹر برلاس اس کے کہنے پر دوبار نرسوں کو اضافی طاقت کے انجکشن لگانے کی خاطر اس کے گھر بھیج چکا تھا۔ پہلے جو نرسیں آئی تھیں وہ زیادہ پرکشش نہیں تھیں اس لیے شیخ حامد نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن موجودہ بدیسی نرس کے جسمانی نشیب و فراز اتنے ہیجان انگیز تھے کہ شیخ حامد انہیں نظرانداز نہیں کرسکا تھا۔

''تمہارا نام؟'' اس نے نرس کی مخاطب کیا۔

''جولیانا......'' نرس نے پیشہ وارانہ انداز میں جواب دیا پھر سرنج میں دوا بھرنے لگی، اس کی نظریں سرنج پر مرکوز تھیں لیکن شیخ حامد اس انداز کو خاص طور پر محسوس کررہا تھا۔ اس کے نقوش خوبصورت نہیں لیکن تیکھے اور نمکین بلاشبہ تھے، وہ انجکشن تیار کرنے کے بعد شیخ حامد کے قریب آئی تو اس نے نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے بے باک انداز میں پوچھا۔

''جانتی ہو یہ انجکشن کس کام آتا ہے؟''

''ایکسٹرا اسٹرینتھ (Extra Strength) حاصل

کرنے کے لیے۔'' جولیانا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

شیخ حامد نے آستین اوپر اٹھا کر بازو کھول دیا، جولیانا انجکشن لگانے کی خاطر اور قریب آئی تو اس کے جسم اور لباس پر لگے سینٹ کی سوندھی سوندھی خوشبو شیخ حامد کو بے چین کرنے لگی۔ اس وقت اگر اسے کنول کے پاس نہ جانا ہوتا تو شاید وہ کسی آدم خور کی طرح جولیانا کو بلاتکلف دبوچ لیتا لیکن وہ بہرحال اس قابل نہیں تھی کہ اسے کنول جیسی تازہ چٹکتی کلی پر ترجیح دی جاتی۔

''ڈاکٹر برلاس کے ہاں شاید نئی آئی ہو؟''

''ہاں......'' جولیانا نے انجکشن لگاتے ہوئے بہ دستور بے نیازی سے کہا۔ ''عام طور سے میں کسی کے گھر پر وزٹ نہیں کرتی لیکن ڈاکٹر برلاس نے آپ کے لیے خاص طور پر میری ڈیوٹی لگادی۔ اس لیے کہ آج نائٹ ڈیوٹی کی نرس کسی وجہ سے نہیں آئی تھی۔''

''میں آئندہ تم ہی کو طلب کیا کروں گا۔'' شیخ حامد نے فراخدلانہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''آپ کو اس وقت شاید کہیں اور جانا ہے؟'' جولیانا نے پہلی بار قدرے بے تکلفی سے شیخ حامد کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔'' شیخ حامد نے پھریری لیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا تو جولیانا نے شانے اچکا کر دبی زبان میں کہا۔

''آپ جو انجکشن لیتے ہیں یہ انسان کو صرف عارضی قوت بخشتا ہے جو زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ عادی ہوجانے کے بعد انسان اسی کا محتاج ہوجاتا ہے۔''

''تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس کے بغیر مرد کو اگر کبھی شرمندگی اٹھانی پڑے تو وہ بھی اس کے لیے بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو۔'' جولیانا نے کھل کر جواب دیا۔ ''ورنہ، آپ کا پارٹنر اگر باڈی مساج کے فن سے واقف ہو تو آپ زیادہ انجوائے کرسکتے ہیں۔''

''تت...... تم کو باڈی مساج آتا ہے؟'' شیخ حامد کی آنکھوں میں خمار جاگنے لگا۔

''آپ کی ضرورت پر منحصر ہے لیکن میں صرف باڈی مساج کے دس ہزار لیتی ہوں۔'' جولیانا نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ ''صرف باڈی مساج کے۔''

''اور...... اس کے بعد......''

''ٹین تھاؤزنڈ پلس...... لیکن آپ اس کے لیے ڈاکٹر برلاس سے نہیں کہیں گے۔'' جولیانا نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر شیخ حامد کی طرف بڑھاتے ہوئے رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ ''اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ آپ جب چاہیں ون ویک پیشتر بک کرسکتے ہیں۔''

''پروفیشنل ہو؟'' شیخ حامد نے چبھتے ہوئے انداز میں اسے سر سے پاؤں تک گھورا۔

''نہیں...... پروفیشنل ہوتی تو ڈاکٹر کے ہاں سروس نہ کرتی۔ باڈی مساج میں دو ماہ میں صرف ایک بار کرتی ہوں جو میری ضرورت پوری کردیتا ہے۔ ٹین تھاؤزنڈ پلس والی بات میری مرضی پر منحصر ہے۔''

شیخ حامد کو اچانک کنول کا خیال آگیا اس لیے اس نے بات آگے نہیں بڑھائی لیکن، یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اسے کبھی بہ وقت ضرورت...... خدمت کا موقع دے سکتا ہے۔ جولیانا کے جانے کے بعد وہ بن سنور کر تیار ہوا۔ اس وقت ساڑھے نو کا عمل تھا، اس نے اپنے خاص ڈرائیور اور ایک بااعتماد گن مین کو ساڑھے دس کا وقت دیا تھا۔ وہ دونوں اس کے آزمائے ہوئے آدمی تھے۔ زبان ہوتے ہوئے بھی گونگا بنا رہنا ان کی سرشت میں شامل تھا، نہ ہوتا تو بہت پہلے موت کی ابدی نیند سو چکے ہوتے۔ دس بجے کنول نے اسے فون کیا۔

''مجھے آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار ہے۔'' اس کے لہجے میں گھریلو عورت کی محبت تھی۔ ''آخر ہم کب تک اس طرح دور دور رہ کر چوری چھپے ملتے رہیں گے؟''

''ڈونٹ وری مائی سوئٹ ہارٹ، میں تمہیں لے کر باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں جہاں ہمارے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ہم دو تین مہینے تک دل بھر کر انجوائے کریں گے۔''

''اور اس کے بعد......؟'' کنول نے دبی زبان میں پوچھ ہی لیا۔

''اس کے بعد......'' شیخ حامد نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں اپنی تمہاری شادی کو سب پر ظاہر کردوں۔ ابھی وعدہ نہیں کرسکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔''

''میں بس دس منٹ میں نکل رہا ہوں۔'' شیخ حامد نے کنول کو دلاسا دے کر کال منقطع کردی پھر وہ اپنی منحوس اور مرحوم بیوی صبا بیگم کو بے نقط گالیاں بکنے لگا جس کی خودکشی نے اسے محتاط رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے بعد ایس پی اورنگ زیب کی شخصیت بھی اس کے آڑے آرہی تھی جس کی وجہ سے اس نے اوباش لڑکیوں کو بھی گھر بلانا بند کردیا تھا۔ وہ فرنٹ فٹ کا کھلاڑی تھا لیکن حالات نے اسے بیک فٹ پر

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پندرہ منٹ تک وہ صبا بیگم اور رنگ زیب دونوں کو دل ہی دل میں گالیاں بکتا رہا پھر ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر اس نے واش روم میں جا کر قد آدم آئینے کے سامنے اپنا آخری جائزہ لیا۔ باہر آ کر اس نے موبائل پر گیٹ والے گارڈ سے رابطہ قائم کر کے معلوم کرنا چاہا کہ اس کی مخصوص گاڑی آئی یا نہیں لیکن تین چار نمبر پنچ کرنے کے بعد اس نے خود کو تیزی سے فرش پر گرا دیا اور اپنے بستر تک پہنچنے کی خاطر کسی چوٹ کھائے مگرمچھ کی طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگا جہاں اس کی چھوٹے دستے کی رائفل رکھی تھی۔

اچانک ہونے والا دھماکا اتنا ہی خطرناک تھا کہ بیڈروم کے در و دیوار بھی لرز اٹھے تھے، اس کے ساتھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی تھی۔ رائفل حاصل کرنے کے بعد اس نے دیوار کے ساتھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر خواب گاہ کی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ ایک کھڑکی کی طرف قدم اٹھا رہا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملے۔ کال نمبر ٹو نے کی تھی۔

"یہ کون حرام کے پلے ہیں؟" اس نے بڑے خونخوار لہجے میں نمبر ٹو سے سوال کیا۔

"فکر نہ کریں باس...... ہم انہیں گھیر رہے ہیں۔ آج انہیں زندہ نہیں جانے دیں گے۔"

"سب کو بھون ڈالو۔" وہ گرجنے لگا۔ "کسی کی پروا نہ کرنا۔ دیکھ لوں گا، باقی لوگوں کو بھی بلا لو۔"

"میں روشنیاں بند کرا رہا ہوں باس۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ "اندھیرے میں انہیں گھیرنا زیادہ آسان رہے گا۔"

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بنگلے کی بیرونی روشنیاں بھی بند کر دی گئیں۔ شیخ حامد اچانک رائفل لے کر خواب گاہ سے باہر نکلا۔ اس کے لیے پوزیشن تبدیل کرنی ضروری تھی۔ وہ راہداری سے گزرتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا پھر اس نے ایک کھڑکی کے قریب دیوار سے چپک کر پوزیشن سنبھال لی۔ کھڑکی کو ذرا سا کھول کر اس نے باہر کی جانب دیکھا جہاں رائفلیں گولیوں کے ساتھ ہی شعلے بھی اگل رہی تھیں۔ رائفل پر ایک ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے اس نے دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا اور ڈی آئی جی کرائمز آغا منظور کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

"ہیلو۔ شیخ حامد صاحب۔" دوسری جانب سے ڈی آئی جی کرائمز کی آواز ابھری۔ "اس وقت کیسے یاد......"

"میرے بنگلے پر کچھ حرامیوں نے دوسری بار حملہ کر دیا ہے۔" شیخ حامد نے چلاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا وہ نیا ایس پی کہاں مرا ہوا ہے؟"

"پریشان نہ ہوں سر..... میں ابھی دیکھتا ہوں۔" اس بار دوسری طرف سے بھی پریشانی کا اظہار کیا گیا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو...... اس بار بھی اگر مجرم گرفتار نہ ہوئے تو پھر مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔" شیخ حامد نے کال منقطع کر دی اسی لمحے اسے شبنم کا خیال آیا۔

کنول کی طرف جانے کے خیال نے اسے اس قدر محو کر رکھا تھا کہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے دو بار شبنم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں بار گھنٹی بجتی رہی لیکن...... کال ریسیو نہیں کی گئی تو اس نے کسی خطرے کے پیش نظر شبنم والا موبائل خاص تکنیک سے جلا کر ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کا عادی نہیں تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ شاید وہ اور افضل خان نئے سرے سے اپارٹمنٹ ملنے کی خوشی کو انجوائے کر رہے ہوں گے۔ ایسی کسی صورت کے انکشاف کے بعد وہ شبنم کو اس "غفلت" کی مناسب سزا دینے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا لیکن...... اب اس کا ذہن کچھ نئے امکان پر غور کر رہا تھا۔ شاید حملہ کرنے والوں نے شبنم کو بھی اغوا کر لیا ہو؟ ورنہ وہ موبائل کو اٹینڈ کرنے میں دیر نہ کرتی۔ اس خیال نے شیخ حامد کے غصے کو اور مہمیز کر دیا۔

باہر تاریکی میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ جاری تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے نکل کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ رائفل کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی، اسے یقین تھا کہ اس کے کارندے جو ایک لمحہ بھی غافل رہنے کے عادی نہیں تھے، حملہ کرنے والوں سے پوری مستعدی سے برسرپیکار ہوں گے۔ دل ہی دل میں وہ حملہ کرنے والوں کو بھی مغلظات بک رہا تھا جنہوں نے اضافی قوت والے انجکشن اور کنول کے ساتھ ہونے والے پروگرام کا ستیاناس کر دیا تھا۔

وہ ابھی آدھے زینے طے کر پایا تھا جب ایک مسلح کارندہ اس کے قریب آیا اور فکرمندی سے بولا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں باس...... باہر...... تو......"

"سن رہا ہوں سب کچھ لیکن تم لوگ کس مرض کی دوا ہو......؟" اس نے قریب آنے والے کو حقارت سے جواب دیا۔ "دفع ہو جاؤ...... جا کر حملہ کرنے والوں کو گھیرنے کی کوشش کرو۔ کب تک حرام کی کھاتے رہو گے؟"

آنے والا جس تیزی سے آیا تھا۔ اسی تیزی سے لوٹ گیا۔ شیخ حامد وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گھپ اندھیرے میں باہر کھلے میں جانا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ کوئی سنسناتی ہوئی گولی اس کے وجود کو بھی چاٹ جانے سے گریز نہ کرتی۔ اسی وقت موبائل پر سگنل ملے، اسکرین پر کنول کے نمبر روشن تھے۔ اس نے موبائل آن نہیں کیا۔ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گیا۔ سارا پروگرام ستیاناس ہو گیا تھا، اضافی طاقت کا انجکشن بھی ضائع گیا۔ اس نے لائن آف کر کے دوبارہ آن کی اور شبنم کے نمبروں کے بجائے افضل خان کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

"ہیلو...... افضل بول رہا ہوں باس......" دوسری جانب سے افضل خان کی بجھی بجھی آواز ابھری۔

"شبنم کہاں مری ہوئی ہے......؟" اس نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔

"وہ...... اسے دو افراد گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ کل رات کی بات ہے۔"

"تت...... تم...... باسٹرڈ۔" شیخ حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔ "تم نے مجھے فوری اطلاع کیوں نہیں دی۔ اب تک کس کا انتظار کر رہے تھے؟"

"میں نے شبنم کو بچانے کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا تھا لیکن وہ دو تھے اور......"

"کہانیاں مت سناؤ...... میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے کیا کیا میں اس کی بات نہیں کر رہا۔"

"میں ابھی کچھ دیر قبل ہی ہوش میں آیا ہوں۔" اس بار مختصر جواب دیا گیا۔

"وہ کون ہو سکتے ہیں......؟"

"میں نے انہیں پہلی ہی بار دیکھا تھا، بہ ظاہر وہ پروفیشنل نہیں لگتے تھے۔"

"تم نے پولیس کو انفارم کرنے کی حماقت تو نہیں کی؟"

"آپ کی اجازت کے بغیر میں نے کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اچھا کیا......" شیخ حامد نے بل کھاتے ہوئے جواب دیا پھر بڑے سرد لہجے میں حکم دیا۔ "میری بات غور سے سنو۔ تم اپنا سامان لپیٹ کر جتنی جلدی ممکن ہو اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤ۔ کوئی سراغ چھوڑنے کی حماقت نہ کرنا اور...... شبنم کے سلسلے میں اپنی زبان پر تالے ڈال لو۔ کسی سے کچھ کہنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔"

"رائٹ باس......"

"اپارٹمنٹ دس پندرہ منٹ کے اندر اندر چھوڑ دو...... چوکیدار کا منہ بھی اپنے سلسلے میں بند کرنا تمہاری ہی ذمے داری ہوگی۔ کوئی غلطی کی تو اس کی سزا بھی جانتے ہو...... کہیں شفٹ ہونے کے بعد مجھے دوبارہ کال کرنا۔"

موبائل بند کر کے شیخ حامد ہونٹ چبانے لگا۔ شاید اس وقت کوٹھی پر حملہ کرنے والے بھی وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے شبنم کو اغوا کیا ہوگا۔ ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد ان کی موت ہی نے انہیں ورغلایا ہوگا۔ اس نے رائفل پر اپنی گرفت جما کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن پے در پے ہونے والے تین دھماکوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑکھڑاتا ہوا نیچے فرش پر آ گیا۔ تینوں دھماکے بنگلے کے تین حصوں میں کیے گئے تھے۔ گیٹ کی طرف بھی فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن پھر اس کی تیزی میں بتدریج کمی آنے لگی، شاید کوئی ایک پارٹی پسپا ہو کر میدان چھوڑ رہی تھی۔

شیخ حامد لباس جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جنونی کیفیت سے دوچار تھا لیکن اس کیفیت کے باوجود فی الحال کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ جھلایا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اس بار اس نے براہ راست مرکزی حکومت میں اپنے نمک حلالوں کو فون کرنے کی ٹھانی تھی لیکن پھر پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں کی آواز سن کر رک گیا۔ فائرنگ بھی ختم ہو رہی تھی۔ وہ جھلاتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ گیٹ کا ایک مسلح چوکیدار دوڑتا ہوا سامنے آ گیا۔

"صاحب...... پولیس کی گاڑیاں آ گئی ہیں۔"

"جا کر دیکھو کون ہے......" اس نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ "لائٹ جلا دو اور...... کوئی ذمے دار افسر ہو تو اسے اندر آنے دینا، چھوٹا موٹا آدمی ہو تو باہر ہی سے دھتکار دینا۔"

چوکیدار الٹے قدموں واپس چلا گیا، بنگلے کی روشنیاں دوبارہ آن ہو گئیں۔ شیخ حامد ہونٹ چباتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد ڈی آئی جی کرائمز علاقے کے انسپکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ غیر ارادی طور پر رائفل ہاتھ میں لیے کھڑا ہو گیا۔ انتہائی حقارت سے علاقے کے انسپکٹر کی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔

"اب تک تم اور تمہارے عملے کے لوگ کہاں مرے ہوئے تھے؟"

"کام ڈاؤن سر......" ڈی آئی جی نے آگے بڑھ کر شیخ حامد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "علاقے کی پولیس غافل نہیں تھی لیکن ایک ہی وقت میں پولیس کی نفری ہر مکان پر......"

"یو...... گیٹ لاسٹ!" شیخ حامد نے انسپکٹر کو تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا۔ "وہ ڈی آئی جی کا اشارہ پا کر ہونٹ

کا شانا لٹے قدموں باہر نکل گیا تو اس نے آغا منظور کو تیز نظروں سے گھورا۔ ''تم شاید بھول گئے کہ تمہاری ترقی میں بھی میرا ہاتھ تھا۔''

''میں نے کبھی اس سے انکار بھی نہیں کیا لیکن......''

''حملہ کرنے والے کون تھے؟'' شیخ حامد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''تھانہ انسپکٹر اور اس کے عملے نے کیا تیر مارا؟''

''ہم نے چار آدمیوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ ان کی زبان کھولنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔'' آغا منظور نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے ہدایت کردی ہے کہ آئندہ سے سادہ لباس والوں کا ایک دستہ باقاعدہ بنگلے کے اردگرد نظر رکھے۔''

''بنگلے میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک کرانا بھی تمہاری ذمّے داری ہوگی۔''

''سب کچھ آپ کے حسب منشا ہوجائے گا۔'' ڈی آئی جی نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک گزارش میں بھی کروں گا۔ ماتحتوں کی موجودگی میں اگر آپ......''

''پھر کسی وقت تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔'' اس نے بہ دستور بپھرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ پھر ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا وہ نیا ایس پی کہاں مرا ہوا ہے۔ کیا اسے حملے کی اطلاع نہیں ملی یا......''

''وہ بھی آن ڈیوٹی ہے۔ جو افراد گرفتار ہوئے ہیں انہیں اسی نے گھیرا تھا۔''

''کس پارٹی کے لوگ ہیں......؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہ ظاہر صورت شکل سے جرائم پیشہ ہی نظر آتے ہیں۔''

شیخ حامد جواب دینے کے لیے پر تول رہا تھا کہ جب اس کے دوسرے موبائل پر کال ریسیو ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر نیا تھا پھر بھی اس نے موبائل آن کرلیا۔ خشک اور کرخت لہجے میں سوال کیا۔

''کون ہے......؟''

''آج جو کچھ ہوا اسے پہلی اور آخری وارننگ سمجھو۔'' دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ ''ہم چاہتے تو براہ راست تمہاری خواب گاہ کو بھی ٹارگٹ بنا کر تمہیں روسٹ کردیتے لیکن ہم جیو اور دوسرے کو جینے دو کے اصول کے قائل ہیں۔ تم سے بھی آئندہ اسی کی توقع ہے۔''

''لڑکی کو کس جرم میں اغوا کیا گیا ہے؟ کیا اسے بھی تم مردانگی ہی کا نام دوگے؟'' شیخ حامد نے اسے کریدنے کی خاطر سوال کیا۔

''کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟ ہم تمہاری طرح لڑکیوں پر رال ٹپکانے کے عادی نہیں ہیں۔''

''ہنگامہ کرنے کا مقصد کیا تھا؟''

''صرف تمہیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تم ہی حرف آخر نہیں ہو۔'' انتہائی سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ''ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ پہلا ثبوت آج تمہیں مل چکا ہے۔''

''اپنے اس باپ کا نام بھی بتا دو جس کی ناجائز اولاد ہونے کے سبب تم اپنی اوقات بھول رہے ہو......؟'' شیخ حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔

''انتظار کرو...... اس کا جواب بھی تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔'' دوسری جانب سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ شیخ حامد بل کھا کر رہ گیا۔

''کون تھا جناب......'' آغا منظور نے دبی زبان میں پوچھا۔

''فضول ہے......'' اس نے ڈی آئی جی کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''جو سم استعمال کی گئی ہے وہ ان رجسٹرڈ ہی ہوگی۔''

''کیا بکواس کر رہا تھا؟''

''یہی کہ وہ پولیس کی کارکردگی کو آئندہ بھی ضرور آزمائے گا۔'' شیخ حامد نے تلملا کر جواب دیا پھر اس نے شبنم کے اغوا کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''کل رات کسی نے اسے بھی اسی اپارٹمنٹ سے اغوا کرلیا ہے جو پہلے افضل خان کی تباہی کا سبب بن چکا تھا۔ میں نے باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کرائی لیکن...... اسے بازیاب کرانے کی ذمّے داری بھی تمہیں سونپ رہا ہوں۔''

''آپ کا شبہ کس پر ہے......؟''

''احمقانہ سوال ہے......'' اس نے نفرت کا اظہار کیا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا تو اب تک میرے کارندے اغوا کرنے والوں کو موت کی نیند سلا کر اسے بازیاب کراچکے ہوتے...... تم بھی رازداری سے کام لینا۔ میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ اخبارات کو میرے کاروبار پر ہنسنے کا کوئی موقع ملے۔ شبنم میری خاص ورکر تھی اس کا خیال رہے......''

''وہ اس نئے اپارٹمنٹ میں کب شفٹ ہوئی تھی......؟'' ڈی آئی جی نے دریافت کیا۔

''دو روز پہلے کی بات ہے۔''

''ویری سیڈ۔'' آغا منظور نے کسمسا کر ایک خیال کا اظہار کیا۔ ''اغوا کرنے والے کیا اس بات کے انتظار میں تھے کہ اس کو شفٹ کرنے کے بعد ہی اغوا کیا جائے...... میرا مطلب ہے کہ وہ اسے......''

''یہ معلوم کرنا بھی پولیس کا کام ہے۔''

''او۔ کے سر...... میں اس معاملے کو بھی دیکھتا ہوں۔''

ایک بار پھر کنول کی کال مخصوص موبائل پر موصول ہوئی۔ شیخ حامد نے اس بار بھی اسے اٹینڈ کرنے کے بجائے لائن کاٹ دی۔ دس سیکنڈ بعد دوبارہ موبائل گنگنایا تو اس نے جھلا کر روشن اسکرین کی طرف دیکھا لیکن نمبر ٹو کی کال دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگالیا۔

''کوئی خاص بات......؟''

''باس...... پولیس نے جن چار افراد کو حراست میں لیا ہے ان میں تین اپنے آدمی بھی شامل ہیں۔''

شیخ حامد نے موبائل آف کر کے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

''تمہارے ایس پی نے جو تیر مارے ہیں اس کی رپورٹ بھی مجھے مل گئی ہے۔''

''مم...... میں سمجھا نہیں؟''

''جن چار آدمیوں کو اس نے حراست میں لیا ہے اس میں تین میرے آدمی تھے جو بنگلے کی حفاظت پر تعینات تھے۔''

''اوہ......'' ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن ہی جارہا ہوں۔ آپ اپنے کسی آدمی کو بھیج دیں۔ میں صرف چوتھے آدمی کی زبان کھلوانے کی ہدایت کردوں گا۔ آپ کے کارندوں سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی البتہ...... ہوسکتا ہے کہ انہیں دس بارہ گھنٹے تک روکا جائے...... کچھ خانہ پری تو کرنی ہوگی۔''

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے کنول کو فون کر کے مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا پھر نمبر ٹو سے رابطہ قائم کر کے آئندہ کے لیے اپنی رہائش گاہ کی حفاظت کی خاطر ضروری ہدایتیں دینے لگا۔ یہ بھی کہا کہ وہ خاص طور پر رستم علی کو بھی چیک کرے، کہیں اس حملے کی پشت پر اس کا ہاتھ تو نہیں۔

☠☠☠

لیاقت حسین اس وقت سراج کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فرحین کے جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر نہیں تھی، اس نے خاص طور پر الماس سے درخواست کی تھی کہ اسے سراج کی خدمت کا پورا پورا موقع دیا جائے چنانچہ جب الماس دوپہر کام میں مصروف ہوتی تو لیاقت حسین سراج کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی سراج کے بے حد سمجھانے کے بعد ہی اس نے کرسی پر بیٹھنا مناسب سمجھا تھا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے صاحب؟'' حسب معمول اس نے سراج سے پہلا سوال یہی کیا۔

''خدا کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں، بس دو روز اور مسہری توڑنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوں گا۔''

''اتنی جلدی کیا ہے صاحب...... دنیا کے دھندے تو چلتے رہتے ہیں۔''

''فرحین کا کوئی فون آیا......؟'' سراج نے موضوع بدل کر دریافت کیا۔

''وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ پچھلی بار بھی تم ٹال گئے تھے۔''

''آپ کو اس حال میں چھوڑ کر چلے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔'' لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے کہا پھر یکلخت اسے ایک بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ''صاحب، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، لیکن اس شرط پر کہ آپ میری بات کا بھرم رکھ لیں گے۔''

''سب خیریت تو ہے؟'' سراج نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''ہمارے صاحب نے ماربل کا کاروبار بھی شروع کردیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے۔'' لیاقت حسین نے بڑی خوبصورتی سے بات گھما پھرا کر کہی۔ ''ایک روز میں نے صاحب کو فون پر کسی سے بات کرتے سن لیا تھا۔'' اس نے سنی ہوئی تفصیل دہرا کر کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ پارٹی کون ہے جس نے وقت پر صاحب کو مال سپلائی نہیں کیا تھا۔''

''تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟''

''صاحب کے پانچ لاکھ کا معاملہ ہے۔'' لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ''میں بھی اسی علاقے کا ہوں، دو چار کاروباری لوگوں کو بھی جانتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ جس نے مال سپلائی کرنے میں دیر کی ہو اسے بھی جانتا ہوں، کبھی کبھی پرانی واقفیت بھی کام آجاتی ہے۔''

''کیا وہ تمہارے کہنے سے آئندہ مال وقت پر سپلائی کردے گا۔''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے صاحب۔''

''تم یہ بات براہ راست عثمان سے بھی دریافت کرسکتے

تھے؟'' سراج نے کہا۔ ''اس میں تکلف کی کیا بات تھی۔''

''میں نے مناسب نہیں سمجھا صاحب......'' لیاقت حسین نے پھر منت کی۔ ''آپ کسی طرح اس پارٹی کا نام معلوم کر دیں لیکن میرا نام نہ لیں۔ یہ میری درخواست ہے۔''

سراج کے جواب دینے سے پیشتر ہی الماس آ گئی۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے سراج کو اپنے پروگرام سے باخبر کرنے کے بعد لیاقت حسین سے بھی سراج کا خیال رکھنے کی تاکید کی پھر جانے کے ارادے سے پلٹی تھی جب اسے دوبارہ رکنا پڑا۔

''بیگم صاحب۔ آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔'' لیاقت حسین نے خلاف توقع بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک دو چیزیں مجھے بھی خرید کر فرحین کو بھجوانی ہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' سراج نے کہا پھر بے تکلفی سے بولا۔ ''ایک شرط پر تمہیں جانے کی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم الماس کے کسی حکم سے انکار نہیں کرو گے۔''

''میں ایسی جرأت بھی نہیں کر سکتا صاحب۔''

سراج کو جواب دینے کے بعد لیاقت حسین بھی الماس کے ساتھ باہر آ گیا۔ الماس نے اپنے ڈرائیور کو گھر پر رہنے کی ہدایت کر دی۔ اسٹیئرنگ لیاقت حسین نے سنبھال لیا۔ الماس کی ہدایت پر لیاقت حسین نے گاڑی شہر سے دور واقع ایک بڑے شاپنگ مرکز کے گیٹ پر روکی۔ الماس کے اترنے کے بعد وہ گاڑی کو پارکنگ میں لے گیا۔ الماس نے کہا تھا کہ وہ شاپنگ سے فارغ ہو کر اسے فون پر مطلع کر دے گی۔ اس نے لیاقت حسین سے راستے میں پوچھا بھی تھا کہ اسے فرحین کے لیے کیا چیزیں لینی ہیں۔ جواب میں لیاقت حسین نے کہا تھا کہ وہ واپسی میں صدر کے علاقے سے لے لے گا۔

الماس گاڑی سے اتر کر چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کا رخ اختیار کیا جہاں بیشتر اشیا تھوک کے داموں فروخت ہوتی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ مطلوبہ اشیا خرید کر ٹرالی میں رکھتی رہی پھر لفٹ کی طرف جانے لگی تو شاپنگ مرکز کے یونیفارم میں ملبوس نوجوان نے قریب آ کر اسے اپنی خدمت پیش کی۔ الماس نے سامان سے بھری ٹرالی اس کے حوالے کر کے سکون کا سانس لیا لیکن ایک کم مصروف سیکشن کے راستے میں پہنچ کر اس کا سکون برقرار نہ رہ سکا۔

''میڈم......'' یونیفارم میں ملبوس نوجوان نے اسے سرسراتے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''ہمارے آس پاس تین آدمی اور بھی موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو اطمینان کر لیں لیکن......اگر آپ نے شور مچانے کی کوشش کی تو پھر ہم آپ کو آخرت کے سفر پر روانہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں محسوس کریں گے......خیریت اسی میں ہے کہ آپ خاموشی سے ہمارے کہنے پر قدم اٹھاتی رہیں۔''

الماس نے تیزی سے نظریں گھما کر دیکھا، یونیفارم والے نے غلط نہیں کہا تھا، تین افراد جیبوں میں ہاتھ ڈالے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آس پاس موجود تھے جو اسے گھور رہے تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی الماس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی بیوی تھی اس لیے یہ بھی جانتی تھی کہ شور مچانے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ لفٹ کی طرف جانے سے پیشتر اس نے لیاقت حسین کو فون بھی نہیں کیا تھا شاید اس لیے کہ اسے نیچے پہنچ کر کاسمیٹک کی دو چار چیزیں اور بھی لینی تھیں۔

''تم کیا چاہتے ہو......؟'' الماس نے سچویشن کو محسوس کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

''ایک ہی درخواست ہے کہ آپ کوئی ہوشیاری دکھانے کی حماقت نہ کریں ورنہ اس بار ہمیں اوپر سے خطرے کی صورت میں وسیع اختیارات دے دیے گئے ہیں، ہم اس پر عمل کرنے میں دیر بھی نہیں کریں گے۔''

''کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے......؟''

''غلط اندازے نہ قائم کریں۔'' خشک لہجے میں جواب دیا گیا۔ ''ہم بکاؤ مال نہیں ہیں۔''

''مجھے مارنے کی صورت میں تم لوگ بھی نہیں بچ سکو گے......'' الماس نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔

''معلوم ہے...... یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت کچھ نامعلوم لوگ ہماری نقل و حرکت کی بھی نگرانی پر مامور ہیں، دوسروں نے چھوڑ دیا تو وہ ہمیں زیادہ اذیت ناک انجام سے دوچار کر دیں گے اس لیے کسی ناقابل برداشت ٹارچر سے بچنے کی خاطر ہم بھی آسان موت کو ترجیح دینا پسند کریں گے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں......؟'' الماس نے ایک اور ٹرمپ کارڈ استعمال کرنے کی کوشش کی۔

''ڈی ایس پی مسٹر سراج کی بیگم۔'' سپاٹ اور بے پروا انداز میں جواب دیا گیا۔

''یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ایک بار خطرے سے دوچار ہونے کے بعد میں نے احتیاطی تدابیر نہ اختیار کی ہوں گی۔''

''میں سمجھا نہیں......''

"جس گاڑی میں آئی ہوں اس کے ساتھ ایک دوسری کار بھی میری حفاظت کے لیے موجود تھی۔" الماس نے قدرے دبنگ لہجے میں کہا۔ "نیچے پہنچ کر کیا صورت پیش آئے گی۔ اس کا اندازہ ابھی سے لگالو۔"

"گھسا پٹا طریقہ اختیار کرنے کا دور گزر چکا ہے میڈم۔" ٹرالی چلانے والے نے سادگی سے کہا۔ "آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد ہمارے آدمی آپ کی نگرانی کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ پھر بھی، اگر آپ کا خواب سچا ہوا تو ہم بھی اس کا بندوبست کرچکے ہیں۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ لفٹ تک آگئے۔ الماس کے ستارے شاید گردش ہی میں تھے کہ لفٹ میں اس کے ٹرالی والے اور اس کے تین سادہ لباس والوں کے ساتھ صرف دو خواتین اور ایک بچہ ہی سوار ہوا تھا، ان سے کچھ مدد کرنے کی درخواست ان کے حق میں بھی جان لیوا ہوسکتی تھی۔ نیچے پہنچ کر ٹرالی والے نے وہ راستہ اختیار کیا جس کو صرف یونیفارم والے ملازم ہی کسی مخصوص کسٹمر کے ساتھ اختیار کرسکتے تھے، باقی تین سادہ لباس والے بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

دوپہر کا وقت ہونے کے سبب باہر زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ لیاقت حسین کی موجودگی بھی صرف اسی صورت میں ممکن تھی جب الماس نے اسے اپنی واپسی کی اطلاع دی ہوتی۔

شاپنگ مرکز سے ان کے باہر نکلتے ہی ایک سیاہ رنگ کی پک اپ ان کے قریب آکر رکی۔

"آپ کی سواری حاضر ہے میڈم۔" ٹرالی والے نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ تشریف رکھیں۔ ہم ٹرالی کا سامان اتارتے ہیں۔"

الماس نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا، سیاہ پک اپ کو دیکھ کر اب اسے اپنا انجام بھی تاریک ہی نظر آرہا تھا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا کہ وہ خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد اس نے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ قریب موجود تین سادہ لباس والوں میں سے ایک کراہتا ہوا گرا۔ اس کی بائیں کنپٹی سے خون کا فوارا ابل رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کے چونکتے ہی ایک اور کسی بے آواز اسلحہ سے چلائی جانے والی گولی کا شکار ہوکر اوندھے منہ ڈھیر ہوگیا۔ جو کسٹمر باہر موجود تھے، ان کو دو آدمیوں کے مرنے کا احساس ہوا تو ان کے درمیان بھگدڑ مچ گئی۔ ٹرالی والا لپک کر الماس کے قریب آیا۔ الماس کا ہاتھ تھام کر اس نے پک اپ کی جانب جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی ڈکراتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا، گولی اس کی گردن کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی، تیسرے سادہ لباس والے نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا، اس کے گرتے ہی سیاہ پک اپ حرکت میں آکر تیزی سے موقع واردات سے فرار ہوگئی، الماس گم صم کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی جب شاپنگ مرکز کے ڈیوٹی گارڈز کے علاوہ پولیس کی ایک موبائل بھی سائرن بجاتی سامنے آگئی۔ شاید کسی نے اس موبائل کو خطرے کی اطلاع دے دی تھی۔

الماس نے سکون کا سانس لیا لیکن اسی وقت دو مسلح ڈیوٹی گارڈز لیاقت حسین کو تشدد کا نشانہ بناتے گھسیٹ کر پولیس کی طرف لے آئے۔ اسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

"یہ ہے وہ...... جو بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہا تھا......" پولیس والوں نے سب سے پہلے لیاقت کو گھسیٹ کر موبائل میں ڈالا، اس کے پستول کو قبضے میں لیا پھر الماس سے بولے۔

"آپ کو ہمارے ساتھ ملحقہ تھانے تک چلنا ہوگا۔"

الماس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ اپنا تفصیلی تعارف کرادے لیکن اس نے مجمع میں اپنی تشہیر مناسب نہیں سمجھی، خاموشی سے قدم اٹھاتی اگلی نشست پر موبائل کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لیاقت حسین نے بھی گرفتاری کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا تھا، اس کو قابو کرنے والوں نے اس کا لباس پھاڑ ڈالا تھا، جو گت بنائی تھی وہ بھی قابل رحم تھی مگر اس نے بھی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالا تھا۔

موبائل کے حرکت میں آتے ہی الماس کا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس کے دماغ میں کئی پراسرار سوالات ابھر رہے تھے۔ لیاقت حسین کو اس کے اغوا کیے جانے کی اطلاع کس طرح ہوئی......؟ اس نے اچانک ان چاروں اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ کیوں اتار دیا؟ ایک بھی زندہ ہاتھ آجاتا تو پولیس اس کو زبان کھولنے پر مجبور کرسکتی تھی۔ پشت پر کام کرنے والا ہاتھ بھی بے نقاب ہوجاتا۔ کیا لیاقت حسین اتنا ہی دیوانہ ہوگیا تھا کہ اس نے اس اہم نکتے پر بھی غور نہیں کیا...... پہلی بار بھی الماس کو اغوا کرنے والوں سے بچانے میں لیاقت حسین کا ہاتھ تھا......

اس بار بھی یہی کام آیا...... اس نے عین وقت پر الماس کے ساتھ جاکر فرحین کے لیے سامان خریدنے والی بات کیوں کی تھی؟ کیا اسے پہلے سے علم تھا کہ کیا سچویشن پیش آسکتی ہے؟ اگر ایسا تھا تو اس نے قبل از وقت اس خدشے کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ ایسی کیا مصلحت تھی جس نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کردیا تھا...... اسے بھی الماس کے اغوا کیے جانے کا علم بعد میں کسی اور ذریعے سے ہوا...... وہ ذریعہ کیا تھا......؟

☆☆☆

مخصوص ٹارچر سیل کے ساؤنڈ پروف کمرے میں وہ تمام خطرناک اور ضروری سامان موجود تھا جو کسی مجرم کی زبان کھلوانے کے لیے بہت موثر ہوسکتا تھا۔

کمرے میں ایس پی اورنگ زیب اور دو دیگر اہلکاروں کے علاوہ چاروں مجرم بھی تھے جنہیں شیخ حامد کے بنگلے کے باہر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ چاروں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، دوسرکار کے اہلکار بھی ان کی پشت پر موجود تھے جو افسران ڈیوٹی کے احکامات پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے کے عادی تھے، ملزمان کی چیخ وپکار اور دم توڑتی سسکیوں پر بھی وہ ہمیشہ گونگے اور بہرے خاموش کھڑے رہتے تھے، وہ موت اور زندگی کے اس ہولناک کھیل کو دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہوچکے تھے۔

اورنگ زیب کی خونخوار نظریں ان چاروں کو باری باری دیکھ رہی تھیں جو بہ ظاہر بے پروائی نظر آرہے تھے۔ دس منٹ تک ان کے درمیان ایک خاموش اور اعصاب شکن جنگ جاری رہی پھر اورنگ زیب نے ان چاروں کو بیک وقت انتہائی سفاک لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس حقیقت سے ضرور واقف ہوگے کہ تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے اور...... اس مہمان خانے میں کس مقصد کے تحت لایا گیا ہے؟ ایک بات اور بھی کان کھول کر سن لو...... میں کسی کے رعب میں آنے والا آفیسر نہیں ہوں۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں، یا تو شرافت سے کھل کر میرے سوال کے جواب دو۔ تعاون کی صورت میں تمہارے ساتھ نرم سلوک بھی ہوسکتا ہے۔ کسی کی پشت پناہی کے گھمنڈ میں رہے تو دردناک موت تمہارا مقدر بھی بن سکتی ہے۔ فی الحال کسی کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت بھی نہیں ہے کہ تمہیں حراست میں لیا گیا تھا۔ اس لیے کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہونا۔ تمہیں پوچھنے والوں کو تمہاری قبر کا نشان تک بھی نہیں ملے گا۔ میں مردوں کی طرح کھل کر تم سے دوٹوک بات کروں گا۔ تمہاری عافیت بھی اسی میں ہے کہ کسی آنا کانی سے کام نہ لینا، تعاون کرنے کی صورت میں، میں تمہارے کسی کام آنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ یہ کسی پولیس آفیسر کا نہیں، ایک مرد کا وعدہ ہے۔"

وہ چاروں اس کی بات توجہ سے سنتے رہے، انہوں نے کوئی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، بہ ظاہر وہ ہراساں یا خوفزدہ بھی نظر نہیں آرہے تھے اس لیے کہ وہ اس قسم کی باتیں سننے کے عادی ہوچکے تھے۔ اورنگ زیب ان کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے بے حد سرد مہری سے انہیں مخاطب کیا۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا جواب دیں۔" ایک دراز قد والے نے شانے اچکا کر کہا۔ "ہمیں کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے، ہم یہ بھی نہیں جانتے۔"

"تمہارے قبضے سے جو بغیر لائسنس کا اسلحہ ملا ہے اس کے لیے کیا کہوگے؟"

"آپ کس اسلحہ کی بات کر رہے ہیں؟" دوسرے

قابل تعریف

لارڈ ارون ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، ان کا دایاں ہاتھ جنگ میں کٹ چکا تھا۔ مختلف اخبارات نے اس تقرر پر مخالفانہ انداز میں لکھا لیکن مولانا سالک نے "افکاروحوادث" میں جس طریقے سے لکھا، وہ قابل تعریف ہے، لکھتے ہیں۔

"ہندوستان پر حکومت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

چاند کے مہینے

علامہ محمد مغربی نے لکھا ہے کہ قمری کیلنڈر میں چار مہینوں تک مسلسل تیس کا چاند ہوسکتا ہے مگر اس کے بعد نہیں اور 29 کا چاند مسلسل تین ماہ تک ہوسکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ کسی رمضان کی پانچ تاریخ جس دن ہو، اگلے رمضان کا پہلا روزہ لازماً اسی دن ہوتا ہے۔ علامہ مغربی کہتے ہیں کہ اس قاعدے کو 50 سال آزمایا گیا ہمیشہ صحیح نکلا لیکن ظاہر ہے ان تمام حسابات کی حیثیت اندازے سے زیادہ نہیں۔ احکام شریعت میں اعتبار رویت ہلال ہی کا ہے۔

جسٹس مفتی تقی عثمانی کی کتاب "تراشے" سے اقتباس

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

نے حیرت کا اظہار کیا۔ ’’ہم اس وقت آپ کے قبضے میں ہیں، آپ جو چاہے الزام ہمارے سر تھوپ دیں لیکن عدالت میں ہمارا بیان یہی ہوگا کہ......‘‘

’’شٹ اپ......‘‘ اورنگ زیب نے گرج کر جواب دیا۔ ’’پرانے اور گھسے پٹے ہتھکنڈوں کو بھول جاؤ۔ شرافت کی زبان نہیں سنو گے تو تمہارا عدالت تک جانے کا خواب بھی تمہارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے جناب......‘‘ تیسرے نے بھی اپنے دو ساتھیوں کی طرح بے جگری سے کہا۔ ’’پھر......آپ بولتے رہیں، ہم سنتے رہیں گے۔‘‘

’’کیا تمہارا بھی یہی جواب ہے؟‘‘ اورنگ زیب نے چوتھے کو سفاک نظروں سے گھورا۔

’’میں تسلیم کرتا ہوں سر کہ میں نے گولیاں چلائی تھیں لیکن کسی کو مارنا نہیں، صرف خوفزدہ کرنا مقصود تھا۔‘‘

اس کے جواب پر اورنگ زیب کے علاوہ باقی تین بھی چونکے تھے۔ چوتھے آدمی کو ان تینوں نے بڑی حقارت سے گھورا تھا۔ اورنگ زیب کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ چوتھا شخص جو درمیانہ قد اور دہرے جسم کا مالک تھا اس کا تعلق باقی تینوں میں سے نہیں تھا۔

’’تم نے کس کو خوفزدہ کرنے کی خاطر گولیاں چلائی تھیں......؟‘‘

’’اسی نمرود کو جس نے سب کا جینا حرام کر دیا ہے۔‘‘ اس بار بھی تلخ لہجے میں جواب دیا گیا۔ اس نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن اورنگ زیب سمجھ گیا کہ نمرود کے حوالے سے اس کا اشارہ شیخ حامد ہی کی طرف تھا۔ ساتھ کھڑے ہوئے باقی تینوں بہ دستور اسے نفرت سے دیکھ رہے تھے۔

’’تمہارا تعلق کس گروپ سے ہے......؟‘‘ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس بار انداز جارحانہ نہیں تھا۔

چوتھے فرد نے باقی تینوں کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر اس نے ایک اہلکار کو اشارہ کیا کہ چوتھے شخص کو سائڈ روم میں منتقل کر دیا جائے۔ اورنگ زیب کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد وہ دوبارہ واپس آ گیا۔

’’اب تم تینوں کیا کہو گے......؟‘‘

’’ہم نے ان حرامیوں کو مارنے کی کوشش کی تھی جو بنگلے پر حملے کے ارادے سے آئے تھے۔‘‘ تینوں میں سے ایک نے تلخ انداز میں کہا۔

’’کس کے بنگلے کی بات کر رہے ہو؟‘‘

’’یہ تم بھی جانتے ہو......پھر ہم سے کیوں پوچھ رہے ہو؟‘‘ دوسرے ساتھی نے چمک کر کہا۔ ’’ہماری زبان پر اس کا نام مرتے دم تک نہیں آئے گا۔ تم بھی اپنے دل کی حسرت نکال کر دیکھ لو۔ تم سے پہلے جو افسران چھاتی ٹھونک کر سامنے آئے تھے۔ ایک تجربے کے بعد وہ بھی بھیگی بلی بن گئے تھے۔‘‘

’’گڈ......‘‘ اورنگ زیب نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ’’مجھے اب تمہارا جواب پسند آیا۔ تمہارے مشورے کے مطابق ایک تجربہ میں بھی ضرور کروں گا۔ بھیگی بلی کون بنتا ہے اور شیر کون؟ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جائے گا اور تمہیں ہتھیلی لگانے والے کو بھی۔‘‘

پھر اورنگ زیب کے حکم پر ان تینوں کو ننگا کر کے چھت سے لٹکتی زنجیروں میں باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ خود وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑے سکون سے بولا۔ ’’جب انتڑیاں باہر آنے لگیں تو بتا دینا۔ رعایت کی گنجائش تمہاری زبان کھولنے سے مشروط ہوگی۔‘‘

’’پھر سوچ لو آفیسر......‘‘ ایک نے تلملا کر کہا۔ ’’تمہیں یہ کارروائی بہت مہنگی پڑے گی۔‘‘

اورنگ زیب نے اس کے جواب میں سادہ لباس اہلکاروں کو دوسرا حکم دیا جس کے بعد ان کے سروں کے نیچے گیس کے برنر آن کر دیے گئے۔ ’’ہم نے زبان کھول دی تب بھی تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے ہم جس کے لیے کام کرتے ہیں۔‘‘ دوسرے نے جواب دیا۔

’’پریشان مت ہو......‘‘ اورنگ زیب نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ’’ہر پندرہ منٹ بعد آگ کی لو تیز اور تمہاری زنجیریں نیچے ہوتی رہیں گی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم فر فر بولنے لگو گے۔‘‘

تینوں نے زبانیں بند رکھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کے فضا میں معلق جسموں اور بھڑکتی آگ کی لپٹوں کا فاصلہ کم ہوتا رہا، تین منٹ بعد ان کے چہرے سرخ ہونے لگے، انہوں نے اپنا منہ بند کر رکھا تھا لیکن حالت بتدریج غیر ہوتی جا رہی تھی پھر پندرہ منٹ بعد ایک چیخنے لگا۔ ’’بگ باس کو خبر ہوگئی تو تمہارا انجام ہم سے بھی بھیانک ہوگا۔ اب بھی وقت ہے تمہارے پاس۔‘‘

’’پروا مت کرو، میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔‘‘ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے تو تینوں ہی کی حالت غیر

ہونے لگی، ان کے منہ شدت تکلیف سے کھل گئے، کھایا پیا باہر آنے لگا تو ایک نے چیخ کر کہا۔ ’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’مجھے بھیگی بلیاں یاد آ رہی ہیں......تم بھی اپنے آدم خور کو پکارو۔‘‘

’’ہم مر جائیں گے لیکن زبان نہیں کھولیں گے۔‘‘ دوسرا تڑپتے ہوئے بولا۔

’’تم مرد کے بچے ہو تو اپنے پالتو کتوں سے کہو کہ ہمیں گولیاں مار دیں۔‘‘ تیسرا بلبلانے لگا۔

اورنگ زیب نے زبان نہیں کھولی، بھڑکتی آگ اور تین لٹکے ہوئے مجرموں کے درمیان کشمکش جاری تھی جب ڈی آئی جی کمرے میں داخل ہوا، اس نے تینوں مجرموں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی پھر سادہ لباس والوں کو عمل روکنے کا اشارہ کر کے اورنگ زیب کو لے کر باہر چلا گیا۔

’’چوتھا مجرم کہاں ہے؟‘‘ اس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

’’اس نے زبان کھول دی ہے۔ میں اس کا بیان بعد میں لوں گا۔‘‘ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

’’یہ تینوں حرامزادے جو فضا میں مچل رہے ہیں......شیخ حامد کے ذاتی پہرے دار ہیں جو گھر کی حفاظت پر مامور تھے، میں اس کے ایک آدمی کو ساتھ لایا ہوں، وہ ان کی شناخت کر لے گا۔‘‘ ڈی آئی جی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ’’میں جانتا ہوں کہ یہ سب پولیس کی وانٹڈ لسٹ پر بھی ہیں لیکن......‘‘

’’آپ انہیں چھوڑنا چاہتے ہیں؟‘‘ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس کے تیور بدلنے لگے تھے۔

’’مصلحت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔‘‘ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’ہم میں کسی ایک کو یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ وہ ابھی تک اس باسٹرڈ کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح ہم اندر کی باتیں بھی معلوم کر سکیں گے۔ پلیز، مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے آپ لوگوں سے جو وعدہ کیا ہے اس پر بھی قائم رہنے کو تیار ہوں لیکن یہ بھی نہ بھولیں کہ میری اور سراج کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے جہاں تک اس کی اور آپ کی ہے......اب فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے، میں آپ پر ان تینوں کو چھوڑنے کی خاطر زور نہیں دوں گا۔‘‘

اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کے انداز تخاطب کو اپنے تجربوں کی روشنی میں تولا۔ وہ ہار تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آغا منظور کو ہٹا کر کوئی دوسرا ڈی آئی جی مرکز سے تبدیل ہو کر آ گیا تو اسے ایک وقت میں کئی محاذ پر زور آزمائی کرنی پڑے گی۔ سراج کے ساتھ بھی ایسی ہی کوئی صورت پیش آنے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ جاتا۔ کچھ دیر غور و خوض کرنے کے بعد اس نے ڈی آئی جی سے کہا۔

’’آپ چاہتے ہیں تو ان تینوں کو چھوڑ دیں، میں چوتھے مجرم کو لے کر جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کارآمد ہو۔‘‘

ڈی آئی جی نے سکون کا سانس لے کر اس کی تجویز منظور کر لی۔ اورنگ زیب نے دوبارہ ٹارچر روم میں قدم نہیں رکھا۔ چوتھے مجرم کو دوسری جانب سے بلا کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر تھانے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر اس کا ذاتی گارڈ سادہ لباس میں موجود تھا۔

’’تم کس کے آدمی ہو......؟‘‘ دس منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے چوتھے مجرم سے سوال کیا جو......اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔

’’آپ نے جگا کا نام ضرور سنا ہوگا۔‘‘

’’آئی۔سی‘‘ اورنگ زیب جگا کا نام سن کر چونکا پھر اس نے دوبارہ خشک لہجے میں سوال کیا۔

’’کیا تمہیں صرف شیخ حامد کو ہراساں کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟‘‘

’’آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے صاحب۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ’’میرے ساتھ کچھ دوسرے ساتھی بھی تھے جو پولیس کے آنے سے پہلے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں بھاگتا تو شاید وہ تین، جو آپ کے قبضے میں ہیں مجھے زندہ نہ جانے دیتے۔‘‘

’’کیا تم ان کو جانتے ہو......؟‘‘

’’ایک سے بہ خوبی واقف ہوں جو تینوں میں سب سے اہم ہے، اسے تین افراد کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا لیکن شیخ حامد کے خاص آدمیوں نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح قانون کے شکنجوں سے صاف بچا لیا۔ اصل واردات کی فائلیں بھی غائب کر دی گئیں۔‘‘ اس نے کچھ توقف سے پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ’’شیخ حامد نے ایسے قاتلوں اور دہشت گردوں کی ٹیم بنا رکھی ہے، کچھ اور لوگ بھی میری نظر میں ہیں۔‘‘

’’جگا کہاں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ وہ بھی کسی وجہ سے روپوش ہے۔‘‘

’’آپ نے غلط نہیں سنا صاحب......وہ روپوش نہیں ہے لیکن قتل و غارت گری کے خلاف ہے اس لیے سامنے نہیں آ رہا۔ جس دن آ گیا تو شیخ حامد کو بھی دن میں تارے نظر

آ جائیں گے۔''

اورنگ زیب بہت دیر تک اس سے بڑی کارآمد باتیں معلوم کرتا رہا پھر بولا۔

''تمہارا نام کیا ہے......؟''

''کبھی اکرم تھا صاحب لیکن اب وکی پینتھر کے نام سے مشہور ہوں۔'' اکرم نے لمبی سانس لے کر جواب دیا۔ ''مجھے بھی قانون کی نظروں میں مفرور سمجھا جارہا ہے جو گاؤں سے بھاگ کر ادھر شہر میں آ گیا۔ جگا نے پناہ نہ دی ہوتی تو شاید فاقوں سے تنگ آ کر مجرم بھی بن جاتا۔''

''کیا جرم تمہارے نام پر لگا تھا؟''

''گاؤں میں میری ایک پڑوس کی جوان لڑکی کا چکر تھا صاحب جسے زمیندار کے آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے، میرا نام بلاوجہ لکھوا دیا گیا میں صاف انکاری ہو گیا تھا، جب اغوا میں ملوث نہیں تھا تو پھر ڈر بھی نہیں تھا لیکن...... آٹھ دس روز بعد اس لڑکی کی ادھڑی ہوئی اور روندی گئی لاش میرے گھر کے قریب کھیتوں میں ملی تو میں گرفتاری کے ڈر سے فرار ہو گیا۔''

''تمہارے گھر والوں کا کیا بنا ہوگا؟'' اورنگ زیب نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''گھر میں میرا رونے والا کون تھا صاحب، ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کرلی تھی، وہ بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اجلی نہیں تھی۔ زمیندار کے لڑکوں سے بھی اس نے چکر چلا رکھا تھا۔ اسی کے اشارے پر پڑوس کی لڑکی کو بھی اٹھوا لیا گیا تھا، میں فرار نہ ہوتا تو وہ میرا نام لینے سے دریغ نہ کرتی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا جگا کے ہراساں کرنے کے بعد شیخ حامد اس کا پیچھا چھوڑ دے گا؟''

''کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوئی جناب۔'' اکرم نے کسمسا کر کہا۔ ''یہی بات میں نے اور دوسرے ساتھیوں نے بھی استاد کی کھوپڑی میں بٹھانے کی کوشش کی تھی ایک بار تخت یا تختہ والا کھیل کرلیں۔ جو جیتے وہی سکندر۔ لیکن استاد نے ہماری بات نہیں مانی۔''

''پھر تم لوگوں نے بلاوجہ خود کو خطرے میں ڈالنے کی غلطی کیوں کی؟'' اس بار اورنگ زیب نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا صاحب۔'' اکرم نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''سچ کیا ہے یہ اوپر ہی والے کو معلوم ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ استاد نے یہ ہراساں کرنے والا قدم کسی اور کے مشورے پر اٹھایا ہے۔''

''اور کون سے تمہاری کیا مراد ہے......؟''

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم جناب لیکن سنا ہے وہ کوئی بیوہ عورت ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے کوئی پرانا حساب چکتا کرنا چاہتی ہے۔ استاد کے آدمی اس عورت کے لیے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔''

اورنگ زیب بیوہ عورت کے حوالے پر چونکا لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اکرم سے پوچھا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟ قانون نے بہرحال تمہیں غیرقانونی حرکت میں ملوث پا کر گرفتار کیا ہے۔''

''آپ کے رحم و کرم پر ہوں صاحب...... چاہیں تو اندر کردیں یا چھوڑ دیں۔ میں ہیر پھیر بھی نہیں کروں گا۔''

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک سنسان راستے کے درمیان روک دی، اکرم سے اترنے کو کہا تو وہ نیچے اترنے کے بعد ہاتھ باندھ کر بولا۔

''صاحب...... اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرا موبائل نمبر نوٹ کرلیں، کبھی ضرورت پڑے تو یاد کرلیجیے گا۔ میں آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔''

اورنگ زیب نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر ڈیش بورڈ پر پڑے پیڈ کو اٹھا کر وکی پینتھر کا موبائل نمبر نوٹ کرلیا۔

''میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا صاحب۔'' اس نے اورنگ زیب سے کہا۔ ''کم از کم ایک بار اس خادم کو خدمت کا موقع ضرور دیجیے گا۔''

''تم نے کہا تھا کہ تم ان تینوں میں سے ایک کو جانتے ہو، جو سب سے اہم ہے؟''

''میں نے غلط نہیں کہا تھا صاحب۔ اسی واقفیت کی وجہ سے اس نے مجھے جہنم رسید نہیں کیا۔ اب بھی پہلی فرصت میں وہ مجھے تلاش کر کے استاد تک پہنچنے کی کوشش ضرور کریں گے۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' اورنگ زیب نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''تم ان تینوں کے پتے ٹھکانے کا کھوج لگا کر مجھے بتاؤ گے۔ اس کے بعد باقی کام میرے ذمے ہوگا۔''

''آپ کا موبائل نمبر......''

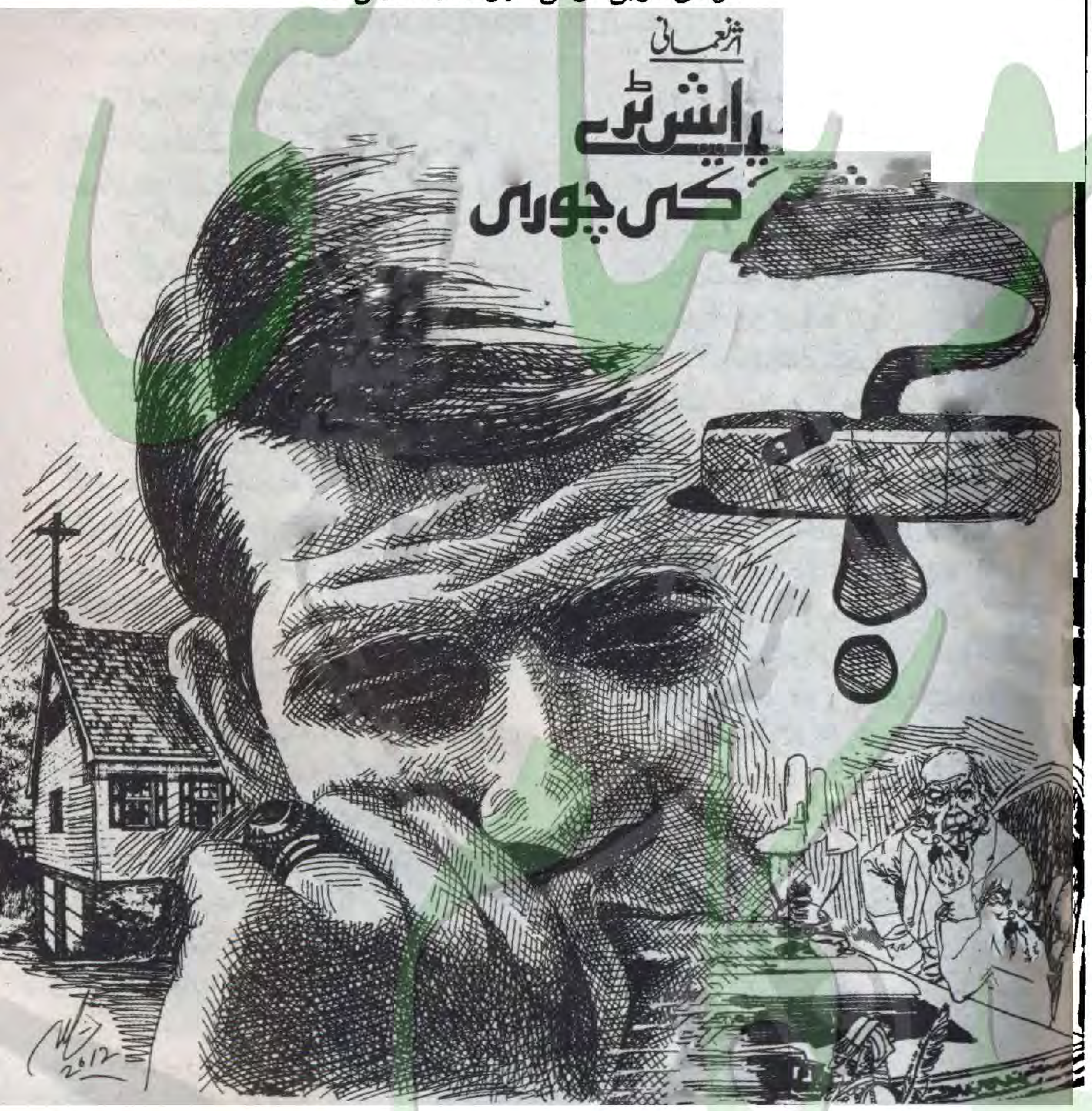
''میں خود تم سے ایک دو روز میں رابطہ قائم کروں گا۔'' اورنگ زیب نے سپاٹ آواز میں کہا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

سہولتوں کی فراہمی میں انسان ایسے آلات ایجاد کربیٹھا ہے کہ جرائم کی دنیا میں حالات کے گرداب سے نکل ہی نہیں پاتا۔ یہ اور بات کہ کچھ لوگ مشق کے تسلسل سے مسائل کا حل تلاش کرلیتے ہیں۔ اس کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا... جو قانون کی مدد کرنے کے لیے غیرقانونی کام بھی بڑے قاعدے سے کرنے کے قائل ہوتے ہیں... یہی انفرادی خوبی اس کی شہرت کا باعث بنی...

اثر نعمانی

پائیشڑے کی چوری



نام نہاد فلاحی اداروں کی قلعی کھولتی ایک پراثر تحریر

فرسٹ سٹی سیونگ بینک کا ہیڈ کوارٹر لیگزنگٹن ایونیو کی ایک عالیشان بلند و بالا عمارت میں واقع تھا۔ تیز رفتار لفٹ میں 56 ویں منزل پر جاتے ہوئے نک ویلوٹ سوچ رہا تھا کہ اس کی نوعمری کے زمانے کے مقابلے میں آج کل بینک اور ان کا انتظام کتنا بدل گیا ہے اور غالباً اسی کے ساتھ بینک لوٹنے کے طریقے بھی جس وقت وہ سیکریٹری کے ساتھ ایک کمپیوٹر روم سے گزر رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اس مشینی دور میں اگر کوئی ان کمپیوٹروں کو دھوکا دے سکے تو اس کے لیے

کسی ہتھیار اور تشدد کے استعمال کے بغیر بڑی سے بڑی رقم چرانا کس قدر آسان ہوگا۔ بینک کی طرح بینک کے صدر فلپ نارٹن کا دفتر بھی پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ فلپ نارٹن دورِ حاضر کا ایک کامیاب بینکر ہی نہیں، سیاست کے میدان میں تیزی سے ترقی کرتا ہوا ایک ذہین و خوبصورت سیاستداں بھی تھا۔ اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا وہ خاصا نمایاں اور ممتاز نظر آ رہا تھا۔

''تمہارا نام نک ویلوٹ ہے؟'' اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا ہے۔''

نک مسکراتے ہوئے پیش کردہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے حیرت ہے کہ تم نے کس سے سنا ہوگا؟ مجھے معلوم نہیں کہ اب میری شہرت بینکاروں کے حلقوں تک بھی پہنچ چکی ہے۔''

''آج کل بینکروں کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔'' نارٹن نے کہا۔ ''ہر وہ شخص جس کے پاس کچھ دولت ہے کسی نہ کسی انداز میں بینک سے متعلق ضرور ہوتا ہے اور پھر ہم تو اس بارے میں بھی بہت سے سوالات نہیں کرتے ہیں کہ جو روپیہ جمع کرایا جا رہا ہے وہ کہاں سے آیا۔ لیکن یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ میں نے تمہیں ایک خاص مشورے کے لیے زحمت دی ہے اور میں تمہارے وقت کی پوری قیمت دینے کے لیے آمادہ ہوں۔''

''مشورہ!'' نک نے چونک کر پوچھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس بات کی توقع کی جا رہی ہے۔

''میں اپنی خدمات معاوضے پر دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور جب تم نے مجھے بلایا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں میری خدمات کی نوعیت بھی معلوم ہوگی؟''

''جانتا ہوں۔'' نارٹن بولا ''تم معمولی اور بے قیمت چیزیں چراتے ہو اور اس کے لیے تمہاری فیس بیس ہزار ڈالرز ہے۔''

''اب میری فیس پچیس ہزار ہے۔ گرانی اور زندگی کی بڑھتی ہوئی قدروں نے آخرکار مجھے بھی اپنی فیس میں اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''فیس کچھ بھی ہو مجھے تمہاری خدمات کی نہیں تمہاری ماہرانہ رائے کی ضرورت ہے۔ میری ایک چیز چرالی گئی ہے۔ ایک بے قیمت شے...... اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟''

''میں کوئی جاسوس یا سراغ رساں نہیں ہوں مسٹر نارٹن۔''

''لیکن اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی طویل مدت میں تمہیں ایسی بے شمار وجوہات سے سابقہ پڑا ہوگا جو معمولی اور بے حقیقت چیزیں چرانے کا مقصد رہی ہوں۔''

''چرایا کیا گیا ہے؟'' نک نے پوچھا۔

''میری میز پر رکھی رہنے والی شیشے کی ایک بھاری ایش ٹرے۔''

''کچھ معلوم ہے کہ اسے کس نے چرایا؟''

''ہاں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کیوں چرالیا۔ وہ اس وقت غائب ہوئی جب میں ایک مذہبی شخصیت پادری فیلکس میبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ صرف وہ ہی اسے چرا کر لے جا سکتا تھا۔''

''ایش ٹرے کس طرح کی تھی؟''

''اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس طرح کی ایش ٹرے عام ملتی ہے۔ شفاف شیشے کی مربع نما جس میں راکھ جھاڑنے کے لیے دائرہ نما گڑھا بنا تھا۔ وہ اندازاً پانچ انچ چوڑی اتنی ہی لمبی اور دو انچ موٹی تھی۔''

''کچھ پادری میبی کے بارے میں بتاؤ۔''

''اس کا پورا نام فیلکس میبی ہے۔ وہ ڈن ٹروہوپ نامی چرچ کا منتظم اعلیٰ ہے۔ یہ چرچ لانگ آئی لینڈ پر واقع ہے۔ پادری میبی ایک دوسرا چرچ بنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بینک سے قرضہ لینے کے لیے آیا تھا۔''

''تم بینک کے صدر ہو کیا قرض وغیرہ جیسے معاملات نمٹنے کے لیے بینک میں کوئی علیحدہ افسر نہیں ہے؟''

''دراصل میرے ایک دوست نے سفارش کی تھی کہ میں اسے ملاقات کا موقع دوں۔'' نارٹن نے جواب دیا۔ ''شاید میری غلطی تھی۔ آخر میں نے اسے بینک کے قرض منظور کرنے والے افسر کے پاس بھجوا دیا لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے قرض نہیں دے سکیں گے۔''

''اس نے کتنے قرض کی درخواست کی تھی؟'' نک نے پوچھا۔

''ڈھائی لاکھ ڈالرز، جب کہ اس کے پاس چرچ کے نام کے علاوہ کوئی ضمانت بھی نہیں۔ اس کی درخواست ہرگز منظور نہیں ہوگی۔''

''کیا وہ ایش ٹرے اپنے کوٹ کے اندر چھپا کر لے گیا؟''

''ایسا ہی ہوا ہوگا۔ میں سگریٹ نہ بھی پی رہا ہوں تب بھی باتیں کرتے ہوئے عموماً اس سے کھیلتا رہتا ہوں۔ جیسے ہی وہ گیا میں نے دیکھا کہ ایش ٹرے غائب ہو چکی ہے۔''

''اس وقت ٹرے میں راکھ وغیرہ تو ہوگی؟''

''ممکن ہے ایک آدھ ٹوٹا پڑا ہو۔ آج کل میں سگریٹ کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ سگریٹ پیتا ہی نہیں۔''

''راکھ کے علاوہ کوئی چیز مثلاً کوئی پھٹا ہوا کاغذ کی پیکنگ کا ٹکڑا وغیرہ۔''

''نہیں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔''

''کیا اس پر بینک کا نام یا نشان کندہ تھا؟''

''نہیں۔''

''اس واقعے کو کتنا وقت گزر چکا؟''

''تین دن۔ گزشتہ پیر کا واقعہ ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس معاملے میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' نک نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ شاید وہ چیزیں چرانے کی بیماری میں مبتلا ہوگا۔''

''تمہارے تجربے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا؟''

''بالکل نہیں۔''

''مجھے تو امید تھی کہ تم سے اس معاملے میں مفید مدد مل سکتی ہے۔'' نارٹن نے کچھ مایوسی سے کہا۔

''کاش میں کچھ کر سکتا۔'' نک نے کہا۔ ''لیکن جیسا کہ میں نے بتایا میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔ ''ممکن ہے کبھی کوئی ایسی بات پیش آئے جس کا میری لائن سے کوئی تعلق ہو تب میں بڑی خوشی سے تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' نارٹن بھی کھڑا ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر ہچکچا رہا ہو۔

نک ویلوٹ دروازے تک گیا۔ ابھی اس کا ہاتھ ہینڈل تک ہی پہنچا تھا کہ نارٹن کی آواز سنائی دی وہ بہت آہستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اگر تم پادری میبی سے وہ ایش ٹرے چرا کر لا دو تو میں تمہیں پچیس ہزار ڈالرز دینے کے لیے تیار ہوں۔''

☆☆☆

نک ویلوٹ کبھی اپنے موکلوں سے ان کے مقصد کے بارے میں سوالات نہیں کرتا تھا اور نہ اس نے نارٹن سے ہی پوچھا کہ اسے اس بے حقیقت ایش ٹرے کی ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس کے لیے اتنی رقم خرچ کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ نک نے اس کام کو بھی اسی طرح قبول کر لیا جس طرح وہ پہلے بھی اس نوعیت کے کام لیتا رہا تھا۔ مطلوبہ چیز لانے کا وعدہ کیا اور پادری فیلکس میبی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا جو کوئی ایسا دشوار کام ثابت نہیں ہوا۔ چرچ ڈن ٹروہوپ کو فون کرنے ہی سے اس کا کام بن گیا اور پادری میبی نے اسی سہ پہر اسے ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔

لیکن جب نک ویلوٹ دو بجے دن کے قریب چرچ پہنچا تو اسے توقع سے زیادہ معلومات ہاتھ آ گئیں۔ ایک سرخ بالوں والی لڑکی اپنے کندھے سے ایک ٹیپ ریکارڈر لٹکائے چرچ کے چوکیدار سے اندر جانے کے لیے الجھ رہی تھی۔

''تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔'' وہ کہہ رہی تھی ''میرا نام لان لارنس ہے۔ میرا تعلق ایک ٹی وی چینل نمبر چھ کی خبروں کے شعبہ سے ہے اور میں یہاں انٹرویو لینے آئی ہوں۔''

''آج کوئی انٹرویو نہیں ہوگا۔'' چوکیدار نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ نک نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری جانب ایک ٹی وی کیمرا مین اپنا کیمرا اٹھائے... یہ سارا منظر محفوظ کرنے میں مصروف ہے۔ چوکیدار نے دروازہ بند کر لیا اور اسی کے ساتھ کیمرا بھی رک گیا۔ نک لڑکی کی طرف بڑھا۔

''یہاں کے لوگوں کا رویہ کچھ زیادہ دوستانہ نہیں کیوں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے لٹکے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو سنبھالا۔ اور پھر بڑی میٹھی مسکراہٹ چہرے پر لیے نک کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کیا تم پادری میبی کے پاس کسی کام سے آئے ہو؟'' اس نے کہا اور جواب ریکارڈ کرنے کے لیے مائکروفون آگے بڑھا دیا۔ نک جو اپنے ایک حالیہ کیس میں ایک کالم نگار عورت سے الجھ چکا تھا۔ پھر دوبارہ کسی ایسی ہی ٹکر کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

''نو کمنٹ۔ کوئی تبصرہ نہیں۔'' اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

''کیا تم پادری میبی سے چرچ کو دی جانے والی ٹیکس کی چھوٹ کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہو؟'' لان لارنس نے دوسرا سوال کیا نک کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے پر اندر چلا گیا۔

چوکیدار نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''بالائی منزل۔ دائیں جانب پہلا کمرا پادری صاحب کا آفس ہے۔'' وہ بولا۔

پادری فیلکس میبی نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے نک کا استقبال کیا اور ایک آرام دہ کرسی پیش کی۔ نک

نے بیٹھتے ہوئے سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھا۔ دفتر میں ایک جانب ایکوریم میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

''تم نے فون پر ہمارے پاکیزہ مقصد کے لیے کسی ممکنہ امداد کے بارے میں کچھ کہا تھا۔'' پادری میبی نے گفتگو شروع کی۔

نک نے میز پر دیکھا لیکن وہاں نارٹن کی ایش ٹرے نظر نہیں آئی۔

''میں ایک ایسے فرد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''جو اس سلسلے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن دروازے پر ایک جھگڑا ہو رہا تھا جو مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔ آخر کیا معاملہ تھا؟''

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ رپورٹر مجھے ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں یہ لوگ ون ٹرو ہوپ چرچ کو بھی مغربی ساحل پر واقع ان اداروں کی طرح قیاس کرتے ہیں جہاں ہر قسم کی بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے۔''

''تمہارے اس چرچ سے کتنے لوگ وابستہ ہیں؟'' نک ویلوٹ نے پوچھا۔

''اس علاقے میں کم و بیش دو سو اور قومی پیمانے پر لگ بھگ سات سو افراد۔'' پادری میبی نے جواب دیا۔

''یہ تو کچھ زیادہ نہیں۔''

''مگر ہمارے ممبر تبلیغی جذبے سے سرشار ہیں۔'' پادری میبی نے کہا ''ہمیں امید ہے کہ ہم سب اپنی مشترکہ جدوجہد سے آئندہ دس سال میں دس لاکھ افراد کو مسیحیت کے دامن میں لے آئیں گے؟''

نک نے بڑے سرسری انداز میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

''کیا تمہارے پاس کوئی ایش ٹرے نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''براہ کرم سگریٹ نہ پینا۔'' پادری میبی نے جلدی سے کہا۔ ''یہ ہمارے چرچ کے اصول کے خلاف ہے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' نک نے پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایش ٹرے اسی اصول کی وجہ سے چرائی گئی ہو۔ مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ کوئی لوگوں کو سگریٹ نوشی سے روکنے کے لیے ان کی ایش ٹرے نہیں چرایا کرتا۔

''ہم نے اپنے چرچ کے لیے کئی مفید اور عظیم منصوبے بنائے ہیں۔'' پادری میبی کہہ رہا تھا۔ ''اور ہمیں اس عظیم مقصد کے لیے لوگوں کے عطیات کی ضرورت ہے۔''

''اگر تمہارے ممبران کی اس تیز رفتاری سے بڑھنے کی توقع ہے تب تو یہ موجودہ چرچ تمہارے لیے چھوٹا پڑے گا۔'' نک نے کہا۔

''یقیناً۔'' پادری میبی نے جوش میں کہا ''ایک نئے چرچ کی تعمیر ہمارے ایجنڈے پر سب سے پہلا کام ہے مگر سوال اخراجات کا ہے۔''

''تم نے قرض لینے کوشش نہیں کی؟''

''ہاں مگر بینک قرض دینے میں ہچکچا رہے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرسٹ سٹی سیونگ بینک کی پالیسی ایسے قرضہ جات کے سلسلہ میں کافی نرم ہے۔''

''ہم نے وہاں بھی قرض کی درخواست دے رکھی ہے مگر کامیابی کی زیادہ امید نہیں۔ میں خود اس ہفتے کے شروع میں بینک کے صدر سے ملا تھا۔ مجھے وہ کوئی ایسا آدمی محسوس نہیں ہوا جو خدا کی خوشنودی کے لیے کوئی کام کرنے پر تیار ہو جائے۔''

نک ویلوٹ کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ یہ پادری اپنے مقصد میں کس حد تک سنجیدہ ہے۔ اپنے زمانے میں اسے بہت سے فریبی اور جعلساز افراد سے سابقہ پیش آیا تھا اور ان میں یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں شکار کھیلا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا کہ پادری میبی ان سے مختلف ہو ممکن ہے اس نے نارٹن کی ایش ٹرے اپنی مذہبی مجالس کے دوران لوبان واگر سلگانے کے لیے چرائی ہو۔ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد نک اس وعدے کی ساتھ رخصت ہو گیا کہ وہ اس ممکنہ عطیہ کے سلسلے میں جلد ہی دوبارہ رابطہ قائم کرے گا۔ پادری بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ دروازے تک نک کو چھوڑنے گیا۔

چرچ سے باہر نکلنے کے بعد نک ویلوٹ کا سامنا ایک بار پھر اسی لڑکی لان لارنس سے ہو گیا۔ اور اسے اس پر کوئی حیرت بھی نہیں ہوئی کہ لان لارنس اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

''دیکھو؟'' وہ اپنے دونوں ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی مائکروفون نہیں ہے۔ کیا تم اب مجھ سے گفتگو کرنا پسند کرو گے؟''

''کس بارے میں؟'' نک نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''پادری میبی کے بارے میں۔'' لان لارنس نے جواب دیا۔ ''تم اس کے پاس کس کام سے آئے تھے؟''

''یہ ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔''

''وہ ایک چھٹا ہوا جعلساز آدمی ہے۔ تم جانتے ہو؟''

''اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھا جائے تب تو وہ کوئی ولی معلوم ہوتا ہے۔'' نک نے جواب دیا۔

''اس طرح میرا ظاہری حلیہ تو غالباً تمہیں کسی سوسائٹی گرل کی طرح نظر آرہا ہو گا لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔'' لان لارنس نے کہا۔ ''حکومت کے چھ سے زیادہ ادارے فیلکس میبی کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ چرچ کو دی گئی ٹیکس کی چھوٹ واپس لے لی جائے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ چرچ کو ملنے والے چندے اور عطیات کا بڑا حصہ پادری میبی کی اپنی جیب میں جاتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو وہ کوئی پہلا فرد نہیں ہو گا۔'' نک نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حکام ہمیشہ مذہبی اداروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچاتے ہیں خواہ مالی اعتبار سے وہاں کیسی ہی بدعنوانیاں کیوں نہ ہو رہی ہوں۔''

''یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد اور اداروں کو بے نقاب کرنے کا فرض پریس پر عائد ہوتا ہے۔''

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔'' نک نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔

☆☆☆☆

گلوریا مکان کے عقبی باغیچے میں کچھ پودے لگا رہی تھی نک کو دیکھ کر وہ اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''کہو اپنے موکل سے ملاقات کیسی رہی؟'' اس نے پوچھا۔

''جیسی ہمیشہ رہتی ہے۔'' نک نے بتایا۔ ''وہ ایک بینکر ہے، میں نے تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی فیس میں پانچ ہزار ڈالرز کا اضافہ کر دیا ہے۔''

''بہت اچھا کیا۔ کوئی خطرناک کام تو نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' نک نے اطمینان دلایا۔

جب سے گلوریا کو نک کے حقیقی پیشے کا پتا چلا تھا وہ کبھی زیادہ سوالات نہیں کرتی تھی لیکن کبھی کبھی وہ یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتی تھی کہ نک کسی خطرناک مہم میں تو نہیں الجھا ہوا ہے۔ نک نے اندر جا کر ڈاک دیکھی لیکن اس میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ ایک لفافہ اسٹار سیکیورٹی سسٹم کی جانب سے تھا۔ اپنے پیشے کے تقاضے کے مطابق نک قفل اور الارم سازی کی صنعت میں تازہ ترین جدت سے باخبر رہنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اسے اس بارے میں مختلف اداروں کی جانب سے لٹریچر ملتا رہے۔ اس لفافے میں جو پمفلٹ ملفوف تھا، اس کے مطابق ایسے قفل بنائے گئے تھے جو چابی کے بجائے مقناطیسی نوعیت رکھنے والے کارڈ سے کھلا کرتے تھے نک نے یہ معلومات پڑھنے کے بعد کچھ دیر غور کیا اور پھر پمفلٹ میں دیے ہوئے فون نمبر کو ڈائل کیا جو کہ جرسی کا تھا۔

رابطہ قائم ہونے پر نک نے سیلز منیجر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ فون پر آیا تو نک نے ایک فرضی نام سے اپنا تعارف کرایا۔

''میں ابھی تمہارا پمفلٹ دیکھ رہا تھا۔'' اس نے بتایا ''خاص طور سے وہ قفل جو مقناطیسی کارڈ سے کھل جاتے ہیں۔''

''درست ہے۔'' سیلز منیجر نے جواب دیا۔ ''آج کل ان تالوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔''

''مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کہیں ایک الیکٹرانک قفل کے بارے میں پڑھا تھا جو کہ صرف نشانِ انگشت سے ہی کھل سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟''

''یقیناً۔ دستخط یا پھر انگلی کا نشان۔ اس کا اصول بہت سادہ ہے۔ جب دو ایک جیسے نشانات مل جاتے ہیں تو قفل کھل جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں انگلی کا نشان دستخط سے زیادہ مفید اور کارآمد رہتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص ایک ہی طرح کے دو دستخط نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو لوگ دستخط کو ترجیح دیتے ہیں انہیں نمونے کے دستخط کا ایک کارڈ اپنے پاس رکھنا پڑتا ہے اور یہ صورت تحفظ کے نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر نہیں۔''

''کیا تم انگلی کے نشانات والے قفل تیار کرتے ہو؟''

''نہیں۔ یہ بہت زیادہ مہنگے ہوتے ہیں اور چند خاص کمپنیاں ہی تیار کرتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہیں ایک فرم کا پتا دے سکتا ہوں۔ اس وقت دیر ہو گئی ہے پھر بھی شاید ان کے دفتر میں کوئی موجود ہو۔''

مزید تین فون کالیں اور نصف گھنٹا خرچ کرنے کے بعد نک کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں۔ اسے بتایا گیا کہ ایک ایسا ہی انگلی کے نشان سے کھلنے والا قفل فرسٹ سٹی سیونگ بینک نیویارک کو فروخت کیا گیا ہے، جواب دینے والے نے کہا کہ اسے افسوس ہے مگر اس ضمن میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ مگر نک کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ اگلی صبح وہ ایک بار پھر بینکر فلپ نارٹن کے آفس میں موجود تھا۔ نارٹن اسے دیکھ

کر خوش ہوا اور فوراً ہی موضوع پر آ گیا۔

”کیا تم میری ایش ٹرے لے آئے ؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ۔“ نک نے جواب دیا۔ ”مگر میں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اسے کیوں چرایا گیا تھا؟“

”کیا واقعی ۔“ نارٹن نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔

”کل تم نے بتایا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے تم عموماً اس سے کھیلتے رہا کرتے تھے۔ پادری میبی نے یقیناً تمہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے ایش ٹرے تمہاری انگلیوں کے نشانات کے لیے چرائی ہے۔“

”میری انگلیوں کے نشانات......“

”اس عمارت میں کہیں کسی جگہ کوئی دروازہ یا کوئی والٹ ایسا موجود ہے جس میں الیکٹرانک قفل لگا ہوا ہے جو صرف تمہاری انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے۔“ نک نے بتایا۔

نارٹن کا چہرہ ایک دم ستا ہوا نظر آنے لگا۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے۔ تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں یا نہیں؟ “

”میں نے تمہاری خدمات ایش ٹرے واپس لانے کے لیے حاصل کی ہیں۔ تمہیں بینک کے حفاظتی انتظام کی ٹوہ لگانے کا کوئی اختیار نہیں۔“

”مجھے شبہ ہے کہ بینک کے کسی والٹ میں کوئی ایسا قفل لگایا گیا ہو جس کے لیے ہر وقت تمہاری موجودگی کی ضرورت پڑے۔“ نک نے جواب دیا۔ ”اس لیے یہ امکان زیادہ ہے کہ وہ قفل تمہارے کسی ذاتی لاکر۔ والٹ یا اسٹرانگ روم میں لگایا گیا ہو۔ ایک اتنی بڑی عمارت میں ایسی کوئی بھی چیز بڑی آسانی سے بنائی جا سکتی ہے۔“

”بہت خوب مسٹر ویلوٹ ۔“ نارٹن نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”بس یہ کافی ہے ، بہت ہو چکا۔ مجھے تمہاری خدمات کی مزید کوئی ضرورت نہیں۔“

”لیکن ابھی میں نے تمہاری ایش ٹرے لا کر نہیں دی۔“

”کوئی بات نہیں۔ اب تم میرے لیے ہر قسم کی کوشش ترک کر دو اور کل سے اس وقت تک اپنے کام کے سلسلے میں جو بھی معاوضہ بنتا ہو اس کا حساب بتا دو تاکہ میں ادائیگی کر دوں۔“

”میں گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے کام نہیں کرتا۔“

نک افسوس کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے نارٹن سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا کہ جو بات بھی معلوم ہو اسے بتانے دوڑا جائے۔ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر نارٹن نے اسے اس لیے برطرف کر دیا تھا کہ اس نے نارٹن کے کسی ایسے اسٹرانگ روم کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا تھا جس میں انگلی کے نشان سے کھلنے والا قفل لگا ہو۔ نارٹن نک کے قبضے میں ایسی معلومات کے آنے سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ شاید یہ سوچ کر کہ نک ایک چور ہے اور کہیں وہ ان معلومات کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہ کرے۔ لیکن نک ویلوٹ جیسے آدمی کو اس آسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے نارٹن نے اپنی ایش ٹرے چرانے کے لیے مامور کیا تھا اور وہ یہ کام پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆☆

اس نے اتوار کی صبح تک انتظار کیا جب پادری میبی ایک کرائے پر لیے ہوئے ہال میں مٹھی بھر افراد کے سامنے وعظ کر رہا تھا۔ نک اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چرچ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں عقبی دروازے سے بہت ہی آسانی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پادری میبی حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں کچھ دور اندیش واقع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں قدم رکھتے ہی نک پادری کے بالائی آفس میں داخل ہوا اور تلاشی شروع کر دی۔ الماری میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ ایک فائل کیبنٹ میں بے شمار پتے موجود تھے میز کے خانوں میں صرف ایک تعجب خیز شے ملی۔ اعشاریہ 38 بور کا ایک ریوالور نہایت حفاظت سے نچلی دراز میں پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اگر خانے میں کوئی بائبل ملتی تو بھی شاید نک کو اتنی حیرت نہ ہوتی۔

پندرہ منٹ کی ناکام تلاش کے بعد نک کچھ مایوس ہو کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ چونکہ پادری میبی نے ایش ٹرے ذاتی طور پر چرائی تھی اس لیے نک کا خیال تھا کہ وہ عمارت میں کہیں ادِھر رکھی جانے کے بجائے پادری کے اپنے ذاتی آفس میں ہی ہو سکتی ہے کہیں اور رکھنے سے دوسروں کی نگاہ پڑ سکتی تھی ، جب کہ یہاں دفتر میں وہ ہر طرح محفوظ تھی۔ پھر پادری ایک ایسا آدمی معلوم ہوتا تھا جو اسے کسی ایسی جگہ

رکھنا پسند کرے گا جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہے اور ایش ٹرے ایسی چیز ہے جو کہیں بھی رکھی جا سکتی ہے لیکن شاید ایک ایسے شخص کے دفتر میں نہیں جس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتا۔ اس لیے اسے چھپانے کے لیے کوئی ایسی جگہ چاہیے جو نظروں کے سامنے بھی ہو پھر بھی عام افراد کی نگاہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

اور تب اس وقت نک کی نظر ایک بار پھر مچھلیوں کے ایکیوریم پر پڑی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے بلا تکلف اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور وہ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ بینکر نارٹن کی شفاف شیشے کی ایش ٹرے مچھلیوں کے ایکیوریم میں سب کے سامنے اور پھر بھی سب سے پوشیدہ موجود تھی۔ نک نے بڑی حفاظت سے اسے نکالا۔ اسے صاف کیا۔ وہ اس کے کوٹ کی جیبوں کے لیے بڑی تھی چنانچہ اس نے اسے ایک اخبار میں لپیٹا اور بغل میں دبا لیا۔ نہایت مطمئن انداز میں وہ جس طرح اندر داخل ہوا تھا اسی طرح عقبی دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گیا۔

پھر وہ اس جگہ پہنچا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں اس نے ایک جانے پہچانے منی ٹرک کو کھڑے دیکھا۔ ٹی وی چینل چھ کی ٹیم مصروفِ کار تھی۔

”ہیلو“ لان لارنس نے اسے دیکھتے ہی آواز دی ”کیا پادری میبی کا وعظ سننے آئے تھے؟ “

”نہیں خاص طور پر اس لیے نہیں آیا تھا۔“

”تمہیں آج کا وعظ ضرور سننا چاہیے تھا۔“ لان لارنس بولی۔

”ایسی کیا خاص بات تھی آج ؟“

”پادری صاحب نے ابھی اعلان کیا ہے کہ فرسٹ سٹی سیونگ بینک نے ان کے نئے چرچ کے لیے ڈھائی لاکھ ڈالرز کا قرضہ منظور کر لیا ہے۔“

☆☆☆☆

نک پیر کے دن ایک بار پھر بینک گیا۔ شیشے کی ایش ٹرے اس کے بریف کیس میں رکھی تھی۔ نارٹن کی سیکریٹری نے پہلے اسے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ وہ مختلف قسم کی میٹنگ میں دن بھر مصروف رہے گا لیکن نک نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”اس سے کہنا کہ میرے پاس ایک بہت اہم شے ہے جو صرف ذاتی طور پر اسے دی جا سکتی ہے۔“

سیکریٹری نے فون پر نارٹن سے کچھ بات کی اور پھر نک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

”پندرہ منٹ انتظار کرو۔ مسٹر نارٹن تمہیں بلا لیں گے۔“

ایک مختصر انتظار کے بعد نک دفتر میں داخل ہوا تو نارٹن نے بڑی سرد مہری سے استقبال کیا۔

”اب کیا بات ہے ویلوٹ ؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

نک نے بریف کیس کھول کر ایش ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”جیسا کہ تم نے ہدایت کی تھی۔ ایش ٹرے حاضر ہے۔“ اس نے کہا۔ نارٹن مبہوت سا بنا اسے دیکھتا رہا۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“ آخر اس نے پوچھا۔

”جہاں پادری میبی نے اسے چھپایا تھا۔ مچھلیوں کے ایکیورم میں جو کہ اس کے دفتر میں رکھا ہے۔“ نک نے جواب دیا۔

”ایکیوریم میں؟“ نارٹن نے حیرت سے دہرایا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خود بھی وہاں جا کر دیکھ چکے ہو۔“

”ہاں، میں وہاں گیا تھا۔“

”یہ برا ہوا کہ میرے ایش ٹرے لانے سے پہلے ہی بینک نے اسے قرض دینا منظور کر لیا۔“ نک بولا۔ نارٹن کے چہرے پر سرخی آ گئی۔

”اسے دیے جانے والے قرض کا میری ایش ٹرے کی چوری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”وہ کون سا دروازہ ہے جس کا قفل تمہاری انگلیوں کے نشان سے کھلتا ہے؟ “ نک نے پوچھا۔ ”اور اس میں کیا رکھا ہوا ہے؟“

”گڈ ڈے مسٹر ویلوٹ ۔“ نارٹن نے ناگواری سے کہا۔ ”ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“

”ابھی مکمل طور پر نہیں ۔“ نک نے کہا۔ ”تمہیں ابھی میری فیس کے پچیس ہزار ڈالرز ادا کرنا ہیں۔“

”میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے ۔ تم نے چیز برآمد کر کے واپس لانے میں دیر کر دی۔“

”واپس لانے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں لگائی گئی تھی۔“ نک نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے ایک ہفتے سے بھی کم وقت میں لا کر دے دیا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے ویلوٹ۔“

”میں اپنی فیس لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ نک بولا۔

لیکن نارٹن نے یقیناً پہلے سے اس مشکل کا اندازہ کرلیا تھا تقریباً فوراً ہی کسی پوشیدہ الارم کا اشارہ پاکر ایک مسلح گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

’’مسٹر ویلوٹ کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔‘‘ نارٹن نے گارڈ سے کہا مگر نک خود ہی کھڑا ہوگیا۔

’’میں تمہیں بل بھیج دوں گا۔‘‘ اس نے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

لفٹ میں عمارت سے باہر نکلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ یہ صورت حال پرانے ناولوں سے مختلف نہیں تھی۔ ایک خفیہ کمرا کسی بے نام راز کا حامل جسے پوشیدہ اور مقفل رکھنا ضروری نہیں ہو۔ فرق یہ تھا کہ یہ کمرا کسی قدیم حویلی میں نہیں ایک ماڈرن بلڈنگ میں تھا۔ نک سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے پادری میبی کو یہ راز معلوم ہوگیا تھا یا کم سے کم اسے اس راز کی کنجی ہاتھ آ گئی تھی۔ اس کے بل بوتے پر اس نے ڈھائی لاکھ ڈالرز کا قرضہ منظور کرالیا۔ نک کے ذہن میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ پادری میبی یقیناً ایک جعلساز اور فراڈ آدمی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آیا نارٹن بڑا بدمعاش ہے یا پادری میبی۔ مگر خواہ کوئی بھی ہو وہ اپنی فیس کیسے حاصل کرے؟ اس کے لیے ظاہر تھا کہ اسے بھی کوئی چالاکی کرنا پڑے گی۔ اس نے سوچا ممکن ہے لان لارنس کی مدد سے وہ کوئی ایسی ترکیب بروئے کار لانے میں کامیاب ہوجائے۔

☆☆☆☆

لان لارنس نے بڑی توجہ سے نک کی باتیں سنیں۔

’’مجھے واضح طور پر سمجھنے دو۔‘‘ آخر وہ بولی۔ ’’تم یہ چاہتے ہو کہ میں فرسٹ سٹی سیونگ بینک کے صدر فلپ نارٹن سے انٹرویو لوں۔‘‘

’’ہاں اور بینک کی عمارت میں اس کے آفس کے اندر‘ مجھے امید ہے کہ تم یہ کام کرسکتی ہو۔‘‘

’’اس میں میرے ہاتھ کیا آئے گا؟ ‘‘ لان لارنس نے پوچھا۔

’’ایک بہترین کہانی۔‘‘ نک نے جواب دیا۔ ’’اگر میرے شبہات درست ثابت ہوئے تب۔ یوں بھی چونکہ تم آج کل پادری میبی کے پیچھے لگی ہوئی ہو اس لیے اسے اس کی ایک کڑی سمجھ کر کام کرسکتی ہو کیونکہ بہر حال پادری کو نارٹن کے بینک نے قرضہ دیا ہے۔‘‘

’’چلو منظور ہے۔‘‘ لان لارنس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ’’لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس میں کہاں فٹ ہوتے ہو؟‘‘

’’میں تمہارے ساتھ انٹرویو لینے چلوں گا۔‘‘ نک مسکرا کر بولا ’’اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم میرے لیے جگہ پیدا کرو۔‘‘

’’یہ ناممکن ہے۔ ہماری یونین......‘‘

’’کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔‘‘ نک نے بات کاٹ دی۔

بدھ تک لان لارنس نے انٹرویو کا انتظام کرلیا۔ اور اسی روز سہ پہر کو وہ نارٹن کے دفتر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک کیمرا مین اور ایک ساؤنڈ ٹیکنیشن بھی تھے۔ آخری آدمی کا کردار نک ویلوٹ ادا کررہا تھا۔ اس نے ایک وگ اور مصنوعی مونچھیں لگا رکھی تھیں۔ یہ کوئی اچھا اور معیاری میک اپ نہیں تھا لیکن نک کو یقین تھا کہ کمرے میں لان لارنس کی موجودگی میں نارٹن کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوگا۔

’’میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مس لارنس!‘‘ نارٹن نے کہا۔ ’’آخر تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟‘‘

’’میں اس قرضے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں جو آپ نے پادری میبی کو نئے چرچ کی تعمیر کے لیے دیا ہے؟ ‘‘ لان نے جواب دیا۔

’’میں شعبہ قرضہ جات کے فیصلے کو زیر بحث نہیں لاسکتا۔‘‘

’’لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ نے ذاتی طور پر قرضے کی درخواست منظور کی ہے۔‘‘

’’چرچ ایک ایسا مذہبی ادارہ ہے جسے حکومت کی طرف سے ٹیکس کی چھوٹ دی گئی ہے اور جب تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے لیے قرض منظور نہ کیا جائے۔‘‘

’’کیا یہی بات کیمرے کے سامنے کہہ سکیں گے؟‘‘ لان نے پوچھا۔ نارٹن نے ناگواری سے کیمرا مین کی طرف دیکھا۔

’’یقیناً۔‘‘ وہ بولا ’’مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

کیمرے نے اپنا کام شروع کردیا۔ نک ساؤنڈ وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور اس وقت بھی جب وہ مائکروفون کو صحیح زاویہ پر رکھنے کے لیے میز پر جھکا، نارٹن نے اس کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر جب تک انٹرویو مکمل ہوا اور وہ لوگ رخصت ہوئے تو نارٹن کی ایش ٹرے بڑی صفائی سے اس بکس میں منتقل ہوچکی تھی جس میں ایمپلی فائر وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

ایش ٹرے پر قبضہ کرنے کے بعد نک کو چین کہاں آتا اس نے اسی سہ پہر نارٹن کو فون کیا۔

’’تم میری فیس ادا کرنے کے بعد اپنی ایش ٹرے واپس لے سکتے ہو۔‘‘ نک نے کہا۔ ’’رقم کی مالیت یاد نہ رہی ہو تو بتادوں کہ وہ پچیس ہزار ڈالر ہے۔‘‘

’’ویلوٹ!‘‘ نارٹن کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ ’’تم اسے کس طرح......؟‘‘

’’اصولاً تو مجھے دگنی فیس کا مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ اسے مجھے دومرتبہ چرانا پڑا ہے۔‘‘ نک نے بات کاٹی۔

’’اس لعنتی ایش ٹرے کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔‘‘ نارٹن نے کہا۔ ’’وہ اب مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتی۔‘‘

’’یہ بات اتنے یقین سے مت کہو۔‘‘ نک نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

اگلی صبح وہ پھر پادری میبی سے ملاقات کرنے پہنچ گیا۔ پادری نے حسبِ سابق مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

’’تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسٹر ویلوٹ۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’کیا تم نے اپنے موکل سے عطیہ کے بارے میں بات کی؟‘‘

جواب دینے کے بجائے نک اٹھ کر ایکیوریم کے پاس آ کھڑا ہوا۔

’’آج اس میں پانی کی سطح اس روز سے کچھ کم معلوم ہوتی ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’کیا؟‘‘ پادری نے حیرت سے پوچھا۔

’’ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے۔‘‘ نک نے گویا جواب دیا۔ ’’میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے فلپ نارٹن کی ایشن ٹرے تمہارے ایکیوریم سے نکالی ہے۔‘‘ نک نے بتایا۔

پادری میبی کا ہاتھ اپنی میز کی دراز کی طرف بڑھا لیکن نک اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے لات مار کر دراز بند کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کا ہاتھ دراز کی زد میں آ گیا۔ اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکلی۔

’’تمہیں ریوالور نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ نک بولا۔ ’’میں تمہارے نہیں نارٹن کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔‘‘

’’تم چاہتے کیا ہو؟‘‘ پادری میبی نے اپنا ہاتھ نکال کر کلائی مسلتے ہوئے پوچھا۔

’’معلومات۔‘‘ نک نے جواب دیا۔ ’’تم نے ایش ٹرے کو نارٹن سے زبردستی قرضہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔‘‘

’’تو پھر۔‘‘

’’میں پوری داستان سننا چاہتا ہوں اور اگر تم نے انکار کیا تو جو کچھ مجھے معلوم ہے اسی کے ساتھ پولیس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی رپورٹر لان لارنس اس خفیہ والٹ کے بارے میں یقیناً دلچسپی لے گی جو صرف نارٹن کی انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے۔‘‘

’’تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی ؟‘‘

’’میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے۔‘‘

’’کیا تم مجھ پر کسی بدعنوانی کا الزام لگا رہے ہو؟‘‘ پادری میبی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

’’صرف حقائق بیان کررہا ہوں۔ اگر بلیک میلنگ کوئی بدعنوانی ہے تو پھر شاید میں تمہیں اسی کا مرتکب قرار دے رہا ہوں۔‘‘

’’تو پھر تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا ہوں کہ نارٹن مجھ سے کہیں زیادہ بڑا مجرم ہے۔‘‘ پادری میز پر جھکتے ہوئے بولا۔

’’مثلاً کس بات کا؟‘‘ نک نے فوراً پوچھا۔

’’گزشتہ سال ایک عورت، ایک بوڑھی بیوہ۔ ہمارے چرچ کی ممبر بنی۔ کافی مالدار تھی۔ اگر میں یہ کام کیلیفورنیا... میں کررہا ہوتا تو وہاں دولت مند گھرانوں کے لڑکوں لڑکیوں کو پھانسنا مفید ہوتا۔ لیکن یہاں نیویارک میں ہمیں امیر بوڑھی عورتوں کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن اس عورت کے معاملے میں مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھ سے پہلے ہاتھ صاف کرچکا ہے۔‘‘

’’فلپ نارٹن؟‘‘ نک نے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘ پادری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’وہ اس کا بینکر تھا اور ایک خوبصورت شیطان بھی۔ اس نے عورت سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلیے۔ عورت کا مرحوم شوہر اس کے لیے کئی چیزیں چھوڑ گیا تھا۔ جن میں سب سے قیمتی چیز پرانے نایاب سکوں اور ٹکٹوں کا ایک ذخیرہ تھا جس کی قیمت ادنٰی اندازے کے مطابق ایک لاکھ ڈالرز سے کہیں زیادہ تھی۔ عورت چاہتی تھی کہ یہ ذخیرہ اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کو ملے اس سے پہلے نہیں۔ سوال یہ تھا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ گھر میں وہ چوروں کی دسترس سے محفوظ نہ رہتا اور اگر بینک میں رکھتی تو یقینی طور پر اس کا علم حکومت کو ہوجاتا اور پھر اس کی موت کے بعد ورثہ میں تقسیم ہونے سے پہلے اس پر اتنے ٹیکس عائد ہوجاتے کہ وارثوں کو معقول حصہ نہ ملتا۔ اس

مشکل کا حل اس کے بینکر فلپ نارٹن نے پیش کیا۔ اس کا دوست اور مالی مشیر ہونے کی حیثیت سے اس نے مشورہ دیا کہ اس ذخیرے کو بینک میں اس کے ذاتی والٹ میں محفوظ کردیا جائے۔ اس کے بارے میں بینک کو یا حکومت کو اس ذخیرے کا پتا نہیں لگے گا۔ اور وہ عورت کے مرنے کے بعد جوں کا توں اس کے وارثوں کے سپرد کردے گا۔ عورت کو اس پر مکمل اعتماد تھا اس نے اپنا ذخیرہ نارٹن کے حوالے کردیا۔ نارٹن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس بارے میں ایک علیحدہ تحریر لکھ کر اپنی فائل میں لگادے گا تاکہ اگر اتفاق سے اس کا انتقال عورت سے قبل ہوجائے تو اس کا وکیل اس ذخیرے کو عورت یا اس کے وارثوں کو واپس کردے۔ لیکن اس نے یہ چالاکی، کی کہ عورت کو اس تحریر کی کوئی نقل نہیں دی تاکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ رہے۔ عورت نے مجھے بتایا کہ اس نے کبھی یہ نقل مانگی بھی نہیں۔''

''تم ایش ٹرے پر بنے ہوئے اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے؟'' نک نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یہ توقع تھی کہ اتنے حفاظتی انتظامات کے باوجود بینک میں موجود اس کے ذاتی والٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔''

''نہیں۔'' پادری میبی نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے کہ میں انگلی کا نشان حاصل کرنے کے باوجود والٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ نارٹن کو معلوم ہوجائے کہ میں اس خفیہ والٹ کی موجودگی سے واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ اس کے اندر کیا کچھ رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے ایش ٹرے چرائے جانے سے اندازہ لگالیا۔ سمجھ گیا کہ میں اس کا راز جانتا ہوں یہی وجہ تھی کہ اس نے میری قرضے کی درخواست منظور کرنے کی اجازت دے دی۔''

''کیا صرف اس بوڑھی بیوہ کے سکوں اور ٹکٹوں کے ذخیرے کی وجہ سے؟'' نک نے پوچھا۔

''صرف وہ ہی ایک نہیں تھی۔ مجھے ایک دوسری بیوہ عورت کے بارے میں بھی معلوم ہے جس نے اسے اپنے تمام چاندی کے برتن اور زیورات والٹ میں رکھنے کے لیے دے دیے تھے اور یہ سب آف دی ریکارڈ تھا'' گویا یہ ایک بینک کے اندر دوسرا پرائیویٹ بینک قائم تھا اور بھی معلوم نہیں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ نارٹن کا والٹ روم کسی بڑے خزانے سے کم نہیں ہوگا۔''

''حکومت کے نزدیک یہ حرکت یقیناً ناپسندیدہ ہوگی اور اسی طرح بینک کے اسٹاک ہولڈروں کے لیے بھی۔'' نک نے کہا۔ ''بات کھل جائے تو نارٹن ایک لمحے کے لیے بھی اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہ سکتا۔''

''چنانچہ میری حرکت بلیک میلنگ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔'' پادری پہلی مرتبہ مسکرایا ''اس کا فیصلہ کون کرسکتا ہے؟''

''تم دونوں جعلساز اور فراڈیے ہو۔'' نک بولا۔ ''جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کررہے ہو۔ لیکن نارٹن کے بارے میں پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ عورت کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو وہ ذخیرہ دے ہی دے۔''

''اس کا انتقال ہوچکا ہے۔'' پادری میبی نے بتایا۔ ''اور نارٹن نے ذخیرہ واپس نہیں کیا۔''

''وہ مرچکی ہے؟'' نک نے چونک کر پوچھا۔

''ایک ماہ ہوا۔ اور نارٹن نے اس کے وارثوں کو ذخیرے کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ میں اس لیے جانتا ہوں کہ میں نے ان سے پوچھا تھا۔''

''پھر تم نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی؟ ''

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مجھے یہ ہی مناسب معلوم ہوا کہ میں اس معاملے سے اپنے طور پر نمٹوں۔''

''میری بات سنو۔'' نک نے دفعتاً کہا۔ ''میں نے ایش ٹرے دوبارہ حاصل کرلی ہے۔ میں نے اسے نارٹن کو دیا تھا مگر اس نے میری فیس ادا نہیں کی۔ چنانچہ میں نے پھر چرالیا۔ ہم دونوں مل کر اسے نارٹن کے والٹ میں داخل ہونے کا ذریعہ بنائیں گے۔''

''اب اس پر نارٹن کی انگلی کے نشانات نہیں ہونگے۔'' پادری میبی نے کہا۔ ''وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے مجھے بھی اس کی امید نہیں ہے۔''

''تب پھر ہم والٹ میں کیسے داخل ہوسکیں گے؟ ''

''فلپ نارٹن خود ہمارے لیے والٹ کھولے گا۔'' نک نے جواب دیا۔

☆☆☆☆

نک کو سب سے پہلے جو بات معلوم کرنا تھی وہ یہ تھی کہ نارٹن کا ذاتی والٹ بینک میں کس جگہ واقع ہے۔ اس سلسلے میں اسے نیویارک کنسٹرکشن کمپنی سے مدد ملی جس نے بینک کی عمارت تعمیر کی تھی۔ کمپنی کی فائلوں میں بینک کی عمارت کا نقشہ اب بھی موجود تھا۔ اس نے متعلقہ فرد کو مناسب رشوت پیش کی اور اسے اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ ایک گھنٹے تک تنہا اس فائل کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ نک نے نقشے میں دیکھا کہ عمارت کی 56 ویں منزل پر جہاں نارٹن کا آفس تھا کوئی والٹ نہیں دکھایا گیا تھا البتہ ایک الماری کے جتنے سائز کا ایک اسٹرانگ روم اس سے نچلی منزل یعنی 55 ویں فلور پہ ضرور موجود تھا۔ عمارت کی ڈائریکٹری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فلور پر تمام متعلقہ شعبہ جات کی سیکریٹری کام کرتی تھیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ انہیں کسی اسٹرانگ روم کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس لیے لازمی تھا کہ یہ ہی نارٹن کا ذاتی والٹ ہو۔

اس سے اگلی صبح حسبِ پروگرام نک پادری میبی سے بینک کی عمارت کے باہر ملا۔

''تمہیں پتا ہی ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟'' نک نے پوچھا۔

''جانتا ہوں۔ مگر یہ مجھے پسند نہیں۔ تم مجھے بہت گہرائی میں لیے جارہے ہو۔''

''تم پہلے ہی کافی گہرائی اتر چکے ہو۔ اگر اس ترکیب سے تمہیں لان لارنس سے چھٹکارا حاصل ہوجائے۔ تو تمہیں میرا ممنون ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پادری میبی نے جواب دیا۔ ''وہ ہے کہاں۔ میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ وہ بھی اس پلان میں شامل ہے؟''

''جب اس کی ضرورت ہوگی وہ بھی آجائے گی۔'' نک نے جواب دیا۔

وہ لفٹ کے ذریعے 55 ویں منزل تک پہنچے۔ نک نے نقشے کی مدد سے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ الیکٹریکل فیوز بکس کس جگہ ہے۔ وہ سیدھا وہیں پہنچا۔

''الارم سسٹم کا تعلق لازماً اس فیوز بکس سے بھی ہوگا۔'' اس نے پادری سے کہا۔

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ نارٹن کے پرائیویٹ والٹ میں الارم بھی لگا ہے؟''

''ایک ایسے بینک میں ہر مقفل دروازے میں کوئی نہ کوئی الارم فٹ ہوگا۔''

''اگر تم نے فیوز بکس کو چھیڑا تو عین ممکن ہے کہ والٹ کا الارم بجنے لگے۔''

''میں بالکل یہی کرنا چاہتا ہوں۔'' نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆

فلپ نارٹن اس وقت مختلف شعبہ جات کے منیجروں کے اجلاس میں مصروف تھا۔ اچانک اس کی سیکریٹری نے

آ کر بتایا۔

''55ویں منزل پر الارم بج رہا ہے۔ کوئی آپ کے والٹ میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''پھر مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔'' نارٹن نے ناگواری سے کہا۔ ''سیکیورٹی گارڈ کو لے جاؤ۔''

سیکریٹری کچھ دیر کے بعد پھر واپس آئی۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جناب۔'' وہ بولی۔ ''کہ کوئی آپ کے والٹ میں بند ہو گیا ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ کوئی شخص والٹ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک......'' نارٹن کہتے کہتے رک گیا۔

اس نے میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے افراد کی طرف دیکھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں حضرات۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ایک ضروری کام میری فوری توجہ چاہتا ہے۔''

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ سیکریٹری اس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے 55 ویں منزل پر آئے۔ یہاں تمام سیکریٹریوں میں بوکھلاہٹ مچی ہوئی تھی۔ الارم کی گھنٹی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ نارٹن مختلف دفاتر سے گزرتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں اس کا نجی والٹ واقع تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں پادری فیلکس میبی کے ساتھ ہی دو سیکیورٹی گارڈ بھی کھڑے ہیں۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نارٹن نے پادری سے پوچھا۔

''ویلوٹ والٹ کے اندر بند ہو گیا ہے۔'' پادری میبی نے فرش پر پڑی ہوئی ایش ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے تمہاری انگلی کا نشان ایش ٹرے سے حاصل کر کے اس سے والٹ کھول لیا ہے۔''

یہاں الارم کی گھنٹی کا شور زیادہ تھا۔ نارٹن سیکیورٹی گارڈز کی طرف گھوما۔

''اس الارم کو بند کر دو۔'' اس نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے اندر آتے جاتے دیکھا تھا؟''

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

''جب ویلوٹ نے گارڈ کو آتے دیکھا تو اس نے اندر سے والٹ کا دروازہ بند کر لیا'' پادری بول اٹھا۔ ''معلوم نہیں اس سے کیا گڑبڑ ہو گئی کہ جب اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔'' نارٹن نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں والٹ کھولنا ہی پڑے گا۔'' ایک گارڈ اپنا ریوالور نکالتے ہوئے بولا۔

''بڑی خوشی سے۔'' نارٹن نے کہا۔ ''میں خود اس حرکت کے لیے ویلوٹ کو جیل میں سڑائے بغیر نہیں مانوں گا۔ کوئی وکیل اسے بینک میں ڈاکا ڈالنے کے الزام سے بری نہیں کرا سکتا۔''

نارٹن نے والٹ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اوپر لگے ہوئے ایک چھوٹے سے چوکور شیشے پر رکھ دیا۔ اس کے انگوٹھا رکھتے ہی قفل کا الیکٹرانک سسٹم حرکت میں آیا۔ نارٹن کے انگوٹھے کا عکس الیکٹرانک سسٹم میں محفوظ عکس سے ملتے ہی قفل کھل گیا۔ نارٹن نے دروازہ کھول دیا مگر اسٹرانگ روم بالکل خالی تھا۔

☆☆☆☆

''کیا مجھے تلاش کر رہے ہو؟'' پیچھے سے نک کی آواز آئی۔

''تم کہاں تھے؟'' نارٹن نے تیزی سے پلٹ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

''میں برابر کے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔'' نک نے جواب دیا۔ ''یہ محض تمہیں والٹ کھولنے پر آمادہ کرنے کی ایک ترکیب تھی ظاہر ہے کہ میں خود یہ حرکت کر کے کسی جرم کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرتا۔''

نارٹن نے گھوم کر پادری میبی کی طرف دیکھا۔

''تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔'' اس نے کہا۔ ''تم کہہ رہے تھے کہ یہ اندر ہے۔''

''ممکن ہے میرے الفاظ نے تمہیں کوئی ایسا تاثر دیا ہو۔'' پادری نے جواب دیا۔

نارٹن نے خود کو سیکیورٹی گارڈز اور بینک کے دوسرے.... عملے کے درمیان گھرا پا کر سنبھلنے کی کوشش کی۔

''اچھی بات ہے ویلوٹ۔'' اس نے کہا۔ ''تم خود دیکھ سکتے ہو کہ میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے میں چھپانے کی کوشش کروں۔ میرا یہ نام نہاد والٹ اندر سے بالکل خالی ہے۔''

نک نے والٹ میں داخل ہو کر دیکھا۔ نارٹن بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ والٹ میں کئی کھلی الماری نما خانے بنے ہوئے تھے مگر وہ سب خالی تھے۔

''ٹھیک ہے میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے اس نے بلند آواز سے لان لارنس کو پکارا۔

اور دفعتاً پتا نہیں کہاں سے نکل کر لان لارنس مع اپنے

www.Paksociety.com

کیمرا مین وغیرہ کے سامنے آگئی۔

''ہمیں کس شے کی منظر کشی کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک خالی والٹ کی۔ اس کی منظر کشی کرواور اسے چھ بجے کی خبروں میں ٹیلی کاسٹ کرنے کا انتظام کرو، میں اس کے ساتھ بیان کرنے کے لیے تمہیں ایک دلچسپ کہانی فراہم کردوں گا۔''

فلپ نارٹن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''تم ایک خالی والٹ کی فلم کیوں بنانا چاہتے ہو؟''

''اس سے بالکل برعکس جو میں اور پادری میبی کرنے کا ارادہ کررہے تھے۔'' نک نے جواب دیا۔ ''اسے ایش ٹرے کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ تمہارے انگوٹھے کے نشان کی مدد سے اس والٹ میں داخل ہوکر وہ خزانہ چرا سکے جو اس کے خیال میں یہاں پوشیدہ تھا۔ یا اگر چرا نہ سکے تو چرانے کی دھمکی دے کر تم سے اپنا کام کرالے۔ اور میں اس کے برعکس صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس والٹ میں اب کوئی خزانہ موجود نہیں ہے۔ ٹی وی پر اس خالی والٹ کی فلم بہت سی بیوہ عورتیں دیکھیں گی اور حیرت وتعجب سے سوچیں گی کہ ان کے زیوارت ان کے چاندی کے برتنوں، قدیم سکوں اور ٹکٹوں کا کیا بنا جو انہوں نے تمہیں اس والٹ میں رکھنے کے لیے دیے تھے۔ یقین کرو کہ کل صبح تمہیں بہت سی معزز خواتین کے سامنے اس کی کوئی معقول وضاحت پیش کرنا پڑے گی۔''

مارٹن جس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا، بہت ہی آہستہ آواز میں بولا۔

''لعنت ہو ویلوٹ۔ اس عورت اور اس کے کیمرا مین کو روک لو۔ میں تمہیں تمہاری فیس ادا کردوں گا۔''

''دے نہیں دوں گا۔ بلکہ ابھی دو۔ اور وہ بھی نقد۔''

''منظور ہے۔'' نارٹن کو کہنا پڑا۔

نک ویلوٹ مسکرایا اور لان لارنس کی طرف دیکھا۔

''بس کافی ہے لان۔ اب فلم نہیں بنائی جائے گی۔''

اس کے بیس منٹ بعد نک بینک سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اس کی جیب میں اس کی مطلوبہ فیس موجود تھی پچیس ہزار ڈالرز کے بالکل نئے اور کرارے نوٹ جو نارٹن نے اسی وقت اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے نکلوا کردیے تھے۔ اس ادائیگی کے وقت لان لارنس بھی موجود تھی اور رقم کی وصولیابی کے بعد اس کے ساتھ ہی باہر جارہی تھی۔

''میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' وہ بولی۔ ''مگر پھر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ اس نے تو سچ مچ تمہیں رقم ادا کردی۔''

''ہاں وہ فیس جو ایک کاروباری معاہدے کے سلسلے میں کئی دن سے واجب تھی۔''

''ممکن ہے بعد میں وہ پولیس میں رپورٹ کرکے یہ دعویٰ کرے کہ اسے تم نے چرایا ہے۔''

''کیسے کرسکتا ہے۔ اس نے کئی گواہوں کی موجودگی میں خود اپنے ہاتھوں سے رقم دی ہے۔''

''کیا وہ یہ تو نہیں سمجھ رہا ہے کہ تمہیں فیس ادا کرکے اس نے مجھے یہ داستان استعمال کرنے سے بھی روک دیا ہے۔''

''ممکن ہے اس نے یہی تاثر لیا ہو۔'' نک نے جواب دیا۔ ''غلط نتائج اخذ کرنے میں وہ بہت تیز ہے۔''

''اس کیس میں پادری میبی کہاں فٹ ہوتا ہے؟'' لان لارنس نے پوچھا۔

''وہ تمہیں اس بارے میں بتائے گا کہ حقیقت میں اس والٹ کے اندر کیا ہونا چاہیے تھا۔'' نک نے کہا۔ ''ایک ایسا خزانہ جسے نارٹن نے کئی دولت مند بیوہ عورتوں کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جمع کیا تھا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ اتنے بڑے بینک کا صدر فراڈ کا مرتکب ہوسکتا ہے؟''

''کوئی اس پر یقین نہیں کرسکتا تھا اور اس لیے وہ ابھی تک بڑی کامیابی سے دوسروں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتا آرہا تھا! اس کی نجی زندگی کو چیک کرنا ممکن ہے تمہیں پتا چلے کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ ممکن ہے وہ بینک کے اثاثے کو بھی اپنے ذاتی قرض ادا کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہو۔ کچھ بھی سہی اس نے غالباً وہ تمام چیزیں فروخت کردی ہیں جو بیوہ عورتوں نے امانتاً اس کے سپرد کی تھیں۔ نارٹن جیسے آدمی پر شبہ کرنے کے لیے پادری میبی جیسے جعلساز کا ذہن ہی کام کرسکتا تھا۔''

''اور اسے شکست دینے کے لیے تم جیسے ایک چور کی ضرورت تھی۔'' لان لارنس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاید۔'' نک نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اپنی کہانی میں میرا نام شامل مت کرنا۔ میں پبلسٹی قطعی پسند نہیں کرتا۔''

نک ویلوٹ اسے بینک کے سامنے چھوڑ کر رخصت ہوگیا لیکن گھر جاتے ہوئے اس کے ذہن کو یہ خیال پھر بھی پریشان کررہا تھا کہ اس کیس میں اس نے ایک چیز دو مرتبہ چرائی مگر اسے فیس صرف ایک مرتبہ کی وصول ہوئی۔

غیر ضروری

طاہر جاوید مغل

بعض لمحات انسان کے شعور میں ایسے نقش ہوجاتے ہیں کہ مٹائے نہیں مٹتے... بالخصوص جن کے باعث کسی بہت کڑی آزمائش سے گزرنا پڑجائے، وہ لمحات نہ چاہتے ہوئے بھی یادوں کے دروازے پر دستک دینے آجاتے ہیں... اس کائنات میں بے شمار چہروں میں مماثلت پائی جاتی ہے مگر... تقدیر کی تفریق یہ ثابت کردیتی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے جدا ہے... لیکن انسان ہے کہ اپنی خوشیوں کی خاطر کتنے ہی لوگوں کے لیے اذیت کا نشان بن کر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔

بند مٹھی سے ریت کے مانند بکھرتی یادوں کا قصہ



اسکول میں اسپورٹس ڈے تھا۔ میں اپنی بیوی عارفہ اور آٹھ سالہ بیٹے ندیم کے ساتھ اسکول میں تھا۔ دفتر سے آدھے دن کی چھٹی ملی تھی۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں ندیم بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''پاپا ممی! آئیں، میں آپ کو ایک ٹیچر دکھاؤں۔ اسکول کی دوسری برانچ سے آئی ہیں۔ ان کی شکل چھوٹی پھپھو سے بہت زیادہ

ملتی ہے، ان جیسے بال، انہی جیسی آنکھیں...... آئیں...... میں دکھاؤں آپ کو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ندیم نے ایک عام سی بات کہی تھی۔ اس میں غصہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے غصہ آگیا۔ پورے جسم میں ایک طیش آمیز لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے ندیم سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا فضول بات ہے شکل ملتی ہے تو ہم کیا کریں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے پاس اب تیس چالیس منٹ سے زیادہ نہیں ہیں اور بیس منٹ دفتر جاتے جاتے لگ جاتے ہیں۔ بس جلدی سے فارغ ہوکر آؤ۔''

ندیم ایک دم بجھ سا گیا۔ عارفہ بھی ذرا حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا موڈ آف ہوگیا ہے اور اب وجہ پوچھی گئی تو مزید آف ہوجائے گا۔ کبھی کبھی ایسا ہوجاتا تھا میرے ساتھ۔ ندیم بے چارہ بیس منٹ کے بجائے دس منٹ میں ہی فارغ ہوکر آگیا۔ میں نے عارفہ اور ندیم کو گھر چھوڑا اور دفتر کی طرف لپک گیا۔ موڈ بہ دستور خراب تھا۔ سوزوکی کار ڈرائیو کرتے ہوئے بھی ذہن بار بار اسکول والے واقعے کی طرف جارہا تھا۔ کچھ بھولی بسری یادیں ماضی کے دریچوں سے نکل نکل کر دل و دماغ میں اودھم مچانے لگی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا، ہم غیر ضروری کام کیوں کرتے ہیں؟ کبھی بے جا تجسس اور کبھی تفریح طبع کی خاطر کیوں غیر متعلقہ معاملات میں سر گھسیڑتے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ان کے نتیجے کچھ بھی نکل سکتے ہیں۔

دفتر میں آکر میں نے دروازہ بند کیا اور نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔ انجم میرا بہت گہرا دوست تھا میرا بیسٹ فرینڈ۔ اسکول سے لے کر کالج تک ہم ساتھ رہے تھے اور ہماری دوستی ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ہم لنگوٹیے دوست تھے، ایک دوسرے سے کچھ چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ شاید چھپا ہی نہیں سکتے تھے۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر ہماری دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ہمارے گھروں میں بھی بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ایک دوجے کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔

انجم کی امی کو میں بڑی روانی سے کشور خالہ کہتا تھا۔ وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں اور اس چھوٹے سے گھر کی ملکہ تھیں۔ اس گھر میں انجم کے علاوہ انجم کی بڑی بہن کنول آپی اور انجم کے ابو آغا جی ہوتے تھے۔ پتا نہیں [illegible]

وہ راجپوت تھے۔ آغا انکل بھی ایک مسکراتے چہرے والے ملنسار شخص تھے۔ ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اپنی جسمانی ساخت اور شاید اپنی خوش پوشی کی وجہ سے بھی پینتیس چھتیس کے لگتے تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ اچھے عہدے پر تھے۔ اپنے کام کے سلسلے میں انہیں اکثر دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ان دنوں میں اور انجم ایف ایس سی کے دوسرے سال میں تھے۔ کنول آپی بی سی ایس کررہی تھیں یہ جوش جذبے اور مستی کا دور ہوتا ہے۔ یوں تو دونوں گھروں میں ہم پر کسی طرح کی سرگرمی کے حوالے سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی، پھر بھی جب آغا انکل دورے پر ہوتے ہم زیادہ آزادی محسوس کرتے اور خوب ہلا گلا رہتا۔ انجم کے گھر کے وسیع لان میں کرکٹ کھیلی جاتی، شام کو گاڑی پر لد کر لاہور کی سڑکوں کا طواف کیا جاتا۔ ریس کورس پارک، جوائے لینڈ، گلشن اقبال، لبرٹی مارکیٹ، کوئی بھی اہم جگہ ہماری دستبرد سے محفوظ نہیں تھی۔ کبھی فلم دیکھنے کا پروگرام بنتا اور کبھی رات رات بھر کمپیوٹر پر گیمز کھیلے جاتے۔ ایک دو اور کزن بھی ان مصروفیات میں ہمارے ساتھ شریک ہوجاتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کشور خالہ بھی اکثر ہمارے اس گروپ کا حصہ ہوتی تھیں۔ وہ دانائی اور فہم و فراست میں یکتا تھیں لیکن بچوں کے ساتھ بالکل بچوں کی طرح ہی ہوجاتی تھیں۔ ان کی خوشیوں میں خود کو اس طرح شامل کرتی تھیں کہ لطف آجاتا تھا۔ کشور خالہ کے پکوان خاندان بھر میں مشہور تھے۔ خاص طور سے ان کی بنائی ہوئی نہاری اور مولی والے اسپیشل پراٹھے۔ ناشتے میں ان کے ہاتھ کے مولی والے پراٹھے کھانے کے لیے تو بعض اوقات آغا انکل بھی اپنا دورہ مختصر کرکے راتوں رات لاہور پہنچ جاتے تھے۔ آغا انکل اور کشور خالہ کی شادی کو بیس سال کے لگ بھگ ہوچکے تھے اور ان کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ بیس سال گزرنے کے باوجود وہ کبھی کبھی تو نئے نویلے جوڑے کی طرح نظر آتے تھے۔ آغا انکل اپنی شریکِ حیات کے لیے نت نئے تحفے لاتے تھے اور کشور خالہ بھی ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک موقعے پر جب آغا انکل کو اپنے سرکاری کام سے ڈیڑھ ماہ کے لیے ہالینڈ جانا پڑا تو انہیں خوشی خوشی رخصت کرنے کے بعد کشور آنٹی گھر آئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، سردرد کا بہانہ کیا لیکن ہم جانتے تھے کہ وجہ کیا ہے۔

[illegible]

سی کا امتحان دیا تھا۔ رزلٹ آنے تک چھٹیاں تھیں۔ ہمارے ایک دور کے رشتے دار افضل صاحب بہاولپور میں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے احسن سے میری دوستی تھی۔ وہ دیر سے اصرار کررہا تھا کہ امتحان کے بعد چھٹیاں گزارنے میں اس کے پاس بہاولپور آؤں۔ انہی دنوں انجم کی بہن کنول آپی کی منگنی بھی تھی۔ جونہی ہم اس رنگا رنگ رسم سے فارغ ہوئے میں نے بہاولپور کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ بہاولپور میں یہ میرا پہلا وزٹ تھا۔ بہاولپور میں اور اردگرد دیکھنے کے لائق بہت سی جگہیں تھیں۔ جن میں شاندار عمارت نور محل اور احمد پور شرقیہ کے نواح میں قلعہ دراوڑ شامل تھے۔ احسن کے ساتھ دو تین ہفتے بڑے اچھے گزرے شاید میں دس پندرہ دن مزید وہاں قیام کرتا لیکن اسی دوران میں لاہور سے انجم کا فون آگیا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''اوئے ناہنجار! کچھ یاد بھی ہے کون سی اہم تاریخ آنے والی ہے؟''

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ وہ بولا۔ ''اوئے لگڑ بھگے...... فروری کی 29 تاریخ...... اور تیرے جیسے جاہل کو بھی پتا ہوگا کہ یہ تاریخ پورے چار سال بعد آتی ہے۔''

ایک دم میرا دماغ کام کرگیا اور مجھے پتا چل گیا کہ انجم اس تاریخ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔ یہ اس کے امی ابو کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا جو چار سال بعد آتا تھا۔ یعنی جب سے کشور خالہ اور آغا انکل کی شادی ہوئی تھی یہ سالگرہ تین چار دفعہ ہی منائی جاسکی تھی۔ بہر حال یہ جب بھی منائی گئی تھی۔ خاصے اہتمام سے منائی گئی تھی۔ اس مرتبہ بھی یہ دن اہتمام سے منائے جانے کا پروگرام تھا اور اس پروگرام میں انجم اور کنول آپی پیش پیش تھے۔

میرے اور انجم کے درمیان اس حوالے سے دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی اور پھر طے ہوا کہ میں بدھ کو یعنی سالگرہ کی تاریخ سے تین دن پہلے ہی لاہور پہنچ جاؤں گا...... جلد ہی بدھ کا دن بھی طلوع ہوگیا۔ وہ ایک خنک لیکن چمکیلی صبح تھی۔ میں بہاولپور سے لاہور آنے کے لیے ایک آرام دہ بس میں سوار تھا۔ اچانک میں اپنے ایک ہم سفر کو دیکھ کر چونکا۔ اس کی شکل صورت میرے لنگوٹیے انجم سے بہت ملتی تھی۔ اسی طرح کی چوڑی اور تھوڑی سی گول پیشانی...... اسی کی طرح آنکھیں...... پتلے لیکن چمکیلے بال جو بار بار سرک کر پیشانی کی طرف آجاتے تھے۔ اس کی عمر بھی اٹھارہ انیس برس ہی رہی ہوگی۔ میں اس مشابہت پر

حیران ہوا۔ لاہور سے سیکڑوں میل دور بہاولپور کے اس چھوٹے سے بس اسٹینڈ سے بس میں سوار ہونے والا یہ لڑکا اسّی نوے فیصد انجم سے ملتا تھا۔ شکلوں میں مشابہت میں مجھے ہمیشہ سے بہت دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ میں دیر تک اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز، اس کے ہنسنے کا اسٹائل۔ مجھے یہ ایک دلچسپ کیس محسوس ہوا۔

بہاولپور سے لاہور تک کا سفر خاصا طویل تھا، ہمیں بارہ تیرہ گھنٹے لگ جانے تھے۔ لب سڑک ہماری بس ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ''لنچ'' کے لیے رکی۔ وہ ڈائننگ ہال میں اکیلا ہی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ یہ میرے اندر پایا جانے والا وہی اضافی تجسس تھا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ لڑکے کے ساتھ علیک سلیک ہوئی۔ میں نے اسے وجہ بتائی کہ میں اس کے پاس کیوں بیٹھا ہوں۔ وہ کچھ حیران ہوا اور کچھ خوش بھی۔ اس کا نام عبدالرحمان تھا۔ وہ یہیں بہاولپور شہر کا رہنے والا تھا۔ والد کا نام امتیاز علی تھا۔ وہ سرسوں کے بیجوں کا کام کرتے تھے۔ سرسوں کی فصل اٹھا کر اپنے گوداموں میں اسٹور کرتے تھے بعدازاں اسٹور کیے ہوئے بیجوں کو ویسے ہی فروخت کردیتے تھے یا پھر ان کا تیل وغیرہ نکلوا کر تھوک فروشوں کو دیتے تھے۔ ان کے ایسے دو گودام ساہیوال میں تھے اور ایک ملتان میں۔ عبدالرحمان آئی کام کررہا تھا جبکہ اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی پڑھ رہے تھے۔ عبدالرحمان کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور بہاولپور کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔

عبدالرحمان نامی اس سادہ سے نوجوان کے ساتھ مل کر مجھے اچھا لگا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ انجم کو سرپرائز دوں بلکہ انجم کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کو بھی۔ ایک دم عبدالرحمان کو ان کے سامنے لے جاکر کھڑا کردوں...... اور دیکھوں کہ ان کا ری ایکشن کیا ہوتا ہے۔ یہ تو خیر فلمی بات تھی کہ وہ عبدالرحمان کو انجم سمجھیں گے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ مشابہت انہیں ایک دفعہ ضرور چونکائے گی۔

میں نے عبدالرحمان سے پوچھا کہ وہ کہاں جارہا ہے؟

اس نے بتایا۔ ''ایک ڈومیسائل بنوانا تھا۔ راولپنڈی سے بننا ہے۔ جانا تو ابو کو تھا لیکن وہ مصروفیت کی وجہ سے جا نہیں سکے۔''

''یہ بس تو اب ہوجائے گی۔'' میں نے کہا۔

''وہاں سے پنڈی کے لیے بس پکڑوں گا۔ سفر تو کافی زیادہ ہوجائے گا لیکن مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔''

میں نے اسے اپنا ایڈریس اور فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر کبھی لاہور آؤ تو مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔ پھر میں تمہیں تمہارے ''ہمزاد'' سے بھی ملواؤں گا۔''

وہ مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے اس کی شکل انجم سے اور زیادہ ملنے لگتی تھی۔ بس کے سفر کے دوران میں میرے اور عبدالرحمان کے درمیان گاہے بگاہے گفتگو ہوتی رہی۔ عبدالرحمان نے بھی مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ دیا۔ مجھے امید تھی کہ مستقبل قریب میں ہم ملیں گے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اتنی جلدی ملیں گے۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ میں انارکلی بازار سے گزر رہا تھا۔ یہاں میں آغا انکل اور کشور خالہ کی شادی کی سالگرہ کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ تحفہ بھی کوئی اچھا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اپنی امی کے ساتھ جاکر میں نے کشور خالہ کے لیے تو ایک شاندار شولڈر بیگ لے لیا تھا۔ اب میں آغا انکل کے لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر ایک زبردست قسم کی ریڈی میڈ پینٹ شرٹ مجھے ان کے لیے پسند آگئی۔ میں گارمنٹس شاپ سے باہر نکل رہا تھا جب اچانک میری نظر عبدالرحمان پر پڑگئی۔ وہ غالباً ونڈو شاپنگ میں مصروف تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ پھر مسکرا کر میرے گلے لگ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم نے تو جلدی واپس جانا تھا بھئی؟''

''یہاں کوئی کام جلدی نہیں ہوتا اور دفتری کام کی تو بات ہی کیا ہے، جس بندے سے مل کر کام کرانا تھا، اسے اپنے کسی ضروری کام سے اچانک چکوال جانا پڑگیا ہے۔ اب وہ کل واپس آرہا ہے۔ آج رات کو دوبارہ بس میں بیٹھوں گا اور صبح راولپنڈی پہنچوں گا۔''

''اب کہاں ٹھہرے ہو؟''

''اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں۔''

''اچھے بندے ہو یار! تمہیں کہا بھی تھا کہ کوئی مسئلہ ہو تو رابطہ کرنا۔ تم میرے گھر میں ٹھہر سکتے تھے۔''

''نہیں مجھے اچھا نہیں لگا۔ ابھی ایک ہی تو ملاقات ہوئی تھی ہماری۔''

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسے رات کو بارہ بجے بس پر بیٹھنا تھا۔ تب تک وہ فارغ ہی تھا۔ میرے

ذہن میں پھر وہی خیال کلبلایا۔ میں نے کہا۔ ''چلو پھر آؤ، تمہیں انجم سے ملائیں۔ ایک دوسرے کو دیکھو اور اندازہ لگاؤ کہ کتنے فیصد ملتے ہو اور کتنے فیصد نہیں۔''

وہ پہلے تو متذبذب نظر آیا۔ پھر میرے اصرار پر راضی ہوگیا۔ میں اسے لے کر اپنی موٹر بائیک تک آیا اور ہم سیدھے انجم کے گھر پہنچ گئے۔

انجم گھر میں ہی تھا۔ کنول آپی اور کشور خالہ بھی موجود تھیں۔ میں نے انہیں تھوڑا سا بتایا اور پھر عبدالرحمان کو ان کے سامنے لے جاکر کھڑا کیا۔ انجم کا ری ایکشن تو خیر اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن آپی اور خالہ کشور واقعی حیران رہ گئے۔

''واقعی کتنی شکل ملتی ہے اس کی انجم سے۔'' خالہ نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

''اور قد کاٹھ بھی۔'' آپی نے تائید کی۔

''اسی لیے تو اسے بہاولپور کے ایک بس اسٹینڈ سے ڈھونڈ کر یہاں لایا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر انجم کوئی اہم شخصیت ہوتا...... کوئی ایکٹر یا سیاست دان وغیرہ تو ہم عبدالرحمان کو اس کے ''ڈپلی کیٹ'' کے طور پر استعمال کرسکتے تھے۔ مزہ آجاتا۔ اخباری نمائندے عبدالرحمان کو انجم سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے اور انجم صاحب گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر اپنی منزل پر پہنچ جاتے۔''

''ہاں جی...... کون اپنی منزل پر پہنچ رہا ہے؟''

صدر دروازے کی طرف سے آغا انکل کی آواز آئی۔ وہ ابھی ابھی کہیں سے آئے تھے۔

انہوں نے عبدالرحمان کو دیکھا...... عبدالرحمان نے انہیں دیکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قطعی غیرمتوقع تھا۔ آغا انکل کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ سکتہ زدہ سے عبدالرحمان کو دیکھتے چلے گئے۔ دوسری طرف عبدالرحمان کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ وہ یک ٹک آغا انکل کو دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں رہا تھا۔ آغا انکل کا چہرہ بالکل سفید پڑچکا تھا...... عبدالرحمان نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''ابو آپ یہاں؟''

آغا انکل نے دوسری شادی کررکھی تھی۔ ان کی دوسری بیوی اور تین بچے لاہور سے سیکڑوں میل دور بہاولپور کی ایک الگ تھلگ رہائشی کالونی میں رہتے تھے۔ آغا انکل اور کشور خالہ میں بہت محبت تھی لیکن اس محبت میں وہ طویل سرکاری دورے بھی شامل تھے جو آغا صاحب ہر ماہ کرتے تھے۔ شاید یہ راز...... راز ہی رہتا اگر میں بہاولپور کے اس چھوٹے سے بس اسٹینڈ پر انجم سے مشابہت رکھنے والے عبدالرحمان کو نہ دیکھتا اور پھر اپنے بے جا تجسس کے سبب اس سے بات چیت شروع نہ کرتا۔ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ کشور خالہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا نام لے لے کر جیتی تھیں۔ وہ ان کی آن بان شان تھے اور جب ذی شان تاج محل چکنا چور ہوتے ہیں تو پھر ان کے ملبے میں جان لیوا دکھ کی کرچیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ جس روز آغا انکل اور خالہ کشور کی شادی کی سالگرہ تھی۔ اس روز صبح سویرے خالہ کمرے میں مردہ پائی گئیں۔ ''انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ بیمار نہیں تھیں۔ ہر لحاظ سے صحت مند تھیں اور زندگی سے بھرپور بھی۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ وہ اچانک چل بسی ہیں...... ہاں جب بلند وبالا تاج محل لڑکھڑاتے ہیں تو اپنا ہی بوجھ انہیں چکنا چور کردیتا ہے۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد آپی کنول کی منگنی بھی ٹوٹ گئی۔ اس صدمے نے انہیں بستر سے لگادیا۔ پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ انجم اور آپی کنول کو ان کے ماموں اپنے پاس کوئٹہ لے گئے ہیں۔ تین چار ماہ بعد آغا انکل نے بھی لاہور والا گھر بیچ دیا اور مستقل طور پر بہاولپور شفٹ ہوگئے۔ (جہاں وہ بہت عرصے سے امتیاز علی کے نام سے رہائش پذیر تھے) ایک ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔ ایک گلشن تھا جو ویران ہوا۔ اب بہت عرصہ ہوا ہے انجم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تقریباً دو سال پہلے آخری بار اس کی آواز سنی تھی۔ آہ...... آغا انکل، آپ جیسے کردار ہیں جنہوں نے اس دنیا کی خوبصورتی کو گہنایا ہوا ہے۔ ایک کھلکھلاتا، مسکراتا ہمدرد چہرہ آپ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مٹی میں اوجھل ہوگیا۔ میں کہاں ڈھونڈوں اب وہ کھلنڈرے دن، وہ رنگین شامیں، وہ آخرشب کے قہقہے...... اور...... اور وہ مولی والے پراٹھے جن میں ماں جیسی محبت کی خوشبو ہوتی تھی۔

ماضی کے دریچے بند ہوئے۔ میں سوچوں کی دنیا سے نکلا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے اپنے بیٹے ندیم کو بری طرح جھاڑ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ میری بیوی کی سمجھ میں کہ میرا موڈ یکدم کیوں اتنا بگڑا ہے ... اس کی وجہ یہی تھی۔ مجھے بے جا تجسس اور غیرضروری روابط سے نفرت ہوچکی ہے۔



سازشی کردار

مرزا امجد بیگ

روپ بہروپ بدلنا... نئے نئے رنگوں میں ڈھلنا تو اس دنیا کی ریت ہے... قدرت کی سرزنش کے باوجود بہت سے سازشی کردار نئی نئی کہانیوں کو جنم دیتے رہتے ہیں... وہ بھی اس ڈرامائی صورتِ حال کا ایک اہم کردار تھا جس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار قائم کیا ہوا تھا مگر وہ بھول گیا کہ وہی حصار ایک دن اس کے لیے کس قدر خطرناک جال بن جائے گا۔ اگرچہ اس بار بیگ صاحب کو حقائق اگلوانے کے لیے لوہے کے چنے چبانے پڑے مگر انہوں نے لاحاصل کچھ نہ جانے دیا... اور یہی ان کا کارنامہ تھا۔

جیتے جاگتے کرداروں سے کھیلتے بیگ صاحب

کا منفرد انداز......اور عدالت کا منظر نامہ

منگل کے روز جو شخص سب سے پہلے میرے چیمبر میں داخل ہوا، اس نے نہایت ہی سادہ مگر صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کی نفاست کو ظاہر کرتا تھا۔ لباس سستا سا ہو یا بیش قیمت، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کی تراش خراش، پاکیزگی اور پہننے کا سلیقہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ تمام خصوصیات آنے والے کی شخصیت میں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر میری ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام ارشاد حسین ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اور میں اپنے بیٹے کے لیے سخت پریشان ہوں۔ اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

ارشاد حسین جتنا نفیس طبع دکھائی دیتا تھا، اتنا ہی خوش کلام اور شائستہ گفتار بھی تھا۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے بیٹے کو ہوا کیا ہے......؟''

''میرے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کس جرم میں؟''

''میرے بیٹے نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب......''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کس الزام میں پکڑا ہے؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''پولیس نے حنیف پر قتل کا الزام عائد کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

ظاہر ہے، حنیف اس کے اسی بیٹے کا نام تھا جسے پولیس پکڑ لے گئی تھی۔ میں نے پیڈ پر قلم گھستے ہوئے استفسار کیا۔

''حنیف پر کس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟''

''اس شخص کا نام ڈاکٹر سلیم ہے۔'' ارشاد حسین نے جواب دیا۔

''مقتول کس چیز کا ڈاکٹر تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ کسی شعبے کا اسپیشلسٹ تھا یا جنرل فزیشن......؟''

''جناب! وہ نہ تو جنرل فزیشن تھا اور نہ ہی اس نے کسی شعبے میں اسپیشلائزیشن کر رکھا تھا۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔

"پھر وہ کس قسم کا ڈاکٹر تھا ارشاد صاحب؟" میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

وہ بہ دستور بیزاری سے بولا۔ "وکیل صاحب! میرے خیال میں تو سلیم سرے سے ڈاکٹر تھا ہی نہیں......"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!" میری حیرت میں خفیف سا طنز بھی شامل ہوگیا۔ "جب آپ اسے ڈاکٹر ہی نہیں سمجھتے تو پھر ڈاکٹر کہہ کیوں رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا لفظ لگا ہی کیوں رکھا تھا۔ یہ تو سراسر جرم ہے۔"

"بے شک یہ جرم ہے بلکہ ڈاکٹر سلیم کے کیس میں تو یہ جرم تھا کیونکہ وہ اب باقی نہیں رہا۔" ارشاد حسین میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن جناب! یہاں کون پوچھتا ہے۔"

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے کہا۔ آپ کے اس "کون پوچھتا ہے" سے میں کیا مطلب اخذ کروں؟"

"میرا کوئی خاص مطلب نہیں تھا وکیل صاحب!" وہ بڑی بددلی سے بولا۔ "میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی شخص اپنے نام کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے، کون پوچھتا ہے۔ ہر فراڈ شخص نے اپنے نام کے ساتھ مختلف قسم کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے، کون پوچھتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، پروفیسر، حاجی، علامہ وغیرہ وغیرہ......" وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل ڈاکٹر یا پروفیسر یا حاجی یا علامہ یا شاہ جی ہوتے نہیں ہیں مگر دھوکا زیادہ ہے۔"

"جب "طوطا فال" نکالنے والا پروفیسر اور بسوں میں سرمہ و منجن بیچنے والا آئی اسپیشلسٹ اور ڈینٹسٹ ہوسکتا ہے تو پھر ہمارے معاشرے میں دیگر لوگوں کے لیے بھی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"میرا اشارہ بھی ایسے ہی نام نہاد ماہرین کی جانب تھا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب یہی دیکھ لیں جناب...... کیسی دلچسپ بات ہے۔ فال والا لفافہ تو طوطا اپنی چونچ میں پکڑ کر باہر نکالتا ہے اور "پروفیسر" اس شخص کے نام کے ساتھ لگا ہوتا ہے جو محض اس طوطے کو آپریٹ کر رہا ہوتا ہے۔"

"ہاں، بات دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجیب و غریب بھی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تمام تر معاشرتی حقائق دل جلانے کا سامان ہیں۔ عوام ان کے سدھار کے لیے کچھ نہیں کرسکتی...... آپ مجھے ڈاکٹر سلیم کے بارے میں بتا رہے تھے جو اب مرحوم بلکہ مقتول کے درجے پر فائز ہوچکا ہے۔"

"جی ہاں، وہ بھی ایک ایسا ہی فراڈ شخص تھا۔" وہ ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنی دانست میں بہت پہنچا ہوا بندہ تھا۔ اب نہ وہ باقی رہا اور نہ ہی اس کی دانش...... سب کچھ پہنچ گیا ہے...... بہت دور۔"

"اور اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے آپ کے بیٹے کو گرفتار کرلیا ہے۔" میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "ارشاد صاحب! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آخر پولیس نے آپ ہی کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا ہے۔ آپ کے بیٹے حنیف اور ڈاکٹر سلیم کے درمیان کیا دشمنی تھی؟"

"کوئی دشمنی نہیں تھی جناب......"

"دشمنی نہیں تھی تو پھر دوستی رہی ہوگی؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی وکیل صاحب۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"نہ دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی!" میں نے قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "پھر کس تعلق اور کن وجوہات کی بنا پر پولیس نے حنیف پر ہاتھ ڈالا ہے۔ آخر ملزم اور مقتول میں کوئی تو رابطہ یا واسطہ رہا ہوگا۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "حنیف اور ڈاکٹر سلیم میں استاد اور شاگرد کا تعلق تھا۔"

"ان میں سے استاد کون تھا اور کون شاگرد؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"ڈاکٹر سلیم کو حنیف نے اپنا استاد چن لیا تھا۔" ارشاد حسین نے بتایا۔

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" میں نے خفگی آمیز نظر سے ارشاد حسین کی طرف دیکھا۔ "جب آپ مقتول ڈاکٹر سلیم کو ایک فراڈ شخص تسلیم کرتے ہیں تو پھر آپ نے اپنے بیٹے کو اس کی شاگردی میں کیسے جانے دیا؟"

"حنیف مجھ سے پوچھ کر اس کے چکر میں تھوڑا ہی پھنسا تھا۔" اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے تو جب خبر ہوئی، پانی سر سے اوپر جاچکا تھا۔ بہرحال، میں نے حنیف کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اسے جتنا سمجھاتا، وہ اتنا

ہی مجھ سے باغی ہوتا چلا گیا اور پھر یہ دن دیکھنا پڑا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل کی اولاد کو کوئی بات سمجھانا کتنا مشکل ہے......؟"

"جی ہاں، بہت مشکل ہے۔" میں نے اس کا دل رکھنے کی غرض سے کہہ دیا۔ "یہ لوگ کوئی جملہ سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے، سمجھانا تو بہت دور کی بات ہے۔"

یہ مسئلہ صرف آج کل کی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، یہی سنتا آیا ہوں بڑے بزرگوں کی زبان سے کہ آج کل کی اولاد کچھ سنتی ہی نہیں اور اس نوعیت کا شکوہ کرتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کردیتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے وہ بھی کسی کی اولاد تھے اور ان کے بزرگوں کو بھی ان سے یہی شکایت تھی کہ ان کی کوئی بات سمجھ کر نہیں دیتے اور اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ آج جو اولاد اپنے والدین کی بات پر کان نہیں دھرتی، کل ان کی اولاد بھی یہی سلوک کرے گی۔

میری تائیدی رائے نے ارشاد حسین کو قدرے مطمئن کردیا تو میں نے معلومات اخذ کرنے کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "حنیف نے مقتول کو کس شے کا استاد بنالیا تھا؟"

"وہ ڈاکٹر سلیم سے ٹیلی پیتھی سیکھ رہا تھا۔"

ارشاد حسین کے جواب نے مجھے چونکا دیا اور میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا واقعی ڈاکٹر سلیم، آپ کے بیٹے کو ٹیلی پیتھی سکھا رہا تھا؟"

"حنیف تو یہی سمجھ رہا تھا جناب۔"

"کیا آپ نے اپنے بیٹے کے اندر اس علم کے کوئی آثار وغیرہ دیکھے تھے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"کوئی نہیں جناب......" اس نے مایوسی سے گردن کو نفی میں جنبش دی اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں تو اس قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کرتا ہوں۔ پتا نہیں، حنیف ان الٹے سیدھے چکروں میں کیوں پڑ گیا تھا۔"

"نہیں صاحب! ٹیلی پیتھی کا علم تو ایک سائنس اور ٹھوس حقیقت ہے۔" میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ "آپ اسے خرافات میں شامل نہیں کرسکتے۔"

"وکیل صاحب! میں نے ساری زندگی حساب کتاب اور اعداد و شمار میں گزاری ہے۔" ارشاد حسین نے کہا۔ "میں دو اور دو چار...... کی فلاسفی پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ آپ جس بھی شخص سے جو بھی سیکھنا چاہیں، پہلے یہ چیک کرلیں کہ وہ کام اس شخص کو خود بھی آتا ہے یا نہیں......"

"یہ تو بالکل اصولی بات ہے ارشاد صاحب!" میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے قانون نہیں پڑھ رکھا اور وکالت کے پیشے میں میرا تجربہ نہیں ہے تو پھر آپ مجھے وکیل کرکے اپنا ہی نقصان کریں گے۔"

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں وکیل صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر سلیم کو کچھ بھی نہیں آتا تھا اور وہ ماہر بنا بیٹھا تھا ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، مسمریزم اور جانے کون کون سے علوم کا......" اس نے دو سیکنڈ کا توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"میری نگاہ میں ڈاکٹر سلیم ایک نمبر کا فراڈ اور دھوکے باز شخص تھا۔ پتا نہیں، کس دکھے ہوئے دل کی آہ اسے کھا گئی ہے۔"

"چلیں جناب...... اچھے یا برے، وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیں کہ پولیس نے حنیف کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"ٹھیک آٹھ بجے رات۔" اس نے جواب دیا۔ "اس وقت وہ گھر پر موجود تھا بلکہ چند منٹ پہلے ہی وہ گھر پہنچا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"اسی دن...... جب ڈاکٹر سلیم کو قتل کیا گیا تھا۔"

"میرا مطلب ہے، کس تاریخ کو......؟"

"سترہ اپریل کو۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

"آج انیس اپریل ہے۔" میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، پولیس نے اگلے روز یعنی اٹھارہ اپریل کو حنیف کو عدالت میں پیش کردیا ہوگا۔"

"جی ہاں، اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

"ٹھیک......!" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، عدالتی چارہ جوئی اب ریمانڈ کی مدت پوری ہوجانے کے بعد ہی کی جاسکے گی۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کیا واقعات پیش آئے تھے؟" میں نے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس بارے میں، میں آپ کو تفصیلاً کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "بہتر ہوگا، آپ

حنیف سے ایک بھرپور ملاقات کرلیں۔''
''وہ تو میں آج رات کسی وقت کرلوں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''وہ کس تھانے میں زیرِ تفتیش ہے؟''

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد سوال کیا۔ ''میں مطمئن رہوں نا کہ آپ نے حنیف کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟''

''اس بات کا حتمی فیصلہ تو میں حنیف سے ملاقات کے بعد ہی کروں گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں آپ کی بھرپور مدد کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''یہ آپ کی ''حتمی فیصلہ'' والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب......؟''

''بڑی سیدھی اور صاف سی بات ہے۔'' میں نے وضاحت ضروری جانی۔ ''عدالت تو کسی کیس کا فیصلہ اس کیس کے اختتامی مراحل میں تمام تر ثبوت، شواہد، گواہان کے بیانات اور دونوں جانب کے وکلا کے دلائل کی روشنی میں کرتی ہے لیکن میں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں کسی کیس کو لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ملزم سے ایک بھرپور ملاقات کے بعد کرتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہوجائے کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی بھی حوالے سے ملزم اس کیس میں ملوث ہے تو پھر میں معذرت چاہتے ہوئے اس کیس سے ہینڈز اپ ہوجاتا ہوں۔''

''یہ آپ کا بہت ہی زبردست اصول ہے۔'' وہ تعریفی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انشااللہ! حنیف سے ملاقات کے بعد آپ کو کسی قسم کا شک نہیں گزرے گا۔''

''پھر تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

اس کے بعد ارشاد حسین نے مجھ سے میری فیس کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اسے اپنی فیس بتا دی اور اس پر یہ بھی واضح کردیا کہ میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔

اس نے فوراً میری مطلوبہ فیس ادا کردی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقم ایک امانت کی طرح میرے پاس ہے۔ اگر خدانخواستہ، میں نے آپ کے صاحبزادے کے کیس میں ہاتھ نہ ڈالا تو کل اسی وقت آپ میرے دفتر آ کر اپنی امانت لے جایئے گا۔''

''اور اگر آپ نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کرلیا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''اس صورت میں بھی آپ کو میرے دفتر تو آنا ہی ہوگا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تاکہ اس کیس کے حوالے سے آیندہ کے لیے منصوبہ بندی کی جاسکے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔
''تو پھر مجھے اجازت دیں۔''
اور میں نے اسے رخصت کی اجازت دے دی۔

❖❖❖

عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں پھنسے ہوئے کسی ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس رات میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹا ملزم حنیف کے ساتھ حوالات میں گزارا، اس طرح کہ وہ آہنی سلاخوں کے اس طرف ایک قیدی کی حیثیت سے موجود تھا اور میں اس جانب ایک آزاد شہری کے مانند۔ میرے مختلف سوالات کے جواب میں حنیف نے مجھے بے حساب حقائق کے بارے میں بتایا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں اس کا کیس لینے کا حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔ تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں وہ نوجوان مجھے بے قصور و بے گناہ نظر آیا تھا۔

میں نے وکالت نامے، درخواست ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لیے اور اسے تسلی دینے کے بعد تھانے سے واپس آگیا تھا۔

حنیف بھاری بدن کا مالک ایک گندمی رنگت کا ہینڈسم اور پُرکشش نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس کے آس پاس تھی۔ اس سے حاصل ہونے والی قیمتی معلومات کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہوجائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہاں پر یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ اس تفصیل کے اندر سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپالی ہیں جنہیں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر ظاہر کروں گا۔

ارشاد حسین اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ گلشن اقبال کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے پاس دو سو گز کا ذاتی گھر تھا جو اس نے زندگی بھر کی محنت سے بنایا تھا۔ اس کی ساری زندگی بینک کی ملازمت کرتے گزری تھی اور حال ہی میں وہ اس جاب سے ریٹائر ہوا تھا۔ آج کل وہ اپنے ایک دوست اشتیاق بزمی کی ایجنسی پر بیٹھ کر کاروباری اسرار و رموز سیکھنے کی

کوشش کررہا تھا۔ اشتیاق بزمی رئیل اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور کراچی کے علاقے ایف بی ایریا میں اس کی خوب چلتی ہوئی ایجنسی تھی۔

ارشاد حسین نے بینک کے آڈٹ ڈپارٹمنٹ میں زندگی گزاری تھی۔ اس کے پاس مال بنانے کے بہت مواقع تھے۔ اس کے ساتھ کے لوگ کہاں سے کہاں چلے گئے تھے لیکن ارشاد حسین کے اندر رچی بسی ایمانداری نے اسے کبھی کوئی غلط کام نہیں کرنے دیا جب ہی وہ زندگی بھر کی جمع پونجی سے ایک مکان ہی بنا سکا تھا۔ بصورتِ دیگر، اگر وہ چاہتا تو کسی بھی پوش علاقے میں عالیشان بنگلا بنانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ اپنی اولاد کو رزقِ حلال کھلانا چاہتا تھا اور اس مقصد میں اسے صد فیصد کامیابی ہوئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی پریشانی تھی کہ اس کا جوان بیٹا قتل کے ایک کیس میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

ارشاد حسین کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی سلمٰی کی شادی ہوچکی تھی اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ سلمٰی کی شادی ایک بینکر فیضان سے ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔

سلمٰی سے چھوٹے دو لڑکے تھے۔ حنیف اور عمران۔ حنیف کی عمر چوبیس، پچیس سال کے درمیان تھی اور عمران اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ ارشاد حسین نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی بینکر بنانے کے بارے میں سوچا تھا لیکن حنیف نے اس کی ساری آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ البتہ عمران ابھی تک اپنے مقصد پر جما ہوا تھا۔ وہ ان دنوں بی کام کررہا تھا اور اپنے بڑے بھائی حنیف سے تعلیمی میدان میں آگے نکل گیا تھا۔ ارشاد حسین کو توقع تھی کہ وہ عمران کو ضرور کسی بینک میں فٹ کروادے گا۔

حنیف انٹر سائنس میں تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر پُراسرار قوتوں کے حصول کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا کہ آج کی دنیا میں تعلیمی اسناد انسان کو صرف کلرک ہی بنا سکتی ہیں، اچھا یا برا کلرک۔ اس کی نظر میں کسی بینک کا چپراسی بھی ایک کلرک تھا اور اسی بینک کا وی پی بھی کلرک۔ اس کے خیال میں معاشرے کا تنخواہ دار طبقہ کلرک ہی شمار ہوتا تھا چاہے اس کی تنخواہ ایک ہزار ہو یا ایک لاکھ۔

ان اونچے خیالات کے ساتھ وہ کیا تعلیم حاصل کرتا اور کیا ارشاد حسین کی، اس کی بینک جاب کے سلسلے میں کوششیں بارآور ہوتیں۔ وہ بس، دن رات ماورائی علوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھا کرتے میں سرگرداں رہتا تھا پھر کسی میگزین میں اس نے ٹیلی پیتھی کے حوالے سے کوئی مضمون پڑھ لیا۔ اس مضمون کی اثرپذیری نے حنیف کے ذہن اور سوچ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس نے حتمی فیصلہ کرلیا...... چاہے کچھ بھی ہوجائے، وہ ٹیلی پیتھی سیکھ کر ہی رہے گا۔

اس مصمم ارادے کے بعد اس نے کسی ایسے مردِ میدان کی تلاش شروع کردی جو اسے ٹیلی پیتھی کا علم سکھا سکے۔ جلد ہی اس کی مراد بر آئی۔

ایک روز وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کررہا تھا کہ ماورائی علوم کا ذکر نکل آیا، پھر ان علوم کے ماہرین کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ حنیف ان دنوں چونکہ ٹیلی پیتھی سیکھنے کے جنون میں مبتلا تھا لہٰذا الیاس کی بات نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

''یار، سننے میں آیا ہے کہ اِدھر نارتھ میں کوئی صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں۔'' الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کے پاس ایسے علوم کا خزانہ ہے۔''

حنیف، شیخ احمد، الیاس اور مختار اکثر رات میں ''منظور'' نامی اس ہوٹل میں آبیٹھتے تھے۔ مذکورہ ہوٹل کے مالک کا نام منظور حسین تھا جو کافی عرصہ پہلے اس دارِفانی سے کوچ کرگیا تھا، یہ اپنے علاقے کا ایک خوش ذائقہ ہوٹل سمجھا جاتا تھا جو لگ بھگ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔

الیاس کی بات سن کر حنیف کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''نارتھ کا علاقہ تو خاصا وسیع و عریض ہے۔ تم کہاں کی بات کررہے ہو؟''

''میں نارتھ ناظم آباد کی بات کررہا ہوں۔'' الیاس نے جواب دیا۔ ''وہ صاحب شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔''

''ان کا نام کیا ہے؟'' حنیف نے پوچھا۔
''ڈاکٹر سلیم فاروقی......'' الیاس نے بتایا۔

اب گفتگو کا دائرہ سمٹ کر الیاس اور حنیف تک محدود ہوگیا تھا۔ شیخ احمد اور مختار بڑی دلچسپی سے انہیں سن رہے تھے۔ حنیف نے سوال کیا۔

''یار الیاس! کیا تم مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا سکتے ہو۔ مجھے ان سے کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔''

حنیف نے دانستہ یہ بات ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ ٹیلی پیتھی کا علم سیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تشویش اور تجسس نے الیاس کو بتا دیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے لیکن گڑبڑ کہاں واقع ہے، اس بات کا اسے اندازہ نہ ہوسکا۔ وہ

حنیف کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

”کس سلسلے میں؟“ اس کے استفسار میں بڑی معنی خیزی تھی۔

”بس، ہے کوئی سلسلہ!“ حنیف نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”بتانا نہیں چاہ رہے ہونا......“ الیاس کے لبوں پر شکایت ابھر آئی۔ ”ہم دوستوں سے چھپاؤ گے یار...... کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے تو بتادو...... ڈاکٹر صاحب بڑا مجرب تعویذ بھی دیتے ہیں ایسے معاملات کے لیے......“

”میرا ایسا کوئی چکر نہیں جو تم دوستوں سے پوشیدہ ہو۔“ حنیف نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ”ہمارے ایک دور کے رشتے دار ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آرہے ہیں، میں ان کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر میری بات کا یقین آجائے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا دینا ورنہ تمہاری مرضی ہے۔“

حنیف نے اب بھی اصل بات نہیں بتائی تھی۔ شیخ احمد نے کہا۔ ”یار حنیف! ہم تو پُراسرار اور ماورائی علوم کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور الیاس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ذکر کر دیا۔ بیچ میں تمہارے کسی عزیز کی بیماری کہاں سے آگئی؟“

”بتائے گا...... یہ ضرور بتائے گا۔“ مختار نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”ہم کیا اس کی عادت سے واقف نہیں ہیں...... اسے مشرق کی طرف جانا ہو تو یہ شمال کی جانب سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور جنوب کے قریب سے گزر کر بالآخر اپنی منزلِ مطلوب تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ جانتے نہیں ہو، شیرازی صاحب نے اس کے لیے کون سا ٹائٹل منتخب کر رکھا ہے......؟“

شیرازی صاحب ان کے علاقے کے ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے لیکن نہایت ہی زندہ دل اور خوش مزاج۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ نئی نسل کے اندر بڑی آسانی سے گھل مل جاتے تھے۔ مختار نے انہی شیرازی صاحب کا حوالہ دیا تو الیاس پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”شیرازی صاحب نے حنیف کو کیا ٹائٹل دے رکھا ہے؟“

”چپ چھنال......!“ مختار نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔

حنیف نے کسی زبانی یا عملی برہمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ شاکی نظر سے مختار کو گھور کر رہ گیا۔ شیخ احمد نے پوچھا۔

”ہاں تو یار حنیف، اب تم اپنی زبان ہی سے ہمیں بتا دو کہ کسی عزیز کی بیماری سے شروع ہونے والا معاملاتی سفر کہاں جا کر ختم ہونے کا نام لے گا؟“

”آپ لوگوں نے اگر آج میری بھد اڑانے کا پروگرام بنا ہی لیا ہے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ حنیف کی آواز میں خفگی کا عنصر بڑھ گیا۔ ”آپ لوگ بڑے شوق سے اپنا رانجھا راضی کر سکتے ہیں۔“

”ہم تو اپنے رانجھے کے ساتھ ساتھ تمہاری ہیر کو بھی راضی کرنا چاہتے ہیں یار!“ الیاس نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن پتا تو چلے کہ وہ ہے کون؟ اس کا نام کیا ہے؟ مقام کیا ہے؟ اور تم دونوں کے ملاپ میں گھمسان کیا ہے......؟“

”کرلو...... جتنی بھی بکواس کرنا ہے۔“ حنیف نے تیز آواز میں کہا۔ ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ جب ایسا کوئی معاملہ ہی نہیں تو خواہ مخواہ میں کیوں چڑوں؟“

”ارے بے وقوف! ایسے معاملات پر چڑا نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔“ شیخ احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو مجھ سے منسوب کر کے دن بھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہو، میں تمہارا شکر گزار رہوں گا اور تمہیں اپنی جیب سے مرغی فرائی کھلاؤں گا، دودھ پتی اس کے علاوہ ہے......“

حنیف یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اپنی بات سے پھرو گے تو نہیں؟“

شیخ احمد یہی سمجھا کہ حنیف کا اشارہ مرغی فرائی اور دودھ پتی کی جانب ہے۔ وہ بڑی کشادہ دلی سے بولا۔

”زبان سے جو کہہ دیا، سو کہہ دیا یار! میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا۔ یہ دونوں گواہ بھی ہیں اور اگر پھر بھی تمہیں میرا یقین نہ آئے تو میں تمہاری ضمانت کے بل کی رقم نکال کر ابھی میز پر رکھ دیتا ہوں۔“

”ہاں، ٹھیک ہے...... یہ بھی کر دیکھو۔“ حنیف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

شیخ احمد نے بڑے جوش سے پتلون کی ہپ پاکٹ میں سے بٹوا نکالا اور پھر اس بٹوے میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ برآمد کر کے میز پر دے مارا جیسے تاش کے کھیل میں ترپ کا پتا دوسرے پتوں کے اوپر پٹخا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے بڑے حاتم طائی کے انداز میں کہا۔

”آج سب لوگ میری جیب سے مرغی فرائی کھائیں گے۔“

حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے پچاس روپے میں چار افراد بہ آسانی مرغی فرائی کھا لیتے تھے اور ان کی چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ کا آسرا بھی ہو جاتا تھا۔ آج کل پچاس روپے میں مرغی کی ایک ٹانگ بھی دستیاب نہیں ہوتی...... اللہ اللہ، کیا انقلاب زمانہ ہے۔

”اب شروع ہو جاؤ تم جلدی سے۔“ شیخ احمد نے کہا۔ ”میں نے اپنی زبان پوری کر دی ہے۔“

”میں سب سے پہلے دو لڑکیوں کا ذکر کروں گا۔“ حنیف نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”اگر یہ ذکر تم ہضم کر پائے تو پھر میں آگے بھی کوشش کروں گا ورنہ یہ سلسلہ یہیں ختم سمجھو......“

شیخ احمد نے ٹٹولنے والی نظر سے حنیف کو دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم کن دو لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟“

”ان کے نام ہیں......“ حنیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سحرش اور نازنین......!“

”ابے یار...... اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے......“ مختار نے بے ساختہ کہا۔

الیاس بے اختیار بولا۔ ”اس نے تو شیخ احمد کی بہنوں ہی سے ابتدا کر دی......“

شیخ احمد اس دوران میں لال بھبوکا ہو چکا تھا۔ چیخ سے مشابہ لہجے میں اس نے حنیف سے کہا۔ ”میری بہنوں کا اگر دوبارہ نام لیا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی......؟“

”یہ ہمت تو مجھے آپ ہی نے دلائی ہے شیخ صاحب!“ حنیف نے نہایت ہی مہذب، ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”آپ نے ایسی تو کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ آپ کی بہنوں کو ٹچ نہیں کرنا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو آپ سے منسوب کر سکتا ہوں۔ اب یا تو آپ سارا غصہ تھوک کر اپنے کہے پر شرمندہ ہو جائیں یا پھر یہ ثابت کریں کہ سحرش اور نازنین اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں۔“ وہ بڑے جذباتی انداز میں متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”افسوس کہ ہم دوسری لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی کسی کی بہنیں یا کسی کی بیٹیاں ہوں گی۔ ہم اپنے نفس کی تسکین اور ذہن کی تفریح کے لیے اپنے پسندیدہ زاویوں پر انہیں فٹ کر کے حظ اٹھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور جب کوئی دوسرا شخص ہماری چال ہم پر لوٹا کر ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو ٹارگٹ کرتا ہے تو ہمارے لہو میں ڈیڑھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا ابال آجاتا ہے۔ کیوں...... آخر کیوں...... کیا ہمارا خون صرف اپنی عزت کے لیے جوش مارتا ہے، دوسروں کی عزت تفریحِ طبع کا سامان ہے بس......“

”مجھے پتا نہیں تھا یار! کہ تمہارے اندر کوئی مولوی چھپا بیٹھا ہے۔“ شیخ احمد نے اٹھ کر بازو آگے کر دیے۔ ”مجھے معاف کرو حنیف! تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آئی ایم ریئلی ویری سوری۔“

اگلے ہی لمحے وہ دونوں بغل گیر ہو چکے تھے۔

آئندہ دس منٹ میں سب کچھ نارمل ہو گیا۔ دوستوں میں روٹھنا اور مان جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ ویسے حنیف نے جتنی بڑی حقیقت کو شیخ احمد کے سامنے اجاگر کیا تھا، ان میں سے کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں تھا۔ مختار نے شیخ احمد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر ان پچاس روپے کی مرغی فرائی منگوالی جائے؟“

”میری طرف سے پوری اجازت ہے۔“ وہ خجل سا ہو کر بولا۔

”میرا خیال ہے، اس سلسلے میں ہمیں حنیف کا مشورہ ماننا چاہیے۔“ الیاس نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔ ”کیونکہ ان پچاس روپے کا فاتح تو یہی ہے نا؟“

سب نے الیاس کی بات سے اتفاق کیا تو حنیف سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے خیال میں مرغی ٹھیک نہیں۔ وہ تو اور بلڈ پریشر بڑھائے گی۔ یہاں پہلے ہی خاصی گرما گرمی ہو چکی ہے لہٰذا اس رقم کی ہم آئس کریم کھائیں گے لیکن ایک شرط ہے۔“

حنیف نے جملہ نامکمل چھوڑا تو الیاس نے فوراً پوچھا۔

”کیسی شرط؟“

”منظور سے اٹھنے سے پہلے تم مجھے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ایڈریس بتاؤ گے۔“ حنیف نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”سچی بات تو یہ ہے حنیف...... کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔“ الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھ سے بھی ایک دوست نے ذکر کیا تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے، پھر تم اپنے اس دوست ہی سے پوچھ کر بتا دینا۔“ حنیف نے کہا۔ ”لیکن یار، میرے اس کام کو یاد رکھنا۔“

''تم بے فکر ہوجاؤ۔'' الیاس نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

اور حنیف...... واقعی بے فکر ہوگیا۔

اگلے روز الیاس نے حنیف کو اپنے ساتھ لے جاکر اس دوست سے ملوادیا جس کا اس نے ''منظور'' میں ذکر کیا تھا۔ اس شخص کا نام طارق شاہ تھا اور وہ ایف سی ایریا کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ حنیف کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ طارق شاہ، ڈاکٹر سلیم فاروقی کے ساتھ ہی ہوتا تھا بلکہ کلینک کے معاملات میں وہ ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ تھا۔

طارق شاہ ایک گورا چٹا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ جسم مائل بہ فربہی اور چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی مونچھیں۔ وہ اپنے سر پر ہر وقت ٹوپی لگائے رہتا تھا۔ طارق شاہ نے بڑی محبت اور اخلاص سے ان کا استقبال کیا۔ راستے میں حنیف نے الیاس کو اپنے مقصد سے تفصیلاً آگاہ کردیا تھا کہ ڈاکٹر سلیم سے ملنے کے لیے اتنا بے تاب کیوں ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد الیاس نے حنیف کا تعارف کرانے کے بعد طارق شاہ سے کہا۔ ''شاہ جی! یہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ یہ آپ کے ڈاکٹر صاحب سے ٹیلی پیتھی سیکھنا چاہتا ہے۔''

''بڑی خوشی سے جناب۔'' طارق شاہ نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''ہم بیٹھے کس لیے ہیں آخر......'' وہ پھر براہِ راست حنیف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ سرکار سے ملاقات کے لیے کبھی کلینک پر تشریف لائیں۔''

''سرکار!'' سے اس کی مراد یقیناً ڈاکٹر سلیم ہی سے تھی۔ حنیف نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

''آپ مجھے کلینک کی لوکیشن بتا دیں میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

طارق شاہ نے نہایت سہل انداز میں اسے ''فاروقی کلینک'' کی لوکیشن سمجھا دی تو حنیف نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔

''کلینک کی کوئی مخصوص ٹائمنگ ہے یا......؟''

''بالکل ٹائمنگ ہے بھائی۔'' طارق شاہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''دن میں گیارہ بارہ سے لے کر چار بجے تک اور شام میں پانچ بجے سے لے کر رات دس بجے تک کلینک کھلا رہتا ہے۔ ان اوقات میں آپ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔''

''کیا اس دوران میں تمام وقت ڈاکٹر صاحب کلینک پر موجود رہتے ہیں۔'' حنیف نے اپنی تسلی کے لیے پوچھ لیا۔ ''دراصل، میں ایسے وقت میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جب انہیں ذرا فرصت ہوتا کہ میں اپنے معاملے پر ذرا تفصیلاً ان سے بات کرسکوں......!''

''بس، تو پھر آپ شام میں ہی آئیں تو اچھا ہے۔'' طارق شاہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''صبح کے وقت تو زیادہ رش عورتوں ہی کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سنا سنا کر سرکار کا دماغ خالی کردیتی ہیں۔ سرکار چار بجے سے پانچ بجے تک آرام فرماتے ہیں۔ پانچ بجے فریش ہوکر دوبارہ بیٹھ جاتے ہیں اور اس وقت سائلین کا سب سے کم ہجوم ہوتا ہے بلکہ میں نے تو دیکھا ہے کہ پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان تو کلینک خالی ہی پڑا ہوتا ہے۔ سرکار ہوتے ہیں، میں ہوتا ہوں یا پھر آصف جو کلینک میں اوپری کام کے لیے رکھا گیا ہے۔ کلائنٹس وغیرہ چھ بجے کے بعد ہی آنا شروع ہوتے ہیں۔''

''بس تو جناب، میں کل ٹھیک پانچ بجے کلینک پر حاضر ہورہا ہوں۔'' حنیف نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرانا آپ کا کام ہے......''

''میں سرکار سے آپ کی ملاقات ضرور کرادوں گا۔'' طارق شاہ نے یقینی لہجے میں کہا۔ ''بلکہ میں دن ہی میں ان سے آپ کا ذکر کردوں گا۔''

''یہ تو آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ پر!'' حنیف نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

وہ دس پندرہ منٹ مزید طارق شاہ کے فلیٹ پر رکے، چائے بسکٹ سے معدے کو محظوظ کیا پھر صاحبِ خانہ سے پُرجوش مصافحہ کرکے واپس آگئے۔

آیندہ روز سے حنیف نے فاروقی کلینک پر جانا شروع کردیا۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی نے پہلی ہی ملاقات میں اسے سرتاپا متاثر کرلیا تھا۔ ڈاکٹر کو ٹیلی پیتھی آتی تھی یا نہیں اور مجھے یقین ہے...... بالکل نہیں آتی تھی! ورنہ وہ ایسی بے بسی اور بے کسی کی موت ہرگز نہ مرتا۔ بہرحال، تو میں آپ کو بتارہا تھا کہ وہ شخص مختلف ماورائی علوم کے بارے میں گہری معلومات ضرور رکھتا تھا۔ شعور، لاشعور، تحت الشعور، حواس خمسہ، چھٹی حس، پچیوٹری گلینڈ، تھرڈ آئی اور دیگر ایسی ہی درجن بھر دماغی و نفسیاتی اصطلاحات کی مار، مار کر ڈاکٹر نے حنیف کو اپنا مرید بنالیا بلکہ اس کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں کردیا کہ وہ اسے بہت عزیز رکھتا ہے اور اس احساس نے حنیف کے اندر اس کی اوقات سے زیادہ ہوا بھر دی اور وہ بعض اوقات تو دن میں بھی ''سرکار'' کی خدمت میں حاضریاں دینے لگا۔

حنیف لگ بھگ تین ماہ تک ٹیلی پیتھی سیکھنے کے شوق میں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک جاتا رہا۔ ٹیلی پیتھی کا تو ''ٹ'' بھی اس کے دماغ میں نہیں سمایا تھا، البتہ اس نے اس دوران میں کلینک پر عجیب عجیب کلائنٹس کو دیکھا اور ان کے مسائل کو سنا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ کیس عورتوں کے ہوتے تھے جن میں سے بیشتر اپنے شوہروں کو سیدھا کرنے کے لیے ڈاکٹر سے مختلف قسم کے تعویذات اور بندشیں وغیرہ بنوا کر لے جاتی تھیں۔ ایسی احمق عورتیں اگر اس سے آدھی توجہ بھی اپنے شوہروں پر مرکوز کرتیں جتنی وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے بچا کر رکھتی ہیں تو انہیں کسی تعویذ یا بندش کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ ان کے بگڑے ہوئے شوہر نہ صرف یہ کہ سیدھے ہوجاتے بلکہ ان کے مطیع و فرماں بردار بھی بن جاتے۔

کیونکہ وہ محبت کے بھوکے، رومانس کے متلاشی اور پُرسکون گھریلو ماحول کے پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو ہر رات ایک بنی سنوری دلہن کے روپ میں دیکھنے کے بھی متمنی ہوتے ہیں لیکن دوسری جانب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اسے باہر والوں کے ''دیکھنے'' کا اتنا زیادہ خیال اور اس خیال کا ایسا شاندار اہتمام کا احساس ہوتا ہے مگر جس شخص کو انہیں دیکھنا چاہیے جب یہ اس کے قریب جاتی ہیں تو 'کچن والا' پسینے میں بسا ہوا لباس ان کے بدن پر سجا ہوتا ہے جس میں سے لہسن پیاز کے علاوہ مختلف چٹنیوں کی مہک اٹھ رہی ہوتی ہے۔

ان کے اس حسن سلوک کی تاب نہ لاتے ہوئے اگر کوئی شوہر گھر سے باہر ''سکھ چین'' کے لیے نگاہ دوڑانے کی کوشش کرے یا ایسی کوشش کے دوران پکڑا جائے تو سب سے پہلے تو گھر کے اندر ایک فسادِ عظیم برپا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی جیسے عامل کامل فراڈ لوگوں کے آستانے پر شوہروں کو سیدھا کرنے کے لیے تعویذات اور بندشیں وغیرہ لینے پہنچ جاتی ہیں۔

ایک بیوی کسی سیانے کے پاس پہنچی اور عرض کیا۔ ''حضرت! کوئی ایسا عمل کریں کہ میرا شوہر سدھر جائے......''

''اس میں ایسی کیا خرابی ہے؟'' سیانے نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''سرکار! وہ مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔'' اس بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ''مجھے گھر کی مرغی اور گھڑے کی مچھلی سمجھتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اور محبت باہر کی رنگین تتلیوں پر نچھاور ہوتی ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔''

''بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔'' سیانے نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کرتا ہوں کچھ......''

''وہ میری طرف راغب ہوجائے گا نا......؟'' بیوی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ہوجائے گا!'' سیانا تیقن سے بولا۔ ''میرا عمل خطا نہیں جاتا لیکن......''

''لیکن کیا بابا جی؟'' سیانے کے ادھورے جملے پر اس بیوی نے تڑپ کر پوچھا۔

''لیکن یہ کہ......'' سیانا گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے اس عمل کے لیے شیر کی گردن کا ایک بال چاہیے ہوگا۔ میں چاہوں تو وہ بال کسی سے بھی منگوالوں لیکن اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا کام ہو، بال بھی اسی کو لانا ہوگا......''

''لیکن قبلہ!'' بیوی جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''شیر تو بہت ہی خطرناک جانور ہے۔ میں اس کی گردن میں سے کوئی

بُرائے چاول

اُمِ رباب کی تلاش

دو چیزیں انسان کی کمزوری ظاہر کرتی ہیں۔ جہاں بولنا ہو، وہاں خاموش رہنا اور جہاں خاموش رہنا ہو، وہاں بولنا۔

فارسی کہاوت

شادی ہر صورت میں فائدے مند ہے۔ اگر آپ کو اچھی بیوی ملی تو آپ خوش نصیب ہوں گے ورنہ مفکر بن جائیں گے۔ ''سقراط''



دو سفری سیلز مین بہت عرصے بعد ملے۔ ایک نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج کا دن تو بہت ہی بُرا گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی۔ کہیں گالیاں، کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کرلیا، کہیں گرجنے برسنے لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔''

''کیا بیچ رہے ہو آج کل؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔'' پہلے نے جواب دیا۔

بال......؟‘‘

’’مجھے یقین ہے، تم یہ کام کرسکتی ہو!‘‘ سیانے نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ’’مجھے تمہارے اندر چھپی ہوئی وہ صلاحیت صاف نظر آرہی ہے جس کو بروئے کار لاکر تم ناممکن کو ممکن بناسکتی ہو۔ جاؤ...... شیر کی گردن کا صرف ایک بال لے آؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔‘‘

وہ بیوی سیانے کے آستانے سے واپس آگئی اور اگلے ہی روز سے اس نے باقاعدگی کے ساتھ چڑیا گھر جانا شروع کردیا جہاں ایک پنجرے میں شیر ببر بھی بند تھا۔ اس کے سامنے چونکہ ایک مقصد آن کھڑا ہوا تھا لٰہذا وہ پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں لگ گئی۔ وہ ہر قیمت پر شیر کی گردن کا بال حاصل کرکے، سیانے کے طلسماتی اور کرشماتی عمل سے اپنے شوہر کو قابو کرنے کا تہیہ کرچکی تھی۔

ابتدا میں اس نے اپنے ساتھ گوشت کا ایک پارچہ لے جانا شروع کیا۔ وہ شیر کے پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوجاتی اور گوشت کے ٹکڑے کو پنجرے کے اندر پھینک کر شیر کو اس جانب متوجہ کرنے کے لیے اشاروں اور سیٹیوں کی ترکیب آزمانے لگی۔ دوسری یا تیسری کوشش پر ہی شیر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا...... وہ شیر ببر کو گوشت کی جھلک دکھا کر آنکھوں سے مخصوص اشارہ کرتی تو وہ اس کی دعوت پر فوراً گوشت سے فیض یاب ہونے کے لیے لپک پڑتا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ شیر اس بیوی سے اس قدر مانوس ہوگیا کہ گوشت سے لذت آشنا ہونے کے بعد وہ اسی کے قریب بیٹھ جاتا اور وہ بیوی اس کی گردن کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اسے مزے دلاتی رہتی...... پھر ایک روز اس نے موقع دیکھ کر شیر کی گردن سے ایک بال نوچ ہی لیا۔

اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں وفرحاں وہ بھاگتی ہوئی اس سیانے کے پاس پہنچی اور مذکورہ بال اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

’’حضرت! یہ لیں بال۔ میں نے تو اپنا کام کردیا۔ اب آپ بھی اپنا عمل شروع کریں......‘‘

سیانے نے حیرت بھری نظر سے اس بیوی کو دیکھا پھر پوچھا کہ اس نے یہ بال حاصل کرنے کے لیے کیا ترکیب آزمائی ہے۔ بیوی نے اپنی کوشش کو پوری تفصیل سے بیان کردیا۔ سیانے کی حیرت دوچند ہوگئی، وہ پُرمعنی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

’’اللہ کی بندی! سمجھ لو کہ تمہارا کام ہوگیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اب میرے کسی عمل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔‘‘

’’آپ عمل نہیں کریں گے تو میرا کام کیسے ہوگا؟‘‘ وہ تعجب خیز لہجے میں بولی۔

’’میں نے کہا نا، تمہارا کام ہوگیا۔‘‘ سیانے نے اصراری لہجے میں کہا۔ ’’بس، اب تمہیں میری ایک بات دھیان سے سننا ہوگی۔ اگر تم نے میری بات کو پوری توجہ سے سن کر اپنے ذہن میں بٹھالیا تو سمجھو کہ تمہارا بیڑا پار ہوگیا۔‘‘

وہ بیوی ہمہ تن گوش ہوگئی۔ سیانے نے اس کے انہماک اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’او جھلیے...... جتنی مہارت اور عقل مندی سے تم نے گوشت دکھا دکھا کر جنگل کے بادشاہ کو رام کرلیا تھا، اگر تم خلوص تن من سے...... اس سے آدھی محنت بھی اپنے شوہر پر کرو تو وہ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑا رہے گا۔ پھر تمہارے سارے گلے شکوے جاتے رہیں گے۔‘‘

تو...... میں آپ کو یہ بتارہا تھا کہ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم حنیف کو ٹیلی پیتھی سیکھنے کی غرض سے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جاتے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہوئے تھے کہ ایک روز اسے اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔

❖❖❖

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی اور اپنے مؤکل کی ضمانت کے لیے دلائل دینا شروع کردیے۔

قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے بلکہ یہ کام ناممکن کی حدود کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا کہ میں اپنے مؤکل کی ضمانت کروانے میں قطعی ناکام رہا تھا۔

پولیس نے اپنی تفتیش کی روشنی میں میرے مؤکل کو ڈاکٹر سلیم فاروقی کا قاتل نامزد کیا تھا اور اسی رپورٹ کو استغاثہ کہا جاتا ہے۔ یہ رپورٹ کئی صفحات پر مشتمل تھی جس کے اہم مندرجات گاہے بہ گاہے آپ کی نظروں سے گزرتے رہیں گے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے کلینک کے آخری یعنی تیسرے اور عقبی پورشن میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کی موت کا سبب ایک آہنی سلاخ تھی جس کی خطرناک ضرب

نے مقتول کی کھوپڑی کے پچھلے حصے کو بڑی بے دردی سے ’’پاش پاش‘‘ کردیا تھا یعنی وہ حصہ بری طرح چٹخ گیا تھا۔ اس کاری وار نے اسے موت کی نیند سلادیا تھا۔

رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول کو حالتِ نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کلینک کا وہ عقبی پورشن اس نے اپنے آرام کے لیے مختص کر رکھا تھا جہاں فرش پر ایک گداز بستر بچھا دیا گیا تھا۔ مقتول کے معمول میں یہ بات شامل تھی کہ وہ روزانہ سہ پہر میں چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک اسی پورشن میں لیٹ کر ایک آرام دہ نیند لیا کرتا تھا جس کے بعد وہ فریش ہوکر دوبارہ اپنے کلینک پر آبیٹھتا تھا۔ اس کی بیٹھک کلینک کے دوسرے یعنی وسطی پورشن میں ہوا کرتی تھی جہاں وہ اپنے پاس آنے والے مصیبت زدہ لوگوں کے مسائل سنتا تھا اور ان کے مسائل کے لیے مختلف ماورائی اور غیر ماورائی حل تجویز کیا کرتا تھا اور ظاہر ہے، یہ کام وہ مفت میں یا فی سبیل اللہ نہیں کرتا تھا۔

مقتول ڈاکٹر نے اپنی کوئی مخصوص فیس مقرر نہیں کر رکھی تھی۔ اس کے پاس معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کلائنٹس آیا کرتے تھے جن میں ایسے بھی ہوتے تھے کہ جنہیں تعویذ کے علاوہ کھانے کے پیسے بھی دینا پڑتے تھے اور بعض ’’پارٹیاں‘‘ ایسی بھی تھیں جن سے وہ ’’بندش‘‘ کرنے یا ’’بندش‘‘ کاٹنے کی مد میں ہزاروں وصول کرلیا کرتا تھا۔ اس نے حصہ بہ قدر جثہ کے مصداق ایک ایسی نادیدہ چھری ہاتھ میں پکڑلی تھی یہ موقع محل دیکھ کر کلائنٹس کو کاٹتی تھی اور وہ ہر صورت میں فائدے ہی میں رہتا تھا۔ وہ جن سے رقم وصول نہیں کرتا تھا، انٰ سے کچھ اور وصول کرلیا کرتا تھا اور یہ ’’کچھ اور‘‘ فرد بہ فرد بدلتا رہتا تھا۔ اس معاملے میں وہ مرد اور عورت میں تمیز کرنا خوب جانتا تھا۔

مقتول کے کلینک کا پہلا یعنی ابتدائی پورشن ریسیپشن کی حیثیت کا حامل تھا جہاں مقتول ڈاکٹر کا اسسٹنٹ طارق شاہ براجمان ہوا کرتا تھا۔ طارق شاہ کی مخصوص نشست کے علاوہ سائلین کے لیے دو تین صوفے ڈال دیے گئے تھے جہاں بیٹھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ گویا وہ ابتدائی پورشن بیک وقت طارق شاہ کا کمرا بھی تھا اور کلائنٹس کے لیے انتظار گاہ بھی جہاں پر موجود ضرورت مند طارق شاہ کی مرضی ہی سے مقتول ڈاکٹر کے پاس شرف باریابی پاتے تھے۔

جب ملزم کی درخواست ضمانت مسترد ہوچکی تو عدالت کی جانب سے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔

ابتدائی چند پیشیوں پر کوئی بھی قابلِ ذکر عدالتی کارروائی نہ ہوسکی۔ اس ٹیکنیکل تفصیل کو بیان کرکے میں آپ کو بور نہیں کروں گا۔ لگ بھگ دو ماہ کے بعد، عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں، میں مختلف پہلوؤں سے، ڈھیروں اہم نکات جمع کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا گویا، میں اس کیس سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکا تھا۔

آیندہ پیشی پر جب اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی جس کے جواب میں، میرے مؤکل نے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔

ملزم نے معزز عدالت کے سامنے کم وبیش وہی بیان دیا تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جج کی اجازت کے بعد ملزم پر کڑی جرح کی لیکن ملزم میری ہدایات کی روشنی میں بڑی ثابت قدمی سے وکیل مخالف کی جرح کے سامنے ڈٹا رہا۔

اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ’’کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتول کے کلینک پر اکثر جایا کرتے تھے؟‘‘

’’جی ہاں...... یہ بات سچ ہے۔‘‘ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

’’یہ سلسلہ کب سے جاری تھا؟‘‘

’’لگ بھگ تین ماہ سے۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے......‘‘ میں نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔ ’’مقتول کی بھیانک موت سے، تین ماہ پہلے سے؟‘‘

’’جی ہاں، میرا یہی مطلب تھا......‘‘

’’کیا تم پر کوئی جن وغیرہ آتا تھا یا کسی بندش کو کٹوانے تم مقتول کے کلینک پر جایا کرتے تھے۔‘‘ میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ’’سنا ہے، مقتول بہت ہی پہنچا ہوا ماہر عامل تھا......؟‘‘

’’سنا تو میں نے بھی یہی تھا جناب......‘‘ وہ بددلی سے بولا۔ ’’لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ...... دور کے ڈھول سہانے...... تو میرے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے نا تو......‘‘ اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’مجھ پر نہ تو کوئی جن آتا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ بندش جیسا کوئی معاملہ تھا۔ جن اس لیے نہیں آسکتا تھا کہ میں

کوئی حسین وجمیل دوشیزہ نہیں تھا اور بندش کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا تھا کہ دور دور تک میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔"

"تم مقتول ڈاکٹر کے ساتھ رہ کر کافی ٹیکنیکل ہو گئے ہو!" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "جب تمہارے ساتھ کوئی عارضہ نہیں تھا تو پھر تم مقتول کے کلینک پر کیوں جایا کرتے تھے؟"

"ٹیلی پیتھی سیکھنے......!"

"اوہ، ٹیلی پیتھی......" میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ ٹیلی پیتھی کیا بلا ہوتی ہے؟"

"جناب! یہ بلا نہیں بلکہ ایک سائنٹیفک علم ہے۔" وہ بڑے مدبرانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جسے خیال خوانی اور مینٹل کمیونی کیشن بھی کہا جاتا ہے۔"

"اچھا تو مقتول ڈاکٹر نے تمہیں ٹیلی پیتھی کے حوالے سے بہت کچھ پڑھا رکھا ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ساری معلومات تو ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے ہی مجھے حاصل تھیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا انسان کسی دوسرے انسان کی سوچ تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"کیا مقتول ڈاکٹر کے پاس تمہاری بیان کردہ ٹیلی پیتھی کی یہ صلاحیت موجود تھی......؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور کیا اس نے تمہیں بھی اس حیرت انگیز صلاحیت سے روشناس کرایا تھا؟"

"میں سمجھتا ہوں، وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتا تھا۔" وہ خاصے جرأت مندانہ انداز میں بولا۔ "اور جب وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا تو بے چارہ بھلا مجھے کہاں سے سکھاتا!"

"اس کے باوجود بھی تم اس کے پاس ٹیلی پیتھی یا تھاٹ ریڈنگ سیکھنے لگ بھگ تین ماہ تک جاتے رہے......؟"

"مجھے یہ احساس بہت بعد میں ہوا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اس معاملے میں عملی طور پر بالکل کورا ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھے الّو بنانے کے لیے موم بتی اور آئینے کی مختلف مشقیں بتاتا رہتا تھا۔ کبھی میں رات میں شمع بینی کر رہا ہوتا اور کبھی آئینے کے سامنے بیٹھ کر اور پشت پر چراغ روشن کر کے آئینے میں اپنے عکس کو گھورا کرتا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں ڈاکٹر کے پاس حاضریاں لگا کر محض اپنا وقت برباد کر رہا ہوں تو میں نے اس سلسلے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وقوعہ کے روز میں مقتول کو اپنے اسی فیصلے سے آگاہ کرنے گیا تھا کہ مصیبت میں پھنس گیا......"

"تم وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"کم و بیش سوا پانچ بجے۔" ملزم نے جواب دیا۔

"کیا تم ہمیشہ اسی وقت وہاں جایا کرتے تھے؟"

"میں عموماً پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان وہاں جایا کرتا تھا۔"

"وقوعہ کے روز تم وہاں کتنی دیر رکے تھے؟"

"زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔"

"یعنی تم پانچ پچیس پر کلینک سے نکل گئے تھے؟"

"جی ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"گویا وقوعہ کے روز تم نے مقتول کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور وہاں سے واپس آ گئے۔" میں نے دانستہ چند زمینی حقائق کی نقاب کشائی کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ "تم نے وہاں زیادہ دیر رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی......؟"

"جناب! یہ بات تو درست ہے کہ میں وقوعہ کے روز بہ مشکل دس منٹ کلینک پر رکا تھا۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس روز مقتول سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔"

"کیوں...... کیا وہ اپنے کلینک پر موجود نہیں تھا؟"

"موجود تو تھا لیکن خلافِ معمول وہ دیر تک آرام کمرے میں سوتا رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا اور واپس آ گیا۔"

"کیا تم نے کلینک کے تیسرے اور آخری پورشن یعنی بہ قول تمہارے آرام کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا کہ مقتول وہاں سو رہا ہے؟"

"جی نہیں، میں نے اندر تو نہیں جھانکا تھا۔"

"پھر تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ وقوعہ کے روز مقتول آرام کمرے میں خلافِ معمول زیادہ دیر تک سو رہا تھا؟" میں نے کرید جاری رکھی۔

"یہ بات مجھے شاہ جی نے بتائی تھی۔"

"شاہ جی...... مطلب طارق شاہ؟"

"جی ہاں، میں طارق شاہ ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"معزز عدالت کو مختصر الفاظ میں بتاؤ کہ وقوعہ کے روز جب تم مقتول کے کلینک پر پہنچے تو وہاں دس منٹ کے وقفے میں حالات کس ترتیب سے پیش آئے تھے۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ "مختصر الفاظ میں حالات بیان کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم کسی اہم واقعے ہی کو

گول کر دو۔ معزز عدالت چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کو بھی جاننا چاہتی ہے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی، میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلانے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس روز میں پانچ پندرہ پر یعنی سوا پانچ بجے مقتول ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچا تھا۔ میں پچھلے تین ماہ سے وہاں جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو تین بار تو جانا ہوتا ہی تھا لہٰذا میں ڈاکٹر سلیم کے معمولات سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ روزانہ سہ پہر چار بجے سے پانچ بجے تک آرام کرتا تھا پھر تر و تازہ ہو کر دوبارہ کلینک کرنے لگتا تھا اس حساب سے اسے کلینک میں بیٹھے ہونا چاہیے تھا لیکن جب میں سوا پانچ بجے وہاں پہنچا تو ڈاکٹر کی سیٹ خالی تھی......"

"سیٹ خالی تھی......!" میں نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ اپنی کرسی پر موجود نہیں تھا۔"

"کرسی پر نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جناب! میں وہی تو آپ کو بتانے جا رہا تھا۔" وہ ایک مضمحل سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "جب میں نے ڈاکٹر سلیم کو اس کی سیٹ پر نہ پایا تو طارق شاہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ طارق شاہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ہی ہوں گے۔ میں نے کہا۔ اندر تو میں دیکھ چکا ہوں۔ ان کی سیٹ خالی ہے، اس پر طارق شاہ بولا۔

"تو پھر وہ ابھی تک آرام ہی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ "ابھی تک وہ کیسے سو سکتے ہیں۔ وہ تو ٹھیک پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں اور اس وقت سوا پانچ بج رہے ہیں......؟"

میری وضاحت کے جواب میں طارق شاہ نے بڑی عجیب سی بات کی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا ڈاکٹر صاحب تمہیں اس کمرے میں کہیں نظر آ رہے ہیں؟"

"نہیں......" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو وہ نہیں ہیں۔"

"اور وہ اپنے کلینک والے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ بات ابھی تم نے ہی مجھے بتائی ہے۔ ہیں نا......؟"

"ہاں......!" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"اب باقی رہ جاتا ہے ایک ہی کمرا......" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جہاں ڈاکٹر صاحب روزانہ آرام کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں کلینک سے باہر جاتے ہوئے تو دیکھا نہیں۔ جب وہ دو کمروں میں نہیں ہیں تو یقیناً وہ آرام کمرے میں ہوں گے اور آرام کر رہے ہوں گے......" وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تمہیں زیادہ جلدی ہے تو انہیں سوتے سے اٹھا دو یا پھر تم بعد میں آ جانا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرو......"

اس روز میرا عجیب سا موڈ ہو رہا تھا۔ میں تو صرف ڈاکٹر سے یہ کہنے گیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں آیا کروں گا۔ جب وہ ابھی تک سویا پڑا تھا تو پھر میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔ میں نے یہ سوچ کر وہاں سے واپس ہی آ جانے کا فیصلہ کیا کہ بعد میں کسی وقت فون کر کے ڈاکٹر کو بتا دوں گا۔"

"تو تم وقوعہ کے روز سوا پانچ بجے مقتول کے کلینک پہنچے تھے۔" میں نے ضروری حقائق کو تازہ کرتے ہوئے ملزم سے تصدیق چاہی۔ "لگ بھگ دس منٹ تک تم کلینک میں رکے، طارق شاہ سے بات چیت کی اور پھر کم و بیش پانچ پچیس پر تم کلینک سے واپس آ گئے۔" میں نے رک کر سانس لی پھر اپنا استفسار مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ان دس منٹ کے دوران میں تم نے مقتول کی جھلک دیکھی اور نہ ہی اس کے آرام کمرے میں داخل ہو کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں موجود بھی ہے یا نہیں اور...... اگر موجود ہے تو وہ...... سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں...... آپ بجا فرما رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "بالکل یہی ہوا تھا جو آپ نے بیان کیا ہے۔"

"وقوعہ کے روز تم پانچ پچیس پر مقتول کے کلینک سے باہر آ گئے تھے۔" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "کیا اس کے بعد تم سیدھے گھر چلے گئے تھے یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟"

"میں سیدھا گھر نہیں گیا تھا جناب۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے بتایا ہے نا، اس روز میری طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں اپنے علاقے گلشن اقبال میں پہنچا تو گھر سے قریبی پارک میں چلا گیا۔ وہاں اپنے ہی علاقے کے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں بھی دل بہلانے کے لیے ان کے کھیل میں شامل ہو گیا۔ پھر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے کھیل چھوڑ دیا اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں پارک سے نکلا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔"

"وقوعہ کے روز تم کتنے بجے گھر پہنچے تھے؟" میں نے

سوال کیا۔

’’لگ بھگ پونے آٹھ بجے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’اور پولیس نے تمہیں کتنے بجے گھر سے گرفتار کیا تھا؟‘‘

’’اس وقت آٹھ یا آٹھ پانچ ہوئے ہوں گے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’بس، یوں سمجھیں کہ میں نے آکر منہ ہاتھ دھویا، لباس تبدیل کیا اور پولیس آدھمکی۔‘‘

’’جب پولیس کی زبانی یہ پتا چلا کہ وہ لوگ تمہیں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کے الزام میں گرفتار کررہے ہیں تو کیسا لگا تھا؟‘‘

’’ایک دم شاک لگا تھا۔‘‘ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ یہی محسوس ہوا کہ وہ لوگ مجھ سے مذاق کررہے ہیں۔‘‘

’’لیکن یہ ان کا مذاق نہیں تھا۔‘‘ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’انہوں نے تمہیں نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا بلکہ اس سلسلے میں سخت ترین سزا دلوانے کے لیے تمہیں حوالۂ عدالت بھی کردیا......؟‘‘

’’جی ہاں، یہ تلخ حقیقت تو آپ سب کے سامنے ہے۔‘‘ وہ مایوسی سے بولا۔

’’ایک آخری سوال......!‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن اس سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کردینا ہوگا......!‘‘

’’جی، میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے......‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز تم نے سہ پہر چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک کا وقت کہاں گزارا تھا......؟‘‘

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول سلیم فاروقی کی موت چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ نیند کی حالت میں اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر، آہنی بار کی طوفانی ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا یہ سوال نہایت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ آپ اسے حاصلِ جرح بھی کہہ سکتے ہیں۔

ملزم نے اس اہم سوال کے جواب میں بتایا۔ ’’جناب! اس روز میں کوئی سوا تین بجے گھر سے نکلا تھا۔ باہر آیا تو شیخ احمد سے ملاقات ہوگئی اور ہم ’’منظور‘‘ پر چائے پینے بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان گپ شپ بھی ہوتی رہی اور ہم چائے وغیرہ بھی نوش کرتے رہے۔ الیاس کی زبانی مختار اور شیخ احمد کو بھی خبر ہوگئی تھی کہ میں آج کل ٹیلی پیتھی سیکھنے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جایا کرتا ہوں۔ شیخ احمد نے اسی حوالے سے پوچھ لیا۔

’’اور سناؤ یار...... تمہارا وہ ٹیلی پیتھی والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟‘‘

’’بس، یوں سمجھو کہ بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔‘‘ میں نے بددلی سے بتایا۔

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ شیخ احمد نے پوچھا۔

’’مطلب یہ کہ یار...... کچھ ہو ہی نہیں رہا......‘‘

’’میں نے تو تمہیں شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اس چیز کے پیچھے مت بھاگو جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔‘‘ شیخ احمد نے کہا۔ ’’یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں میری جان۔‘‘

’’نہیں یار!‘‘ میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ ’’ٹیلی پیتھی قصے کہانیوں کی بات نہیں۔ یہ ایک باقاعدہ اور مستند علم ہے، ایک سائنس ہے۔‘‘

’’اگر یہ ایک سائنس ہے تو پھر اس کے مروجہ اصول اور قاعدے بھی ہوں گے۔‘‘ وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ’’جو بھی شخص سائنس کے قانون، قاعدے اور اصولوں کو اپناتا ہے، وہ سائنس کی روح کو پالیتا ہے...... پھر ٹیلی پیتھی کے سلسلے میں تم پچھلے تین ماہ سے جھک کیوں ماررہے ہو؟‘‘

’’میں سمجھتا ہوں، اس میں بے چاری ٹیلی پیتھی کا کوئی قصور نہیں ہے۔‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’میرے استاد ہی میں سیکڑوں آنچوں کی کمی ہے......‘‘

’’تو ایسے استاد کو تم چولہے میں کیوں نہیں ڈال دیتے جہاں وہ اپنی آنچوں کی کمی پوری کرکے کندن بن جائے!‘‘ شیخ احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’جان چھڑاؤ یار، تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟‘‘

’’آج میں جان چھڑانے ہی تو جارہا ہوں۔‘‘ میں نے ولولہ انگیز انداز میں کہا۔ ’’میں ڈاکٹر سلیم کو صاف صاف بتادوں گا کہ اب میں اس کے پاس نہیں آیا کروں گا۔‘‘

’’شاباش!‘‘ شیخ احمد نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔ ’’یہ تم ایک نیک کام کرنے جارہے ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔‘‘

میں تھوڑی دیر مزید شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا اور پھر ایک بس پر سوار ہوکر ڈاکٹر سے ملنے اس کے کلینک کی جانب چل پڑا تھا۔‘‘

’’کیا تم مجھے بتاسکتے ہو کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں تم

’’منظور‘‘ سے کتنے بجے اٹھے تھے؟‘‘ میں نے اپنی جرح کو وائنڈاپ کرتے ہوئے پوچھا۔

’’اس وقت چار بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔‘‘

’’تو گویا اس روز تم سہ پہر تین، تیس سے لے کر چار پینتالیس تک ’’منظور‘‘ میں بیٹھے چائے پیتے اور گپ شپ کرتے رہے تھے؟‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

’’جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔‘‘

’’اور شیخ احمد اس حقیقت کا چشم دید گواہ ہے؟‘‘

’’جی بالکل۔ میں اسی کے ساتھ تو ’’منظور‘‘ میں بیٹھا ہوا تھا۔‘‘

’’کیا تمہارا دوست شیخ احمد اس امر کی گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہوسکتا ہے کہ وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک تم اس کے ساتھ بیٹھے منظور میں گپ شپ کررہے تھے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ’’اور تم نے اس کے سامنے ان خیالات کا بھی اظہار کیا تھا کہ آج تم آخری مرتبہ مقتول ڈاکٹر کے کلینک پر جارہے ہو؟‘‘

’’جی ہاں، سوفیصد!‘‘ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ’’شیخ احمد اس حقیقت کو بیان کرنے ضرور عدالت میں حاضر ہوسکتا ہے۔‘‘

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر روئے سخن جج کی طرف پھیر کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!‘‘

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

آیندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہان کی گواہی اور ان پر ہونے والی جرح کا ہی ذکر کروں گا۔

❖❖❖

میں نے پچھلی پیشی پر بڑے مفصل انداز میں اپنے مؤکل کی پوزیشن صاف کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول کی موت کا جو وقت متعین کیا گیا تھا اس دوران میں میرا مؤکل نارتھ ناظم آباد سے کافی فاصلے پر گلشن اقبال کے ایک معروف ہوٹل ’’منظور‘‘ میں اپنے ایک دوست شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کررہا تھا لہٰذا اس کا کسی بھی زاویے سے قتل کی اس واردات میں ملوث ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں اپنی پیشہ وارانہ کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

لیکن یہ ایک طرف کا یعنی ڈیفنس کا اسٹینڈ تھا اور عدالت کوئی فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے استغاثہ اور صفائی دونوں کا مُوقف سنتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دوسری جانب سے میری پچھلی محنت کا کیا جواب آتا ہے۔

اس پیشی پر میں نے کسی گواہ کے کٹہرے میں آنے سے پہلے ہی جج سے درخواست کرکے کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت لے لی۔

تفتیشی افسر یا آئی۔ او کو ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک آپ تمام عدالتی امور و نکات سے اچھی طرح واقف ہوچکے ہیں اور میں وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی ہوں اور غلطی و انسان لازم و ملزوم ہیں لہٰذا آپ بھی مجھے اور میری غلطیوں کو معاف کردیا کریں۔

تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ’’آئی۔ او صاحب! آپ کو کب اور کس نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟‘‘

’’پولیس کے روزنامچے کے مطابق اس افسوسناک واقعے کی اطلاع سترہ اپریل کی شام چھ بجے دی گئی تھی۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’اور یہ اطلاع مقتول کی بیوی فریدہ خانم نے فون کے ذریعے دی تھی۔‘‘

’’فریدہ خانم!‘‘ میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر اپنی تحقیق کی روشنی میں آئی۔ او سے پوچھا۔ ’’یعنی مقتول کی پہلی بیوی......؟‘‘

’’یہ تو آپ ہی کو پتا ہوگا کہ وہ مقتول کی پہلی بیوی ہے یا آخری بیوی!‘‘ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ’’میں نے ابھی تک اس سلسلے میں تفتیش نہیں کی۔ فریدہ خانم نے فون پر بتایا تھا کہ وہ مقتول سلیم فاروقی کی بیوی ہے، بس......!‘‘

’’اگر آپ نے مقتول کی بیویوں کے حوالے سے ابھی انوسٹی گیشن نہیں کی تو یہ نیک کام کیس کے فیصلے سے پہلے مکمل کرلیجیے گا۔‘‘ میں نے طنز کا جواب طنز ہی میں دیا۔ ’’آپ کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی......!‘‘

اس نے مجھے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ’’فریدہ خانم نے یہ فون اپنی رہائش

گاہ سے کیا تھا یا......؟''

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں، اس نے کلینک سے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا یعنی جائے وقوعہ سے۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''ساڑھے چھ بجے!''

''کیا اس وقت بھی مقتول کی بیوی فریدہ خانم جائے حادثہ پر موجود تھی؟''

''جی ہاں، وہ وہیں موجود تھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر کیا دیکھا تھا؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو......!''

''ہم کیا مطلب؟'' میں نے اسے شروع ہی میں ٹوک دیا۔

''میں اور دو کانسٹیبل۔'' آئی او نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''آگے کیا ہوا؟''

''جائے وقوعہ پر بہت سے لوگ جمع تھے۔'' وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مقتول کی بیوی فریدہ خانم اور اس کا اسسٹنٹ طارق شاہ سب سے نمایاں تھے اور انہی دونوں افراد کی راہنمائی میں، ہم کلینک کے سب سے آخری کمرے میں پہنچے تھے جہاں مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی ایک بستر پر مردہ پڑا تھا۔''

''آپ نے پہلی نظر ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکا ہے یا کوئی معائنہ وغیرہ بھی کیا تھا اس کا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت تو نہیں تھی۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''لیکن پھر بھی میں نے مقتول کی لاش کو الٹ پلٹ کر موقع کی کارروائی کا تقاضا نبھایا تھا۔''

''کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے تلخی بھرے انداز میں انکوائری آفیسر کے جملے کو دہرایا اور پھر پوچھا۔ ''ایسا کیوں آئی۔ او صاحب۔ کیا مقتول کی لاش پکار پکار کر اپنی موت کا اعلان کر رہی تھی؟''

''ہاں، ایسا ہی سمجھ لیں......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ضرور سمجھ لوں گا۔'' میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ''لیکن اگر آپ اپنے مضمون کی تھوڑی وضاحت کر دیں تو بڑی نوازش ہو گی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ کوئی لاش کس پیرائے میں اپنی موت کا اعلان کر سکتی ہے......؟''

''بہ زبانِ خاموشی!'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''قبلہ!'' میں نے فرماں برداری کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو وضاحت کرنے کے بجائے معاملے کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔''

''لگتا ہے، آپ کو بچوں کی طرح سمجھانا پڑے گا؟'' وہ جھنجلا گیا۔

میں نے اس کی جھنجلاہٹ میں پتنگے لگاتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، بالکل۔ آپ مجھے اس وقت مونٹیسوری یا نرسری کا کوئی بچہ ہی تصور کریں اور ''اے با کا ڈا......'' کے لیول پر اس گمبھیر معاملے کی وضاحت فرمائیں۔''

وہ میری اس چوٹ پر تلملا کر رہ گیا پھر خاصے جارحانہ انداز میں بتانے لگا۔ ''مقتول اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا اور وہ اس طرح کہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو کسی ناریل کے مانند چٹخا کر رکھ دیا گیا تھا۔ سر سے خارج ہونے والے خون نے بستر کے بیشتر حصے کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔ اس حالت میں بے حس و حرکت پڑے ہوئے کسی شخص کو دیکھ کر کوئی بھی بڑے یقین سے یہ اندازہ قائم کر سکتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے......'' وہ ایک ہی سانس میں وضاحت کی بیشتر منازل طے کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لاش کے قریب ہی ہمیں آلۂ قتل بھی پڑا ہوا مل گیا تھا جو کہ ایک آہنی بار تھی اور جس کے ایک سرے پر مقتول کا تازہ بہ تازہ خون بھی چمک رہا تھا......!''

''آلۂ قتل...... آہنی بار......'' میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں ایک سیلوفین بیگ میں آلۂ قتل محفوظ حالت میں رکھا نظر آ رہا تھا۔

میں نے مذکورہ آہنی بار والے سیلوفین بیگ کو بڑی احتیاط سے اٹھا لیا پھر چلتے ہوئے آئی۔ او کے قریب پہنچا اور مذکورہ سیلوفین بیگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ اسی آہنی بار کی بات کر رہے ہیں نا؟''

''جی ہاں!''

''آپ کے خیال میں یہی آلۂ قتل ہے؟''

''جب اسی آہنی بار کی ضرب سے مقتول کی کھوپڑی کو چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو پھر قانون کی

زبان میں اس آہنی بار کو آلۂ قتل ہی کہا جائے گا۔'' وہ خاصے کٹیلے انداز میں بولا۔ ''مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ آپ تو مجھ سے زیادہ قانون جانتے ہیں......؟''

''اس میں کیا شک ہے!'' میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ خفیف سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جرح میں تندی بھرتے ہوئے سوال کیا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ اس آہنی بار کی مدد سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

''آلۂ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ سے۔'' وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''اس بار کے ایک سرے پر پایا جانے والا خون، مقتول کے خون سے میچ کر گیا تھا۔ پھر بار کے خون آلود حصے پر چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ وہ بال مقتول ہی کے سر کے تھے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں تفتیشی افسر کو دیکھا اور پھر پوچھا۔ ''یہ اندازہ آپ نے کس بنا پر قائم کیا کہ میرے مؤکل ہی نے اس آہنی بار کی مدد سے مقتول کی جان لی تھی؟''

''اس بنا پر کہ آہنی بار کے دوسرے یعنی صاف سرے پر ملزم کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات پائے گئے تھے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''کیا کسی شے پر کسی شخص کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا اسے ملزم قرار دینے کے لیے کافی ہوتا ہے؟''

''نہیں جناب، ہمیں اس سلسلے میں اور بھی بہت سی چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مثلاً؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''مثلاً، سب سے اہم پوائنٹ تو ایف پی (فنگر پرنٹس) کی میچنگ ہوتی ہے۔'' وہ اپنی بات واضح کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں آلۂ قتل پر ملنے والے انگلیوں کے نشانات اور ملزم کے فنگر پرنٹس کو آپس میں ملا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم کسی حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔''

''تو میرے مؤکل کے سلسلے میں آپ حتمی نتائج تک پہنچ گئے تھے؟''

''جی ہاں، ہم نے پرفیکٹ ایف پی میچنگ کر لی تھی۔''

''یہ کام تو ملزم کی گرفتاری کے بعد ہی ممکن ہوا ہو گا؟''

''ظاہر ہے، اس سے پہلے کیسے ہو سکتا تھا۔''

''گویا جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے، آپ نے مقتول کی لاش کو دیکھا اور آلۂ قتل آپ کے قبضے میں آ گیا اس وقت آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ڈاکٹر سلیم فاروقی کو میرے مؤکل ہی نے قتل کیا ہو گا؟''

''ظاہر ہے، یہ وثوق تو ایف پی میچنگ کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔''

''کیا آپ ملزم کو اس واقعے سے پہلے بھی جانتے تھے؟''

''ہرگز نہیں!'' اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔

''اس کے گھر کا پتا تو آپ کو معلوم ہو گا؟''

''جب میں ملزم ہی کو نہیں جانتا تھا تو پھر اس کے گھر کا پتا کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں جناب......؟''

''میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں جناب......'' میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ ''کہ آپ تو پولیس والے ہیں۔ ملزم کے گھر کا پتا ٹھکانا تو بہت معمولی بات ہے۔ آپ تو ان چیزوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتے ہیں جو دنیا میں موجود ہی نہیں ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!'' وہ خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ وکیلوں نے ہم پولیس والوں کو کچھ زیادہ ہی بدنام کر رکھا ہے۔''

''چلیں اس ''کچھ زیادہ کو ذرا کم کر لیتے ہیں۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ یہ تو مانیں گے نا کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔ یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر آئی۔ او کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر دوستانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلیں چھوڑیں ان تلخ اور ترش باتوں کو۔ میں آپ کی بات ہی رکھ لیتا ہوں کہ آپ ملزم کے گھر ٹھکانے سے بالکل واقف نہیں تھے۔ اب ذرا میری معلومات میں اضافے کے لیے اتنا بتا دیں کہ ملزم کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر کی جانب آپ کی راہنمائی کس نے کی تھی؟''

''فریدہ خانم نے...... طارق شاہ نے......!'' وہ الجھن زدہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''ایک جواب دیں آئی۔ او صاحب؟''

''فریدہ خانم نے......!''

''پھر آپ نے طارق شاہ کا نام کیوں لیا؟''

''وہ بھی جائے وقوعہ پر موجود تھا۔'' وہ گڑبڑائے

ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس نے بھی مجھے ملزم کے بارے میں بتایا تھا، بلکہ......'' وہ ذرا دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بلکہ ملزم کے گھر کا ایڈریس مجھے مقتول کے اسسٹنٹ طارق شاہ ہی نے دیا تھا......''

''تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل آپ طارق شاہ کی نشاندہی پر ملزم کے گھر پہنچے تھے اور اسے گھر سے گرفتار کرلیا تھا؟''

''جی ہاں...... بالکل......!'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

''دیٹس آل یور آنر......!'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا......''

میں نے اس کیس کے تفتیشی افسر پر اپنی جرح موقوف کرنے کا اعلان کیا تو استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پیشی پر دو ایسے گواہوں کو شہادت کے لیے وٹنس باکس میں لایا گیا جن کے بیان اور بعدازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو اس کیس میں کسی حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ ان دو گواہوں میں ایک ''فاروقی کلینک'' میں چپراسی کی حیثیت سے کام کرنے والا آصف محمود تھا اور دوسرا ڈاکٹر سلیم فاروقی کا پڑوسی دکان دار امتیاز حسین۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات سے صرف یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں ملزم حنیف ''فاروقی کلینک'' پر آیا تھا۔

اگلی گواہی مقتول کی بیوی فریدہ خانم کی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک اہم گواہی تھی۔ فریدہ خانم وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوئی اور اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ سوالات کے لیے فریدہ خانم کے قریب چلا گیا۔

فریدہ خانم ایک دراز قامت اور قبول صورت عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ فریدہ خانم کا رنگ سانولا تھا تاہم اس کی شخصیت میں جنس مخالف کے لیے ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ وکیل استغاثہ نے چند ایک رسمی اور سرسری نوعیت کے سوالات کے بعد گواہ کو فارغ کردیا۔

اس کے بعد میں اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کرکے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ فریدہ خانم کی اس کیس میں دہری حیثیت تھی۔ وہ اس کیس کی مدعی بھی تھی اور اسی کیس میں استغاثہ کی ایک گواہ بھی۔ ان لمحات میں وہ خاصی محتاط نظر آرہی تھی۔

''فریدہ صاحبہ......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ''مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو واپس تو نہیں لاسکتا لیکن ان کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''بے نقاب......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے کوئی برقع وغیرہ تو نہیں پہنا ہوا جو آپ اسے بے نقاب کریں گے؟''

''میں نے ''ڈاکٹر فاروقی'' کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی بات کی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بے چارہ تو اس کیس کا ملزم ہے جسے میں بہت جلد باعزت بری کروالوں گا۔''

''اگر یہ اس کیس کا ملزم ہے تو پولیس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے گرفتار کیا ہوگا نا!'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''میری معلومات کے مطابق اسی بدبخت نے میرے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

ملزم کے لیے فریدہ خانم کے لب و لہجے سے زہر ٹپکتا تھا اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی صاف محسوس ہورہی تھیں۔ میں نے بڑے تحمل سے استفسار کیا۔

''فریدہ صاحبہ! کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟''

''کیا مطلب......؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

''مطلب یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ملزم کے قاتل ہونے کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ پولیس نے یا......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''طارق شاہ نے۔''

''طارق شاہ!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ ''آپ کا مطلب ہے، ڈاکٹر صاحب کے اسسٹنٹ طارق شاہ نے؟''

''جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''طارق شاہ نے آپ کو یہ اطلاع کس طرح دی تھی؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس آکر یا آپ کو فون کرکے یا آپ اس وقت

جائے وقوعہ پر موجود تھیں......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جائے وقوعہ پر آپ کی موجودگی کی بات میں نے اس...... لیے کی ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کے مطابق آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے پولیس اسٹیشن فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور جب پولیس وقوعہ پر پہنچی تو آپ پہلے سے وہاں موجود تھیں......؟''

''تفتیشی افسر نے آپ کو غلط نہیں بتایا وکیل صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میں نے واقعی ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے تھانے فون کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ پولیس کی آمد کے وقت میں کلینک میں موجود تھی بلکہ موقع کی تمام تر کارروائی کے دوران میں، میں کلینک پر ہی تھی لیکن جب طارق شاہ نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی اس وقت میں اپنے گھر پر تھی۔''

''اپنے گھر پر......'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟''

''ناگن چورنگی کے قریب۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''آپ کو طارق شاہ نے کتنے بجے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟''

''اس وقت پانچ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''طارق شاہ نے آپ کو کیا بتایا تھا؟''

''اس نے کہا تھا، ڈاکٹر صاحب کو ان کے عقیدت مند نے قتل کردیا ہے۔''

''کیا طارق شاہ نے مذکورہ عقیدت مند کا نام بھی لیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے قاتل کا نام ''حنیف'' بتایا گیا تھا۔''

''یعنی......'' میں نے اکیوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ حنیف جو اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل یہی۔'' اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

''کیا آپ ملزم کو پہلے سے جانتی تھیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ عقیدت مند ان کے پاس کس غرض سے آیا کرتا تھا؟''

''جی نہیں۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اس بندے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے پولیس کی تحویل میں دیکھا تھا یا اس کے بعد عدالت کے کمرے میں دیکھ رہی ہوں البتہ طارق شاہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ ان کے پاس، میرا مطلب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس پُراسرار علوم سیکھنے آیا کرتا تھا۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے مقتول شوہر ڈاکٹر سلیم فاروقی مختلف نوعیت کے پُراسرار علوم کے ماہر تھے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، بالکل......'' وہ بڑے وثوق سے بولی تاہم اس کے لہجے کا کھوکھلا پن عیاں تھا۔ ''اگر ان میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو پھر ان کے کلینک پر عقیدت مندوں کا ہجوم لگا نظر نہ آتا۔''

''ہجوم...... والی بات کو فارمولا نہیں بنایا جاسکتا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ڈگڈگی تماشا دکھانے والے حضرات چٹکی بجاتے میں اپنے گرد ''ہجوم'' لگا لیتے ہیں۔ یہ تو تماشا ختم ہونے کے بعد بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سوچ کر انہوں نے اپنا قیمتی وقت برباد کردیا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی نے ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، مسمریزم اور دیگر ماورائی علوم کس یونیورسٹی سے سیکھے تھے؟''

''جی......'' وہ گڑبڑا گئی۔

''آپ مقتول کی شریک حیات ہیں؟'' میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ''یہ بات آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا کہ یہ تمام تر پُراسرار علوم ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے سیکھے ہوں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا نا......؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے جی کہ......'' وہ صورتِ حال کو سنبھالا دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ سارے علوم انہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے حاصل کیے تھے۔ میں اس بات کی گواہ ہوں کہ وہ اکثر راتوں کو جاگ کر وظیفے اور چلے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے اللہ والے تھے۔ اللہ نے انہیں بہت سی روحانی طاقتوں سے نواز رکھا تھا۔''

''واہ وا...... سبحان اللہ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آج پہلی بار مجھ پر اور حاضرینِ عدالت پر یہ انکشاف ہورہا ہے کہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم جیسے سائنسی علوم وظیفوں اور چلوں کے رہینِ منت ہیں۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے مداخلت کی۔ ''مقتول کے پاس کون کون سے پُراسرار علوم تھے اور اس نے یہ علوم کہاں سے حاصل کیے تھے، اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے فاضل دوست خوامخواہ فریدہ خانم سے الٹے سیدھے سوال کر کے انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ان پُراسرار علوم کا زیر سماعت کیس سے بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی۔'' میں نے وکیل استغاثہ کے حملے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ملزم کو ٹیلی پیتھی سیکھنے کا شوق تھا اور یہی شوق اسے مقتول کے کلینک تک لے آیا تھا لیکن تین ماہ کی خواری کے بعد جب ملزم کو محسوس ہوا کہ مقتول اسے بے وقوف بنا رہا ہے تو اس نے مقتول کو خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ وقوعہ کے روز جب وہ یہی بات کہنے مقتول کے کلینک پر پہنچا تو مقتول سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ مقتول خلافِ معمول اس روز دیر تک سوتا رہا تھا چنانچہ مقتول کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ملزم واپس لوٹ آیا اور...... پھر اسی رات کو آٹھ بجے کے قریب ملزم کو اس گھر سے گرفتار کر لیا گیا......'' میں نے تھوڑا وقفہ کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جناب عالی! یہ تمام تر تفصیلات گزشتہ پیشیوں پر معزز عدالت کے سامنے دہرائی گئی ہیں اور عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔''

''فریدہ بی بی!'' جج نے مقتول کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ یہ تمام علوم آپ کے مقتول شوہر نے ''اپنی مدد آپ'' کے تحت سیکھ رکھے تھے؟''

''جی...... جی سر!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''بالکل، میرا یہی مطلب تھا۔''

''بیگ صاحب......'' جج میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پلیز پروسیڈ۔''

''فریدہ خانم صاحبہ!'' میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ''آپ جائے وقوعہ یعنی اپنے شوہر کے کلینک پر کتنے بجے پہنچی تھیں؟''

''پونے چھ بجے۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''طارق شاہ نے پانچ پچیس پر مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور یہ خبر سنتے ہی میں فوراً گھر سے نکل پڑی تھی۔ ناگن چورنگی سے شادمان زیادہ دور نہیں اس لیے میں بیس منٹ میں بڑی آسانی سے کلینک پر پہنچ گئی تھی۔''

''فریدہ صاحبہ! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی کہ کوئی بلاوجہ کسی کو قتل نہیں کر ڈالتا۔'' میں نے مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گی کہ ملزم کی آپ کے شوہر کے ساتھ ایسی کون سی دشمنی تھی جس کی بنا پر اس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

''طارق شاہ نے آپ کو اس بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا؟''

''جی بالکل نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''آپ نے پہلی مرتبہ ملزم کو پولیس کی تحویل میں اس وقت دیکھا جب اسے آپ کے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے آپ نے کبھی اس کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا فریدہ صاحبہ؟''

''جی نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن ملزم نے آپ کو پہلے بھی ایک مرتبہ دیکھ رکھا ہے۔'' میں نے حنیف سے حاصل ہونے والی کارآمد معلومات کی روشنی میں کہا۔ ''جب دو ماہ پہلے آپ نے...... میرا مطلب ہے، وقوعہ سے دو ماہ پہلے آپ نے کلینک پر تابندہ نامی ایک حسین و جمیل عورت کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ ان دنوں ملزم نے نیا نیا کلینک آنا شروع کیا تھا......؟''

''دیکھا ہوگا!'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''یہ کون سی خاص بات ہے۔ میں تو اکثر و بیشتر کلینک کا چکر لگاتی ہی رہتی ہوں۔''

''خاص بات آپ کے کلینک پر چکر لگانے کی ہے اور نہ ہی ملزم کے آپ کو دیکھنے کی فریدہ صاحبہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اصل معاملہ تابندہ سے جھگڑا کرنے کا ہے...... آپ کا کسی خوب صورت اور دلکش عورت سے مقتول کے کلینک پر جھگڑا ہوا تھا یا نہیں؟''

''ہوا ہوگا......'' ایک مرتبہ پھر اس نے بے پروائی کا انداز اختیار کرنا چاہا تاہم اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دانستہ کسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہوا ہوگا نہیں فریدہ صاحبہ...... ہوا تھا!'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا......'' وہ ٹالنے والے انداز

میں بولی۔

''میں یاد دلاؤں گا تو سب یاد آجائے گا۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''میرے فاضل دوست غیر متعلقہ معاملات کو اچھال کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کے تاخیری حربے استعمال کرنے سے روکا جائے۔''

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے وقوعہ سے دو ماہ پہلے، فریدہ خانم کے کسی عورت سے جھگڑے کا جو ایشو اٹھایا ہے، کیا اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نکلتا ہے؟''

''یس سر......'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''آپ اپنی جرح جاری رکھیں!'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جی فریدہ صاحبہ!'' میں نے دوبارہ مقتول کی بیوہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو کچھ یاد آیا یا اس سلسلے میں، میں آپ کی مدد کروں؟''

جب میں نے تھانے جا کر اپنے مؤکل حنیف سے ملاقات کی تھی تو دیگر تفصیلات کے ساتھ ہی اس نے مجھے مقتول کی بیوہ اور تابندہ نامی ایک پری وش کے جھگڑے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ بعدازاں میں نے اس حوالے سے کچھ تحقیقات خود بھی کی تھیں جو اس وقت جرح کے دوران میں کام آرہی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ قدرے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... کچھ یاد تو آرہا ہے......!''

''جی...... کیا یاد آرہا ہے؟'' میں سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

''میں نے کلینک پر پہنچتے ہی براہِ راست ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جانا چاہا تھا۔'' وہ مکاری سے بولی۔ ''تابندہ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہوں اسی لیے وہ مجھ سے الجھ پڑی تھی کہ میں اپنی باری کا انتظار کیے بغیر ڈائریکٹ کیسے اندر جارہی ہوں۔ اسی بات پر ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوگئی تھی لیکن جب اسے حقیقت کا پتا چلا تو معاملہ رفع دفع ہوگیا تھا۔''

''آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آرہی......!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مم...... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے......؟'' وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کون سا جھوٹ بولا ہے۔'' میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ کو تابندہ اور مقتول کے باہمی، تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کا علم ہوگیا تھا۔ وہ جھگڑا آپ نے اسی سلسلے میں کیا تھا۔ کلینک سے کسی نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ اس وقت تابندہ آپ کے شوہر سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ آپ آنِ واحد میں وہاں پہنچیں اور خوب ہنگامہ آرائی کی...... کی کہ نہیں؟''

''ہاں...... یہ سچ ہے!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ نامی اس چڑیل سے شادی کرنے والے ہیں۔ وہ ہنگامہ آرائی میں نے اسی سلسلے میں کی تھی۔ میں نے جو بھی کیا اس پر مجھے ایک ذرا سی بھی ندامت نہیں ہے۔ ایک بیوی اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

''تو اس ہنگامہ آرائی سے آپ اپنے سہاگ کو بچانے میں کامیاب ہوگئی تھیں؟'' میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، بالکل......'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اس دن کے بعد سے تابندہ کبھی ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر نظر نہیں آئی تھی۔''

''کلینک پر وہ اس لیے نظر نہیں آئی تھی کہ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں نظر آنے لگی تھی، دوسری بیوی کی حیثیت سے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب نے تابندہ کو گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں آباد کردیا تھا۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب......؟'' وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''ننھی بچی بننے کی کوشش نہ کریں فریدہ صاحبہ!'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اس معاملے کی کوئی بھی بات آپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کلینک میں آپ کا کوئی ایسا جاسوس ضرور موجود تھا جو آپ کو تابندہ اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات کی خبریں پہنچاتا تھا۔ جس دن آپ نے کلینک پر جا کر تابندہ سے پھڈا کیا! اس روز بھی آپ کے جاسوس ہی نے آپ کو تابندہ کے کلینک پر آنے کی اطلاع دی تھی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے، اس روز آپ کس کی اطلاع پر، تابندہ سے دو، دو ہاتھ کرنے کلینک پر پہنچی تھیں؟''

وہ ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگی پھر کٹہرے کی

ریلنگ کو تھام کر اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

''وہ اطلاع مجھے طارق شاہ نے دی تھی......!''

❖❖❖

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ طارق شاہ کھڑا تھا۔ طارق شاہ کی حیثیت مقتول کے اسسٹنٹ ایسی تھی۔ وہ ''فاروقی کلینک'' کے تمام معاملات کا نگران بھی تھا۔ طارق شاہ مائل بہ فربہی ایک درمیانہ قد اور گورا چٹا شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی اور مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں اور سر پر ٹوپی لگا رکھی تھی۔

طارق شاہ نے بڑے نستعلیق انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اس کے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔ وکیل استغاثہ نے مختلف زاویوں سے چند ایسے سوالات کیے جن کے جواب سے ملزم کا تاثر خراب ہوتا تھا مثلاً یہ کہ ملزم ایک آوارہ، غیر سنجیدہ اور کھسکا ہوا نوجوان تھا۔ مقتول نے کئی بار اسے اپنے پاس سے بھگانے کی کوشش کی تھی تاہم وہ خبطی پھر چلا آتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کی تو میں جج کی اجازت حاصل کرکے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاہ جی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ مقتول کے قابلِ اعتماد ساتھی، اس کے دستِ راست اور اسسٹنٹ تھے؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے ڈاکٹر صاحب کی موت کا دلی صدمہ ہے......!''

''افسوس کہ میں آپ کے اس صدمے کو کم کرنے کے لیے کسی قسم کی مرہم کاری نہیں کرسکتا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ بات بھی درست ہے کہ آپ مقتول کے اسسٹنٹ ہونے کے علاوہ فریدہ خانم کے لیے بھی کام کرتے تھے...... ایک جاسوس کی حیثیت سے؟''

''یہ جھوٹ ہے......'' وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ ''مجھ پر الزام ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کی بات کا یقین کرلیتا ہوں۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں طارق شاہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ جھوٹ ہے کہ آپ فریدہ خانم کے لیے جاسوسی کیا کرتے تھے تو پھر آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ سچ کیا ہے......'' میں نے چند لمحے رک کر اسے تیز نظر سے گھورا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''شاہ جی! کوئی بھی جواب دینے سے پہلے ایک بات ذہن میں رکھیے گا کہ پچھلی پیشی پر فریدہ خانم عدالت کو بتا چکی ہے کہ اس روز آپ ہی نے فون کرکے انہیں تابندہ کی کلینک پر آمد کے بارے میں بتایا تھا......؟''

''اس فون کی حد تک تو یہ بات درست ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بیگم صاحبہ کو تابندہ کے حوالے سے کس قسم کا شک تھا، یہ بات انہوں نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ جب تابندہ کلینک پر آئے تو مجھے بتانا اور میں نے فون کرکے انہیں تابندہ کے بارے میں بتا دیا تھا پھر جب کلینک پر ان دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا تو یہ بات سامنے آئی کہ بیگم صاحبہ کو شک تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ سے شادی کرنے والے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ میں بیگم صاحبہ کے لیے کسی جاسوس کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔''

''آپ کی یہ بات بھی میں نے مان لی۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بتائیں کہ آپ کی ڈاکٹر صاحب اور تابندہ کے بارے میں کیا رائے تھی۔ کیا ان کے بیچ شادی کے حوالے سے کسی قسم کی کھچڑی پک رہی تھی؟''

''جی...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنی موت سے چند ماہ پہلے ڈاکٹر سلیم فاروقی نے تابندہ سے شادی کرلی تھی اور اسے گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رکھا تھا۔ کیا یہ بات بھی آپ کے علم میں نہیں؟''

''جی نہیں...... بالکل نہیں!'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

''کمال ہے...... آپ تو ان کے رازدار اسسٹنٹ تھے۔ آپ کے علم میں لائے بغیر مقتول یہ کام کیسے کرسکتا تھا!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جب مجھے اس دلچسپ حقیقت کا علم ہے تو آپ کیسے بے خبر ہوسکتے ہیں۔''

''جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔''

''اوکے...... اگر آپ کے بیان کی تصدیق کے لیے مجھے تابندہ کو عدالت تک لانا پڑا تو میں یہ کام ضرور کروں گا......'' میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''فی الحال، ہم دوسری طرف چلتے ہیں۔''

تابندہ کو عدالت میں حاضر کرنے والی بات پر طارق شاہ خاصا نروس دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ

اس نے مقتول اور تابندہ کی شادی کے حوالے سے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ اس شادی کے حوالے سے اول آخر سب کچھ جانتا تھا۔

''شاہ جی! کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت کا وقت کیا ہے؟''

''سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''اور یہ وہی وقت ہے جب مقتول ایک گھنٹے کے لیے اپنے کلینک کے تیسرے پورشن یعنی آخری عقبی حصے میں آرام کیا کرتا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مقتول کی لاش بھی کلینک کے اسی حصے میں بیڈ پر پڑی ملی تھی۔ قاتل نے آہنی وزنی راڈ کا وار کر کے مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو بری طرح چٹخا دیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اوندھے سونے کے عادی تھے اس لیے قاتل کا وار ان کے سر کے عقبی حصے پر پڑا اور کھوپڑی چٹخ گئی۔ آپ نے جس آہنی راڈ کا ذکر کیا ہے اس کے ایک سرے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسی بدبخت نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کیا ہے۔''

''گویا آپ کو یقین ہے کہ ملزم ہی نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو قتل کیا ہے؟''

''جی...... بالکل......!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''اس یقین کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

''دیکھیں جی...... سیدھی اور سچی بات ہے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے اور اس دوران میں صرف ایک ہی شخص ان کے آرام کمرے میں گیا تھا اور وہ شخص ہے...... ملزم حنیف!''

''وقوعہ کے روز حنیف کتنے بجے کلینک پہنچا تھا؟'' میں نے طارق شاہ کی عالمانہ تقریر کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ساڑھے چار بجے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''کیا اس وقت آپ کلینک پر موجود تھے؟''

''جی ہاں۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔''

''یعنی کلینک کے پہلے حصے، ریسیپشن والے کمرے میں؟'' میں نے تصدیقی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب اس وقت آرام فرما رہے تھے۔ درمیان والا حصہ ڈاکٹر صاحب اپنے پاس آنے والے لوگوں سے ملاقات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جس آہنی راڈ سے انہیں قتل کیا گیا ہے وہ ان کے کمرے میں میز پر رکھی رہتی تھی۔ دراصل، ڈاکٹر صاحب اس راڈ کو اپنے کلائنٹ کے سر پر رکھ کر کچھ عمل وغیرہ پڑھا کرتے تھے جس سے یہ پتا چل جاتا تھا کہ کسی نے اس شخص پر کچھ کیا ہوا تو نہیں......''

''یہ...... کچھ کیا ہوا سے آپ کی کیا مراد ہے شاہ جی؟''

''مطلب یہ کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس شخص پر کسی ہوائی مخلوق کے اثرات ہوتے یا کسی نے سفلی یا بندش وغیرہ کرائی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کو فوراً پتا چل جاتا تھا۔ اس طرح مریض کے علاج میں بہت آسانی ہو جاتی تھی۔''

''اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔'' میں نے اس طرح گردن ہلائی جیسے اس کی بیان کردہ خرافات سے اتفاق کر رہا ہوں۔ لہٰذا اپنے مقصد پر ثابت قدم رہتے ہوئے میں نے استغاثہ کے گواہ طارق شاہ سے استفسار کیا۔ ''ملزم ساڑھے چار بجے کلینک پر پہنچا۔ اس نے کلینک کے ابتدائی حصے میں آپ سے ملاقات کی...... اس نے آپ سے کیا کہا تھا؟''

''جناب! اس وقت ملزم خاصا گھبرایا ہوا تھا۔'' وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''اس نے مجھ سے کہا کہ یہ فوری طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب تو سو رہے ہیں اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ چار سے پانچ بجے کے درمیان آرام کرتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا، کچھ بھی ہے۔ مجھے اسی وقت ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے لہٰذا میں انہیں جگا دوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں تو نہیں جگا سکتا۔ اگر اتنا ہی ضروری کام ہے تو خود جا کر انہیں جگا لو۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ برا سا منہ بناتے ہوئے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈاکٹر صاحب آرام کر رہے تھے۔'' طارق شاہ نے بتایا۔ ''تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ واپس آیا اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سے بات ہو گئی ہے...... پھر یہ کلینک سے واپس

چلا گیا تھا۔''

''ذرا سوچ کر بتائیں شاہ جی۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے خیال میں ملزم زیادہ سے زیادہ کتنی دیر کلینک پر رکا ہوگا؟''

''بہ مشکل پانچ منٹ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ چھ، سات منٹ۔''

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! وقوعہ کے روز ملزم نے سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک کا وقت اپنے ایک دوست احمد شیخ کے ساتھ جائے وقوعہ سے پانچ کلومیٹر دور گلشن اقبال کے ایک ریسٹورنٹ میں گزارا تھا لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ساڑھے چار بجے سے لے کر چار پینتیس یا چار چالیس پر ''فاروقی کلینک'' میں موجود رہا ہو۔ احمد شیخ عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ میں گواہی کے لیے اسے اندر بلانا چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے......!'' جج نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

آیندہ دس منٹ کے اندر احمد شیخ نے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہو کر حقیقتِ حال بیان کر دی۔ ملزم نے وقوعہ کے روز جو سوا گھنٹے کا وقت اپنے دوست احمد شیخ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے گزارا تھا۔ شیخ احمد نے اس کی تفصیل بڑے جامع انداز میں پیش کر دی۔ شیخ احمد کی گواہی مکمل ہونے کے بعد میں دوبارہ طارق شاہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''جی شاہ صاحب...... اب آپ کیا کہیں گے؟''

''جو سچ تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تو آپ کے خیال میں صفائی کے گواہ شیخ احمد نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

''جی ہاں...... سو فیصد!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''آپ کو کب پتا چلا کہ ڈاکٹر سلیم کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب پانچ بجنے سے دس منٹ پہلے خود ہی اٹھ جایا کرتے تھے اور ٹھیک پانچ بجے وہ فریش ہو کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو جاتے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب تک وہ فریش ہوتے، میں ان کے کمرے کی کرسیوں اور ٹیبل وغیرہ کو سیٹ کر دیا کرتا تھا لیکن وقوعہ کے روز جب وہ مقررہ وقت پر بیدار نہیں ہوئے تو مجھے تشویش ہوئی، ملزم تھوڑی دیر پہلے بتا کر گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے اس کی بات ہو گئی ہے۔ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب کو بیدار ہی ہونا چاہیے تھا پھر وہ سامنے کیوں نہیں آئے؟ اسی سوال کے جواب کے لیے میں نے جا کر کلینک کے اس حصے میں جھانکا جہاں وہ آرام کیا کرتے تھے اور اسی وقت مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی کہ انہیں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا......''

''آپ نے کتنے بجے ان کے آرام کمرے میں جھانکا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔''

''ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کا انکشاف ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام کون سا کیا تھا؟'' میں نے لہجے میں درشتی کو شامل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے فوراً بیگم صاحبہ کو فون کیا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''پہلی بیگم صاحبہ یا دوسری بیگم صاحبہ؟''

''پہلی بیگم صاحبہ...... فریدہ خانم کو...... آں......!'' وہ اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

''بہت خوب شاہ جی!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تو آپ بڑے دعوے کے ساتھ یہ کہہ چکے ہیں کہ آپ کو مقتول اور تابندہ کی شادی کا کچھ علم نہیں اور اب ''پہلی بیگم'' اور ''دوسری بیگم'' کا حساب بہ خوبی بیان کر رہے ہیں۔ یہ کیا انداز ہے شاہ جی؟''

''وہ...... وہ...... میں کنفیوژ ہو گیا...... تھا......'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مم...... میرا...... مطلب یہ تھا کہ...... میں نے ڈاکٹر صاحب کی بیگم...... فریدہ خانم کو...... فون کیا تھا......!''

''شاہ جی! آپ کنفیوژ ہو نہیں گئے تھے بلکہ ابھی تک کنفیوژ ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خیر، میں بھی آپ کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں...... تو آپ نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھ کر فوراً ان کی بیگم فریدہ خانم کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟''

''جی...... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ نے پانچ منٹ کم پانچ پر ڈاکٹر سلیم فاروقی کو

مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔'' میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ ''اور فوراً آپ نے فریدہ خانم کو فون کر دیا یعنی جب آپ نے یہ فون کیا تو اس وقت پانچ بجنے میں چار منٹ ہوں گے یا تین یا دو یا زیادہ سے زیادہ پورے پانچ بج چکے ہوں گے...... ہیں نا؟''

''جی ہاں...... اس سے زیادہ نہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن فریدہ خانم نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو یہ بتایا ہے کہ آپ نے ٹھیک پانچ بج کر پچیس منٹ پر انہیں فون کیا تھا اور وہ ٹھیک پونے چھ بجے کلینک پر موجود تھیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟''

''مم...... میں...... کیا...... کہہ سکتا ہوں۔'' وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھر آیا تھا۔

''آپ کیوں نہیں کچھ کہہ سکتے......!'' میں نے نفرت بھری نظر سے اسے گھورا۔ ''بڑے آرام سے کہہ دیں کہ وقت کے معاملے میں فریدہ خانم جھوٹ بول رہی ہیں جیسا کہ...... ملزم نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ...... ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک گلشن اقبال کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا؟''

''پپ...... پانی!'' وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے، اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے منمنایا۔

''پانی ملے گا...... ضرور ملے گا مگر...... سچ بولنے کے بعد!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ...... تم نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو کیوں قتل کیا؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سنسنی خیز سوال کے جواب میں کچھ کہتا، اس کی ٹانگیں کپکپائیں اور وہ دھڑام سے کٹہرے کے فرش پر گرا اور...... بے ہوش ہو گیا۔

❖❖❖

پچھلی پیشی پر میرے تیکھے سوالات اور طارق شاہ کے ڈرامائی طرزِ عمل نے اس کیس کا نقشہ پوری طرح کھول کر رکھ دیا تھا۔ جج نے طارق شاہ کو شاملِ تفتیش کرنے کے احکام صادر کر دیے تھے۔ جب شاہ جی کی گردن چھری کے نیچے آئی تو اس نے اپنی زبان سے حقیقتِ حال بیان کر دی۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کا اقرار کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ کام اس نے فریدہ خانم کی شہ پر کیا تھا۔ آلۂ قتل یعنی وہ آہنی راڈ جو مقتول کی میز پر رکھی رہتی تھی، چند روز پہلے طارق شاہ نے اس پر ملزم کی انگلیوں کے نشان حاصل کر کے اسے غائب کر دیا تھا اور ڈاکٹر کے استعمال کے لیے اس کی جگہ اس کی ''جڑواں راڈ'' میز پر رکھ دی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ دونوں ایک جیسی راڈز اس لیے بنوائی تھیں کہ ان میں اگر ایک اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کی پڑھائی والا ''مخصوص کام'' نہ رکے۔ فاضل راڈ طارق شاہ کی تحویل میں رہتی تھی لہٰذا اسے اس ''ادلی بدلی'' میں کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی اور اس نے دستانے پہن کر اس آہنی راڈ سے اوندھے سوئے ہوئے ڈاکٹر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس کے ایک سرے پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ اس طرح طارق شاہ کی نشاندہی پر پولیس نے ملزم کو گرفتار کر کے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کے الزام میں حوالۂ عدالت کر دیا تھا۔

جب طارق شاہ کے اقبالِ جرم پر فریدہ خانم کو شاملِ تفتیش کیا گیا تو پہلے تو وہ اس بات سے انکار کرتی رہی کہ وہ بھی شریک سازش ہے لیکن جب پولیس نے اپنے مخصوص تفتیشی ''ہتھکنڈے'' استعمال کیے تو وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکی اور اسے بھی اقبالِ جرم کرتے ہی بنی۔

واقعات کے مطابق فریدہ خانم کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ تابندہ سے شادی کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی اسے طلاق دے کر فارغ کرنے والا ہے لہٰذا اس نے طارق شاہ کے ساتھ مل کر ڈاکٹر فاروقی کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ فریدہ نے اسے یہ پیشکش کی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر کو موت کی نیند سلا دے تو وہ نہ صرف یہ کہ ''فاروقی کلینک'' اس کے حوالے کر دے گی بلکہ اس سے شادی بھی کر لے گی۔ طارق شاہ کو جب پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں نظر آیا تو وہ بلا چون و چرا فریدہ خانم کی پیشکش کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

صدیوں سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ ''برے کام کا برا نتیجہ'' سو اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی، طارق شاہ اور فریدہ خانم نے اپنی اپنی سطح پر جو کچھ بھی کیا اسے برے کام ہی میں شمار کیا جائے گا لہٰذا ان میں سے ایک تو جان سے گیا اور باقی دونوں عدالت سے لمبی سزا پانے کے بعد جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے!

فریدہ خانم اور طارق شاہ جیسے ''سازشی کردار'' ہمارے معاشرے میں ہر جگہ موجود ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان پر گہری نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے بلکہ اگر موقع ملے تو ان کا سر کچلنے کی کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے...... اور ڈاکٹر فاروقی جیسے معاشرتی ناسوروں کو بھی کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے......!

(تحریر: حسام بٹ)



کون کہتا ہے کہ وقت پلٹ کر نہیں آتا... اگر
ایسا ہوتا تو دن کے بعد رات... اور پھر سے دن
کبھی نہ نکلتا۔ بس یہی فارمولا زندگی کے
گرد بھی اپنا چکر پورا کرتا ہے اور پھر سے
کسی نئے روپ میں ڈھل کر اپنی چالیں
دہراتا ہے۔ ان تینوں کا مثلث بھی کچھ ایسے
ہی گھن چکر کا شکار تھا... جب ایک کی
دُم ایک کے ہاتھ میں تھی... لیکن اچانک
ان میں سے ایک کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی
اور پھر سب کچھ بکھر گیا۔

گھن چکر

غلام قادر

دوسروں کی کمتری اور اپنی برتری کے احساس
سے مغلوب ایک سبق آموز جھلک

''آیئے آیئے تشریف لایئے محترمہ ڈاکٹر اقبال فاطمہ...... ہیڈ آف دی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ...... یونیورسٹی آف نیو جرسی۔''

''میں نے تم جیسا بے شرم اور ڈھیٹ شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔''

''یہ بے شرمی...... یہ ڈھٹائی...... بالکل بھی نہ ہوتی اگر تم اپنی آمد کی اطلاع دے دیتیں۔''

''بے حیائی کا جو مظاہرہ میں نے کل رات دیکھا ہے کیا

یہ اپنی نوعیت کا پہلا مظاہرہ تھا؟"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔"
"مختلف اسی طرح سے ہے کہ اس سے زیادہ بے غیرتی شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"
"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن تم پہنچی کب تھیں؟"
"جب تم دونوں انتہائی غیر مناسب انداز میں لیٹے ہوئے تھے جبکہ تمہارے جسم سے چادر پوری طرح اور نین کے آدھے جسم سے چادر لپٹی ہوئی تھی۔"
"میں تمہاری قوت برداشت کی تعریف کروں گا ڈاکٹر صاحبہ۔"
"اس لیے کہ میں نے رات ہی کوئی ہنگامہ بپا نہیں کیا۔"
"نہ صرف یہ کہ ہنگامہ کرنے سے گریز.... کیا بلکہ دوسرے بیڈ روم میں جا کر سو گئیں۔"
"میری اس کیمپس میں ایک عزت ہے جسے میں تم جیسے گھٹیا آدمی کے لیے قربان نہیں کر سکتی۔"
"ویسے یہ تمہاری بھول ہے کہ یہاں کے لوگوں کے لیے یہ کوئی موضوع ہوتا۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"مطلب یہ کہ یہ امریکا ہے میری جان جہاں پوری طرح شخصی آزادی کا راج ہے۔"
"اتنی آزادی بھی نہیں ہے کہ باپ اپنی سوتیلی بیٹی کے ہم بستر ہو جائے۔"
"اس معاشرے کے لیے یہ انہونی نہیں ہے۔ ویسے نین تمہاری بیٹی نہیں ہے۔"
"وہ میرے شوہر کی بیٹی ہے اور اس رشتے سے وہ میری بھی بیٹی ہے۔"
"اور تم اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتی ہو کہ اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائداد ڈکار لیے بغیر ہڑپ کر گئیں۔"
"جو کچھ مجھے ملا ہے وہ وسیم اپنی وصیت میں لکھ گئے تھے۔"
"اور وہ سب کچھ لکھوایا کس نے؟"
"مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔"
"عرفان سے شادی کے لیے گھر سے بھاگ جانے کا مشورہ نین کو کس نے دیا تھا۔"
"میں نے اسے اپنی مثال دی، ملک سلیم سے شادی کے لیے میں نے بھی اپنی فیملی کو چھوڑا تھا۔"
"تم جانتی تھیں کہ عرفان ایک ناکارہ شخص ہے اور نین کا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔"
"میں نے تو تم جیسے ناکارہ شخص سے بھی شادی کر لی تھی۔"
"جس مقصد کے لیے تم نے مجھ سے شادی کی تھی وہ تو تم حاصل کر رہی ہو۔"
"بکواس مت کرو۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"
"میں تعلیم میں تمہارے برابر کا تھا نہ عمر میں پھر بھی تم نے مجھ سے شادی کر لی؟"
"میں تمہاری چاہت کے ڈرامے سے متاثر ہو گئی تھی۔"
"اپنے اس فقرے پر تمہیں خود بھی ہنسی آ رہی ہوگی۔"
"کیا تم تپتی دوپہر میں میرے ڈیپارٹمنٹ کے باہر میرا انتظار نہیں کرتے تھے۔"
"بالکل کرتا تھا لیکن اس سے پہلے جو ہوا تھا وہ کیا تھا؟"
"تم کس کی بات کر رہے ہو......؟"
"تم جانتی ہو ڈاکٹر اقبال فاطمہ کہ میں کس واقعے کی بات کر رہا ہوں۔"
"کھل کر بات کرو۔"
"آج واقعی ہر بات کھل کر ہو جانی چاہیے۔"
"میں بھی آج ہر بات، ہر آخری بات کرنے کے موڈ میں ہوں۔"
"لیکن ناشتا تو تم اتنے اطمینان سے کر رہی ہو جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔"
"میں رات میں فیصلہ کر چکی ہوں اب صرف اس پر عمل کرنا باقی ہے۔"
"یہ بات تو تمہاری قابل تعریف ہے کہ تم ہر فیصلہ سوچ سمجھ کے پورے اعتماد کے ساتھ کرتی ہو۔"
"تعریف کرنے کا شکریہ۔"
"پہلے 18 سال بڑے شخص سے شادی پھر دوسری شادی 10 برس چھوٹے شخص سے۔"
"شاید یہ دونوں فیصلے غلط کیے تھے۔"
"پہلے فیصلے کے بارے میں تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو، اس شادی نے تو تمہیں کروڑ پتی بنا دیا تھا۔"
"شادی کے وقت میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ رضوان صاحب کو ورثے میں اتنی جائداد ملی ہے کہ ان سے انہیں لاکھوں کی ماہانہ آمدنی ہوتی ہے۔"
"اتنی معصوم تو اس وقت بھی نہیں تھیں جب تم نے اپنی بڑی بہن کے باس کو بے وقوف بنایا تھا۔"
"بکواس مت کرو...... اب تم گھٹیا ترین باتوں پر اتر آئے ہو۔" اس بار وہ تلملا گئی تھی۔
"تمہاری ایجوکیشن کے تمام اخراجات صفدر صاحب نہیں اٹھاتے تھے؟"
"وہ ان کی رحم دلی تھی کہ انہوں نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میرے تعلیمی اخراجات اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔"
"وہ ان کی رحم دلی تھی اور تمہاری دریا دلی یہ تھی کہ ہر ہفتہ کی صبح تم کالج جانے کے بجائے ان کے فلیٹ پہنچ جاتی تھیں اور کالج ٹائم وہیں گزارتی تھیں۔"
"احتشام تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔"
"آخری بات ہے اس لیے ہر بات کھل کر ہونی چاہیے۔"
"لیکن اپنی حد میں رہ کر بات کرو۔"
"یہ نہیں پوچھو گی کہ مجھے یہ سب کچھ کس نے بتایا؟"
"تم کسی کا بھی نام لے لو گے۔"
"خود صفدر صاحب نے میری جان۔"
"بکواس کرتے ہو تم وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔"
"اب یہ بھی پوچھ ہی ڈالو کہ صفدر صاحب سے مجھے کس نے ملوایا تھا۔"
"تم انیلا کا نام لو گے۔"
"اپنی بڑی بہن کا نام لے کر تم نے ثابت کر دیا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔"
"اتنا کچھ جاننے کے باوجود تم نے مجھ سے شادی کر لی؟"
"شادی نہ کرتا تو امریکا کس طرح آتا۔ اتنی عیاشی کس طرح کرتا۔"
"تم اعتراف کر رہے ہو کہ میرے عشق میں مبتلا ہونے کا وہ ڈراما محض ڈھکوسلا تھا۔"
"مجھ سے پہلے یہ ڈھکوسلا تم نے اس شریف آدمی کے ساتھ کیا جو تمہارا استاد بھی تھا۔"
"میں ان سے واقعی متاثر تھی، میرا مطلب ہے ان کی علمیت سے متاثر تھی۔"
"علمیت کے ساتھ جب ان کی جائداد کے بارے میں علم ہوا تو تمہاری محبت دو آتشہ ہو گئی۔"
"تم کیے جاؤ اپنی بکواس مجھ پر اب کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔"
"تم نے ایک تجربہ کار شکاری کی طرح انہیں بھی اپنے دام میں پھنسایا اور جب تمہارے جسم کے جال میں پھنس گئے تو تم نے انہیں شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔"
"یہ بات بھی تمہیں انیلا نے بتائی ہوگی؟"
"بہت سی باتیں اس نے اور کچھ نین نے۔"
"انیلا ہمیشہ سے مجھ سے جلتی ہے۔"
"ایک بڑی بہن کی حیثیت سے اس نے تمہیں ہمیشہ سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن تم دونوں کے راستے الگ الگ تھے اور منزلیں بھی جدا تھیں۔"
"اسی لیے وہ آج بھی کہیں دو کمروں کے فلیٹ میں رہ رہی ہوگی اور صبح سے شام تک نوکری کر رہی ہوگی۔"
"اس کا ایک بیٹا انجینئر اور ایک ڈاکٹر بن چکا ہے اور بیٹی میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔"
"اس کا مطلب ہے تم اس سے رابطے میں ہو۔"
"ہر دس پندرہ دن میں اس سے بات ہو جاتی ہے۔"
"ہر رابطہ ختم کرنے کے بعد میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ بھی میرا پیچھا نہیں کرے گی لیکن اب بھی اسے معاف نہیں کروں گی۔"
"اسے یہ فکر پریشان کرتی ہے کہ جس راستے پر تم چل پڑی ہو اس کا انجام بخیر نہیں ہوگا۔"
"وہ میری اتنی خیر خواہ ہے کہ اس نے صفدر سے لے کر رضوان تک کی ہر بات تمہیں بتا دی؟"
"وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ تم صفدر اور رضوان کی طرح مجھے بھی شکار کر رہی ہو۔"
"جبکہ حقیقتاً شکاری تم تھے۔"
"ہر شکار آخری لمحہ تک یہی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ شکار کر رہا ہے جبکہ حقیقتاً وہ خود شکار ہو رہا ہوتا ہے۔"
"اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے مجھے شکار کیا ہے؟"
"تمہارے طنز اور طنزیہ مسکراہٹ کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مجھے مجسٹریٹ کی شادی کی اس تقریب سے واپسی پر لفٹ کی پیشکش کی تو میں کچھ اور سمجھا تھا۔"
"مگر تم نے کہا تھا کہ واپسی کے لیے تمہارے پاس سواری نہیں ہے۔"
"سواری ہونے کے باوجود میں نے انکار اس لیے کیا تھا کہ میں یہی سمجھا تھا کہ تم ایک رات کے لیے مجھے مہمان بنانا چاہتی ہو۔"
"لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

''جب تم نے اپنی مظلومیت کی داستان سنانی شروع کی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چاہتی کیا ہو لیکن دوسری ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ تم طویل منصوبہ بندی کر رہی ہو۔''

''شادی کی پیشکش تمہاری جانب سے ہوئی تھی۔''

''میں نے وہی کیا تھا جو تم چاہتی تھیں۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''میں تو انکار کرتی رہی تھی۔''

''صرف اس لیے کہ میرا اصرار بڑھتا رہے۔''

''میں نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ شادی کے بغیر بھی مجھ سے رشتہ قائم کر سکتے ہو لیکن تمہارا ہی اصرار رہا تھا شادی کے لیے۔'' اس نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

''صرف کہا نہیں تھا بلکہ قائم بھی کیا تھا۔''

''اس کے باوجود تمہارا اصرار اپنی جگہ رہا تھا۔''

''وہ سب کچھ تم نے اس لیے کیا تھا جس طرح مال خریدنے سے پہلے گاہک مال کو اچھی طرح پرکھتا ہے۔''

''کیا یہ سب جاننے کے باوجود تم بکنے کے لیے تیار تھے؟''

''کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم سے دس گیارہ برس کم عمر شخص تم سے کیوں شادی کرے گا؟''

''اس کی وجوہات بھی تم خود ہی بیان کرتے رہے ہو۔''

''خوب صورت تو کیا قبول صورت بھی تم کبھی نہیں رہیں اس وقت بھی نہیں جب تم نے صفدر کو گھیرا تھا۔''

''کیا میں وہ الفاظ دہراؤں جو تم مجھ سے کہتے رہے ہو۔''

''ہم دونوں اپنے اپنے ٹارگٹ پر کام کر رہے تھے۔''

''میں نے تمہیں ہر طرح کی آسائش فراہم کی۔''

''اور میں تمہیں وہ کچھ مہیا کرتا رہا جو تم چاہتی تھیں۔''

''لیکن اس کے ساتھ ہی تم وہ کچھ بھی کرتے رہے جو تمہارا دل چاہتا تھا مگر میں نہیں......''

''تسکین کے کچھ لمحات پر میرا بھی حق ہے۔''

''یہی سوچ کر میں بہت کچھ برداشت کرتی رہی تھی لیکن اب تم نے ہر حد پار کر لی ہے تو......''

''تم نے نین تارا سے ہر شے تو چھین لی ہے اب اس کے اتنے خلاف کیوں ہو؟''

''میں نے نہیں چھینی اس نے خود گنوا دی تھی۔''

''کورٹ میرج کرنے اور گھر چھوڑنے کا مشورہ تم نے اسے نہیں دیا تھا؟''

''میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد اس کا باپ اسے معاف کر دے گا۔''

''ضرور معاف کر دیتا اگر تم اسے یہ نہ سمجھاتی رہتیں کہ نین نے اس کی زندگی بھر کی کمائی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔''

''وہ بچہ نہیں تھا۔''

''اس کے باوجود تمہارے معاملے میں اس نے ہر بار ناسمجھی کا مظاہرہ ہی کیا تھا۔''

''یہ نین تارا نے کہا ہوگا۔''

''وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ جب اس نے اپنے باپ کو پوری صورت حال بتائی تو تمہارا اس سے شدید جھگڑا ہوا تھا۔''

''جھوٹ بولتی ہے وہ......''

''اس کا کہنا ہے کہ جس صبح کو اس کا باپ تبدیل شدہ وصیت نامے پر دستخط کرنے والا تھا اس رات تم نے اسے زہر دے دیا۔''

''نین تارا نے تو باپ کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کروایا تھا۔''

''تم کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہو اور تمہارا سبجیکٹ ہی زہر اور زہریات ہے۔''

''خوب اچھی طرح اس نے سبق پڑھایا ہے۔''

''میں صرف اس کے کہے ہوئے الفاظ دہرا رہا ہوں۔''

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ جب میں پہلے شوہر کو زہر دے سکتی ہوں تو تمہیں کیوں نہیں دے سکتی یا نین تارا کو کیوں نہیں دے سکتی۔''

''نین کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے مارنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''تم بھول رہے ہو کہ ہم امریکا میں ہیں اور یہاں مرد اور عورت کے بغیر شادی ساتھ رہنے پر کوئی پابندی نہیں۔''

''مجھے بھی علیحدگی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ اور نین تارا کے ساتھ گلچھرے اڑاؤ۔''

''تمہیں اس سے کیا غرض کہ میں اپنی باقی کی زندگی کس کے ساتھ بسر کرتا ہوں۔''

''گویا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے نین تارا کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔''

''تب تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری زندگی باقی ہی نہیں رہے گی کہ تم نین تارا کے ساتھ اسے گزار سکو۔''

''تم دھمکی دے رہی ہو؟''

''میں تمہیں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔''

''تم مجھے بھی وہی زہر دو گی جو تم نے نین کے باپ کو دیا تھا۔''

''میں تمہیں وہ زہر دے چکی ہوں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''میں سچ بتا رہی ہوں اتنا ہی بڑا سچ جتنا کہ میں اس وقت تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

''مگر مجھ پر اس کا اثر کیوں نہیں ہوا؟''

''یہ ایک ایسا زہر ہے جسے نہ کھانے والا محسوس کرتا ہے نہ اس کے اثرات کسی بھی پوسٹ مارٹم میں ملتے ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔''

''اپنی ٹانگوں پر زور مت دو بلکہ چلنے کی کوشش تو ہرگز نہ کرنا۔''

''کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

''اپنی جگہ پر بیٹھے رہو گے تو تمہاری زندگی دو سے تین گھنٹے بڑھ جائے گی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''اپنے لیے ناشتا میں نے خود بنایا ہے اور جب سے تم یہاں آئی ہو، میں نے تم سے کوئی چیز لے کر نہیں کھائی ہے بلکہ بریڈ بھی میں نین کو چھوڑنے گیا تھا تو دکان سے لیتے ہوئے آیا تھا۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تم مجھے ماہر زہریات کہہ چکے ہو۔''

''تمہاری ریسرچ اسی پر ہے۔''

''اسی لیے میں اس واحد زہر کے بارے میں جانتی ہوں جو انڈے کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے۔''

''انڈے میں نے خود بنائے تھے۔''

''لیکن یہ غور نہیں کیا کہ فریج میں صرف دو انڈے ہی کیوں ہیں۔''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔''

''اوپر کمرے میں چھ وہ انڈے رکھے ہیں جو فریج میں رکھے تھے اور میں نے انہیں زہریلا نہیں کیا تھا اور تمہارے ہارٹ اٹیک کے بعد تمہاری لاش کو اسپتال لے جانے سے پہلے میں انہیں دوبارہ فریج میں رکھ دوں گی۔''

''انڈوں کو تم زہریلا کس طرح بنا سکتی ہو، انڈے میں تو سرنج بھی نہیں جا سکتا۔''

''کچھ دیر بعد مرحوم ہو جانے والے میرے شوہر! یہ زہر صرف برازیل کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے جو پانی میں حل ہو جاتا ہے اور اگر انڈے کو اس میں دس منٹ کے لیے ڈوبا رہنے دیا جائے تو یہ زہر انڈے میں سرایت کر جاتا ہے۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ایک مرتے ہوئے آدمی سے مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''میرا گناہ، اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ تم مجھے قتل ہی کر دو۔''

''میں نین تارا سے کتنی نفرت کرتی ہوں تم اس کا اندازہ بھی کر سکتے۔''

''اگر میں نین سے کبھی نہ ملنے کا وعدہ کروں تو تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔''

''تم بہت کچھ جان چکے ہو اس لیے اب تمہارے زندہ رہنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔''

''مجھے معاف کر دو۔''

''تمہیں یہ کیوں یقین ہے کہ میں معاف کردوں گی تو تمہاری جان بھی بچ جائے گی۔''

''ہر زہر کا تریاق ہوتا ہے اور تمہارے پاس اس زہر کا تریاق یقیناً ہوگا۔''

''موت کو سامنے دیکھ کر تمہارا ذہن کتنی تیزی سے کام کررہا ہے۔''

''میں اپنے بینک میں موجود رقم کے علاوہ سب کچھ تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہاری بیوہ ہونے کے ناتے وہ تو ویسے بھی مجھے مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ سب کچھ بھی تو میرا ہی دیا ہوا تھا۔''

''تم جو کہو گی وہ میں مان لوں گا لیکن خدا کے لیے میری جان بخش دو۔''

''تمہارے مرنے کا مجھے بھی افسوس ہوگا لیکن میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔''

''خون کبھی چھپتا نہیں ہے، تم ضرور پھنسوگی۔''

''کون پھنسائے گا مجھے؟''

''میں پھنساؤں گی اپنی سوتیلی ماں کو دو قتل کے جرم میں۔''

''تم یہاں کیا کررہی ہو، اندر کیسے داخل ہوئیں؟''

''تمہارے گھر کے ہر تالے کی ایک ڈپلیکٹ چابی ہے میرے پاس۔''

''نین تارا اس عورت نے مجھے زہر دے دیا ہے۔''

''جانتی ہوں میں، باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی تم دونوں کی گفتگو ریکارڈ کرتی رہی تھی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تم تو صبح سویرے چلی گئی تھیں۔''

''لیکن جانے سے پہلے تمہارے سامنے موجود گلدان میں مائک چھپا کر گئی تھی۔''

''اب مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں ہے۔ میرے بعد پھانسی سے تمہیں بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

''مجھے وہ ٹیپ دے دو میں تمہارے عاشق کی جان بخش دوں گی۔''

''اس کی زندگی سے مجھے کوئی غرض نہیں یہ مرے گا تبھی تو تمہیں اس کے قتل پر پھانسی ہوگی۔''

''نین یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''آج سچ بولنے کا دن ہے اس لیے سچ بول رہی ہوں۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟''

''صرف وہ تمام رقم جو تم نے میرے باپ کی موت کے بعد حاصل کی تھی۔''

''لیکن اس میں میری اپنی کمائی بھی شامل ہے۔''

''میرے پاس ایک ایک پائی کا حساب ہے، جو تم نے میرے باپ سے ہتھیائی تھی۔''

''میں اس کا چیک تمہیں دوں تو تم مجھے یہ ٹیپ دے دوگی؟''

''چیک کیش ہونے کے ساتھ ہی میں تمہارے سامنے سب کچھ جلا دوں گی۔''

''تم اپنے باپ کا خون معاف کردوگی نین؟''

''اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا اور اس نے اسے قتل کردیا۔''

''تم تو مجھ سے بھی محبت کا دعویٰ کرتی تھیں، میرا خون بھی معاف کردوگی۔''

''میں نے صرف اپنے مرحوم شوہر سے محبت کی تھی اور مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ اس کے بعد میں اس کی وفادار نہیں رہ سکی ویسے میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال فاطمہ اب تمہیں مرنے نہیں دیں گی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اب میں بھی اس راز میں شریک ہوں۔''

''میں بچ گیا تو یہ تمہیں رقم کیوں دیں گی۔''

''قتل کی کوشش کرنا بھی ایک جرم ہے اور پہلا قتل بھی ان کے ذمے ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں اب اسے مرنے نہیں دوں گی لیکن اسے میری اور تمہاری زندگی سے دور جانا ہوگا بہتر ہوگا کہ یہ پاکستان چلا جائے۔''

''لیکن پہلے بینک سے رقم نکلوا کر میرے حوالے کردو ورنہ میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکوں گی۔''

''نین پلیز پہلے میری جان بچانے دو۔''

''اگلے ہی بلاک میں بینک ہے اور وہاں رش بھی نہیں ہوتا یہ چاہے تو وہاں سے جاکر پندرہ منٹ میں واپس بھی آسکتی ہے۔''

''میں جارہی ہوں لیکن رقم ملتے ہی تم دونوں میری زندگی سے دفع ہوجانا۔''

''تم شرائط عائد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو لیکن

میرا نام بھی نین تارا ہے میں اپنا وعدہ پورا کرتی ہوں۔''

''وہ تو چلی گئی لیکن تم نے یہ بات غلط کہی کہ تم اپنا وعدہ پورا کرتی ہو۔''

''میری پاپا سے آخری ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک بڑا پیکٹ اس ہدایت کے ساتھ دیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہوجائے تو میں اسے کھولوں۔''

''کیا تھا اس پیکٹ میں؟''

''ان کی ڈائریاں تھیں اور وہ تمام ریسرچ کی تفصیلات تھیں جو انہوں نے کی تھی۔''

''تبھی تم نے اس پر زہر دینے کا الزام عائد کیا تھا۔''

''لیکن میں جانتی تھی کہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوسکے گا۔''

''اس کے باوجود تم اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں امریکا تک آگئیں۔''

''امریکا میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے نہیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی لیکن یہاں آکر اس نے بھی وہی کیا جو پاکستان سے یہاں آنے والے اکثر مرد کرتے ہیں۔''

''پھر تم نے مجھے اپنے جال میں پھنسایا۔''

''میں نے اسے دیکھا تو زخم تازہ ہوگئے تھے۔''

''رقم حاصل کرلینے کے بعد کیا کروگی؟''

''واپس پاکستان چلی جاؤں گی۔''

''اور میں چاہوں کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں؟''

''تمہاری فطرت میں بے وفائی ہے۔''

''آج ملنے والا سبق میرے لیے کافی ہے۔'' اس نے التجا کی۔

''یہ بات ہے تو پھر بقیہ زندگی یہیں گزار دو۔''

''میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ تم اس کے ساتھ بھی کرسکتے ہو۔''

''خطرے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہے گی۔''

''میں اس کے زہر چوری کرچکی ہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔''

''غلطی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اس کے تمام تالوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا۔''

''تو کیا تم نے اس کی الماری کی بھی چابیاں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کوئی جاسوس اعظم ہوں کہ فروخت کردہ تمام جائداد کی تفصیلات میرے پاس ہیں۔''

''وہ اپنی تمام ضروری چیزیں وہیں رکھتی تھی۔''

''ان ضروری چیزوں میں وہ زہر بھی شامل ہیں جواب



ایک بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ ڈارلنگ، تم میری دُنیا ہو۔''

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جب میں تمہیں اپنی دُنیا کہتا تھا تو اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اور اب تو میں کئی دُنیائیں دریافت کرچکا ہوں۔''

میرے پاس ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے وہ مجھے زہر نہیں دے سکی تھی؟''

''وہ یہی سمجھتی ہے کہ اس نے تمہیں زہر دیا ہے۔''

''یہ بات میں اس کو بتادوں تو وہ تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گی۔''

''لیکن تم اسے بتاؤ گے کیوں؟''

''ایک صورت میں نہیں بتاؤں گا، اگر مال مسروقہ میں سے پچاس فیصد مجھے مل جائے۔ یہ جاننے کے بعد کہ زہر تمہارے قبضہ میں ہے تمہارے ساتھ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''رقم کا کیا کروگے؟''

''کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جس کا تصور بھی تم دونوں کے ذہن میں نہ ہو۔''

''یہی بات تم دونوں کے لیے بہتر ہے۔''

''تم کب واپس آئیں؟''

''میں گئی کب تھی جو واپس آتی۔''

''لیکن تمہاری گاڑی تو گئی تھی اور......''

''جتنی رقم تم دونوں کے حصے میں آتی ہے وہ لو اور یہاں سے دفع ہوجاؤ۔''

''جب تم حقیقت جان گئی ہو تو پھر......''

''یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی نین تارا کہ ایک کامیاب قتل کرنے کے بعد بھی زندگی کس عذاب کا شکار ہوتی ہے۔''

''میری بات سنو۔''

''میں نے تمہارے ساتھ بھی زیادتی کی اس لیے اب تمہیں بھی آزاد کرتی ہوں۔''

''پہلے میری بات تو سن لو......''

''میں سب کچھ سن چکی ہوں حالانکہ میں تمہاری وجہ سے ہی رکی ہوئی تھی کہ کہیں تم بھی......''

''اگر یہ بات ہے تو تم نے زہر مجھ پر آزمایا ہی کیوں؟''

''صرف تمہیں دھمکانے کے لیے ورنہ میں واقعی......''

''اگر میں واپس آنا چاہوں۔''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور میں اس غلطی کو جاری نہیں رکھ سکتی۔''

''اب میں اپنی خوشی سے رہنا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ۔''

''تم اور نین تارا شادی کرلو اور نین تارا کے باپ کی رقم سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

''میں وہ زہر ضائع کردوں گی تاکہ تمہارے ذہن پر تلوار نہ لٹکی رہے۔''

''لیکن اقبال تم......''

''مائیکل چیک کیش کروا کر آتا ہی ہوگا۔ رقم آپس میں بانٹ لو اور برابری کی بنیاد پر اپنے رشتے کا آغاز کرو۔''

''اور آپ کیا کریں گی؟''

''باقی کی زندگی میں کوشش کروں گی کہ اپنے گناہوں کو معاف کرواسکوں۔''

''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟''

''جب تک مائیکل بینک سے واپس آئے ہم ناشتا کرلیتے ہیں۔''

''یہ مائیکل وہی ہے نا جو تمہارے ساتھ سیمینار میں گیا تھا؟''

''ہاں وہی ہے۔''

''وہ صبح سویرے کیسے آگیا؟''

''میں نے اسے بلوایا تھا۔''

''ڈاکٹر اسٹیفن مائیکل جس کی بیوی چار ماہ پہلے ہارٹ اٹیک سے چل بسی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''میں پیکنگ کرتا ہوں تاکہ فوری طور پر روانہ ہوسکوں۔'' اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔''

''شکریہ لیکن میں تمہارے ساتھ بھی نہیں جارہا ہوں۔''

''لیکن ابھی تو تم نے کہا تھا کہ میں اور تم۔''

''ان چند لمحوں میں دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آئی ہیں کہ جس طرح بچھو اپنی ڈنک مارنے کی جبلت کو ختم نہیں کرسکتا اسی طرح کوئی انسان بھی اپنی جبلت کو ترک نہیں کرسکتا۔''

''میں نہیں سمجھی کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''دولت اور عیاشی کی متلاشی تم دونوں خواتین کی جبلت ایک جیسی ہے۔''

''تم ہم دونوں کو ایک صف میں کھڑا کررہے ہو۔''

''یہ مائیکل جو آج میری لاش اٹھانے بلوایا گیا تھا مجھے افسوس ہے کہ اس کی لاش اٹھانے کے لیے میں یہاں نہیں ہوں گا۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ مائیکل کو اپنی بیوی سے کتنی دولت ملی ہے اور تم بھی جو رقم مجھے اس لیے دے رہی ہو کہ مائیکل......''

''تم فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ......تم دونوں......''

''اور ہماری رقم۔''

''رقم اور طلاق کے کاغذات لے کر میں ایک گھنٹے میں نین تارا کے گھر پہنچ جاؤں گی۔''

''اب تم یہ رسک نہیں لینا چاہتی ہو کہ ہمارا سامنا مائیکل سے ہو۔''

''میں کہتی ہوں دفع ہوجاؤ ابھی اور اسی وقت۔''

''میرے کپڑے اور میری چیزیں رائزنگ ہوٹل میں پہنچا دینا۔ نین مجھے وہاں تک ڈراپ کردے گی، کیوں نین؟''

''میں بھی وہیں پر انتظار کرلوں گی۔''

''ہوسکا تو میں آج کی فلائٹ سے ہی واپس چلا جاؤں۔''

''فی الحال یہاں سے دفع ہوجاؤ۔''

''خدا حافظ......''

''بائی!''

طوائف

ڈاکٹر شیر شاہ سید

یہ حقیقت ہے کہ بردہ فروشی کے کاروبار میں اپنے پرائے کی شناخت بے معنی ہوتی ہے اور... اگر کوئی اسے اہمیت دے تو اپنی حیثیت بھی کھو بیٹھتا ہے... وہ بھی کچھ ایسی ہی خوش گمانی میں مبتلا تھا کہ اچانک ٹوٹے ہوئے آئینے میں اپنا بکھرا ہوا عکس دیکھ کر نگاہیں چرا بیٹھا مگر... نگاہیں چرانے سے حقیقتیں کب بدلا کرتی ہیں۔

حسین چہروں میں چھپی غلاظت اور شرفا کی بدحواسیاں

وہ مجھے بنکاک میں ملی تھی۔ میں ہوٹل سے باہر نکلا ہی تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوروں نے مجھے گھیرلیا۔ ''لڑکی چاہیے، لڑکی۔ یو پاکستانی، مسلمان؟ مسلم لڑکی ایویل ایبل۔ آل کلین، آل نیشنل، میڈیکل سرٹیفکیٹ۔ باڈی مساج ساتھ میں۔'' وغیرہ وغیرہ نہ جانے وہ لوگ کیا کیا بولتے رہے تھے۔ تیز تیز قدموں سے چل کر میں نے انہیں پیچھے چھوڑا۔ میں عیاشی ہی کرنے آیا تھا مگر اس وقت عیاشی کا موڈ نہیں تھا۔ ابھی تو پاکستان سے مزید مہمانوں کو آنا تھا۔ جن کے لیے پورے ہفتے کا عیاشی کا پروگرام مجھے ہی ترتیب دینا تھا۔

میں ایک بزنس مین تھا۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ ہر جگہ میرا بزنس تھا اور ہر قسم کے بزنس میں میرا عمل دخل بھی کبھی امپورٹ کبھی ایکسپورٹ۔ ادھر کا مال ادھر



اور ادھر کا مال ادھر۔ چینی۔ شکر کے دھندے میں بھی، لوہے کے کاروبار میں بھی۔ دوائیں منگوانی ہیں، چار پیسے کا فائدہ ہے تو خدمات حاضر ہیں۔ روئی بھجوانی ہے تو بھجواؤں گا۔ توپ منگانا ہے تو منگواؤں گا۔ گاڑیوں کے لائسنس اٹک گئے ہیں، نکل جائیں گے۔ بلڈنگ گرانی ہے، گر جائے گی۔ چار منزل کے بجائے چودہ منزل بنانا ہے، بن جائے گا۔ ہر قسم کے کام میں میرا ہاتھ تھا۔ آج کل بزنس ایک چیز کا نہیں ہوتا، وہ زمانہ چلا گیا جب کاروباری لوگ صرف ایک کاروبار کرتے تھے۔ اب اصول یہ ہے کہ کوئی اصول نہیں، آگے بڑھنا ہے، وقت سے پہلے ٹارگٹ پورا کرنا ہے صرف یہ اصول ہے۔ یہی میں بھی کر رہا تھا اور بڑی برکت تھی میرے کاروبار میں۔

ایک میرے باپ نے کاروبار کیا تھا۔ ساری زندگی لی مارکیٹ کی ایک چھوٹی سی دکان میں چائے بیچتا رہا اور نمازیں پڑھتا رہا۔ ساری زندگی جتنے پیسے اس نے بنائے اس سے زیادہ حساب تو میں نے ایک جھٹکے میں اسٹیل مل کی ایک ڈیل میں کر لیا تھا۔ بلجیم سے تھرمو ریزسٹنٹ واشر چاہیے تھے۔ ایک تگڑی پارٹی نے مجھ سے بات کی کہ انہیں بھی آگے اسٹیل مل کو سپلائی کرنا ہے۔

میں نے کہا۔ ''بابا، جمہوری حکومت ہے کسی وزیر وغیرہ سے بات کرتا ہوں، کام ہو جائے گا۔''

کام ہو گیا تھا۔ اسٹیل مل والوں نے جو واشر آٹھ سو روپے میں بک رہا تھا، وہی واشر چار ہزار ایک سو کا ایک خریدا۔ بس یہ میرا ہنر تھا۔ بلجیم والوں کے دس ہزار واشر بک گئے، پارٹی کو اصل سے بھی بڑا منافع ہو گیا، مجھے پورا پورا کمیشن ملا۔ میں نے کام کروانے والوں کو بھی اچھی خاصی رقم دی تھی۔ کام ہو تو ایسا ہو۔ میرے کام کرنے کے اصول بہت سادہ تھے۔

میرے باپ کی نظر میں یہ بزنس نہیں تھا، چوری تھی۔ اب اسے کون سمجھائے کہ دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ ٹک ٹک بزنس کرنے کا ٹائم نہیں ہے۔ بابا پیسا بناؤ، جتنی جلدی جتنا زیادہ بناؤ اتنا ہی اچھا ہے۔ جائز منافع، ایمان داری کا کام صرف کتابوں کی باتیں ہیں، پرانے زمانے کی باتیں ہیں اب نیا زمانہ ہے جس میں الیکٹرونک میل سے ڈالر روشنی سے بھی تیز سفر کرتا ہوا پہنچ جاتا ہے، وقت بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں اپن کو بھی بدلنا ہوگا۔

میرے باپ کو کھوکھوں کا شوق ہے کہتا ہے پرانی بلڈنگیں، کوئی ہیری ٹیج میری ٹیج ہوتی ہیں۔ میں نے کراچی میں ایک ڈیل میں بڑا اچھو بیہ بنایا۔ ایک بڑا بلڈر لے، بہت بڑا اس نے کروڑوں کی ڈیل کی بھی میں دے کام بھی کوئی ایسا بڑا نہیں تھا۔ کراچی کی کچھ پرانی بلڈنگیں تھیں، کچھ کنٹونمنٹ بورڈ کے تحت، کچھ سندھ گورنمنٹ کے پاس۔ ان کو صرف کمرشل بنانا تھا۔ میں نے کہا، ابھی کراچی میں آفسوں میں چکر لگانے کا نہیں ہے۔ سیدھا اسلام آباد میں خاص آدمی کو ڈالروں سے بھرا ہوا تھیلا دینا ہے پھر سب کچھ ہفتے بھر میں ہو گیا۔ جب کروڑوں کا بزنس ہو تو کون فکر کرتا ہے۔

وہ تو حکومت ہی چلی گئی، اپنے پاس تو ایک پلان اور تھا۔ جناح کی قبر کے چاروں طرف بڑا بڑا پلازا بالکل قبر کا اسٹائل میں۔ اوپر سے کوئی دیکھے تو لگے جیسے بہت سارے گولے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں اور سائڈ میں بابے کی قبر بھی۔ کیا نقشہ بنایا تھا دادا بھائی نے مگر یہ بدقسمتی سے حکومت ہی چلی گئی۔ لیکن خیر حکومت کے جانے سے پہلے میں نے ایک اور بڑی ڈیل بھی کرادی تھی۔ یورپ اور امریکا سے کچھ پرانی ایم آر آئی کی مشینیں آنی تھیں۔ چھ کروڑ ساٹھ کروڑ قیمت میں نئی مل گئیں۔ اس دفعہ مجھے ذرا کم پیسے ملے کیونکہ صحت کے وزیر نے میرے کمیشن میں سے تھوڑا اپنا بھی الیکشن فنڈ نکال لیا تھا۔ بابا کام تو چلانا ہے، دھندے میں رہنا ہے تو یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

یہی بات بڑی کوشش کی تھی میں نے اپنے باپ کو بھی سمجھانے کی مگر سمجھا نہیں۔ بہت ایمان داری سے کام کرتے ہوئے بہت خاموشی سے ایمان داری کی موت مر گیا۔ مرنے کے ٹائم پہ تو بہت دکھ ہوا بعد میں یاد بھی بہت آئی۔

میں نے تمام لفڑوں میں بہت کمایا۔ کیسے اپنے دن کالے کیے اور راتوں کو جاگتا رہا۔ ہر ایک کی قیمت لگائی۔ کسی کے پیسے لندن بھجوائے۔ کسی کے لیے مکان خریدا، کسی کی بیٹی کے نام پہ پلاٹ لکھوائے۔ ایک کو تو جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں لفافے پہنچائے۔ دنیا ایسے ہی چلتی ہے، ایسے ہی چلے گی۔ لوگ کہتے ہیں باپ کو میرا غم کھا گیا۔ ابھی اس کا کوئی جواب دے میرے کو۔ اپن کا غم اپن کو کھاتا نہیں، میرے باپ کو کھا گیا۔ بھئی موت کا وقت آ گیا تو مر گیا۔ مگر اس کے باوجود کیسا بھی تھا اپن کا باپ تو تھا۔ بڑے اچھے دن گزرے اس کے ساتھ، جب میں چھوٹا تھا، دن ویسے ہی رہتے تو اچھا ہوتا مگر دن بدل گئے۔ دوست بدل گئے۔ اپن بدل گئے پر باپ نہیں بدلا۔ یاد آتا ہے اسی وجہ سے کبھی کبھی۔

اس لفڑے کے بعد میں نے بنکاک میں یہ پارٹی رکھی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے جمع ہو رہے تھے۔ ہم تین کے علاوہ سب سرکاری تھے۔ سب کے اپن اوحی نے بتے، سب کے ٹکٹ خریدے گئے اور سب بنکاک پہنچ گئے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کا انتظام تھا اور ہر روز، روز عید تھا اور ہر شب، شب برات۔ میں نے جو ہوٹل چنا تھا اس کا بھی جواب نہیں تھا۔ دریائے چاؤ پائی یا کے کنارے نیا ہوٹل بنا ہے بینن سلا کے نام سے۔ ایسا ہوٹل میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔

بنکاک کا بھی کیا مزہ ہے۔ ایک رات ہم لوگوں نے ایک بڑی گاڑی پکڑی اور تفریح پر نکلے۔ بنکم پو سے بھی آگے جہاں بنگلوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ ان بنگلوں کے بڑے بڑے گیٹ کھلتے ہیں، گاڑیاں اندر جاتی ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس منیجر نما لوگ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ خوب صورت دروازوں سے گزرتے ہوئے مختلف کمروں میں لے جایا جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کر کے کم سے کم کپڑوں میں ملبوس کم عمر لڑکیاں چلی آتی ہیں۔ جسم اور جان کے ہر اشارے سے کہتی ہیں کہ انہیں چن لیا جائے۔ اس رات تین بجے تک ہم لوگ تقریباً دس گھروں میں گئے۔ یہ بھی ایک طرح کا تھرل تھا اور جب رات ٹوٹنے والی تھی تو ہم سب نے ایک ایک لڑکی منتخب کر لی۔ چوبیس گھنٹوں کے لیے یہ لڑکیاں ضرور مہنگی ہوں گی مگر ہمیں زیادہ نہیں لگیں، کیونکہ رقم کسی اور نے دی تھی۔ کسی دفاعی معاہدے کے سودے میں سے، کسی روڈ کی تعمیر کے اکاؤنٹ میں سے، کسی اسپتال کی خریداری کے لیے دیے گئے رقم کی کمیشن میں سے۔

وہ دن، وہ رات غضب کے تھے۔ ہم لوگوں نے بے تحاشا ڈالرز خرچ کیے اور بنکاک نے بھی ہم سے پورا انصاف کیا۔ اتنا سستا شہر، اتنے سستے ہوٹل، اتنی سستی شراب، اتنی سستی عورت کسی اور شہر میں نہیں ملے گی۔ ہمیں مزہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے پینٹ پانگ میں ملی تھی۔ پینٹ پانگ کا علاقہ بھی کیا علاقہ ہے۔ دنیا بھر کی چیزیں خریداری کے لیے مہیا ہیں اور ساتھ میں ایک قطار میں کلب ہیں جہاں دن رات چوبیس گھنٹے عریاں عورتوں کا ڈانس ہوتا رہتا ہے۔ بس ڈالر چاہیے جو آج کے زمانے کا سب سے بڑا بھگوان۔ وہ بنکاک کی لڑکیوں کے مقابلے میں تھوڑی لانبی تھی اور ناک نقشے سے بھی تھوڑی جدا۔ ہمارے واپس آنے میں صرف دو دن ہی رہ گئے تھے اور اسی شام وہ مجھے مل گئی تھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی سودا کر لیا اور اسے لے کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب دو دن مجھے اسی کے ساتھ ہی گزارنا ہیں۔ طوائفوں سے محبت نہیں ہوتی، ہونی بھی نہیں چاہیے۔ مجھے بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس سے انسیت ضرور ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اگر بنکاک آنا ہوگا تو اسی کے لیے آنا ہوگا۔ وہ تھی ہی ایسی۔ ایک تو خوب صورت و پرکشش، اوپر سے اس طرح سے ملی جیسے صدیوں کی شناسائی ہو۔ یہ بھی ایک ادا تھی اس کی، میں بری طرح مر مٹا تھا اس پہ، یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی بنکاک کی طوائف ہے، دھندا کرنے والی ایک پروفیشنل عورت۔

واپس آنے کی شام اسے میں نے بھرپور طریقے سے گلے لگایا اور بوجھل دل کے ساتھ اسے چھوڑ کر آ گیا۔ جہاز پہ کئی دفعہ یہ خیال آیا کہ وہ کسی اور کے ساتھ ہوگی مگر میں نے دل کو بہلا لیا۔ یہی دنیا کا نظام ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ، کوئی کسی کے ساتھ۔

پاکستان کا نظام ویسا ہی چل رہا تھا مگر یکا یک حکومت بدل گئی اور نئی حکومت نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کے ہی لوگوں نے سمجھایا کہ مجھے فرار ہو جانا چاہیے۔ ابھی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے، جھٹکے میں پکڑا جاؤں گا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اپن لوگوں کو بھی جیل میں رہنے کا شوق نہیں۔ اپن کو کھلی ہوا میں ہی رہنا ہے۔ میں نے دیر نہیں کی اور پکڑے جانے سے بہت پہلے ہی بنکاک چلا آیا۔ جا تو کہیں بھی سکتا تھا مگر بنکاک میرے دل سے نہیں نکلا تھا۔ حکومت مجھے وہاں تلاش کرتی رہی اور میں آرام سے نکل گیا۔ میرے جیسے بہت سے لوگ نکل گئے تھے۔ حکومتیں آتی ہیں پھر قیمت لگنے میں دیر لگتی ہے۔ اچھا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہی پھوٹ لو جب سب ٹھیک ہو جائے تو واپسی میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پاکستان میں بھی یہی ہوتا ہے۔ تھوڑا سا بریک ملتا ہے، روز روز کے کام سے بچنے کا۔ پھر حکومت سے بات چیت ہوتی ہے، کچھ دینا ہوتا ہے کچھ وعدے کرنے ہوتے ہیں پھر سب کچھ ہو جاتا ہے۔

بنکاک جاتے ہی میں نے ایک اپارٹمنٹ بنکم پو کے علاقے میں لے لیا تھا۔ یہ علاقہ شہر میں ہی ہے۔ دنیا بھر کی دکانیں، مساج کرنے کے سینٹر، بڑے چھوٹے ہوٹل بزنس۔ اور ہر قوم کا آدمی یہاں مل جاتا ہے۔ یورپ اور امریکا کے وہ لوگ جو اپنے ملکوں میں چائلڈ لیبر کے خلاف مہم چلاتے ہیں ان کے ہی ملک کے لوگوں کے لیے چائلڈ طوائفوں کا بڑا منظم انتظام ہے۔ ایک گھنٹے سے لے کر ہفتوں مہینوں تک کے لیے بھی لڑکیوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ بیچ میں بدلی بھی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی صنعت بن چکی ہے۔

میں نے ایک اچھا اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی اور بھی مہمان پاکستان سے آئیں گے، کچھ ایسے مہمان جو مستقبل میں سفیر، وزیر اور مشیر بنیں گے، کچھ ایسے سیکریٹری جو بعد میں چیئرمین اور ڈائریکٹر بنیں گے۔ اپنا کام ہی ایسا ہے کہ ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ عمرے کے شوقین کے لیے جدہ کا ٹکٹ، شاپنگ کے لیے سنگاپور۔ جس کا

جوشوق ہواس کے مطابق اس کی خدمت۔ میں ہوں نئے دور کا نیا بیوپاری۔

میں نے اسے بھی فون نہیں کیا بلکہ پینٹ پانگ کے اس نائٹ کلب میں پہنچ گیا تھا جہاں پہلی دفعہ وہ ملی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اچانک اس سے مل کر اسے حیران کردوں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ کلب کے منیجر نے بتایا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے۔ یہ سن کر مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کسی امریکی کے ساتھ ہوگی، کوئی شیخ اسے لے کر گھوم رہا ہوگا۔

میں نے منیجر سے کہا۔ ”مجھے ماریا چاہیے، چاہے جتنے بھی ڈالرز لگیں۔“ میں کافی کچھ خرچ کرنے کو تیار تھا۔

”مگر بزنس کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں مسٹر۔ اگر وہ کسی کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ ہے۔ ایک ایگریمنٹ ہے اس کے مطابق چلتے ہیں ہم لوگ۔“ کام غلط ہے مگر کام میں ایمان داری ہونا چاہیے۔ اس کا تو میں بھی قائل تھا۔

”آپ اپنا نمبر بتادیں۔ ہم خود ہی آپ کو فون کردیں گے اور جب تک وہ نہیں ملتی ہے اور حسینائیں ہیں۔ ماریا نہیں تو میری مل جائے گی۔ آپ حکم تو کریں۔“

عورت نہیں ہوئی بیئر ہوگئی۔ میرا کچھ دل نہیں چاہا۔ میں تو اس کے بارے میں ہی سوچتا ہوا آیا تھا، کچھ دل خراب سا ہوگیا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر جانی واکر کی آدھی بوتل خالی کی اور لڑھکتا ہوا ٹیکسی میں بیٹھا اور اونگھتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ میں آکر سوگیا۔

دوسرے دن شام کو اس کا فون آیا، وہی تھی۔ اس کی آواز میں فوراً ہی پہچان گیا۔ وہ فارغ تھی یا شاید میرے لیے فارغ کرا دی گئی تھی، بعد میں اس نے بتایا کہ جب اسے میرے بارے میں پتا لگا تو وہ ایک ڈچ کاروباری آدمی کے ساتھ ہفتے بھر کی ڈیوٹی پر تھی مگر اسی دن یکایک اس ڈچ کو ضروری میٹنگ کے لیے کمبوڈیا جانا پڑ گیا۔ وہ تو اسے بھی لے جانا چاہ رہا تھا مگر جیسے ہی اسے پتا لگا کہ میں اسے تلاش کررہا ہوں، اس نے اس سے بہانہ کرلیا کہ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ پھر وہ خوب ہنسی تھی۔ وہی ہنسی جس کا میں پچھلی ملاقات میں ہی اسیر ہوگیا تھا۔ تھائی زبان کے علاوہ اس میں کچھ بھی تھائی نہیں تھا۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ اس رات ہم لوگوں نے مشہور اورینٹل ہوٹل ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ ایسا ریسٹورنٹ میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ زندہ مچھلی، زندہ مرغی سے لے کر ہر طرح کی تازہ سبزیاں، سب کچھ خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہیں پر خریدیں اور جیسے آپ چاہیں ویسا ہی پکا کر وہ لوگ پیش کردیں گے۔ ہر بات نرالی تھی اس رات کی۔ ماحول رومانی تھا اور دھیمی دھیمی روشنی میں وہ تھائی کپڑے پہنے ہوئے کسی حور کی طرح میرے ساتھ تھی۔ دل میں آیا کاش یہ میری ہی بن جاتی، میرے ہی ساتھ رہتی، کبھی ساتھ نہ چھوٹتا اس کا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ میں اس کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا، بنکاک کے شہر شہر، سمندر سمندر، دریا دریا، جنگل جنگل۔ وہ طوائف تو تھی مگر بہت اچھی طوائف تھی اور بھی بہت کچھ تھا اس کے اندر۔ اس کے بکنے کا بھی ایک انداز تھا۔ میں اسے محبت تو نہیں کہوں گا مگر میں اسے چاہنے ضرور لگا تھا لیکن یہ تو نہیں سوچا تھا کہ زندگی بھر کا ساتھ ہوگا۔ مگر بنکاک کا ساتھ تو اسی کا تھا۔ ڈالروں کی کمی نہیں تھی، بیچ میں اور بھی لوگ پاکستان سے آئے۔ ہر ایک کسی نہ کسی وجہ سے یا تو بھاگ کر آیا تھا یا بھگوا دیا گیا تھا۔ جو بھی میرے پاس آیا، اس کا خیال کیا تھا میں نے۔ اوپر والے نے بڑی برکت دی تھی اس قسم کی کمائی میں۔ ڈالرز ختم نہیں ہو رہے تھے۔ ان کا بھی میں نے معقول انتظام کرایا تھا۔

آہستہ آہستہ پاکستان میں بھی حالات صحیح ہونے لگے۔ نئی حکومت نے اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں۔ پرانے سیاست دان یا تو ملک سے باہر تھے یا پھر حکومت کے ساتھ مل گئے۔ اب مجھے پتا تھا کہ وقت آنے والا ہے جب حکومت کو ہمارے جیسے بیچ کے لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ کام تو کرنا ہے، پچاس سالوں سے یہی ہو رہا ہے۔ مجھے تھوڑا دکھ بھی ہوا کہ اب بنکاک چھوڑنا ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ بنکاک میں بھی ایک مستقل آفس بنالوں، ماریا سمجھ دار ہے، یہاں کام سنبھال لے گی۔ اس کو اس کے پیسے ملتے رہیں گے اور میں مستقل عیاشی کا کاروبار بھی چلاتا رہوں گا۔ اپن کا یہ اسٹائل تھا، ہمیشہ ہی نئے کام کرنے کا، نئے طریقے سے۔ جدھر کچھ ہزاروں کا آسرا ہو فوراً ہاتھ ڈال دو۔ اوپر والے کی مہربانی سے کبھی نقصان نہیں ہوا۔ ایک کا دو بنا اور دو کا ہزار۔ اپنے بزنس میں یہی تو خاص بات تھی۔

ایک دن اسے میں نے بتایا کہ میں اب چلا جاؤں گا اور میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں کے اپارٹمنٹ میں رہے، میرا مستقل تعلق رہے گا۔ وہ میری ہی رہے گی مگر اس کا کام پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی دل داری کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ مجھے بھی پتا تھا کہ اب نئی حکومت کے نئے لوگ ہوں گے، نئے سیاست دان، نئے افسر، نئے ٹھیکے، نئے چکر اور ان سب چکروں میں باہر کی عیاشی کرانے والا ہمیشہ ہی جیت جاتا ہے۔ میں نے مستقبل کا انتظام کرلیا تھا مستقل بنیادوں پر۔

پاکستان واپس آنے سے پہلے ایک شام ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ جارہے تھے کہ اس نے بتایا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی ماں سے ملنا ہے۔ میں انتظار کروں، وہ مل کر آتی ہے۔

میں نے کہا کہ ہم ساتھ ہی چلتے ہیں، میں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا۔ میں اسے زیادہ دیر کے لیے نہیں جانے دینا چاہ رہا تھا۔ نہ ہی میں یہ چاہتا تھا کہ اب جانے سے قبل اس سے علیحدہ رہوں۔ انسانی تعلقات کا بھی عجیب ہی حساب ہوتا ہے۔ خاص طور پر عورت اور مرد کے تعلقات تو سمجھ سے ہی باہر ہیں۔ تمام چیزیں وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

وہ بنکاک کے ہی ایک اور علاقے میں رہتی تھی۔ خوب صورت سا مکان تھا۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا، وہ اندر چلی گئی۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا ہے؟ واپس جاکر کون سے کاموں میں کب ہاتھ ڈالنا ہے؟ نئی حکومت کے لوگوں نے نئے نئے پروجیکٹ سوچ لیے تھے۔ ہر پروجیکٹ میں مجھے ڈالرز نظر آرہے تھے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ نظام نہیں بدلتا، لوگ بدل جاتے ہیں۔ نام بدل جاتے ہیں، کام تو وہی ہوتا ہے جو شروع سے ہو رہا ہے۔ شاید یہی ہوتا رہے گا۔ جو ملک میں چلنے کے قابل نہیں ہیں وہ ملک چھوڑ جائیں گے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔

یکایک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا، جب مجھے اس کی آواز آئی۔ ”خدا حافظ!“ میں نے دیکھا وہ گھر کے دروازے پر اپنی ہی جیسی شکل والی عورت جس کی گود میں ایک چھوٹی بچی تھی، سے گلے مل کر سیڑھی اتر رہی تھی۔ ”پرسوں آجاؤں گی۔“ اس نے بچی کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم اردو جانتی ہو؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

”مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”کیونکہ ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میرے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس پیشے میں کسی قسم کی نسل پرستی، لسانی جانب داری نہیں ہے، مذہبی تعصب نہیں ہے۔ طوائف تو طوائف ہی ہوتی ہے اور گاہک بھی بس گاہک ہی ہوتا ہے۔ طوائف کو پیسا چاہیے ہوتا ہے اور گاہک کو وقت کا مناسب استعمال۔ دونوں اپنا مذہب، رنگ، زبان، نسل، سیاست گھر چھوڑ کے آتے ہیں۔“

میں خاموش سا ہوگیا۔ مجھے نہیں خیال تھا کہ ایک طوائف مجھے فلسفہ بھی پڑھائے گی۔ مجھے تھوڑی سی بے چینی سی ہوئی تھی۔ میں نے رک کر پوچھا۔ ”مگر تم نے اردو کہاں سے سیکھی، گاہکوں سے؟“

”نہیں اپنی ماں سے، اور اب اس کا فائدہ بھی ہوگا۔ تمہارے لوگ جو پاکستان سے آئیں گے، ان سے اگر چاہو گے تو اردو میں بھی بات کرلوں گی“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”اچھی سروس دوں گی، زوردار...... خوب مزہ آئے گا۔“ وہ زور سے ہنسی۔

رات کی ٹریفک میں اس کے چہرے پر پڑنے والی مختلف رنگوں کی روشنی نے اس کے چہرے کو مزید سیکسی بنا دیا تھا۔ میں نے اس کے کاندھوں کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کو کس نے اردو سکھائی؟ کیا وہ بھی دھندا کرتی تھی اور پاکستانی گاہکوں سے زبان سیکھ گئی؟

”نہیں، دھندا تو وہ کرتی تھی پر اردو اسے پہلے سے آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب بنگلا دیش بنا تو وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔ میری ہی طرح خوب صورت رہی ہوگی۔ وہ مجھے اکثر بتاتی رہی ہے کہ اسے بنگلا دیش کے فوجیوں نے اغوا کرلیا تھا، ماں باپ، بھائی بہن کا کچھ پتا نہیں لگا کون مرا، کون جیا، کون کہاں پہنچا؟ اسے وہ لوگ کلکتہ لے آئے تھے۔ کلکتہ میں ہی اسے تین دفعہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں بیچا گیا۔ کلکتہ میں ہی اس سے ایک تھائی بندے نے شادی کی اور اپنے ساتھ بنکاک لے آیا۔ جب میں پیدا ہوئی پھر وہ آدمی بھی چھوڑ گیا۔ ماں کو پھر دھندا کرنا پڑا۔ زندہ تو رہنا پڑتا ہے۔ ہر کوئی تو خودکشی نہیں کرسکتا ہے۔“ اس نے بڑی غمگین مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا تھا۔

میں پہلی دفعہ ساکت سا ہو گیا۔ اپن کو جیسے جھٹکا لگ گیا، بجلی کا جھٹکا، اوپر سے نیچے تک۔ اس کی خوشبو بھی جیسے کچھ بری سی لگنے لگی۔ اپنے ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے سے نکالتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”تو تمہاری ماں کا تعلق کلکتہ سے تھا؟ میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی وہاں کی طوائف مجھے ملے گی۔“

اپن کو پتا نہیں کیا ہوا کہ یہ الفاظ خودبخود اپن کے منہ سے نکل گئے۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، طوائف کہیں کی بھی ہو طوائف ہوتی ہے۔“

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی اور کھلے ہوئے گریبان میں منہ ڈال کر زور سے ہنس دی۔

#

محفلِ شعروسخن



❄ محمد ہمایوں تنولی......ضلع تناول، ہزارہ

تم بادشاہ وقت تھے کٹوا دیے ہاتھ
اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے

❄ ماہاایمان......حافظ آباد

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہوجائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہوجائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہوجائے

❄ محمد جاوید راؤ......بہاولنگر

سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے ہم تو
کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلانے کے لیے

❄ شوکت علی......گلبرگ، لاہور

حوصلہ تجھ میں نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ یوں تیری آنکھوں میں کاجل نہ پھیلا ہوتا

❄ غلام مرتضٰی جانی......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

خوشبوؤں کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے

❄ محمد لطیف ساحل......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہر دعا میں تیری خوشی مانگی ہے
تیرے لیے ستاروں سے روشنی مانگی ہے
نہ ہو جس میں کوئی بھی غم
خدا سے ترے لیے وہ زندگی مانگی ہے

❄ محمد نصیر طلحہ سیال......کوئنس روڈ، سکھر

دل کا درد ہے دل میں میرے بیان کروں تو گھائل ہو
حال میرا پھر وہ کیا جانیں جو دنیا پر مائل ہو

❄ عون عباس بابر......اوکاڑہ

زیست کو زیست کچھ اس طرح کیا جائے
جینا مشکل ہو تو لازم ہے کہ جیا جائے
اس سے پہلے کہ خزاں آکے انہیں پامال کرے
کیوں نہ شاخ سے ہر پھول کو توڑ لیا جائے

❄ ریاض شاہد پینٹرز......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہم نیند کے کچھ زیادہ تو شوقین نہیں حسن
کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارہ نہیں ہوتا

❄ عدنان ساحل......بھیرہ

وہ آج بھی ہر شام مجھ کو ہی سوچتا ہوگا
یہ بات نجانے کیوں میرے دل میں بار بار آتی ہے

❄ عمران حیدر بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

وہ جو برباد ہوئے وہی بدنام ہوئے ہیں
تم تو معصوم رہے اپنی اداؤں کی طرح
غم تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی خوشی راس نہیں
زندگی کاٹ رہے ہیں سزاؤں کی طرح

❄ حسنین عباس بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

مجھ کو جاتے ہوئے آواز نہ دینا ہرگز
دیکھنا اور فقط دیکھتے رہنا مجھ کو

❄ ثقلین عباس بلوچ......اوکانوالہ بنگلہ

میں نہیں مانتا کاغذ پر لکھا شجرۂ نسب
بات کرنے سے قبیلے کا پتا چلتا ہے

❄ اختر عباس چٹھہ......موڑکھنڈا

بن جاتا ہے کبھی حسن بھی دنیا کا تماشا
عبرت کے لیے مصر کا بازار بہت ہے

❄ امتیاز احمد......عظیم پورہ، کراچی

ہم جو چلتے ہیں تو خود بنتا چلا جاتا ہے
لاکھ مٹی میں چھپا کر کوئی رستہ رکھ دے

❄ شبانہ حسن......لاہور کینٹ

یہ الگ بات کہ اوجھل ہوں نظر سے ورنہ
میں تیرے پاس ہی رہتی ہوں صدا دے مجھ کو

❄ ذیشان حیدر بلوچ......کمالا تحصیل ساہیوال

کتنا عجیب اپنی زندگی کا سفر نکلا
سارے جہاں کا درد اپنا مقدر نکلا
جس کے نام اپنی زندگی کا ہر لمحہ کر دیا
افسوس وہی ہماری چاہت سے بے خبر نکلا

❄ سلطان احمد قائم خانی......ٹنڈو جان محمد

پیتل کے کٹورے بھی نہیں اپنے گھروں میں
خیرات میں چاندی کا تقاضا نہ کیا کر

❄ افتخار احمد تارڑ......کوٹ قادر بخش

شاید کبھی خلوص کو منزل نہ مل سکے
وابستہ ہے مفاد ہر اک دوستی کے ساتھ

❄ ادریس خان......میانوالی

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

❄ محمد یونس چودھری......سلطان پورہ، لاہور

اپنا جو نامۂ اعمال ہے سب جانتے ہیں
ہاتھ پھر کیسے اٹھیں، دل سے دعا کیسے ہو

❄ بابر عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں

وہی محسوس کرتے ہیں خلش درد محبت کی
جو اپنے آپ سے بڑھ کر دوسروں سے پیار کرتے ہیں

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا میں اس کو بھول جاؤں گا

❄ تغیر عباس بابر......اوکاڑہ

سکون کی اک سانس کی فرصت نہیں ملتی
اس شہر میں جینے کی اجازت نہیں ملتی
کتنے بے مہر مزاج کے مالک ہیں یہاں لوگ
اپنی تو کسی سے بھی طبیعت نہیں ملتی

❄ جعفر حسین......بھوآنہ، ضلع چنیوٹ

تجھ کو نہیں احساس کہ اے دل تری خاطر
اک شخص بڑے کام کا بیکار ہوا ہے

❄ کنول زریں......گلبرگ، لاہور

وہ جس پہ عمر لگی ہے مجھے منانے میں
اسی کا ہاتھ ہے مجھے مٹانے میں

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی

حرف تسلی تو اک تکلف ہے صاحب!
جس کا درد، اسی کا درد اور باقی سب تماشائی

❄ مدحت رضوان......کراچی

مجھ سا کوئی جہان میں نادان بھی نہ ہو
کرکے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال

دل کی بات کہوں؟ برا تو نہیں مانوں گے؟
بڑی راحت کے دن تھے تیری پہچان سے پہلے

❄ مصحف رضوان......کراچی

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر! تم کو اس سے کیا

❄ محمد آصف ساجد......ارزانی پور، قصور

روکتے ہو کس لیے اڑتے ہوئے لمحات کو
کون اب تک ان پرندوں کو مقید کرسکا

❄ عمران علی......جھنگ

اے ماں، پھر سے مجھے میرا بستہ دے دے
کہ دنیا کا دیا سبق مشکل بہت ہے

❄ خالد انصاری......حیدرآباد

اٹھا سائبان شفقت بڑی تیز دھوپ دیکھی
نہیں دور دور چھاؤں کہاں سر کو ہم چھپائیں

❄ ڈاکٹر ایچ اے لطیف......فقیروالی

لفظ تاثیر سے بنتے ہیں تلفظ سے نہیں محسن
اہل دل آج بھی ہیں زباں سے آگے

❄ طاہرالدین بیگ......میرپورخاص
ملنے کی آرزو لیے پہنچا تھا اس گلی
لیکن مرے سماج کے پہرے عجیب ہیں

❄ سعدیہ بخاری......اٹک
نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

❄ راجا ضیاالحسن کیانی......رتی ٹبی، ساہیوال
جانے کیوں اگ آئی ہیں درد کی ساری فصلیں؟
پیار کے اس کھیت میں کانٹے تو نہیں بوئے تھے

❄ رانا حبیب الرحمٰن......ٹوبہ ٹیک سنگھ
میری رنگوں بھری زندگی کو ویران کر گئی
غموں کی دے کر سوغات خوشیوں سے انجان کر گئی

❄ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی
آخری بات ملاقات کی حسرت ہے مگر
تم سے کچھ اس کے سوا اب نہیں کہنا مجھ کو

❄ راجا افتخار علی افتی......چوآسیدن شاہ
ہم ہر روز اداس ہوتے ہیں اور ہر شام گزر جاتی ہے فراز
اک روز ہر شام اداس ہوگی اور ہم گزر جائیں گے

❄ طاہرہ یاسمین......سرگودھا
یہ سیاہ زلف ہر حال میں قیامت ہے
الجھے تو رخسار پر آئے جو سلجھے تو کمر سے جا الجھے

❄ اختر شاہ عارف......جہلم
ہونٹوں پر مسکان سجائے رکھتا ہوں
اپنے دل کا درد چھپائے رکھتا ہوں

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

❄ بشیر احمد بھٹی......بہاولپور
مدت ہوئی ہے کوئے بستاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

❄ اسلم عارفی......گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ
کیوں دور بے رخی کو سمجھتا حصول عشق
کیا آپ کے مزاج سے ناآشنا تھا میں

❄ ذوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہوجائیے
بندہ پرور! جائیے، اچھا خفا ہوجائیے

❄ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
ہم تری آہٹ پہ سڑکوں پر نکل آئے تو کیا
ہم کو تو رسوا سربازار ہونا تھا، ہوئے

❄ حسن نظامی......قبولہ شریف
میں اسی خیال سے آج تک کبھی دل کی بات نہ کہہ سکا
کہ تو رنج و غم سے ہے بے خبر کہیں مسکرا کے نہ ٹال دے

❄ احسان سحر......میانوالی
مانا وفا نبھائی مگر بے رخی کے ساتھ
جاناں گلاب بھیجا ہے تم نے کسی کے ہاتھ

❄ ذیشان منہاس......گلشن اقبال، کراچی
بچھڑ کے مجھ سے کبھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے

❄ محمد اظہر......ملیر، کراچی
کل شب مجھے بے شکل کی آواز نے چونکا دیا
میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا آوارگی

❄ یمنیٰ احمد......کراچی
غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

❄ محمد امین......کراچی
ملتے ہی خود کو آپ سے وابستہ کہہ دیا
محسوس جو کیا وہی برجستہ کہہ دیا

کوپن برائے شمارہ اگست 2012

محفلِ شعر و سخن

نام: --

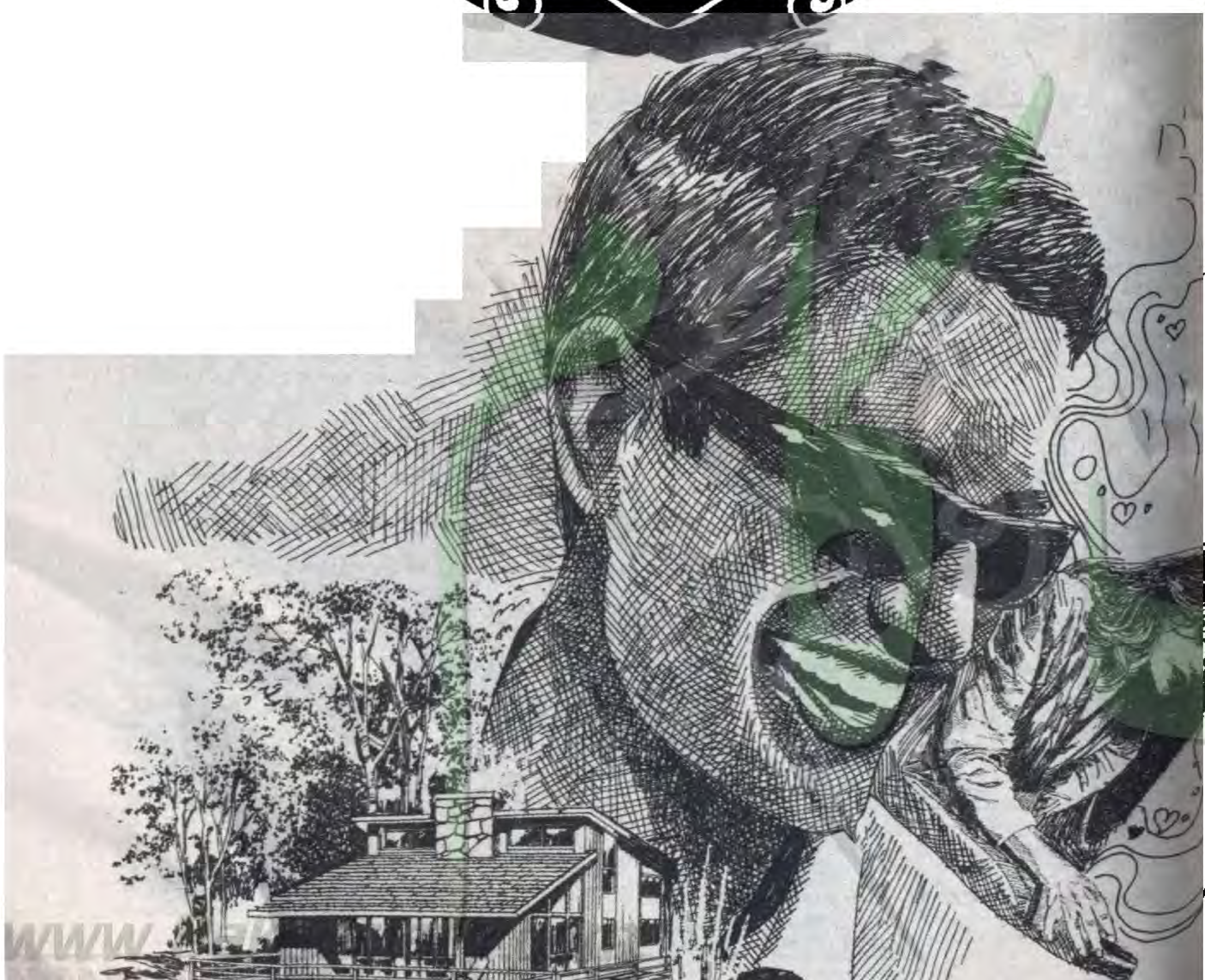
پتا: --

جون مائلو ایک خوش شکل اور ذہین نوجوان تھا اور خوبصورت خواب دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مثلاً اچھی سی نوکری، تاکہ سہولت سے زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی عیاشی بھی ہو سکے، ایک خوب صورت گھر کا خواب جس میں کم سے کم تین بیڈ روم اور ایک سوئمنگ پول بھی ہو، ایک نئی اور تیز رفتار اسپورٹس کار جو اس کی پُرجوش امنگوں کا ساتھ دے سکے اور سب سے آخر میں ایک حسین لڑکی جو اس سے محبت کرے اس کی گرل فرینڈ بنے اور بالآخر بیوی بن کر اس کے بچوں کی ماں بنے۔ یہ خواب جون نے پندرہ سال کی عمر سے ہی دیکھنا شروع کردیے تھے اور اب وہ

مریم کے حنان

یہ حقیقت ہے کہ لگن سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے مگر... پڑاؤ کو منزل سمجھنے والے ہمیشہ خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ وہ بھی مسلسل ایک سراب کے تعاقب میں تھی اور اس بے خبر کو اتنا ادراک ہی نہ تھا کہ منزل تو اس کے ہم قدم تھی... بالآخر جب اس کی جستجو نے دم توڑا تو احساس ہوا کہ وہ تو ایک کارِ لاحاصل کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

خلوص اور وفا کے رنگوں سے کھیلتی ایک دلکش تصویر



پچیس برس کا ایک بھرپور مرد تھا۔

جون نے ایک درمیانے درجے کے تعلیمی ادارے سے درمیانے درجے کی بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک درمیانے درجے کی کمپنی میں درمیانے درجے کا آفیسر بنا۔ یہ اس کے خواب والی نوکری نہیں تھی۔ نوکری کی طرح اس کے پاس کار بھی درمیانے درجے کی تھی۔ بس جون کو دفتر آنے جانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

البتہ گھر کے معاملے میں قسمت کسی قدر مہربان رہی تھی۔ جون مائلو کی عمر ہی لاس اینجلس میں گزری تھی اور اس کے ایک دور کے انکل نے مرتے وقت اپنا ایک ساحلی کاٹیج اس کے نام کردیا تھا۔ لاس اینجلس سے صرف بیس کلومیٹر شمال میں ساحلی ہائی وے کے ساتھ ہی مارک بیچ نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں یہ چھوٹا سا کاٹیج پہاڑی کے کنارے اس طرح ٹکا ہوا تھا کہ اس کے عقبی ٹیرس سے سوفٹ نیچے کا شفاف سمندر صاف دکھائی دیتا تھا اور جب جون کھڑکی سے پردہ ہٹاتا تو سمندر گویا اس کی کھڑکی میں حسین منظر بن کر آجاتا تھا۔

جون کے ماں باپ اس کے بچپن میں ایک ٹریفک حادثے میں دنیا سے گزر گئے تھے۔ خالہ اور خالو نے جون کو بہت محبت سے پالا تھا اور اس کے احساس محرومی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہ ان ہی کی کوشش تھی کہ جون ایک اچھا انسان بنا۔ نگران کے اپنے چار بچے تھے اور وہ سب جون سے چھوٹے تھے اس لیے جیسے ہی اس نے محسوس کیا وہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہے وہ ان کے گھر سے نکل گیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے دوران اس نے بہت سارے کام کیے تھے۔ جب غیر متوقع طور پر اسے یہ کاٹیج ملا تو اسے موقع ملا کہ وہ سیکھے گئے ہنر اس پر آزمائے۔ اس نے عقبی ٹیرس میں خود ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول بنایا۔ پتھروں سے سیڑھیاں بنائیں جو نیچے ساحل کی ریت تک جاتی تھیں۔ کاٹیج کی مکمل مرمت کی اور اس پر نیا روغن کیا۔ سامنے والے حصے میں خوب صورت سا باغ بنایا اور اپنی گاڑی کے لیے شیڈ تیار کیا۔

جون نے محسوس کیا کہ اس نوکری میں وہ پُرآسائش زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اعلیٰ درجے کی نوکریاں انہیں ملتی تھیں جن کے پاس اعلیٰ درجے کی ڈگریاں ہوتی تھیں اور یہ اعلیٰ درجے کی ڈگریاں بہت مہنگی تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسی ہی ڈگری حاصل کرے گا مگر فیسوں کے ساتھ اسے گزارے کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی اس لیے اس نے تمام غیر ضروری اخراجات ترک کر دیے۔ فی الحال بارز اور نائٹ کلبس کا رخ کرنا ترک کر دیا جن لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے ان کی کالز ریسیو کرنا بند کر دیں۔ کفایت شعاری کے لیے اس نے باہر کھانا ترک کر دیا اور زیادہ تر گھر میں کھاتا۔ دفتر جاتے ہوئے اپنا لنچ خود بنا کر لے جاتا تھا۔ اس بچت پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پاس رقم جمع ہونے لگی۔ تین سال میں وہ تقریباً تیس ہزار ڈالرز بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ چھٹی کے دن وہ آس پاس امرا کے لیے باغات میں کام کرتا جس سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر ابھی تک مطلوبہ رقم جمع نہیں ہوئی تھی۔ اسے پچاس ہزار ڈالرز کی ضرورت تھی۔ یہ ساری رقم فیس میں جاتی اس کے بعد جب وہ ڈگری کے لیے داخلہ لیتا تو اسے نوکری چھوڑنا پڑتی۔ تین سال تک وہ صرف پڑھتا اور اس کے دوران اسے گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ رقم درکار ہوتی لیکن اسے اعتماد تھا وہ پارٹ ٹائم کام کر کے اتنی رقم کما لے گا۔ تین سال میں وہ ڈگری حاصل کر لے گا اور اس کے بعد اسے اچھی نوکری مل جائے گی اور پھر وہ اپنے باقی خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکے گا۔ مزید بیس ہزار ڈالرز جمع کرنے میں اسے دو سال لگ جاتے۔ مگر اب وہ مزید تاخیر نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کچھ بینکوں سے بات کی، اسے امید تھی کہ اسے لون مل جائے گا جو وہ جاب حاصل کرنے کے بعد بہ آسانی اتار سکے گا۔

اتوار کی صبح جب وہ کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور مالی کے کام کا لباس بھی پہن چکا تھا تو کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سامنے ایک خوب صورت نوجوان اور صورت سے معصوم نظر آنے والی لڑکی کو پایا تو اسے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ کسی لڑکی کا ان دنوں اس کے دروازے پر آنا اس کے خیالوں سے بھی پرے تھا۔ لڑکی نے ایک چھوٹا سا بیگ شانے سے لٹکا رکھا تھا اس نے سنہری رنگ کا منی اسکرٹ پہن رکھا تھا جو اس کی ٹانگوں کے سنہری رنگ میں یوں گھل مل رہا تھا کہ پتا نہیں چل رہا تھا، اسکرٹ کہاں ختم ہوا اور ٹانگیں کہاں شروع ہوئیں۔ اوپر سفید رنگ کی ململ کی شرٹ تھی۔ اس نے اپنے سنہری مائل سرخ بال پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ دل کش نقوش، نہایت متناسب جسم اور لمبی ٹانگوں کے ساتھ وہ ان حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی جواب تک جون نے دیکھی تھیں۔ لڑکی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی نہایت دلکش تھی۔

''یس...؟'' جون نے کنفیوژ لہجے میں پوچھا۔

''جون مائلو...؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''یس...'' جون نے پھر کہا۔ البتہ اب اس نے اقرار

کیا تھا۔

لڑکی نے اپنا بیگ نیچے رکھا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے گلے لگ گئی۔ اس کے وجود سے نہایت بھینی سی خوشبو اٹھ رہی تھی اور جون کو خیال آیا کہ یہ اس کے وجود کی اپنی خوشبو ہے۔ لڑکی نے گرم جوشی سے کہا۔ ''میں ایلس جوزف ہوں۔''

جون کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے بادل ناخواستہ لڑکی کو خود سے الگ کیا اور بولا۔ ''اچھا تو تم ایلس جوزف ہو۔''

''ہاں میں ایلس جوزف ہوں۔'' لڑکی نے ذرا جھک کر اور نہایت اشتیاق سے کہا جیسے اسے امید ہو کہ اس بار جون خود اسے گلے لگا لے گا۔

جون کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لڑکی اس طرح تعارف کیوں کرا رہی تھی۔ اس نے سر کھجایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے تم ایلس جوزف ہو۔''

اس بار لڑکی کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے اس بار بجھے سے انداز میں کہا۔ ''جون میں ایلس جوزف ہوں۔''

''میرا خیال ہے تم نے خاصا تعارف کرا دیا ہے۔'' جون نے جواب دیا۔ ''آگے کہو۔''

لڑکی کا چہرہ یوں اچانک پھیکا پڑ گیا جیسے پرانے رنگین ٹی وی خرابی کی وجہ سے بلیک اینڈ وہائٹ ہو جاتے ہیں۔ ''تو... تم جون مائلو نہیں ہو؟''

''میں سو فیصد جون مائلو ہوں۔''

''تب تم مجھے پہچان کیوں نہیں رہے ہو؟'' لڑکی چلاّ اٹھی اس سے پہلے وہ بہت دھیمے اور سریلے لہجے میں بات کر رہی تھی، اس لیے اچانک چلاّئی تو جون گڑبڑا گیا۔ اس نے جلدی سے باہر جھانک کر دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ تمام پڑوسی اپنے گھر میں تھے، کوئی اتنی صبح باہر نہیں آیا تھا۔ مگر آ بھی سکتا تھا اور ایک خوب صورت لڑکی کو اس کے گھر کے دروازے پر دیکھ کر بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ جون کو محلے میں اپنی ساکھ کی بہت فکر رہتی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ پڑوسی ہی ہوتے ہیں جو بیویوں کو شوہروں کی قبل از شادی کی سرگرمیوں سے آگاہ کر کے ان کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرتے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک طرف ہو کر ایلس کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ ''پلیز، تم اندر آجاؤ۔''

وہ اندر آگئی اور خود کچن میں میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ جون نے اس کے سامنے سادہ پانی کا ایک گلاس رکھا جو وہ ایک سانس میں چڑھا گئی۔ ایک منٹ بعد اس کے تاثرات کسی قدر نارمل نظر آنے لگے تھے، اس نے معذرت کی۔ ''سوری، میں جذباتی ہو گئی تھی۔''

''میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' جون نے کہا۔ ''اگر تمہیں کسی جون مائلو سے ملنا ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم مجھے نہیں جانتے؟'' ایلس نے کسی قدر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

جون نے سرد آہ بھری۔ ''کاش کہ یہ جھوٹ ہوتا اور میں تمہیں جانتا لیکن یہ تکلیف دہ سچ ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا۔''

ایلس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم جون مائلو ہو اور مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو؟''

''اس لیے کہ میں تمہیں سچ مچ نہیں جانتا... لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم جون مائلو کو کیسے جانتی ہو۔ کیا اس سے ملی ہو؟''

''نہیں میری ہمیشہ اس سے اسکائپ پر بات ہوئی ہے۔'' ایلس بولی۔ ''میں وایومنگ سے آئی ہوں۔''

جون دنگ رہ گیا۔ ''تم تقریباً ایک ہزار میل دور سے آئی ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جون مائلو کون ہے؟''

''وہ دراصل میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' ایلس نے ہچکچا کر کہا۔

جون کو اس معصوم لڑکی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ ''اگر تم مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ جون سے تمہاری بات کیسے ہوئی اور یہاں تم نے مجھ تک آنے کی غلطی کیسے کی تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

ایلس کا تعلق وایومنگ کے ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا۔ اس کی عمر ابھی صرف اٹھارہ برس تھی۔ ایک سال پہلے ہائی اسکول پاس کرنے پر اس کے باپ نے اسے آئی فون گفٹ کیا۔ وہ بہت امیر نہیں تھے۔ ایلس کا باپ ایک گیس اسٹیشن پر کام کرتا تھا۔ اس کے چھ بچے تھے اس لیے بس گزارہ ہوتا تھا۔ ایلس تیسرے نمبر پر تھی اس سے دو بڑے بھائی اٹھارہ سال کے ہوتے ہی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایلس کو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ سے محبت تھی۔ وہ انہیں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس نے باپ کی مدد کے لیے ایک ریستوران میں جاب کر لی۔ فارغ وقت میں اس کا مشغلہ اسکائپ پر دوستوں سے چیٹ کرنا تھا۔ ایک دن اسے جونی بوائے کی طرف سے فرینڈ ریکوئسٹ ملی۔ ایلس کو یہ نام اچھا لگا، اس نے جونی بوائے کو ایڈ کر لیا اور پھر اس سے اسکائپ پر بات ہونے لگی۔ وہ اپنی ویڈیو نہیں دیتا تھا، اس کی جگہ اس نے تصویر لگا رکھی تھی۔ وہ باتیں بہت اچھی کرتا تھا، اس کے لہجے میں ایسی محبت اور مٹھاس ہوتی تھی

کہ کوئی لڑکی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی خاص طور سے اگر وہ ایلس جیسی سیدھی سادی لڑکی ہو۔

جونی بوائے نے اسے یہی بتایا کہ وہ لاس اینجلس کے پاس ایک ساحلی قصبے میں رہتا ہے۔ وہ ایک فرم میں جاب کرتا ہے لیکن اس نے فرم کا نام اور جاب کے بارے میں نہیں بتایا۔ البتہ اس نے اپنا اصل نام بتایا تھا اور یہ نام جون مائلو تھا۔ اس نے تصویر بھی جون مائلو کی لگا رکھی تھی۔ دو مہینے تک اس کی ایلس سے بات چیت رہی اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس وقت ایلس کا خیال تھا کہ وہ جونی کو پسند کرتی ہے لیکن اس کے غائب ہونے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی اور اس کے یوں غائب ہونے پر پاگل سی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آئی فون پر اسکائپ ہمہ وقت آن رکھتی تھی لیکن کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اگر کوئی اسے کال کرتا تو اس کا جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ بس جونی کا انتظار کرتی تھی۔ اسے مسلسل آف لائن میسیج کرتی رہتی تھی۔ مگر وہ نہ تو آن لائن آتا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے کسی میسیج کا جواب دیا تھا۔

''جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو تم نے کیا کیا...؟''

''میں نے اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔'' ایلس بولی۔ ''میں اسے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک آئی ہوں۔''

''لیکن مجھ تک کیسے پہنچیں؟''

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''میں نے جون مائلو کا نام سرچ کیا تو اسکائپ پر تم سامنے آ گئے۔ تمہاری پروفائل میں سب درج تھا تمہارا نام، کمپنی اور گھر کا پتا بھی موجود تھا۔''

''اس میں میرا فون نمبر ہے۔'' جون نے کہا۔ ''تم ایک کال کر کے مجھ سے تصدیق کر لیتیں تو اتنا لمبا سفر کرنے سے بچ جاتیں۔''

ایلس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے صرف تم سے بات نہیں کرنی تھی بلکہ تم سے ملنا بھی تھا۔''

جون اب اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا۔ ''میرا خیال ہے مجھ سے اتنی دیر بات کر کے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں وہ جونی بوائے نہیں ہوں۔ میری آواز یقیناً اس سے مختلف ہے۔''

ایلس ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''سچی بات ہے میں ابھی تک کنفیوژ ہوں کیونکہ تمہاری آواز اس سے بہت ملتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ تم ذرا تیز بولتے ہو اور وہ رک رک کر پُر تاثر انداز میں بات کرتا تھا۔''

''وہ جو تصویر لگائی تھی اس نے...''

''وہ ایک لڑکے کی تھی اس نے بعد میں خود بتا دیا تھا کہ تصویر اصل نہیں ہے۔''

''کیا اس نے تمہیں کبھی ملاقات کے لیے کہا؟''

''ہاں ایک بار کہا تھا اس نے بتایا کہ وہ ورجینیا آئے گا لیکن عین موقع پر اس کا سفر ملتوی ہو گیا۔''

اگلا سوال کرتے ہوئے جون ہچکچایا تھا۔ ''اس نے تمہیں اسکائپ پر دیکھنے کی فرمائش کی... میرا مطلب ہے کچھ خاص انداز میں... تم سمجھ رہی ہو نا؟''

ایلس کا سرخ ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ رہی ہے۔ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں اس نے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی اور کرتا تو میں نہیں مانتی۔''

''دو مہینے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا؟''

''ہاں اس کے بعد سے اس سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا ہے۔''

''اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''سات مہینے اور بارہ دن ہو گئے ہیں۔'' ایلس نے دن بھی گن رکھے تھے۔ وہ واضح طور پر اس کے ساتھ بہت زیادہ انوالو ہو گئی تھی۔

جون ایلس کے مسئلے میں ایسا کھویا تھا کہ کام پر جانے کا بھول ہی گیا۔ اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی۔ دوسری طرف اس کا ایک کسٹمر تھا، اس نے خفگی سے کہا۔ ''جون کہاں مر گئے، ہو اب کیا میں سارا دن تمہارے انتظار میں بیٹھا رہوں، وہاں تھیٹر والے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔''

یہ ایک تھیٹر منیجر تھا، جون نے اسے تسلی دی۔ ''بس میں آ رہا ہوں۔'' فون رکھ کر اس نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ''ابھی تو میں کام پر جا رہا ہوں واپس آ کر تمہارا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا، یہ بتاؤ کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟''

''میں... کہیں نہیں۔ بس سے اتر کر سیدھی یہیں آئی ہوں۔''

جون نے گہری سانس لی۔ ''اوکے اگر تم چاہو تو یہیں ٹھہر سکتی ہو ایک شریف آدمی ہوں اور تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

ایلس نے سر ہلایا۔ ''تم کب تک واپس آؤ گے؟''

''تقریباً پانچ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا، دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا، میرا نمبر ہے نا تمہارے پاس؟'' جون نے اسے بیڈ روم دکھایا۔ ''تم آرام کر سکتی ہو۔ اگر بھوک لگے تو کچن میں بہت کچھ ہے اور اگر کہیں باہر جانا ہو تو بس دروازہ کھینچ کر لاک کر جانا۔''

جون عجلت میں روانہ ہوا آج ویسے ہی دیر ہو گئی تھی۔ اتوار کے دن لوگ تفریحات کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ یادہ دیر اس کا انتظار نہیں کر سکتے تھے صرف دو لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسے چابی دے رکھی تھی اور وہ کسی وقت بھی جا کر ان کے لان میں کام کر سکتا تھا۔ جبکہ تین گھروں میں اسے مکینوں کے ہوتے ہوئے کام کرنا پڑتا تھا وہ پہلے ان کے گھر جاتا تھا۔ ویسے وہ اپنے کام سے لطف اندوز ہوتا تھا اور بہت دل لگا کے کام کرتا تھا لیکن آج وہ الجھا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کے مسئلے کا کیا حل نکالے اور وہ اسے صاف جواب بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ شروع کے تین گھر نمٹا کر اس نے ایک چھوٹے سے ریستوران میں لنچ کیا۔ باقی دو کام نمٹاتے سہ پہر کے تین بج گئے تھے۔

وہ گھر آیا دروازے کا لاک کھولتے ہوئے اسے خیال آیا کہ شاید ایلس جا چکی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا، اس نے ڈرتے ڈرتے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور ایلس کو سوتے پا کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے نہا کر جون کا نائٹ سوٹ پہن لیا تھا اور بے خبر سو گئی۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے گھوم کر ٹیرس میں آ گیا اور وہاں کاؤچ پر لیٹ گیا۔ سمندر کی طرف سے تیز ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی کچھ دیر میں وہ بھی سو گیا تھا۔ پھر ایلس کی چیخ نے اسے بیدار کیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شام ہو رہی تھی اور ایلس باہر آئی تھی۔ ''کیا... کیا ہوا؟''

''وہ میں باہر آئی تو اچانک تمہیں دیکھا۔'' ایلس بولی۔ ''تم ٹھیک سے نظر نہیں آئے تھے اور میں ڈر گئی۔''

''میں تھک گیا تھا اس لیے سو گیا۔'' جون نے کہا۔

''تمہارا مکان چھوٹا لیکن بہت خوب صورت ہے۔''

''واقعی۔'' جون خوش ہو گیا۔ ''یہ ٹیرس اور پول میں نے خود بنایا ہے۔ کھڑکیاں دروازے چینج کیے ہیں اور کلر بھی خود کیا ہے۔''

ایلس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''یہ سب تم نے خود کیا ہے۔ تم یقیناً ماہر کاری گر ہو۔''

''ہاں تعلیم کے دوران میں نے اس قسم کے کام بہت کیے تھے میں بہت اچھا گارڈنر بھی ہوں۔ اتوار والے دن میں لوگوں کے باغات کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔''

''جب تم جاب کرتے ہو تو پھر اتوار والے دن کیوں کام کرتے ہو؟''

جون اندر آیا، اس نے کچن کی روشنیاں جلائیں اور فریج کھول کر اندر سے بیئر کا ایک ٹن نکال کر ایلس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ جون میز پر بیٹھ گیا اور ایلس اس کے سامنے آ گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے پھر ایلس نے ہچکچا کر کہا۔ ''میرا خیال ہے مجھے چلے جانا چاہیے اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تمہارا شبہ ختم ہو گیا ہے؟''

ایلس نے گہری سانس لی۔ ''ہاں کیونکہ اتنی دیر میں مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ تم کیسے شخص ہو تم، کسی بھی لڑکی کو اس طرح دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس شخص نے یقیناً تمہاری آڑ لی ہے اور وہ تم سے واقف ہے۔''

جون سوچ میں پڑ گیا یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جس شخص نے اس کا نام اختیار کر کے ایلس کو دھوکا دیا ہے وہ یقیناً اس سے واقف ہو گا۔ تبھی تو اس نے ایلس کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ ایسا کون سا شخص ہو سکتا ہے۔ اس نے ایلس سے پوچھا۔ ''تم نے اس کے نک نیم سے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''اسکائپ پر کی تھی۔'' وہ بولی۔ ''لیکن اس کی پروفائل میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ ایسا شخص ہے جو دوسروں کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔''

ایلس نے سر ہلایا۔ ''مجھے لگتا ہے وہ لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتا ہے اور جب وہ محسوس کرتا ہے کہ لڑکی اس میں دلچسپی لینے لگی ہے تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔''

''تب وہ کوئی نفسیاتی مریض ہوا۔ ورنہ اس طرح بغیر کوئی فائدہ اٹھائے صرف کسی کو تکلیف دینا نفسیاتی مریضوں کا کام ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گیا ہو۔'' ایلس نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ''وہ بیمار ہو گیا ہو یا کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو؟''

''آٹھ مہینے بہت ہوتے ہیں اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہوا تھا تب بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔'' جون نے سوچ کر کہا۔ ''ایک دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے ممکن ہے وہ اب زندہ ہی...''

''نہیں پلیز۔'' ایلس نے بے ساختہ کہا۔

جون نے نظر جما کر اسے دیکھا۔ ''تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟''

''ہاں اور اس وقت تک کرتی رہوں گی جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔''

''یہ بات نوے فیصد کنفرم ہے کہ وہ تمہیں دھوکا دے

چکا ہے اب صرف دس فیصد اطمینان باقی رہ گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ تم کس طرح یہ اطمینان حاصل کرو گی۔"

ایلس نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم میری مدد نہیں کرسکتے میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔"

"میں۔" جون چونکا۔ "میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"دیکھو اس نے تمہارا نام استعمال کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کہاں رہتے ہو اور کہاں کام کرتے ہو۔"

"یہ بات تو اسکائپ استعمال کرنے والا ہر شخص جان سکتا ہے۔ میری پروفائل اوپن ہے۔"

"اس نے تمہارا نام ہی کیوں استعمال کیا؟" ایلس نے اصرار کیا۔

"ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔" جون نے کہا۔ "اس پر بعد میں سوچیں گے پہلے رات کے کھانے کا بندوبست کر لیں۔"

"کھانا تم خود بناتے ہو، میں نے دیکھا یہاں کچن میں سب کچھ موجود ہے۔"

"ہاں میں زیادہ تر گھر میں کھاتا ہوں۔" اس نے کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ بچت کے خیال سے گھر میں پکاتا ہے۔ اس نے فریج سے منجمد چکن نکالی۔ نیچے تازہ سبزیاں موجود تھیں۔ ایلس کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے جون سے کہا۔

"لاؤ میں بناتی ہوں، میں ریستوران میں بھی بناتی ہوں۔"

"تم کک ہو؟"

"سب تو نہیں لیکن چائنیز کھانے اچھے بناتی ہوں جب کوئی گاہک چائنیز کی فرمائش کرتا ہے تو میں بناتی ہوں۔" ایلس نے چکن سنک میں پگھلنے کے لیے رکھ دی۔ "تم چائنیز پسند کرتے ہو؟"

"بہت شوق سے لیکن مجھے بنانا نہیں آتا۔" جون نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بناتی ہو؟"

"بہت اچھا، میرا دعویٰ ہے تم نے ایسا چائنیز کبھی نہیں کھایا ہوگا۔"

کچن ایلس نے سنبھال لیا اور جون کرسی پر بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے تیزی اور نفاست سے کام کیا اور ایک گھنٹے بعد ڈنر میز پر تھا۔ شاشلک کے ساتھ اس نے سادہ چاول اور فرائی آلو بھی بنائے تھے۔ جون نے سفید وائن کی بوتل نکالی۔ ڈنر واقعی لذیذ تھا اور جون نے اس سے پہلے ایسا شاشلک نہیں کھایا تھا۔ اس کی تعریف سے ایلس خوش ہوگئی۔ ڈنر کے بعد اس نے جون سے کہا۔ "مجھے امید ہے میری آمد سے تمہیں جو کوفت ہوئی اس کا ازالہ ہوگیا ہوگا۔"

"کیا تم جا رہی ہو؟"

"ہاں اس وقت بھی یہاں سے گرے ہاؤنڈ کی بسیں گزرتی ہیں، مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

جون ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا تم رات کو رک جاؤ اور صبح چلی جانا... اتنی رات گئے جانا مناسب نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کسی بس میں جگہ مل جائے۔"

"ایسا تو صبح بھی ہوسکتا ہے۔"

"نہیں صبح زیادہ بسیں چلتی ہیں اور جگہ آرام سے مل جاتی ہے۔" جون نے کہا۔ "میں ڈیوٹی پر جاتے ہوئے تمہیں خود چھوڑ جاؤں گا۔"

"کیا یہ مناسب ہوگا میں نے تمہیں پہلے ہی پریشان کیا ہے؟" وہ ہچکچائی تو جون نے اصرار کیا۔

"ایک رات کی بات ہے میں نشست گاہ میں سو جاؤں گا۔"

وہ مان گئی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جون کا نائٹ سوٹ اسے بڑا تھا پاجامہ نیچے سے موڑنا پڑا تھا اور ہاف آستین اس کے کہنی سے نیچے آ رہی تھی۔ وہ اس لباس میں کسی قدر مضحکہ خیز لیکن دلکش لگ رہی تھی۔ جون نے دو تین بار اسے غور سے دیکھا تو وہ شرمائی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ جون نے کافی تیار کی اور دونوں ٹیرس میں آبیٹھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا خاصی سرد ہوگئی تھی۔ جون نے لکڑیاں جلانے کے لیے جگہ بھی بنائی تھی مگر ابھی اتنی سردی نہیں تھی کہ لکڑیاں جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ ایلس نے کہا۔

"تم مجھے آئیڈیلسٹ لگتے ہو۔"

"میں ہوں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "شاید اس لیے کہ میں نے آئیڈیل لائف نہیں گزاری ہے۔"

"آئیڈیل لائف تو کوئی نہیں گزارتا۔" ایلس گھٹنوں پر چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ "کیا میں ایک خواب کے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہوں؟"

"یہ بھی آئیڈیل لائف نہ گزارنے کا نتیجہ ہے۔" جون نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی تک کر نہیں پایا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

جون اسے بتانے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ بات طویل تھی کافی ختم ہوئی تو وہ اندر سے برانڈی کی بوتل اور گلاس لے آیا۔ ایلس ہچکچائی لیکن پھر اس نے گلاس قبول کر لیا۔ بات ختم کرتے کرتے وہ بوتل تقریباً ختم کر چکے تھے۔ ایلس نے بوجھل ہو جانے والی آنکھیں اٹھائیں۔ "تم وقت ضائع کر رہے ہو تمہارے پاس پچاس ہزار ڈالرز ہیں تم ان سے کچھ کرو، ایسا نہ ہو کہ جب تم ڈگری لو تو تمہیں پتا چلے کہ اس ڈگری کی ویلیو ختم ہو چکی ہے۔"

"میں جو ڈگری لے رہا ہوں اس کی ویلیو کبھی ختم نہیں ہوگی۔" جون نے یقین سے کہا۔

"تب ممکن ہے اس کی اہمیت ختم ہو جائے اور تم جو آمدنی سوچ رہے ہو وہ تمہیں نہ ملے۔"

جون چڑ گیا۔ "ضروری نہیں ہے کہ آدمی ناکام رہے بہت سارے لوگ جو سوچ کر جدوجہد کرتے ہیں وہ اسے حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ تم بھی تو ایک موہوم سی امید پر ایک ہزار میل دوڑی آئی ہو۔"

ایلس کھسیا گئی پھر اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آخر میں وہ رودی جون بوکھلا گیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

ایلس روتی رہی، جون اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب کوشش کرتے کرتے سو گیا تھا۔ ایلس اس سے پہلے ہی کاؤچ پر سو چکی تھی۔ صبح سورج کی تیز روشنی پھیلی تو جون کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نو بج رہے تھے یعنی دفتر جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ ایلس کاؤچ پر سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ رات خاصی سردی تھی لیکن انہیں نشے کی زیادتی میں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ پر پانی مارا اور پھر کافی کا پانی رکھ دیا۔ اس نے دفتر فون کر کے طبیعت خرابی کی اطلاع دی اور مزید دو دن دفتر نہ آنے کا اعلان کیا۔ کافی لے کر وہ ایلس کے پاس آیا جو کاؤچ پر کسمسا رہی تھی۔ اس نے شکریے کے ساتھ کافی لے لی۔ "اتنی صبح ہوگئی پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں آج میں دفتر نہیں جاسکا۔"

وہ اٹھ بیٹھی۔ "مجھے بس مل جائے گی؟"

"بس تو مل جائے گی لیکن میرا خیال ہے جب تم یہاں تک آگئی ہو تو جون مائلو کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے کس طرح تلاش کرسکتی ہوں جبکہ میں سوائے نام کے اور کچھ نہیں جانتی۔"

"تم نہیں اسے ہم تلاش کریں گے۔" جون نے کہا۔ "یہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔"

ایلس کا چہرہ دمکنے لگا۔ "تم سچ مچ میری مدد کرو گے؟"

جون نے سر ہلایا۔ "میں نے تین دن کی چھٹی لے لی ہے اور ہم مل کر جون مائلو کو تلاش کریں گے۔"

ایلس مارے جوش کے اس کے گلے لگ گئی۔ "میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کرسکتی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جون نے نرمی سے اس کی پشت تھپکی۔ "تم میری مہمان بھی ہو اس لحاظ سے یہ میری ذمے داری بنتی ہے۔"

"اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ لاس اینجلس کے کسی ساحلی قصبے میں رہتا ہے۔" جون نے لاس اینجلس کا ساحلی نقشہ نشست گاہ کی میز پر پھیلایا۔ "لاس اینجلس کے ساحل پر کوئی دو سو قصبے ہیں اور یہ سب شہر سے الگ ہیں۔"

"دو سو قصبے۔" ایلس نے فکرمندی سے کہا۔ "کیا تین دن میں دو سو قصبوں میں جون مائلو نامی شخص کو تلاش کیا جاسکتا ہے؟"

جون کے چہرے پر بھی فکرمندی نظر آئی لیکن پھر اس نے شانے جھٹکے۔ "کوشش تو کی جاسکتی ہے۔"

"ہم فون ڈائریکٹری سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔"

ایلس نے تجویز پیش کی تو جون نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس طرح کامیابی یا ناکامی دونوں مشکوک ہو جائیں گی آج کل لوگوں میں فکس فون لگانے کا رواج بہت کم رہ گیا ہے زیادہ تر لوگوں کے پاس سیل فون ہوتا ہے۔ اگر ہم نے کسی قصبے میں جون مائلو کو پا کر وہاں نہیں دیکھا تو ممکن ہے وہ ہم سے مس ہو جائے۔ اس لیے روایتی طریقۂ کار ٹھیک رہے گا۔ ہم ہر قصبے میں جائیں گے اور لوگوں سے پوچھیں گے۔"

ایلس نے لاس اینجلس کی ساحلی پٹی دیکھی۔ "یہ سو کلومیٹرز لمبی ہے کیا ہم روز واپس گھر آئیں گے؟"

"نہیں اتفاق سے مارک بیچ شمال کے آغاز میں ہے اور ہم یہاں سے شروع کریں گے اور جنوب کی طرف سفر کریں گے۔ جہاں رات ہوگی وہیں کسی موٹیل میں رک جائیں گے اور اگلی صبح اس سے آگے سے آغاز کریں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" ایلس خوش ہوگئی اس نے اپنے پرس سے بنڈل بنے نوٹ نکالے۔ "میرے پاس تین سو ڈالرز کی رقم ہے امید ہے یہ ٹرپ اتنی رقم میں پورا ہو جائے گا۔"

اس نے جس طرح یہ رقم نکالی تھی صاف ظاہر تھا یہ اس کی تمام جمع پونجی تھی۔ جون نے نوٹ لے کر واپس ایلس کے پرس میں ڈال دیے۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن..." ایلس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن جون نے اسے خاموش کرا دیا تھا۔

"اگر ضرورت پڑے گی تو میں تم سے لے لوں گا۔"

ان کے پاس تین دن تھے اس لیے جون نے فوری روانگی کی تیاری شروع کردی۔ اس نے اپنے چند پینٹ اور شرٹ کے جوڑے ایک بیگ میں رکھے۔ گاڑی کے عقبی حصے میں بیئر، پانی کی بوتلیں، چپس کے پیکٹ اور چاکلیٹ رکھی۔ احتیاطاً دو کمبل بھی رکھ لیے کہ انہیں کہیں رات کھلی جگہ گزارنی ہو تو مشکل نہ ہو۔ ایلس اس کی تیاری دیکھ رہی تھی۔ سامان رکھتے ہی وہ روانہ ہو گئے۔ ایلس نے کہا۔ ''تمہاری گاڑی اچھی ہے۔''

''ہاں۔'' جون نے بے دلی سے کہا۔ ''لیکن میں نئی اسپورٹس کار چاہتا ہوں۔''

''تم نے اسے بھی بہت اچھا بنا رکھا ہے۔'' ایلس نے اصرار کیا۔ ''دیکھنے میں یہ تقریباً نئی نظر آتی ہے۔''

''اچھا۔'' جون کسی قدر خوش ہو گیا کیونکہ آج تک کسی نے اس کی کار کی اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔

پہلا قصبہ مارک بیچ سے دو کلومیٹرز دور تھا۔ جون یہاں آتا رہتا تھا اور لوگ اس سے واقف تھے اس لیے فوراً پتا چل گیا کہ یہاں اس کا کوئی ہم نام نہیں رہتا۔ شام ہونے تک وہ کوئی تیس قصبے کھنگال چکے تھے۔ ایلس کو جلدی ہوتی تھی لیکن جون تسلی سے کام کرتا تھا۔ جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ اس نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے وہ اگلے قصبے کی طرف نہیں جاتا تھا۔ نو بجے انہوں نے ایک کیفے میں کھانا کھایا اور رات میں بارہ بجے چالیسویں قصبے تک پہنچے۔ دونوں تھک گئے تھے اس لیے جون نے یہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ اتنی رات گئے کسی سے معلوم کرنا آسان نہیں تھا اس لیے یہ کام صبح پر ملتوی کر کے اس نے ایک موٹیل میں کمرا لے لیا۔ اتفاق سے سنگل روم تھا اس لیے ایلس اس وقت تک کار میں چھپی رہی جب تک موٹیل کے کلرک نے آکر جون کو کمرا نہیں دکھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد جون نے اشارہ کیا اور ایلس بھاگ کر کمرے میں گھس آئی۔ اس کا چہرہ مارے ہنسی کے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی وہ بلند آواز سے ہنسنے لگی۔ جون نے بوکھلا کر کہا۔

''چپ ہو جاؤ، اس نے سن لیا تو آ کر دونوں کو باہر نکال دے گا۔''

ایلس خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''بہت مزہ آرہا ہے، ہم نے کس طرح اسے بیوقوف بنایا ہے۔''

کمرے میں ایک ہی سنگل بیڈ اور ایک چھوٹا صوفہ تھا اس لیے جون کار سے کمبل لایا اور قالین پر لیٹ گیا۔ اتنی دیر میں ایلس سو چکی تھی۔ صبح اچانک ہی صفائی والی میڈ آ گئی تو جون نے جلدی سے ایلس کو اٹھا کر واش روم میں دھکیل دیا اور پھر کمبل بستر پر رکھ دیا۔ میڈ نے اندر آ کر مشکوک نظروں سے کمبل کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد ایلس باہر آئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک ہی لباس لے کر آئی تھی۔ رات اسی میں سوئی تھی۔ جون نے تیار ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک نائٹ ڈریس ضروری ہے۔''

اس قصبے سے وہ ناشتا کر کے اور جون مائلو کا پوچھ کر نکل گئے۔ راستے میں ایک سپر اسٹور پر رک کر جون نے ایلس کے لیے ایک سوتی پاجامہ اور ہلکی ٹی شرٹ لی، یہ رات کا آرام دہ لباس تھا جو آسانی سے اس کے چھوٹے بیگ میں آ گیا۔ اس کی ادائیگی بھی جون نے کی۔ ایلس نادم ہو گئی۔ ''تم میرے لیے بہت کر رہے ہو۔''

''ارے نہیں...'' جون نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''یہ کوئی خاص نہیں ہے۔''

ایلس جذباتی ہو گئی۔ ''نہیں تم واقعی بہت کر رہے ہو اور تم نے مجھ سے اس کا صلہ بھی نہیں چاہا۔''

''مجھے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں ہے، خاص طور سے جو لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔''

''کاش...'' ایلس بولتے بولتے رک گئی۔

اس دن بھی انہوں نے کوئی چالیس کے قریب قصبے دیکھے۔ اتفاق سے انہوں نے جس قصبے میں رکنے کا فیصلہ کیا اس میں ایک ہی موٹیل تھا اور اس کے سارے کمرے بک تھے۔ بڑی مشکل سے موٹیل کے مالک نے جون کو اپنی کار موٹیل کی پارکنگ میں کھڑی کرنے کی اجازت دی۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر کسی گاہک نے اعتراض کیا تو اسے کار ہٹانا پڑے گی۔ یہ رات انہوں نے خاصی مشکل سے گزاری تھی۔ ایلس تو پچھلی سیٹ پر سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی تھی لیکن جون فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سوتا رہا تھا۔ صبح بڑی مشکل سے کار سے نکلا تھا۔ ایک ریستوران میں جا کر انہوں نے ناشتا کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک وہ مزید دو درجن قصبے دیکھ چکے تھے اب تک صرف ایک جگہ انہیں جون مائلو ملا تھا لیکن وہ ایک ستر سال کا نابینا بوڑھا تھا۔ ظاہر ہے وہ اسکائپ اور انٹرنیٹ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

''آج آخری دن ہے۔'' ایلس نے جون سے کہا۔

''یہ جگہ کتنی خوب صورت ہے۔'' جون نے ان سنی کر کے ہائی وے کے ساتھ چلتے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے، ہم کچھ دیر کے لیے یہاں رک جاتے ہیں۔'' جون نے گاڑی ساحل کی طرف موڑ لی۔ ساحل کی سفید ریت سے پہلے بہت ہری سبز گھاس تھی جس

میں رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ جون نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ''تیراکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے ہو۔''

''اگر تمہیں یہ فکر ہے کہ آج آخری دن ہے اور جون مائلو نہیں ملا ہے تو فکر مت کرو ہم آخر تک جائیں گے اور تمام قصبے دیکھیں گے۔''

''لیکن تم نے تین دن کی چھٹی لی ہے۔''

''چھٹی مزید لی جا سکتی ہے۔''

''اور جاب...''

''جاب گئی بھاڑ میں۔'' جون کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ کار سے اتر کر ساحل کی طرف چل پڑا۔ ایلس تیزی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

''جون میری بات سنو آئی ایم سوری... پلیز ناراض مت ہو... جو تم کہو گے میں وہی کروں گی۔''

جون کا موڈ اچھا ہو گیا۔ ''بس تو ٹھیک ہے ہم یہاں پکنک منائیں گے اور پھر آگے جائیں گے۔''

سمندر کا پانی نہایت شفاف اور کسی قدر سرد تھا۔ جون کو حیرت تھی کہ یہ جگہ لوگوں سے کیسے بچی ہوئی تھی ورنہ لاس اینجلس کا ہر اچھا ساحل لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ شاید یہ جگہ شہر سے دور تھی۔ جون نے تیراکی کے لیے ایلس کی طرف دیکھا تو وہ شرماتے ہوئے تیراکی کے لباس میں آ گئی تھی۔ یہاں لہریں کم تھیں کیونکہ آگے ریف کی چٹانیں تھیں اور زیر آب بہت خوب صورت مناظر تھے۔ جون اس کا ہاتھ تھام کر اسے کسی قدر گہرے پانی میں لے گیا اور وہ غوطہ خوری کرنے لگے۔ وہ سانس روک کر کچھ دیر زیر آب تیرتے رہتے اور جب سانس روکنا مشکل ہو جاتا تو باہر آ کر دوبارہ سانس لے کر نیچے آ جاتے۔

ایلس کو تیراکی آتی تھی لیکن اس نے کبھی غوطہ خوری نہیں کی تھی اور سمندر میں تیراکی کا اتفاق بھی کم ہوا تھا۔ اگر جون نہ ہوتا تو وہ غوطہ نہیں لگا سکتی تھی۔ جب وہ تھک گئے تو پانی سے باہر آتے ہوئے بہت خوش تھے۔ ایلس یوں خوش تھی کہ اس نے پہلی بار سمندر کے اندر کی خوب صورتی دیکھی تھی، غوطہ لگانے کی سنسنی الگ تھی اور جون اسے دیکھ کر خوش تھا۔ وہ دونوں آتی جاتی لہروں کے ساتھ ساحل پر لیٹ کر سستانے لگے۔

''مزہ آیا؟'' جون نے پوچھا۔

''بہت... لیکن بھوک لگ رہی ہے۔''

یہ حقیقت ہے

غزوۂ بدر میں حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو کنواں کھودنے کا مشورہ دیا جسے نبی ﷺ نے پسند فرمایا اور ان کو ''صائب الرائے'' کا لقب ملا تھا۔

+++

نبی کریم ﷺ نے غزوہ خندق میں حضرت زبیر بن العوامؓ کے لیے فرمایا ''میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔

+++

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو نہ تو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی اور نہ ہی کسی اور نے بلکہ وہ خود نبی کریم ﷺ میں نبوت کی نشانیاں پا کر مسلمان ہوئے۔

+++

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی گود میں بعض اوقات بلی کا بچہ رہتا تھا اسی لیے لوگوں نے ان کو ابو ہریرہ (بلی کا باپ) کہنا شروع کیا۔ ان کا اصل نام ایک قول کے مطابق عبدالرحمن بن صخر تھا۔

+++

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔''

+++

ابن رشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی صرف دو راتیں مطالعے کے بغیر گزریں ایک شادی کی رات اور دوسری موت کی رات۔

+++

مشہور سائنس دان نصیر الدین طوسی 18 برس مسلمانوں کے بدترین اور سفاک دشمن ہلاکو خان کا وزیر رہا تھا۔

+++

بوعلی ابن سینا کی کتاب ''القانون فی الطب'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کسی طبی کتاب کا مطالعہ اس قدر نہیں ہوا جتنا اس کا ہوا ہے۔

+++

سلطان شمس الدین التمش کو اس کے بھائیوں نے بچپن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح باپ سے غیر معمولی محبت کی وجہ سے غلام بنا کر بیچ دیا تھا۔

+++

''ٹھیک ہے لیکن پہلے تیراکی کا ایک دور اور ہو جائے پھر ہم لنچ کریں گے۔ میں پزا اور بیئر لایا ہوں۔''

ایلس نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''یعنی تمہارا پہلے ہی ارادہ تھا؟''

''ہاں تین دن تک اپنی ہی تلاش نے تھکا دیا تھا۔ اب میں نے سوچ لیا تھا کہ آج انجوائے کروں گا اور آرام کروں گا۔''

''تم سچ مچ کام پر...''

جون نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''اب تم اس بارے میں کوئی بات نہیں کروگی۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' ایلس مان گئی۔

سارے دن انہوں نے وقفے وقفے سے تیراکی کی۔ دوسرے دور کے بعد انہوں نے پزا اور بیئر سے لنچ کیا اور کچھ دیر آرام کیا۔ شام تک وہ تھک گئے تھے اور تیز دھوپ نے سمندری آب و ہوا کے ساتھ مل کر ان کے جسم جلا دیے تھے ان کے پاس سن بلاک لوشن نہیں تھے۔ ایلس کی جلد زیادہ نازک تھی اور اسے جلن ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ جون نے کہا۔ ''ہم راستے سے جلن مٹانے والا لوشن لے لیں گے۔ تم کل تک ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''پلیز آج کسی موٹیل میں رکنا۔'' ایلس نے التجا کی۔ ''کار میں سونا بہت مشکل ہے۔''

''اس کے لیے ہمیں جلدی چلنا ہوگا۔'' جون نے کہا۔ ''دیر ہونے کی وجہ سے موٹیل کے سارے کمرے بھر جاتے ہیں۔''

''اس طرح ہم زیادہ قصبے نہیں دیکھ سکیں گے۔'' ایلس نے کہا مگر اس کا انداز فکر انگیز نہیں تھا۔

''میں نے کہا نا آج آرام کا دن ہے۔'' جون نے آخری بار سمندر کا رخ کرتے ہوئے کہا تاکہ جسم سے ریت صاف ہو جائے۔ ایلس نے اس کا ساتھ دیا اور پھر کار تک آ کر انہوں نے کپڑے پہنے۔ ان کے بال کھارے پانی سے الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے راستے میں ایک اسٹور سے جلد کی جلن مٹانے والا لوشن لیا۔ رات ہونے تک وہ ایک موٹیل پہنچ گئے تھے۔ جون نے اس بار ڈبل بیڈ کا روم لیا اور انہوں نے باری باری غسل کر کے کھارے پانی کے اثر سے نجات حاصل کی۔ دوپہر کا کھایا پزا کب کا ہضم ہو گیا تھا۔ موٹیل میں ڈائننگ روم بھی تھا۔ انہوں نے وہیں ڈنر کیا۔ ایلس کا بازو، شانے اور پشت کی کھال زیادہ متاثر ہوئی تھی اور آبلے کی طرح سرخ ہو گئی تھی، اس کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں آ کر جون نے اسے لوشن لگایا اور وہ لباس بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ جون نے تکیہ اور کمبل لیا اور قالین پر دراز ہو گیا۔ تھکن کی وجہ سے وہ دیر تک سوتے رہے۔ پھر ایلس نے اسے بیدار کیا۔

''بس اب اٹھ جاؤ۔''

''تم کیسی ہو؟'' جون نے پوچھا تو اس نے اپنا مرمریں بازو آگے کر دیا جس پر سرخی بہت کم رہ گئی تھی۔

''تقریباً ٹھیک ہوں۔''

گزشتہ دن کی تلافی کے لیے جون نے اس دن زیادہ تندہی سے راستے میں آنے والے قصبوں میں جون مائلو کو تلاش کیا۔ سارے دن میں انہیں ایک ہی جون مائلو ملا اور یہ چار سال کا بچہ تھا۔ جب وہ اس قصبے سے روانہ ہوئے تو جون نے مسکرا کر کہا۔ ''لگتا ہے ہمیں مطلوبہ جون مائلو نہیں ملے گا بوڑھے یا بچے ہی ملیں گے۔''

''ینگ جون مائلو مل گیا ہے۔'' ایلس نے اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن وہ مطلوبہ جون مائلو نہیں ہے۔'' جون ہنسا۔

ایلس نے جواب نہیں دیا وہ کار کے باہر سے گزرنے والے مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ تین چوتھائی قصبے دیکھ چکے تھے اور اب ایک چوتھائی باقی رہ گئے تھے۔ جون کہہ رہا تھا کہ اگر ان میں بھی جون مائلو نہیں ملا تو...؟

''تو کچھ نہیں۔'' ایلس نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ ''میں سمجھوں گی میری تقدیر میں نہیں تھا۔''

''یا ہماری کوشش میں خامی رہ گئی ہوگی۔''

''ایسا مت سوچو کوئی انسان جتنی کوشش کر سکتا ہے تم نے اس سے زیادہ ہی کی ہے۔'' ایلس نے اسے تسلی دی۔ ''میں تمہاری احسان مند ہوں تم سے شکایت نہیں ہے۔''

''اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں۔'' جون ہنسا۔

اس رات انہیں پھر سنگل روم ملا اور جون نے وہی ترکیب اختیار کی۔ ایلس چپکے سے کمرے میں پہنچ گئی۔ ڈنر انہوں نے راستے میں کر لیا تھا۔ جب ایلس نہا کر آئی تو جون قالین پر کمبل بچھا چکا تھا۔ ایلس نے اس سے کہا۔ ''آج نیچے میں سوؤں گی تم بستر پر لیٹ جاؤ۔''

''نہیں بستر پر تم لیٹو اور ویسے بھی قالین پر سونے کا عادی ہوں گھر میں بھی اکثر نشست گاہ کے قالین پر سو جاتا ہوں۔''

اس کے مجبور کرنے پر ایلس اوپر لیٹ گئی۔ یہ دن بھی

بہت مصروف تھا اور وہ دونوں تھک گئے تھے لیکن انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ کل آخری دن تھا۔ اس کے بعد انہیں بچھڑ جانا تھا۔ ایلس نے بیڈ کے کنارے اوندھے منہ لیٹ کر پوچھا۔ ''جون تم نے میرے لیے یہ سب کیوں کیا؟... سچ سچ بتانا...''

جون کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''سچ یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا... میری زندگی میں کسی دوسرے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے اپنے لیے گزرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں تمہارے لیے گنجائش کیوں نکل آئی۔''

''تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

''ویسی نہیں جیسی تم نے جون مائلو سے کی ہے۔ اس کے لیے سب چھوڑ کر ایک ہزار میل دور چلی آئیں۔''

''پتا نہیں وہ مجھے ملتا بھی ہے یا نہیں...'' ایلس کے انداز میں مایوسی تھی۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے میں اسے نہیں پا سکوں گی۔''

''اس کا فیصلہ کل کا دن کرے گا۔'' جون نے اس کی طرف دیکھا۔

ایلس نے گہری سانس لی۔ ''ہاں کل فیصلے کا دن ہے، میں اپنی محبت کو حاصل کر لوں گی یا اسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔''

اس رات وہ دونوں ہی دیر سے سوئے تھے۔ لیکن دوسرے کو ایسا جتاتے رہے جیسے انہیں نیند آ گئی ہے۔ صبح وہ چپ تھے بات کرنا چاہتے تھے لیکن یوں بولتے بولتے رک جاتے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کیا بات کریں۔ وہ بے دلی سے تیار ہوئے اور ناشتا کر کے قصبے میں نکل آئے۔ اس سے پہلے کہ جون تلاش شروع کرتا اچانک ایلس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے جون مائلو نہیں ملے گا اس نے مجھے دھوکا دیا ہے، اس نے سب جھوٹ بولا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے ہمیں اس کی تلاش ترک کر دینی چاہیے؟''

ایلس نے سر ہلایا۔ ''ہاں کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''لیکن اب آخری مرحلہ ہے اسے بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ آخر تم اتنی دور سے اسے تلاش کرتی آئی ہو۔''

ایلس سوچ میں تھی پھر اس نے تذبذب سے کہا۔ ''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں اس کے لیے اب میرے جذبات وہ نہیں رہے ہیں اس لیے اگر وہ مل بھی جائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اگر وہ نہ ملا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

خوف

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی اور چند دنوں میں زمین کے اندر دبی اشیا باہر نکل آئیں گی۔''

''یا اللہ خیر۔'' دوسرے نے بدحواس ہو کر کہا۔ ''میری تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔''

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:

''میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں میں چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے نہیں پاتے۔''

☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمۂ حلال میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے لقمۂ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ تونگری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے لوگ اسے شکم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

بے بسی

ایک مرتبہ امام شافعیؒ ایک خلیفہ کے پہلو میں تشریف فرما تھے کہ ایک مکھی خلیفہ کو پریشان کرنے لگی اس پر خلیفہ نے تنگ آ کر کہا۔ ''نہ جانے اس مکھی کے پیدا کرنے میں خدائے بزرگ و برتر کی کیا حکمت عملی تھی۔''

امام شافعی نے جواب دیا۔ ''اس میں حکمت یہ ہے کہ طاقتوروں کو ان کی طاقت کی بے بسی دکھائے۔''

مرسلہ: ماہا ایمان...... حافظ آباد

جون اسے دیکھنے لگا۔ ”یہ تمہاری مایوسی ہے یا تمہاری خواہش ہے؟“

”جو تم چاہے سمجھ لو مگر اب میں اسے تلاش نہیں کرنا چاہتی، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“

جون نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تمہاری مرضی... میں اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتا۔ میں تمہاری خواہش پر جون مائکو کو تلاش کررہا تھا اور اب تمہاری خواہش ہے کہ میں ایسا نہ کروں تو مجھے اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

ایلس افسردہ نظر آنے لگی۔ ”تم مجھے کسی نزدیکی بس اسٹاپ پر اتار دو جہاں سے مجھے وایومنگ جانے والی بس مل جائے۔“

جون نے اسے پیش کش کی۔ ”کیا حرج ہے اگر تم میرے ساتھ چلو، بسیں تو مارک بیچ سے بھی بہت گزرتی ہیں؟“

ایلس مان گئی اور انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ خاموشی مزید گہری ہوگئی تھی۔ خاصی دیر بعد جون نے کہا۔ ”کیا تمہیں واقعی فرق نہیں پڑتا اگر تمہیں جون مائکو مل جاتا؟“

”ہاں میں اندر سے ایسا ہی محسوس کررہی ہوں۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”جب میں نے یہ بات محسوس کرلی تو اس کی تلاش بے کار تھی اب اس کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔“

”اور اگر وہ تم سے اسکائپ یا فون پر رابطہ کرتا ہے تو...؟“

”میں اسے بتا دوں گی کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“... ایلس اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”پلیز اب کوئی اور بات کرو... تمہارے دفتر سے کوئی فون نہیں آیا؟“

جون نے جیب سے اپنا آئی فون نکالا۔ ”میں نے تین دن پہلے فون بند کر دیا تھا، اب تک بند ہے۔“ اس نے موبائل آن کیا۔ ”کال تو دفتر والوں نے بہت کی ہوں گی۔“

آدھے گھنٹے بعد ہی موبائل نے بیل دی۔ جون نے اسکرین دیکھی اور کراہا۔ ”میرے خبیث باس کا فون ہے اب کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔“

جون نے گاڑی ایک طرف روک کر کال ریسیو کی اور بیمارسی آواز بنا کر بولا۔ ”ہیلو...“

”جون، میں ریکر ہوں۔ تم تین دن سے کہاں غائب ہو؟“

”مجھے فلو ہوگیا تھا حالت بہت خراب تھی۔ اب جا کر بہتر ہوئی ہے۔“

”تو سیل فون کیوں بند کیا ہوا تھا؟“ وہ برہمی سے بولا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی ڈاکٹر نے مستقل آرام کا کہا تھا۔ اس لیے سیل آف رکھا تھا۔“ جون نے آواز میں مزید نقاہت پیدا کر کے کہا اور اس کی بدقسمتی کہ اسی وقت ایک بڑا ٹرالر پاس سے اپنا بھیانک ہارن دیتا ہوا گزرا۔

”خوب! تم ہائی وے پر آرام کررہے ہو۔“ ریکر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”دفتر آتے وقت اس ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ لیتے آنا جس نے تمہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔“

کال کٹ گئی اور جون نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اس خبیث ڈرائیور کو ہارن دینا ضروری تھا؟“

ایلس پریشان ہوگئی۔ ”کیا تمہارا باس تمہیں جاب سے نکال دے گا۔“

جون نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس نے ایلس سے کہہ دیا تھا لیکن اندر سے اسے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کل ملازمتوں کا بحران چل رہا تھا اور زیادہ کم بختی درمیانے درجے کے افسران کی آتی تھی۔ اگر اسے یہاں سے نکال دیا جاتا تو دوسری ملازمت آسانی سے نہیں ملتی اور اس کا اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ جاتا۔ ایلس اس کے انکار کے باوجود بھانپ گئی تھی، اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”تم نے نہیں کہا تھا میں نے خود تمہاری مدد کا فیصلہ کیا تھا۔“ جون نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا اور اگر کچھ ہوا تو...“

”تو کیا...؟“

”تب دیکھیں گے ابھی سے فکر مند ہونے سے فائدہ۔“ جون بولا۔

مزید آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ مارک بیچ پہنچ گئے تھے۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر پتا چلا کہ وایومنگ کی طرف جانے والی بس شام چار بجے یہاں سے گزرے گی۔ ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ جون خوش ہوگیا۔ ”ابھی چار گھنٹے اور ساتھ رہ سکتے ہیں۔“

”ہاں۔“ ایلس نے بجھے لہجے میں کہا۔

”آج میں تمہیں اپنا بنایا ہوا لنچ کراؤں گا۔“ جون بولا۔

”مجھے یقین ہے تم بہت اچھا پکاتے ہو۔“ ایلس نے خود کو سنبھال لیا۔

وہ گھر آئے۔ لیٹر بکس میں ڈاک کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور

فون مشین میں درجنوں کے حساب سے پیغام موجود تھے اور یہ تقریباً سب ہی دفتر کی جانب سے۔ ڈاک کوئی خاص نہیں تھی سوائے ایک خط کے جو ایک بینک کی طرف سے آیا تھا اور اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ بعض وجوہات کی بنا پر اس کی لون کی درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ جون نے ایک گہری سانس لے کر ڈاک کا ڈھیر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ خط ایلس نے بھی دیکھ لیا تھا اس نے جون سے کہا۔ ”میں تمہیں پھر مشورہ دوں گی کہ ڈگری کا خیال چھوڑ دو اور ان پچاس ہزار ڈالرز سے کوئی کام شروع کردو۔“

”مثلاً کون سا کام؟“

”مثلاً یہی اپنا گھروں کی مرمت اور ری شیپ کا کام تم نے اپنا گھر اتنا اچھا بنا لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہیں کام آتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کرو اس میں کام بہت مل جاتا ہے۔ وقت بھی زیادہ نہیں لگتا اور آمدنی بھی ٹھیک ہوجائے گی۔“

جون نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں اس کام کا تجربہ ہے؟“

”مجھے تجربہ نہیں ہے میرے ایک انکل یہی کام کرتے ہیں۔ وہ میری ماما کے دور کے بھائی ہیں۔ پہلے وہ بھی تمہاری طرح جاب کرتے تھے اور پھر انہوں نے یہ کام شروع کردیا اور اب وہ اچھا کماتے ہیں۔“ ایلس نے بتایا۔ ”میرا خیال ہے لاس اینجلس میں اس قسم کا کام زیادہ ملے گا۔ یہ بڑا شہر ہے اور شو بزنس کی وجہ سے یہاں لوگوں میں دکھاوا بھی زیادہ ہے۔“

جون نے سر ہلایا۔ ”چلو تم نے میری ایک ٹینشن تو ختم کردی کہ کل مجھے جاب سے جواب مل گیا تو مجھے آگے کیا کرنا ہوگا۔“

”اگر تمہاری جاب چھوٹ گئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے؟“

”ان معنوں میں نہیں، میں اتوار والے دن کام کر کے جو کماتا ہوں گزارے کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ مگر میرے مستقبل کے خواب ختم ہوجائیں گے۔“

”مجھے افسوس ہے تمہارا یہ نقصان میری وجہ سے ہوگا۔“

”مجھے تمہارا افسوس ہے۔ یہ زیادہ بڑا دکھ ہے۔“ جون نے خلوص سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے یہ اس شخص کی بدقسمتی ہے جس نے تم جیسی لڑکی کو دھوکا دیا ہے۔“

”شاید اس کا قصور بھی نہیں ہے۔“ ایلس بولی۔

جون کچن میں آیا وہ کھانا بنانے میں لگ گیا تھا۔ ایلس اس کے ساتھ بیٹھی تھی اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔

ایلس نے پرس سے نکال کر سیل فون دیکھا اور اس کی پیشانی پر شکنیں آگئیں۔ وہ جون سے معذرت کرتے ہوئے لاؤنج سے باہر ٹیرس کی طرف نکل گئی۔ جون نے اتنا سنا وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”تم نے کال کیوں کی اب...“

پھر وہ ٹیرس پر نکل گئی اور دروازہ بند ہوگیا۔ جون نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا لیکن پھر اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ کسی کی فون کال سننے کی کوشش کرے۔ کچھ دیر بعد ایلس اندر آئی تو برہمی اس کے چہرے سے عیاں تھی جسے وہ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے موبائل پرس میں رکھ دیا اور فریج سے بوتل نکال کر پانی پیا۔ کچھ دیر بعد وہ اعتدال میں آگئی۔ جون نے نہیں پوچھا اس نے خود بتایا۔ ”ایک ایسے شخص کی کال تھی جسے میں اب ناپسند کرتی ہوں۔“

جون نے سر ہلایا اور میز پر برتن رکھنے لگا۔ ”شاید تم نے اسے جھاڑ دیا ہے۔“

”ہاں۔“ ایلس نے گہری سانس لی۔ ”اس نے میرا سر گھما دیا تھا۔ بہرحال لعنت بھیجو اس پر مجھے زور سے بھوک لگ رہی ہے۔“

”بس ایک منٹ۔“ جون نے ڈش نکال کر میز پر رکھی۔ انہوں نے کھانا شروع کردیا۔ جون نے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”واپس جانے کا۔“

”میرا مطلب ہے واپس جا کر کیا کروگی؟“

”اپنی جاب۔“ وہ بولی۔ ”میں صبح سے شام چار بجے تک ایک ہائی وے ریسٹوران میں کام کرتی ہوں۔ مجھے اچھی آمدنی ہوجاتی ہے۔ اس سے میرے باپ کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔“

”تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچا؟“

”سوچا تھا بھی تو یہاں تک آگئی تھی لیکن...“ وہ چپ ہوگئی۔

کھانے کے بعد ایلس نے برتن سمیٹ کر دھوئے۔ پھر وہ ٹیرس میں آبیٹھے۔ یہاں دھوپ تھی لیکن سمندر کی طرف سے آتی ہوا دھوپ کے اثر کو زائل کررہی تھی۔ دو بج گئے تھے وایومنگ کی بس دو گھنٹے بعد وہاں سے گزرتی۔ وہ دونوں کبھی بات کرتے اور کبھی خاموش ہوجاتے۔ کبھی جون ایلس سے کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا اور کبھی ایسا ہی ایلس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک بار وہ نم آنکھوں کے ساتھ واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ آخر جون نے گھڑی دیکھی اور چونکا۔ ”چار بجنے میں بیس منٹ ہیں۔“

ایلس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ پرس پہلے ہی اس کے

شانے سے لٹک رہا تھا۔ وہ دونوں جون کی کار میں بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوئے۔ دس منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ جون نے کار ایک طرف روک دی اور وہ بس اسٹاپ کے شیڈ تک آگئے۔ ایلس نے جون کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’میں تمہاری شکر گزار ہوں اپنی زندگی کے یہ چند دن میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔‘‘

’’اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے کام نہیں آسکا۔‘‘

’’لیکن مجھے خوشی ہے تم میرے کام نہیں آسکے۔‘‘ ایلس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اگر کبھی وایومنگ آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔‘‘

جون نے سر ہلایا۔ ’’میں کوشش کروں گا۔‘‘

کچھ دیر میں وایومنگ جانے والی بس وہاں آکر رکی اور ایلس جون سے گلے مل کر بس میں سوار ہوگئی۔ بس آگے روانہ ہوئی اور جب تک جون کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی وہ اسے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر کار کی طرف بڑھ گیا۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر اس نے ایلس کے سیل فون سے لیا تھا جب وہ واش روم گئی تھی۔ اسی نمبر سے اسے کال آئی تھی۔ جون نے یہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا تھا اور ایلس کے آنے سے پہلے اس کا سیل فون اسی طرح پرس میں رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ جون نے سیل کان سے لگایا۔ چند لمحے بعد ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ جون نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

’’جون مائلو...؟‘‘

’’بات کر رہا ہوں، تم کون ہو؟‘‘

’’جون ابھی تم نے کچھ دیر پہلے ایک لڑکی کو کال کی تھی تم اسے جانتے ہو؟‘‘

’’تم ایلس کی بات کر رہے ہو۔‘‘ جون مائلو نے شک سے کہا۔ ’’لیکن تم کون ہو؟‘‘

’’میں کوئی بھی ہوں۔‘‘ جون مائلو کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ’’میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے ایلس سے کیا بات کی ہے؟‘‘

’’تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟‘‘ جون کے لہجے پر اس کا انداز بھی جارحانہ ہوگیا۔

’’میں اس کا بوائے فرینڈ ہوں۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ جون مائلو کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ ’’تو وہ اب تمہارے پیچھے ہے ورنہ آٹھ مہینے پہلے وہ میرے لیے پاگل ہو رہی تھی۔‘‘

’’تم نے اسے دھوکا دیا...‘‘

’’مجھے ایلس میں دلچسپی نہیں تھی بس وقت گزاری کر رہا تھا لیکن کل میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تو اسے کال کردی۔ میری آواز سن کر اس نے اتنی سنائیں...‘‘

’’اس نے ٹھیک کیا۔‘‘ جون بولا۔ ’’اب اگر تم نے اسے کال کی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔‘‘

جون نے فون بند کر دیا پھر اس نے یک دم کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے روانہ ہوگیا۔ وہ ہر ممکن تیز رفتاری دکھا رہا تھا مگر کار اس کے خیال سے زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی اور اسے شدت سے اس پر غصہ آرہا تھا۔ مگر آدھے گھنٹے بعد جب اسے بس دکھائی دی تو اس کا غصہ سرد پڑ گیا تھا اس نے کار کو بس کے پاس لے کر ہارن دیا اور جب ڈرائیور نے نہیں روکی تو اس نے کار بس کے آگے لے جا کر اس کی رفتار کم کرنی شروع کی اور بالآخر کار روک دی۔ بس والا مسلسل ہارن دے رہا تھا۔ وہ نیچے اترا اور بس کے دروازے تک آیا ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا اور اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑا۔

’’سوری...‘‘ جون نے ایک لفظ میں اسے نمٹایا اور ایلس کی طرف بڑھا جو پہلے ہی اپنی نشست سے کھڑی ہوگئی تھی۔

’’جون یہ کیا حرکت ہے؟‘‘

’’ایلس۔‘‘ جون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’میں تم سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا... جب تم چلی گئیں تو مجھے احساس ہوا مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔‘‘

ایلس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ’’سچ کہہ رہے ہو؟‘‘

جون نے سر ہلایا۔ ’’سو فیصد سچ... میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

ایلس اس کے گلے لگ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد بس کے مسافروں نے تالیاں بجانا شروع کیں تو انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے نہیں تھے۔ وہ جھینپ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ جون نے کہا۔ ’’میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔ میں اپنے معاملات نمٹا کر ایک مہینے کے اندر تمہارے پاس آؤں گا۔‘‘

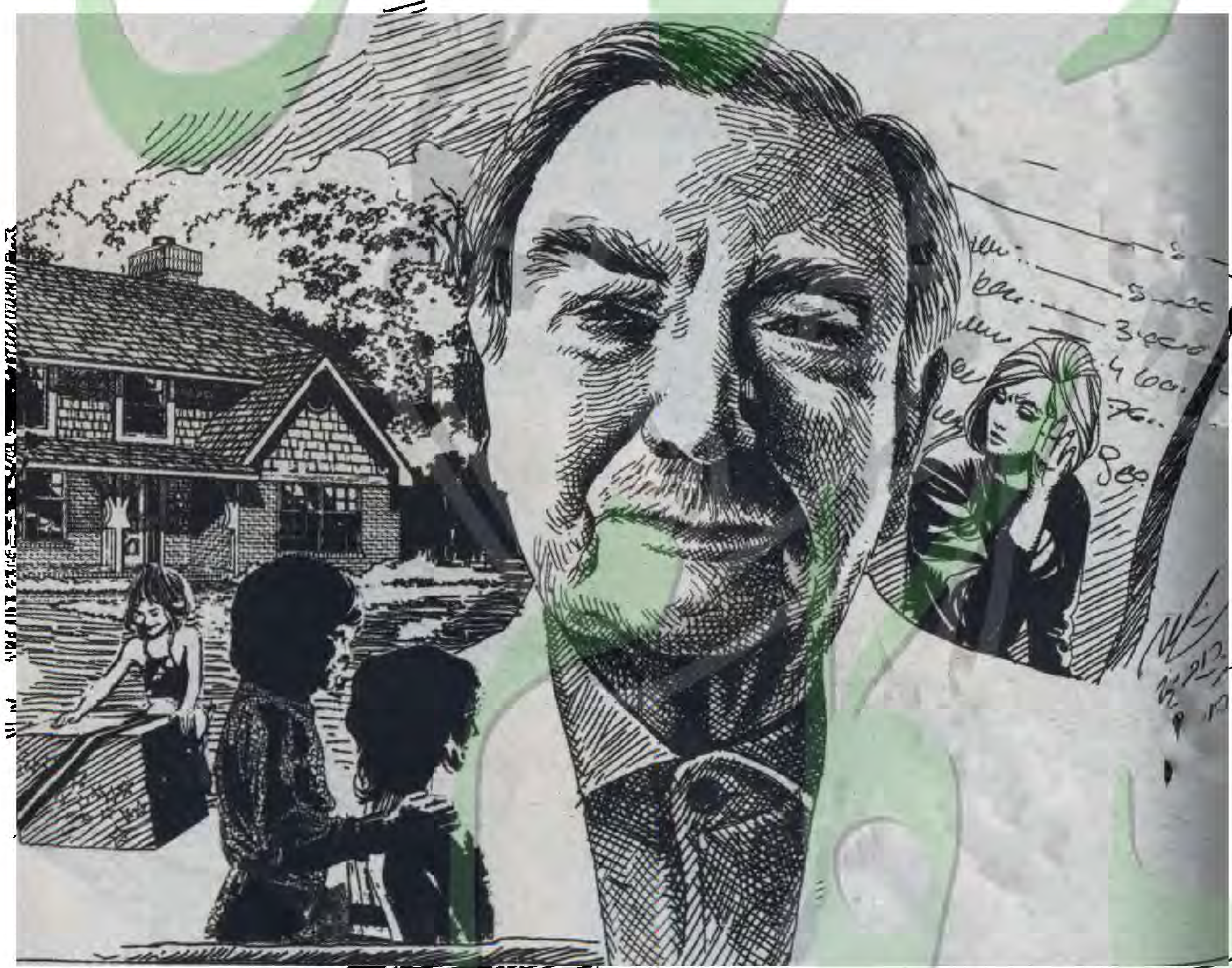
’’میں تمہارا انتظار کروں گی۔‘‘ ایلس نے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ جون نے اسے پیار کیا اور بس سے اتر گیا۔ بس آگے روانہ ہوگئی لیکن اب یہ جدائی کی روانگی نہیں تھی۔ جون نے جاتی بس کی طرف دیکھا، اسے نوکری پسند کی نہیں ملی، گھر بھی ویسا نہیں ملا جیسا وہ چاہتا تھا لیکن گھر والی ویسی مل گئی تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔

غلامی

تنویر ریاض

احساسات کی دنیا میں اگر جذبات کی روانی نہ ہو تو سمجھو انسان صرف آتی جاتی سانسوں کی تعداد مکمل کر رہا ہے مگر... اس ایک شخص نے اپنے بے حس معاشرے سے بغاوت کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ اصل زندگی احساسات اور جذبات کے بغیر نامکمل ہے... وہ اپنے گرد پھیلے خوب صورت رشتوں کے حصار میں لطف اندوز ہوتا رہا حتیٰ کہ محبت کی اس ادا کو معاشرے نے غلامی کا نام دے دیا۔

مغربی معاشرے کی بے حسی اور رشتوں کی ناقدری کا تکلیف دہ احساس



میری زندگی غیر متوقع واقعات وحادثات سے بھری پڑی ہے، ان کے بارے میں لکھنے بیٹھوں تو سیکڑوں صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے شاید اس لیے کہ میں بہت معصوم اور سیدھا سادا سا انسان ہوں حالانکہ ملازمت کے دوران میں میرے ساتھی مجھے بہت تیز اور ہوشیار سمجھا کرتے تھے جو کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتا اور ہر ایک کو خوش رکھنے کے فن سے واقف ہے لیکن میری نجی زندگی اس کے برعکس ہے۔

لوگ جان گئے ہیں کہ میں کسی کو ناراض نہیں کرسکتا۔ اسی لیے وہ میری معصومیت اور سادگی سے فائدہ اٹھا کر میری ہموار زندگی میں ہلچل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا جب میری بہو نے دنیا جہان کی محبت اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''ڈیڈی! کیا تم میرا ایک کام کردو گے؟''

''کیوں نہیں؟'' میں نے اپنی حسین اور اسمارٹ بہو گلوریا کے سراپے پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا جو تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ہمیشہ کی طرح دلکش اور تروتازہ نظر آرہی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مارٹن جیسے گاؤدی کو یہ پری کہاں سے مل گئی۔

''اگلے دو ہفتوں کے لیے میرا باس شہر سے باہر جارہا ہے اور اس کا سارا کام مجھے ہی دیکھنا ہوگا اس کے لیے میں ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکل جاؤں گی اور واپسی میں بھی دیر ہوسکتی ہے۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بچوں کو اسکول لے جاؤں اور دوپہر میں انہیں واپس بھی لے آؤں؟''

''بالکل ایسی ہی بات ہے۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں کار چلانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تم بہ آسانی انہیں صبح گھر سے پک کرکے واپسی میں ڈراپ کرسکتے ہو۔ بچے بہت ہوشیار ہیں، تمہیں بالکل تنگ نہیں کریں گے بلکہ وکٹوریہ تو اپنے مسئلے خود ہی حل کرلیتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ چھوٹے بہن بھائی کا بھی خیال رکھے گی۔''

میں اس کی بات سن کر شش و پنج میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ اس بھاگ دوڑ سے بہتر ہے کہ میں بچوں کو اپنے گھر ہی لے آؤں لیکن میں نے بہو کے سامنے اس کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی بچوں کو تھوڑا بہت وقت والدین کے ساتھ بھی گزارنا چاہیے۔ ان کے بہت سے مسئلے وہی حل کرسکتے ہیں۔

''ٹھیک ہے، میں پندرہ دن کے لیے یہ ذمے داری قبول کرسکتا ہوں۔'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکوں گا۔''

مجھے ہمیشہ سے ہی یہ تینوں بچے بہت عزیز تھے۔ میری خواہش تھی کہ گلوریا اور مارٹن بھی ان سے اپنی محبت و شفقت کا اظہار اسی طرح کریں جیسے والدین اپنے بچوں سے کرتے ہیں لیکن وہ اپنی مصروفیات میں اتنے گھرے ہوئے تھے کہ ان کے پاس بچوں سے پیار جتانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا البتہ موقع بہ موقع وہ بچوں پر چلاتے رہتے تھے۔ یہ کرو، یہ نہ کرو۔ میرے پاس رہنے سے یہ ضرور ہوا کہ بچے اس ڈانٹ ڈپٹ سے آزاد ہوگئے۔ ان کے چہروں پر چھائی خوشی اور اطمینان سے مجھے بھی یک گونہ سکون ملا۔ میں نے وہ تمام پرانے کھلونے نکال لیے جن سے مارٹن اور اس کی بہن جوئے کھیلا کرتے تھے اور ان کے لیے ڈھیروں بسکٹ، کیک اور ان کے پسندیدہ ڈرنکس لے کر آگیا۔

آٹھ سالہ وکٹوریہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار تھی اور بعض اوقات ایسی باتیں کرجاتی کہ میں اس کی شکل دیکھتا رہ جاتا، وہ جب بھی میرے ساتھ شطرنج کھیلتی یا تصویری معما حل کرنے بیٹھتی تو میں سوچنے لگتا کہ کیا واقعی یہ مارٹن جیسے نکمے شخص کی بیٹی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں چند دنوں میں ہی اس کی ذہانت کا معترف ہوگیا۔ سات سالہ لیری کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ اس کی پیدائش سے مارٹن کا خاندان مکمل ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن اور چمکدار تھیں اور وہ بھی اپنی بہن کی طرح ذہین تھا۔ البتہ اس کے چہرے سے شوخی اور شرارت ٹپکتی تھی اور میں نے اسے شاذونادر ہی سنجیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ چار سالہ مارکوس حادثاتی طور پر اس دنیا میں آگیا تھا، میرا مطلب ہے کہ اس کی پیدائش میں والدین کی منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شاید اسی لیے وہ اسے بری طرح نظرانداز کرتے تھے حالانکہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ توجہ شفقت اور پیار کا مستحق تھا۔ اس کی کمزور حیثیت پر مجھے ترس آتا اور اسی لیے مجھے اس سے زیادہ محبت تھی۔

تینوں بچے مجھے بہت عزیز تھے اور میں چند ہی دنوں میں ان سے بہت مانوس ہوگیا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو انہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا لیکن مجبوری تھی۔ گلوریا کی واپسی شام ساڑھے چھ بجے تک ہوتی تھی اور اس سے پہلے میں بچوں کو ان کے گھر چھوڑنے چلا جاتا اور گلوریا کے آنے تک ان کے پاس ہی رہتا۔ گلوریا نے اس معمول پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے وہ مطمئن ہی تھی۔ اس کا معیار زندگی اتنا اچھا نہ تھا کہ وہ میری طرح ان بچوں کی نازبرداری کرسکتی۔ میرا بیٹا مارٹن پولیس میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی کے اوقات انتہائی غیر یقینی تھے۔ ایک بار وہ کام پر چلا جائے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ واپسی کب ہوگی۔ شاید اسی لیے وہ گھر کے معاملات سے بالکل لاتعلق ہوگیا تھا اور گلوریا کو ملازمت کے ساتھ ساتھ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا تھا۔

دو ہفتے گزر گئے لیکن گلوریا نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں اسی طرح بچوں کو اسکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمے داری نبھاتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی جلدی اس معمول کا کیسے عادی ہوگیا یا پھر میں خود بھی اس ذمے داری سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے بچوں کو ان کے گھر سے لیتا اور ساڑھے تین بجے اسکول سے چھٹی ہونے پر انہیں اپنے گھر لے آتا۔ انہیں کھانا کھلاتا اور تین گھنٹے تک ان کے ساتھ کھیلتا رہتا اور پھر ساڑھے چھ بجے انہیں گھر چھوڑ آتا۔ گلوریا کبھی کبھی کوئی رسمی سا جملہ کہہ دیتی مثلاً یہ کہ تم بہت نیک دل انسان ہو یا یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے بغیر میں کیا کرتی، لیکن میں نے کبھی اس کے الفاظ میں گرم جوشی محسوس نہیں کی اور نہ ہی اس نے کبھی میری ان خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کے بارے میں سوچا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ میری قلیل سی پنشن کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ کما رہی تھی اور اسے بھی میری مالی حیثیت کے بارے میں بخوبی اندازہ تھا۔ کیا وہ نہیں جانتی ہوگی کہ ایک مالی کو کتنی پنشن ملتی ہے۔ غالباً وہ یہی سمجھتی ہوگی کہ میں یہ سب کچھ بچوں سے محبت کی خاطر کررہا ہوں اور وہ میری اس جذباتی کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ میں نے ایک بار اسے اپنی پڑوسن سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ ایسی بات کہہ کر اس کے جذبات مجروح کروں۔ ممکن ہے کہ اسے وہ اپنی بے عزتی سمجھے میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اگر کبھی اس نے ایسی کوئی پیشکش کی تو اسے قبول نہیں کروں گا۔ واقعی اس میں میری بے عزتی تھی۔

گوکہ میں نے کبھی ان خدمات کو پیسوں کے ترازو میں نہیں تولا تھا لیکن جانتا تھا کہ زیادہ عرصہ تک یہ اضافی اخراجات برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔ جب وکٹوریہ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول یونیفارم کا بلاؤز تنگ ہوگیا ہے اور اس کے موزے بھی پھٹ گئے ہیں تو میں اسکول سے واپسی پر اسے بازار لے گیا اور اس کے لیے بلاؤز اور دو جوڑی موزے خرید لیے۔ شام کو جب گلوریا گھر آئی تو میں نے خریداری کی رسید اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''وکٹوریہ کو بلاؤز اور موزوں کی ضرورت تھی۔ تم دیر سے گھر آتی ہو۔ لہٰذا میں نے اس کے لیے دونوں چیزیں خرید لیں۔''

گلوریا نے وہ رسید مٹھی میں دبائی اور کچن میں چلی گئی۔ میں اسی انتظار میں رہا کہ وہ مجھے رقم کی ادائیگی کرے گی لیکن وہ اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی کا مگ لیے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں نے کچن میں جاکر دیکھا۔ اس رسید کے ٹکڑے ڈسٹ بن میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی لیکن اس واقعے کے بعد محتاط ہوگیا اور اس سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا تاکہ وہ میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہ کرے۔

کبھی کبھی میں حساب لگاتا کہ اس خدمت کے عوض مجھے کتنے اضافی اخراجات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں تو میری پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ ایک روز میں نے سپر مارکیٹ سے خریدی گئی اشیا کی تمام رسیدیں نکالیں اور ایک کاغذ پر ان کی تفصیل لکھنا شروع کردی، پھر میں نے پیٹرول کا حساب رکھا۔ ان بچوں کی وجہ سے گیس، بجلی اور پانی کے اخراجات میں جو اضافہ ہوا تھا وہ بھی نوٹ کیا اور جب میں نے ان سب کو جمع کیا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

اس کے باوجود میں نے کبھی گلوریا کو ان اخراجات کی تفصیل بتانے کے بارے میں نہیں سوچا، ویسے بھی ایک ایک چیز کا حساب رکھنا بہت مشکل تھا۔ میں نے تو محض ایک اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی اور میرے نزدیک یہ انتہائی گھٹیا بات ہوتی اگر میں اس کا ذکر گلوریا سے کرتا، ویسے بھی ان اخراجات کی اہمیت اس خوشی کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی جو بچوں نے مجھے دی تھی، جب وہ اسکول میں ہونے والے کھیلوں میں کامیابی حاصل کرتے یا امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تو میرا سینہ فخر سے چوڑا ہوجاتا۔

کچھ ہی دنوں بعد میرے اس چھوٹے سے خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوگیا۔ میری بیٹی جوئے کی شادی ایک اسکول ٹیچر سے ہوئی تھی گوکہ اس کی جاب کے اوقات مناسب تھے لیکن قلیل آمدنی میں گزارہ مشکل ہوتا جارہا تھا۔ لہٰذا اس نے شام کے اوقات میں بھی ایک جزوقتی ملازمت اختیار کرلی جوئے، بھی اس کے ساتھ ہی جانے لگی۔ اس کی وجہ سے ننھے ولیم کی دیکھ بھال کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ جوئے اور گلوریا میں ہمیشہ سے ہی رقابت چلی آرہی تھی اور جوئے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ اس کا بوڑھا باپ اس عمر میں گلوریا کے بچوں کی خدمت گزاری کرے۔ لہٰذا جب اس کے شوہر نے تجویز پیش کی کہ ننھے ولیم کو بے بی کیئر سینٹر میں چھوڑ دیا جائے تو جوئے نے اس کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ جب گلوریا اور مارٹن نے اپنے بچے میرے حوالے کردیے ہیں تو وہ کیوں اپنے بچے کو بے بی کیئر سینٹر میں بھیجے۔ جوئے نے یہ مسئلہ میرے سامنے رکھا اور بولی کہ میں گلوریا کے بچوں کے ساتھ ساتھ ولیم کو بھی اسکول سے اپنے ساتھ لے آیا کروں۔

البتہ ولیم ان بچوں کے جانے کے بعد بھی تین چار گھنٹے میرے پاس رہے گا۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ اب میں پہلے کی طرح جوان نہیں رہا۔ اس بڑھاپے میں یہ مشقت مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔''

''مارٹن کے بچوں کے ساتھ تو تم بہت خوش رہتے ہو۔ میرے بچے کے لیے تمہارے پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے۔ تم نے ہمیشہ مارٹن کو مجھ پر ترجیح دی ہے اور اب بھی تم ایسا ہی کر رہے ہو۔''

جوئے کے طعنے سن کر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ اس طرح ولیم کی ذمے داری بھی مجھ پر آ گئی۔ چند دنوں بعد جوئے کو یاد ہی نہ رہا کہ مجھے اپنے لیے بھی کچھ وقت چاہیے۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی نہیں کہا کہ ولیم کی وجہ سے میں پابند ہو کر رہ گیا ہوں اور نہ ہی میں نے اسے یاد دلانے کی ضرورت سمجھی۔ میرے دوست مجھے ایک ایسا غلام سمجھتے تھے جس نے دل سے یہ غلامی قبول کی ہو اور اپنے مالکوں سے پورا پورا تعاون کر رہا ہو۔

بچے مجھ سے باتیں کرتے تو مجھے بڑا سکون ملتا لیکن کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو میں سننا نہیں چاہتا تھا یا جن سے مجھے تکلیف ہوتی تھی جب ایک روز لیری نے بتایا کہ گلوریا نے گزشتہ شب مارکوس کو تھپڑ مارا تھا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا لیکن میں بچوں کے سامنے ان کے والدین پر تنقید کرنے کا حامی نہ تھا۔ اس لیے اوپری دل سے کہہ دیا۔ ''اس نے یقیناً ایسی حرکت کی ہوگی جس کی وجہ سے اسے یہ سزا ملی۔''

ویسے بھی میرا تعلق اس نسل سے تھا جس کے نزدیک تھپڑ مارنا تشدد کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ میرے خیال میں بچوں کو سدھارنے کے لیے ان پر تھوڑی بہت سختی ضروری تھی لہٰذا میں نے گلوریا سے بھی پوچھنا ضروری نہ سمجھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے عام زندگی سے ہٹ کر سمجھا جائے۔

ایک دن شام کو گھر جاتے وقت وکٹوریہ نے مجھے بتایا۔ ''گزشتہ رات ڈیڈی گھر نہیں آئے۔''

''پولیس والوں کی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ بعض اوقات کوئی ایسا کیس آ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ وقت پر گھر نہیں آ سکتے اور پھر گھر میں لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔''

''لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں ہاں، بولو......رک کیوں گئیں۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی خاص بات جانتی ہے جو بتانا نہیں چاہ رہی۔

تین دن گزر گئے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ بچے بالکل گم صم سے تھے۔ وہ بے دلی سے کھانا کھاتے اور کسی کھیل میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں ان کی اداسی کا سبب جاننا چاہ رہا تھا لہٰذا پوچھ بیٹھا۔

''کیا اب بھی تمہارے ڈیڈی بہت مصروف ہیں؟''

ان بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے۔

''ہاں۔'' وکٹوریہ بولی۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا اور گزر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔

''ممی کہتی ہیں کہ انہیں نہیں معلوم، ڈیڈی کب واپس آئیں گے۔''

''اوہ ڈیئر۔'' میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی تسلی کے لیے کیا کہوں پھر بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ ''تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا تمہارے پاس۔''

''ہاں۔'' لیری نے کہا۔ ''اور ہم جب چاہیں یہاں آ کر رہ سکتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

مجھے ڈر تھا کہ وکٹوریہ اس بارے میں کچھ نہ کہہ دے۔ شاید اسے لیری کی بات اچھی نہ لگی ہو لہٰذا میں نے کہا۔ ''فی الحال ہم اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ ہی تم لوگ گھر پر اس کا ذکر کرو گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بہتر ہے کہ ہم اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لیں، ممکن ہے کہ تمہارا باپ کسی مسئلے میں الجھ گیا ہو۔ اس سے فارغ ہوتے ہی وہ گھر آ جائے گا۔''

''کیسا مسئلہ؟'' ننھے مارکوس نے پوچھا۔

''تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔'' میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ منہ بسور کر رہ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں، باپ کی جدائی کا درد تو محسوس کر سکتا ہوں۔

میں نے کئی بار سوچا کہ اس مسئلے پر گلوریا سے بات کروں لیکن بچوں کے خیال سے خاموش رہا۔ وہ یقیناً یہی سمجھتی کہ بچوں نے مجھ سے کچھ کہا ہے اس طرح ان کی شامت آ جاتی لیکن میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ بچوں نے اپنے باپ کے غائب ہونے کا ذکر مجھ سے کر دیا ہے چنانچہ وہ ایک روز کپڑوں سے بھرے دو سوٹ

کیس لے کر میرے پاس چلی آئی اور بولی۔

''ڈیڈی، یہ بچے چند دنوں تک تمہارے پاس رہیں گے۔ میں زیادہ عرصے تک مارٹن کا یہ رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔ یا تو وہ ان بچوں کا باپ بن کر اپنی ذمے داری قبول کرے اور دن میں چند گھنٹوں کے لیے گھر آئے یا پھر ہمیشہ کے لیے فلوزی کے پاس چلا جائے جس کے ساتھ وہ اس وقت رہ رہا ہے۔''

میرے خدشات درست ثابت ہوئے، مجھے پہلے سے ہی شک تھا کہ وہ کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔ ''آخر اس نے گھر نہ آنے کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔ اس کا کوئی خط آیا، کوئی فون کیا؟''

''کچھ نہیں، حالانکہ میں فلوزی کے بارے میں مہینوں سے جانتی ہوں۔''

''اس کے باوجود تم نے یہ بات ظاہر نہیں کی۔ اگر بچے نہ بتاتے تو مجھے بھی معلوم نہ ہوتا۔''

''میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تم اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فلوزی جیسی عورتیں کسی مرد کو بہ آسانی قابو کر سکتی ہیں اور مارٹن تو سدا کا احمق ہے۔ اسے بے وقوف بنانا کون سا مشکل کام ہے، بہرحال ان سوٹ کیسوں میں بچوں کے کپڑے ہیں اور زیادہ تر پر استری کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں چاہوں گی کہ کسی کو بھی ان بچوں کے لباس میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئے اور نہ ہی اسکول میں اس بارے میں کوئی بات کی جائے۔ امید ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور بچوں کی تمام تر ذمے داری مجھ پر آن پڑی۔ میرے پاس ان کے گھر کی ایک چابی تھی چنانچہ جب بھی انہیں کسی کپڑے، گیم یا کھلونے کی ضرورت ہوتی، میں انہیں لے کر وہاں چلا جاتا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جا کر حسرت سے تمام چیزوں کو دیکھتے۔ اس امید پر کہ کب انہیں دوبارہ اپنے گھر میں رہنا نصیب ہوگا اور جب واپسی میں دروازہ بند کرتا تو مجھے ان کے چہروں پر اطمینان اور سکون کی جھلک نظر آتی کہ یہ گھر اب ان کا ہے اور وہ کسی وقت بھی واپس آ سکتے ہیں۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ انہیں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تو میں نہیں دے سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا۔ اگر کسی بچے کے لیے موزوں کی ایک جوڑی خریدی تو بقیہ دو کو بھی کچھ نہ کچھ لے کر دے دیا تاکہ ان کے دل میں کوئی بات نہ

زاویہ نگاہ

☆ عالم بے عمل کی مثال ایسے ہے کہ جیسے اندھے نے چراغ اٹھایا ہو کہ لوگ اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور خود تاریکی میں رہتا ہے۔

☆ اپنی ضرورتوں کو کم کرو گے تو راحت پاؤ گے۔

☆ قدرت انتقام رکھتے ہوئے غصے کو پی جانا افضل ترین جہاد ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے ہم نشین ہیں۔

☆ جب تک تیرا اترانا اور غصہ کرنا باقی ہے، اپنے آپ کو اہل علم میں شمار مت کرو۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا (اوکاڑہ)

آئے۔ ان کے اسکول کی تیاری میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں کوئی ایسی بات ہو جس سے بچے پریشان ہو جائیں۔

جب مارکوس پانچ سال کا ہوا تو ڈاک سے ایک لفافہ ملا جس میں پانچ پاؤنڈز کا ایک نوٹ اور برتھ ڈے کارڈ رکھا ہوا تھا اور اس کی پشت پر لکھا تھا ''تمہاری مما کی طرف سے۔'' وہ اس وقت اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا جو سب جانوروں کی شکل کے تھے۔

''تم بھی میری طرح ہو۔'' میں نے اسے کارڈ تھماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی جانوروں سے بہت محبت تھی لیکن وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ اس لیے کھلونے مشکل سے ملتے تھے۔''

''تمہیں سب سے زیادہ کون سا جانور پسند تھا؟'' مارکوس نے معصومیت سے سوال کیا۔

''مجھے کینگرو پسند تھا۔ ہم اسے پیار سے کانگا کہا کرتے تھے۔''

''کیا مجھے بھی کنگرو مل سکتا ہے؟''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ کسی نہ کسی دکان پر مل ہی جائے گا جہاں پرانی اشیا فروخت ہوتی ہوں ورنہ میں تمہیں اس سے ملتی جلتی کوئی چیز دلا دوں گا۔''

دوسرے دن ہم مختلف دکانوں پر گئے اور ایک دکان پر ہمیں مطلوبہ شے مل گئی، یہ بات دوسری ہے کہ گلوریا کا بھیجا ہوا پانچ پاؤنڈز کا نوٹ اس کی نذر ہو گیا۔ البتہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں مارکوس کی معصوم خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اگلی سالگرہ وکٹوریہ کی تھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اس موقعے پر گلوریا اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھیجے گی لیکن ہم سارا دن پوسٹ مین کی آمد کا انتظار ہی کرتے رہے۔ البتہ ایک ہفتہ بعد اس کی جانب سے سالگرہ کا کارڈ موصول ہوا جس کے ساتھ دس پاونڈز کا ایک نوٹ بھی تھا۔ کارڈ کے اندرونی حصے پر میرے لیے ایک پیغام درج تھا۔ ''ڈیڈی! تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔'' وکٹوریہ نے وہ پیغام پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''گرینڈ پا۔ یہ واقعی تمہارے لیے ہے۔''

اس دوران میں تینوں بچے مجھ سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ وہ میری حقیقی اولاد ہیں۔ وہ میرے ساتھ رہ کر اتنے مطمئن اور خوش تھے کہ اکثر مجھے اپنی بیوی یاد آنے لگتی۔ کاش وہ زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ یہ بچے مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے بچوں مارٹن اور جوئے سے بہت محبت کرتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کے ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگتے اور وہ کہتی۔ ''دیکھ لینا۔ ایک دن یہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' میں اسے ان بچوں کی مثال دے کر بتاتا کہ ضروری نہیں کہ بچے بھی ماں باپ پر جائیں۔ مارٹن کے بچے اپنے باپ سے بالکل مختلف تھے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ میری تربیت کا اثر قبول کر رہے تھے۔ میں انہیں جو کچھ سمجھاتا وہ اس پر سنجیدگی سے عمل کرتے۔ میں جب بھی ان کے ساتھ باہر جاتا تو وہ اپنے دوستوں سے فخریہ انداز میں میرا تعارف کرواتے۔ ''یہ ہمارے دادا ہیں، ہم انہی کے ساتھ رہتے ہیں۔'' میں جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے دل اور ذہن میں مجھے والدین کی جگہ دے رکھی ہے اور اب مجھے ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ جان کر میرے اندر گرم جوشی کی لہر ابھرنے لگتی لیکن اس کے ساتھ ہی میں تھوڑا سا فکرمند بھی ہو جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید زیادہ دیر تک میں ان بچوں کی ذمے داری نہ اٹھا سکوں۔

ایک دن جب سب بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے باپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں گزشتہ آٹھ ماہ سے ان بچوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن مارٹن نے اس پورے عرصے میں ان کی پلٹ کر خبر نہیں لی اور نہ ہی اس دوران اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس بارے میں مجھے مارٹن کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کرنا چاہیے جہاں آخری بار اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔

''کیا میں مارٹن منڈے سے بات کر سکتا ہوں۔''

جواب میں ایک بے زار اور تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔ ''کس سے؟'' اس نے پلٹ کر سوال کیا۔

''مارٹن منڈے۔ میری معلومات کے مطابق وہ گزشتہ برس اسی پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا۔''

''اوہ مارٹن...... میں سمجھ گیا۔'' اس بار اس کا لہجہ خاصا پرجوش تھا۔ ''میں انسپکٹر پلیٹ سے تمہاری بات کرواتا ہوں۔''

انسپکٹر پلیٹ کے لہجے میں شرمندگی نمایاں تھی۔ اس نے کہا کہ بہت سی باتیں فون پر نہیں کی جاسکتیں اس لیے بہتر ہوگا کہ میں پولیس اسٹیشن پر آکر اس سے مل لوں۔

اس کی بات سن کر میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی کہ وہ مجھے پولیس اسٹیشن بلا رہا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش مت کرو۔ مارٹن میرا بیٹا ہے اور جانتا ہوں کہ اس میں کچھ کمزوریاں ہیں۔ میری عمر بہتر برس ہے اور اب بھی قابل رشک صحت کا مالک ہوں۔ مجھے اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کرنا پڑ رہی ہے اور اس وجہ سے میں دن بھر مصروف رہتا ہوں۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی اگر ٹیلی فون پر ہی اس کے بارے میں بتا دو۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹیلی فون پر یہ بات کی جائے لیکن تمہارا اصرار ہے تو یونہی سہی۔ مارٹن فی الحال معطل ہے۔ اس کا جرم اس وقت ہمارے علم میں آیا جب وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔''

''اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا تھا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ان دنوں ہماری سراغ رساں ٹیم ہیلی فیکس میں ایک ایسے گروہ کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی جس کا تعلق مانچسٹر کے ایک بڑے اور خطرناک گروہ سے تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ تمہارے بیٹے کا تعلق اس گروہ سے تعلق رکھنے والی عورت سے تھا۔ اس نے اسے پولیس پلان کے حوالے سے معلومات فراہم کر دیں اور اس طرح وہ عورت جو پہلے اس گروہ کے لیے سردرد بن گئی تھی، اچانک ہی اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی تمہارے بیٹے نے دوسرے گروہوں سے بھی رابطے قائم کر لیے۔ جب ہمیں ان معاملات کا علم ہوا تو اسے فوری طور پر ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ یہ ساری کہانی مانچسٹر کے مقامی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے لیکن دوسرے شہر کے رہنے والوں کو اس بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری زبانی یہ سب کچھ سننے کو مل رہا ہے۔''

''تم سے زیادہ افسوس مجھے ہے کہ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا ہوں۔''

''میں نے سنا ہے کہ اس کے بچے تمہارے پاس ہیں۔''

''ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔''

''ان بچوں کو اپنے بیٹے سے دور رکھنا۔ اس کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑنا چاہیے۔''

اگر وہ مجھے یہ مشورہ نہ دیتا تب بھی میں ایسا ہی کرتا۔ مارٹن سے جو تھوڑی بہت امید تھی، وہ بھی دم توڑ گئی۔ اب مجھے بیک وقت ان بچوں کے لیے ماں اور باپ کا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ایک خلش تھی اور میں سوچتا تھا کہ کاش ایسا کوئی معجزہ ہو جائے کہ مارٹن اپنے بچوں کی محبت میں واپس چلا آئے۔ بہ ظاہر ایسا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر پلیٹ کا کہنا تھا کہ وہ مانچسٹر چلا گیا ہے اور تحقیقاتی ٹیم سے بالکل بھی تعاون نہیں کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی ملازمت کا خاتمہ یقینی ہے۔ جس شخص نے آٹھ ماہ تک اپنے بچوں کی پلٹ کر خبر نہ لی۔ وہ بے روزگار ہونے کے بعد بھلا بچوں کو کیوں پوچھے گا۔

اس واقعے کے بعد میرے دل میں ان بچوں کے لیے ایک نیا احساس پیدا ہو گیا۔ اب تک میں انہیں دادا کی نظر سے دیکھتا تھا اور اسے اپنی ذمے داری سمجھتا تھا کہ ماں باپ کی عدم موجودگی میں ان کی دیکھ بھال کروں لیکن اب اس محبت نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بچے میرا کل اثاثہ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے میں اپنی اولاد کو بھی بھول گیا تھا۔ اب بیوی کی یادیں بھی میرے گرد گھیرا تنگ نہیں کرتی تھیں۔ وہ بہت ہی پیارے بچے تھے اور وہی کچھ کرتے جس کی میں نے انہیں تربیت دی تھی۔ اپنی بساط بھر گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹاتے۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ ان کے ذہن بہت تیز تھے اور ہر بات ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا کہ اس نے بڑھاپے میں مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا تھا اور میں ان بچوں کی صورت میں اپنا روشن مستقبل دیکھ رہا تھا۔

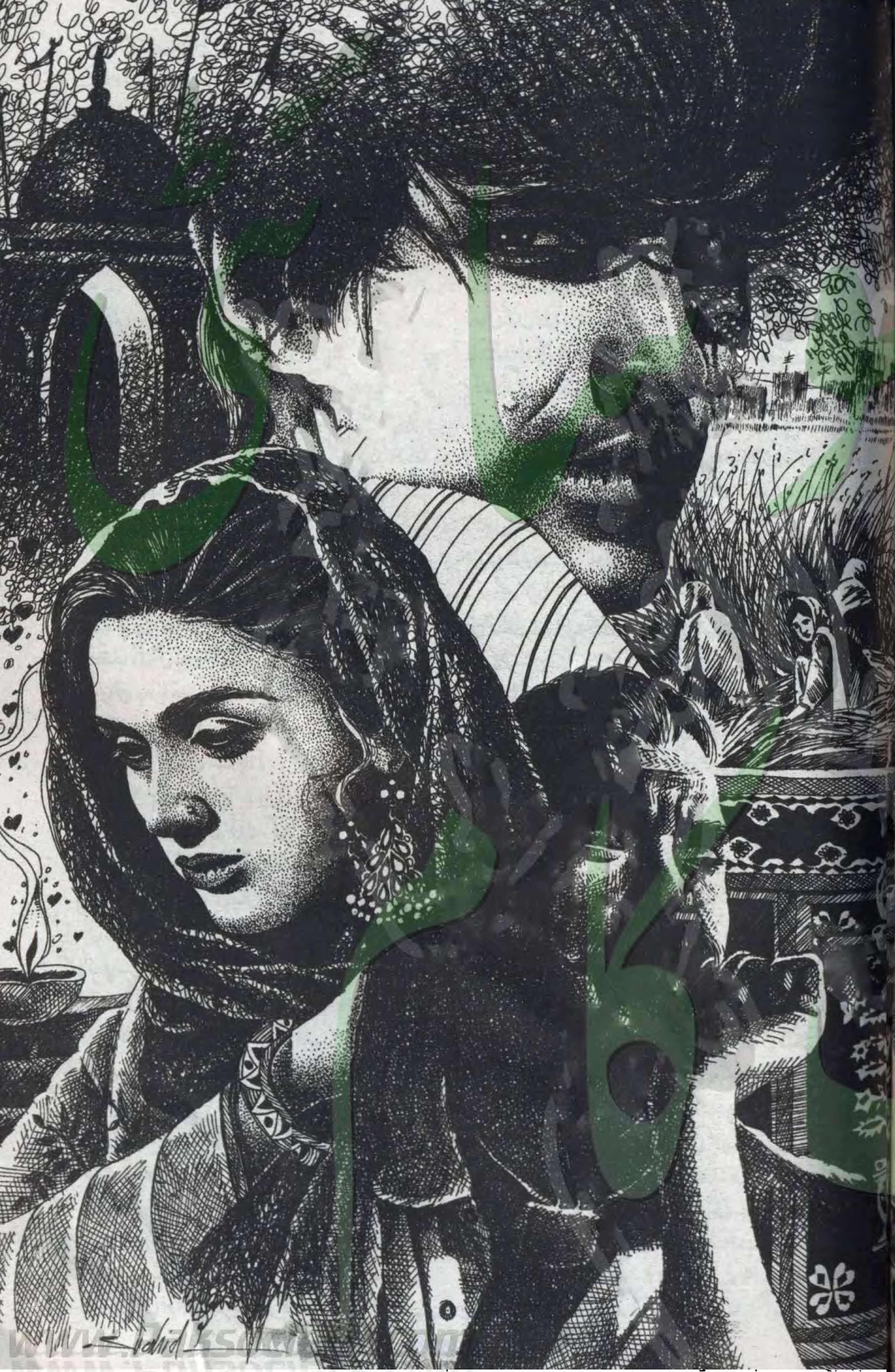
اسکول کی چھٹیاں ہوئیں تو میرا سارا وقت انہی کے ساتھ گزرنے لگا۔ البتہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ پارک میں کرکٹ کھیلنے ضرور جاتے مگر بارش کے موسم میں گھر پر بیٹھ کر ہی مختلف کھیل کھیلتے رہتے۔ وکٹوریہ کو شطرنج سے دلچسپی تھی لہٰذا وہ میری شاگرد بن گئی اور گھنٹوں میرے ساتھ شطرنج کھیلتی رہتی۔ دوسرے بچوں کی طرح انہیں بھی شاپنگ پر جانے کا شوق تھا اور وہ بہانے بہانے سے مجھے مختلف شاپنگ سینٹرز پر لے جاتے۔ مجھے ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کر کے خوشی ہوتی۔ ایک روز وہ ضد کر کے میرے ساتھ وہائٹ روز سینٹر گئے اور بڑے شوق سے ہر دکان میں جا کر اپنی دلچسپی کی اشیا دیکھتے رہے۔ انہوں نے اپنے جیب خرچ سے کافی پیسے بچا کر جمع کر رکھے تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کی چیزیں خرید رہے تھے لیکن یہ ان کی سعادت مندی تھی کہ کچھ بھی خریدنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ضرور کرتے، لیری نے سب سے زیادہ خریداری کی تھی اور اس کے لیے وزنی بیگ اٹھا کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''ڈیڈی، ڈیڈی!''

اس کی آواز سن کر مجھے بھی رکنا پڑ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ تینوں ایک فربہ اندام شخص کی جانب لپکے۔ میری آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ مارٹن تھا جو ایک موٹی بھدی عورت کے ساتھ ایک دکان کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ تینوں بچے اس کے گرد کھڑے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے جیسے انہیں اپنی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔ میری آنکھیں اس کے بعد کا منظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں۔ جب وہ تینوں بچے اس سے لپٹ جاتے اور وہ ان کی پیشانی گالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا لیکن یہ منظر دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا۔ مارٹن گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے بچو۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔''

یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اترے۔ درد کی شدید لہر سینے سے اٹھی جس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا تاکہ بچے میری آنکھوں میں امڈتے آنسو نہ دیکھ سکیں۔ جب سر اٹھایا تو تینوں بچے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں محبت کے ساتھ خوف بھی جھلک رہا تھا۔ شاید ڈر رہے تھے کہ جس طرح ماں باپ نے انہیں ٹھکرا دیا۔ کہیں میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑ دوں۔ میں نے ان تینوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بدنصیب تھے کہ ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے لیکن میں اپنے آپ کو خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔ مجھے یہ غلامی بہت عزیز ہے۔ کاش اتنی مہلت مل جائے کہ ان بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا دیکھ سکوں۔



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر:5

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلا تا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

میرے شدید اصرار پر اس کے لبوں سے یہ وقت برآمد ہوا۔ ”شہرے پتّر! ہم برباد ہو گئے، ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ پینو، اوئے تیری لاڈلی بہن پروین، گھر سے بھاگ گئی ہے......اپنا اور ہمارا منہ کالا کر گئی ہے......ہائے وے میرے ربا! یہ دن دکھانے سے پہلے مجھے مار کیوں نہ دیا تونے؟“



یوں لگا جیسے چاچی نے یک بارگی پگھلا ہوا گرم سیسہ میرے کانوں میں ڈال دیا۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیل سی گئیں اور کمرے میں موجود ہر چیز گھومنے لگی۔

میں نے اپنی پوری قوت سے چاچی کو جھنجوڑ ڈالا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو چاچی! جانتی بھی ہو...... نہیں...... میری پروین ایسا نہیں کرسکتی...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

چاچی کی حالت پھر غیر ہوگئی۔ اٹک اٹک کر بولی۔ ''نہیں...... اللہ سوہنا جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ ہائے میری بچی! یہ تم نے کیا کردیا؟''

بجا طور پر اس کے اوسان خطا ہوچکے تھے۔ میں نے چاچے چراغ اور دوسرے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے سر کو پوری قوت سے دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں پتا...... کون کدھر گیا ہے، میں نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ پتا ہے کہ میرا اس جہان سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے......''

میں نے اسے چارپائی پر لٹایا اور کمرے سے نکل آیا۔ صحن میں کھڑے ہوکر میں نے پوری قوت سے چلّا کر پروین کو پکارا مگر چاچی نے درست کہا تھا، وہ میری آواز کی پہنچ سے کہیں دور جاچکی تھی۔ دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکلا۔ کہاں جانا تھا، کہاں جارہا تھا، کچھ خبر نہیں تھی۔ جب میں کھالے کے باپ کی دکان پر پہنچا تو چاچا چراغ کو دیکھا جو اسپتال کی جانب سے تیز تیز قدموں سے چلا آرہا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچا، پوچھا۔ ''چاچا! یہ چاچی کیا کہہ رہی ہے؟''

تبھی مجھے چاچا چراغ کی بوڑھی آنکھوں کی غیر معمولی سرخی اور اشکوں سے تر سفید ڈاڑھی وہ سب کچھ بتلاگئی جو شاید وہ زبان سے کبھی نہ کہہ پاتا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ کئی ساعتیں عجیب سی، خالی الذہنی کی کیفیت میں گزر گئیں۔ چاچے نے میرے کندھوں پر اپنا استخوانی ہاتھ رکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پتر! ہوش کر...... یہ وقت ہوش کرنے کا ہے۔''

میں نے گردن اٹھائی، چاچے کا دلاسا دیتا ہاتھ دیکھا جو واضح طور پر کپکپا رہا تھا، پھر مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہوگیا۔ اپنے چہار سو نظر ڈالی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھرے بازار میں ننگا ہوگیا تھا۔ ایک خیال اچانک کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میں چاچے کی روکتی آوازوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے ڈیرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بیٹھے ہوئے مویشیوں کو پھلانگتے ہوئے ڈیرے میں داخل ہوا۔ ایک ایک کمرا دیکھا، اپنی فصلوں کو بہ غور دیکھا مگر مجھے کہیں پروین دکھائی نہیں دی۔ میری امید دم توڑ گئی تو میں چارہ کاٹنے والی مشین کا بڑا وہیل دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھک گیا۔ اپنے ہاتھوں کی پشت پر سر ٹکا کر بلند آواز میں رونے لگا۔ انہونی ہوگئی تھی۔ نور پور میں کسی بھی وقت خوف ناک دھماکا ہونے والا تھا۔ پروین نے وہ کیا تھا جو آج تک نور پور میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ آنکھیں چبھنے لگیں مگر دل میں لگی ہوئی آگ کسی طور بجھتی دکھائی نہیں دی۔ جب میں نے ڈیرے سے نکل کر نور پور کو جانے والی پگڈنڈی پر قدم رکھا، بے اختیار میرے حلق سے چیخ برآمد ہوگئی۔ ''نہیں...... پروین ایسا نہیں کرسکتی...... وہ بھاگی نہیں، اسے کسی نے اغوا کیا ہے...... وہ مر تو سکتی ہے مگر اپنے بھائی کو جیتے جی مار نہیں سکتی...... نہیں...... وہ ایسا نہیں کرسکتی!''

مجھے بہ خوبی یاد ہے کہ افسر علی اور بدر دین جو اپنی زمینوں میں کام کررہے تھے، کے مجھ تک پہنچے تو میں اپنے حواس میں تھا۔ پھر یاد نہیں، کیا ہوا، میں نے کیا کہا اور انہوں نے مجھے کس طرح سنبھالا دیا...... جب مجھے اپنی دہلیز دکھائی دی تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنی بانہیں ان کی مضبوط گرفت سے چھڑا لیں۔ میرے دروازے کے سامنے گلی میں جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مختلف انواع کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ان دل گیر آوازوں کے پس منظر میں اپنے گھر کی فضا سے اٹھنے والے بین سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہورہے تھے۔ کسی نے کہا۔ ''وہ آگیا ہے شہرا! اس سے پوچھو...... شاید اسے کچھ پتا ہو......''

وہ سبھی میرے اردگرد کھڑے ہوکر مجھ سے پروین کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں باری باری سبھی چہروں کو دیکھ رہا تھا مگر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں دیوانہ بھیڑ کو چیرتا ہوا مجھ تک پہنچا اور میرے بے جان وجود کو دھکیلتا ہوا گھر میں لے آیا۔ اندرون خانہ کا ماحول باہر سے کسی طور پر بھی کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ نور پور کی کم و بیش تمام عورتیں وہاں موجود تھیں جو ایک ہی وقت میں چاچی اور میری چچازاد بہنوں کو دلاسا دے رہی تھیں اور اپنے اپنے انداز میں اس انہونے واقعے پر رائے زنی بھی کررہی تھیں۔ دیوانہ مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لایا، دروازہ بند کرکے مجھے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ''شہرے! حوصلہ کر...... مصیبت آنی تھی، سو آچکی۔ اب دانش مندی اور دلیری سے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ رونے دھونے اور چیخنے چلّانے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

میں نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس قیامت آگیں گھڑی میں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے کپڑے پھاڑ دوں، ہر دکھائی دینے والی شے کو آگ لگا کر خاکستر کردوں اور پاگلوں کی طرح دھاڑیں مارتا ہوا نور پور کی گلیوں میں نکل جاؤں۔ دیوانے نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سہارا دینے کی پوری کوشش کی مگر ہیجان کسی طور کم نہ ہوا تو وہ میرے لیے پانی کا گلاس بھر لایا۔ زبردستی پلاتے ہوئے بولا۔ ''عقل کے ناخن لو یار! تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی کہ پروین کسی کے ساتھ بھاگنے والی نہیں تھی۔ اسے کسی بے غیرت انسان نے اغوا کیا ہے یا وہ کسی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے۔ تم سبھی لوگ یوں روتے دھوتے رہوگے تو کیا ہوگا؟ اس کے ملنے کے امکانات سرے سے ختم ہوجائیں گے۔''

اس کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ کسی خاص بات کی غیر معمولی آمیزش تھی جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ بولا۔ ''شہرے! میں بالکل ٹھیک کہتا ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اتنا بڑا اور انتہائی قدم اٹھاتی اور نہ ہی اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر تھا۔ یہ بات نور پور کا ہر شخص جانتا ہے۔ اول تو وہ اب تک زندہ نہیں بچی ہوگی، اگر خدا کی رحمت سے اس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوئی بھی تو وہ تم لوگوں کی بے وقوفی اور جہالت کی وجہ سے ختم ہوجائے گی۔''

میں نے بے بسی کے عالم میں کہا۔ ''تو بتا ناں! میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

مجھے اپنی آواز بجا طور پر اجنبی لگی تھی۔

وہ بولا۔ ''پانی پیو...... اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ ہے۔''

میں نے پانی کا ایک اور گلاس حلق میں انڈیلا۔ دیوانے کی باتوں نے مجھے دکھ کی پہلی نہج سے کھینچ نکالا تھا۔ میں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''دیوانے یار! میری پروین مل جائے گی ناں؟''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا دبایا اور پُریقین لہجے میں بولا۔ ''ہاں شہرے! مجھے اپنے رب سوہنے پر پورا بھروسا ہے۔ کوئی اس کا بال بیکا بھی نہیں کرسکتا۔''

وہ کھڑا ہوا، مجھے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک گیا اور پوری قوت سے چلّایا۔ ''چاچی! پروین ابھی مری نہیں ہے مگر مرنے والی ہے۔ رونے دھونے اور بین کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ اس لیے آپ سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے بجائے اسے آس پاس تلاش کریں۔''

دیوانے کی تیز چنگھاڑتی ہوئی آواز نے صحن میں ایک دم سناٹا طاری کردیا۔ میں اس دوران اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ ہر صبح کی طرح کھیتوں کی طرف گئی ہو اور کسی سانپ یا زہریلے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ بعض سانپوں کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا اور بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔ آپ سب لوگ اسے نور پور کے آس پاس تلاش کریں۔ وہ گھر سے بھاگی نہیں ہے، اتنی بات کی آپ لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی؟''

دیوانے کی باتوں سے عورتوں میں غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی۔ سبھی اپنی اپنی چادریں اور دوپٹے سنبھالتی ہوئی وہاں سے کھسکنے لگیں جبکہ میں اور دیوانہ مسجد میں جاکر اعلان کرانے کی غرض سے گھر سے نکل آئے۔ امام مسجد نے فوری طور پر لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا اور نور پور کے سب باسیوں کو حکم دیا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر پروین کو تلاش کریں۔ ایسے ہی وقت میں دریام خان اور حیات خان کا میرے نام بلاوا آگیا۔ میں نے بے اختیار حیات خان کی حویلی کی طرف قدم بڑھائے۔ دیوانے نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یار شہرے! خان سے جلد جان چھڑا لینا۔ وہ کچھ کرے گا نہ کرنے دے گا...... ہمیں ابھی تھانے جاکر رپٹ لکھوانی ہے۔''

میں چونکا۔ ''تھانے؟''

''ہاں تو...... تمہاری بہن اغوا ہوئی ہے۔ اغوا کی رپٹ لکھوانی پڑتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پولیس اسے ڈھونڈ نکالے۔'' وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

انہی باتوں کے دوران ہم حیات خان کے دارے پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ میں نے چاچا چراغ کو حیات خان کے پہلو میں بیٹھ کر سسکتا ہوا دیکھا تو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ حیات خان اس کی گردن میں بازو حمائل کیے تسلی دے رہا تھا اور حوصلے کی تلقین کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے پیچھے چلے آنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے چاچا چراغ کو ساتھ لے کر اپنے دارے کے خصوصی کمرے کی طرف چل پڑا۔ عیاں تھا کہ وہ تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

دیوانہ برآمدے میں ہی رک گیا۔ میں اندر چلا گیا۔ حیات خان متفکر انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ''چراغ خان! جتنا کچھ جانتے ہو، بلاکم و کاست مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کوئی راہ نکل آئے۔''

چاچے نے اپنے تہبند کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”خان! ساری عمر کی کمائی کھوہ کھاتے چلی گئی ہے۔ بتانے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ بھرا (بھائی) اور بھرجائی (بھابی) کا دکھ قسمت میں دیکھنا لکھا تھا، دیکھ لیا۔ دو تیموں کا بھار (وزن) خدا نے مجھ پر لادا، اٹھا لیا۔ یہ بھار میری حیثیت سے بھاری ہے جو قدرت نے میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ چار دن کی زندگی اب گزرتی دکھائی نہیں دیتی...... سر جھک گیا ہے۔ دعا کرو کہ زمین جگہ دے دے اور میں لوگوں کی نظروں کے تیروں سے بچ جاؤں۔“

چاچے کی حالت غیر تھی۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وہاں موجود ہونا یا نہ ہونا چاچے کے نزدیک بے معانی تھا۔ حیات خان نے اسے شفقت آمیز انداز میں ڈانٹا۔ ”انسان بن بھرا! یوں سوانیوں (عورتوں) کی طرح وین (بین) کرنے سے دھی نہیں ملے گی۔ مرد کا بچہ بن اور بتا...... تجھے کس بے غیرت پر شبہ ہے؟“

چاچے کے ساتھ ہی میرا سر بھی ایک جھٹکے سے بلند ہوا۔ چاچا بولا۔ ”نہیں خان! مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔“

”کڑی اپنے ہاتھ سے خاندان کا منہ کالا نہیں کرتی، کسی سے کرواتی ہے۔ کلنک بھرا ہاتھ منہ پر پھیرنے والا زمین پر دندناتا پھرے، یہ کہاں لکھا ہوا ہے۔“

اس کے سوال کا ہم دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے استفسار پر چاچا چراغ نے بتایا کہ ہم سب لوگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ سوئے تو ہوش تک نہیں رہا۔ صبح جب چاچی کی آنکھ کھلی تو اس نے پروین کی چارپائی خالی دیکھی۔ سوچا کہ معمول کے مطابق اٹھتے ہی کھیتوں کی طرف چلی گئی ہوگی۔ دل کو ایک کھٹکا سا لگ گیا کہ وہ سدا اپنی بہنوں کے ساتھ باہر جاتی تھی۔ آج اکیلی کیسے چلی گئی؟ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے کہ اس نے دونوں کو جگانے کی کوشش کی ہو مگر وہ نیند سے بیدار نہ ہوئی ہوں۔ جب نصف گھنٹا گزر گیا اور وہ پلٹی نہیں تو چاچی بے چین ہو گئی۔ دونوں بیٹیوں کو جگایا اور انہیں پروین کا پتا کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ کہیں نہ ملی تو چاچی بری طرح گھبرا گئی۔ ننگے پیروں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ معمول کے مطابق جہاں پروین کو جانا چاہیے تھا، وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے چراغ دین کو جگایا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس قضیے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ شانو نے پروین کا سامان چیک کیا۔ سوائے پہنے ہوئے لباس اور زیور کے، سب کچھ موجود تھا۔ پروین گھر میں عمومی طور پر پہنی جانے والی نائیلون کی چپل پہن کر گئی تھی۔ گھر میں کوئی کھٹ پٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی گزشتہ ہفتہ بھر سے اسے کسی نے ڈانٹا تھا۔

ساری تفصیل جاننے کے بعد حیات خان نے باری باری ہم دونوں کو گھورا، ایک ہنکارا بھرا اور کہا۔ ”پھر تم لوگوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے؟“

ہم دونوں سر جھکائے خاموش رہے تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”وہ بچی ہے، نادان ہے۔ اس کا کسی سے کوئی عشق وشق کا معاملہ بھی نہیں ہے، پھر وہ کیسے کسی کے ساتھ رات کی تاریکی میں نور پور سے باہر جا سکتی ہے؟“

میں نے شکست خوردہ سے انداز میں کہا۔ ”دیوانہ بھی یہی کہتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کیا ہے یا اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔“

”پہلی بات دل کو لگتی ہے، دوسری نہیں کیونکہ اگر وہ کہیں گری ہوتی تو اب تک اس کا سراغ مل چکا ہوتا۔ نور پور والوں نے فصلوں کا چپا چپا چھان مارا ہے۔“

ایسے ہی وقت میں خاص کمرے کے باہر ہلچل ہوئی۔ ایک دارے دار نے جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”خان جی! باہر پولیس آئی ہے۔“

”نکا تھانیدار آیا ہے یا بڑا؟“

”کریماں پاولی آیا ہے جی! اس کے ساتھ دو چار سپاہئے (سپاہی) بھی ہیں۔“

”تم کریمے کو اندر بھیج دو، باقی لوگوں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا کر چاہ پانی کا بندوبست کرو۔ فٹافٹ!“

چاچے چراغ کی پیشانی عرق آلود تھی۔ حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ پولیس والوں کی وردی دیکھ کر ہی سہم جایا کرتا تھا جبکہ آج سامنا ہونے چلا تھا۔ اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چوڑے چکلے سینے والا وردی پوش اندر داخل ہوا۔ سیدھا حیات خان کے پاس پہنچا، مؤدبانہ انداز میں مصافحہ کیا اور بولا۔ ”خان جی! تہاڈے پنڈ کوں کہیں دشمن دی نظر لگ گئی اے سئیں!“

(خان جی! آپ کے گاؤں کو کسی دشمن کی نظر لگ گئی ہے)

حیات خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے، بولا۔ ”ہا...... ہا...... جڈن دی آسیں، بھونکدا آسیں...... کوئی جادو منتر پڑھ، منٹ مارتے ساڈی دھی رانی کوں گول کڈھ نی تاں اساں مردے ہیں......“

(ہاں ہاں! جب بھی آتے ہو، بھونکتے ہوئے آتے ہو۔ چاہے جادو منتر پھونکو، بہ جلد ہماری بیٹی کو ڈھونڈ نکالو نہیں تو

ہم مر جائیں گے)

کریمے پاولی کا اصل نام کریم بخش تھا۔ وہ بہت تیز طرار اور شاطر دماغ شخص تھا۔ دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتا تھا اور پلو بھی نہیں پکڑنے دیتا تھا۔ اس وقت بھیگی بلی بنا حیات خان کے سامنے بیٹھا 'جی، جی' کر رہا تھا۔ رسمی چائے پانی کے بعد حیات خان اور چاچا چراغ پولیس والوں کی معیت میں موقع ملاحظہ کے لیے روانہ ہو گئے جبکہ میں اور دیوانہ حویلی سے نکل کر کھالے کے ویگن اسٹینڈ میں آ کر کھڑے ہو گئے، دیوانہ بولا۔ ”شہرے! تم نے ناشتا کیا ہے؟“

”کیا ناشتے کی کسر باقی ہے؟“

وہ بولا۔ ”آؤ، چل کر روٹی کھائیں۔ آتما میں کچھ پڑے تو پرماتما کی سوجھتی ہے۔“

میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا کر کھا آؤ۔“

وہ مصر نہیں ہوا بلکہ موضوع بدل کر بولا۔ ”کھالا اور امیر نواز دکھائی نہیں دیتے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟“

کھالے کے غیاب کا علم تھا۔ امیر نواز مجھے گزشتہ شام ملا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ میں نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ کل تو ادھر ہی تھا۔“

”وہ نور پور میں نہیں ہے۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اگر وہ یہاں ہوتا تو اسے یقینی طور پر اس حادثے کا علم ہو جاتا۔ پھر یہ ممکن ہی کس طرح تھا کہ وہ اب تک تمہیں نہ ملتا؟“ دیوانے نے پورے وثوق سے کہا۔

”شاید شہر چلا گیا ہو، کھاد یا اسپرے لینے کے لیے۔“

اس نے کندھے اچکائے، بولا۔ ”اس صورت میں بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔“

میری عدم رغبتی کے باوجود دیوانہ حیات خان کی حویلی میں گیا۔ کار پورچ میں جھانک کر واپس آیا، بولا۔ ”شہرے! خان کی دونوں کاریں، ڈالا، ٹریکٹر اور موٹر سائیکل موجود ہیں۔ امیر نواز نور پور سے باہر نہیں گیا۔“

میں نے بیزاری سے کہا۔ ”تو پھر کیا ہوا؟“

دیوانہ منہ سے کچھ نہیں بولا مگر اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ امیر نواز کی طرف سے مشکوک ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے تشکیک کے تاثرات تو مترشح تھے مگر اپنی کم حیثیت کے سبب منہ سے نہیں بولا تھا، آنکھوں سے بول پڑا تھا۔ اس کی خاموش انگشت نمائی سے میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ امیر نواز، خواہ میرا دوست تھا، خواہ امیر زادہ تھا، جوان مرد تو تھا ہی...... عمر کے اس حصے میں تھا جہاں کسی بھی گھر کی عصمت کو نقب لگا سکتا تھا۔ ایسے میں کئی مختلف اوقات میں امیر نواز کے منہ سے برآمد ہونے والے جملے میرے ذہن میں سانپوں کی طرح کلبلانے لگے۔

”دیکھ شہرے! اپنی بہن کو پڑھاتے رہنا۔ اگر پیسوں کا مسئلہ آڑے آئے تو بے دریغ مجھے کہنا۔“

ایک مرتبہ اس نے کہا تھا۔ ”یار! ان پڑھ عورت بھی کوئی عورت ہوتی ہے، اسے نہ بیٹھنے کا ڈھنگ، نہ چلنے کا سلیقہ...... اس کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ تم لوگ اچھا کر رہے ہو، اپنی لڑکیوں کو پڑھا رہے ہو۔“

مجھے یاد آیا، ایک مرتبہ اس نے پروین کی موجودگی میں کہا تھا۔ ”پروین! پڑھائی کے بغیر انسان جاہل ہوتا ہے، بالکل گدھے کی طرح......“

پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہر عید کے موقع پر پروین کے لیے کچھ نہ کچھ بازار سے خرید لاتا تھا اور کہتا تھا۔ ”اگر اسکول جاتی رہو گی تو ہر عید پر اسی طرح ملنے کے لیے آؤں گا ورنہ کبھی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔“

ایک مرتبہ اس نے کھال کے پختہ نکے پر بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا تھا۔ ”شہرے! جب تمہاری بہن میٹرک کر لے گی تو اسے ہماری ملتان والی کوٹھی میں چھوڑ دینا تاکہ وہ اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھا سکے۔ میں نے بات کر لی ہے، اس کی پڑھائی اور رہائش پر جتنا خرچ ہوگا، بابا کرے گا، تم فکر نہ کرنا۔“

جو باتیں آج تک امیر نواز کو میری نظر میں سربلند کرتی تھیں، آج وہ سیم زدہ بڈھی حویلی کی طرح منہدم ہونے لگی تھیں۔ دیوانے کی نظروں کی تیر زنی جاری تھی اور میں سر تھام کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے مجھے امیر نواز کا محبت بھرا رویہ یاد آتا جا رہا تھا، ویسے ویسے میں تشکیک اور نفرت کی بھیانک اور اتھاہ کھائی میں گرتا جا رہا تھا۔ میں دیوانے کی پروا کیے بغیر حیات خان کی حویلی میں چلا گیا۔ دارے کے سبھی کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنے لیے مختص کیے گئے کمرے میں بھی موجود نہیں تھا۔ جھجک کو بالائے طاق رکھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ اس کی ماں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی۔ ”صبح کا گیا ہوا ہے، لوٹ کر نہیں آیا۔ تم بتاؤ، دھی پروین کا کچھ پتا چلا؟“

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کر کے کریدنے کی کوشش کی۔ ”چاچی! بتا کر گیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ”نہیں...... میں اس وقت سو رہی تھی۔ میں نے رات کو نیند والی گولی کھائی تھی۔“

’’گھر میں کسی کو اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے؟‘‘

’’شاید کسی کو بتایا ہو......‘‘ وہ بولتے بولتے چونکی۔ ’’مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ خیر تو ہے؟‘‘

میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ’’خیر ہی تو نہیں ہے چاچی! ہم پر قیامت آن ٹوٹی ہے، اگر وہ نور پور میں ہوتا تو ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کرتا......‘‘

یہ وہ وقت تھا جب میرے قلب و دماغ میں دکھ، یاس یا دہشت نہیں تھی بلکہ عجیب نوع کی نفرت اور چبھن میرے دل میں بھرنے لگی تھی۔ زنان خانے سے نکل کر دیوانے کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ گھر میں کسی کو بھی امیر نواز کا علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ یہی پتا چلا ہے کہ وہ علی الصباح ہی گھر سے نکل چکا ہے۔

’’میں نہ کہتا......‘‘ دیوانہ بولتے بولتے رک گیا، بات بنا گیا، بولا۔ ’’میں نہ کہتا تھا کہ وہ نور پور میں ہوتا تو اس وقت تمہارے ساتھ ہوتا......‘‘

میرے لہجے میں سانپ کا زہر گھل گیا۔ ’’دیوانے! تم جو کہنا چاہتے ہو، کہہ دو۔ میرے اندر ایسی آگ دہک رہی ہے جس کے سامنے کوئی شعلہ، کوئی چنگاری حیثیت نہیں رکھتی۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پروین کے اغوا میں امیر نواز کا ہاتھ ہے، ہیں؟‘‘

دیوانے کا رنگ فق ہو گیا ہکلا کر بولا۔ ’’نن...... نہیں......م...... میں نے یہ تو......نہیں کہا تم سے!‘‘

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ میرے چہار سمت آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بھی پل میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔ میں بے ارادہ سر جھکائے چلتے ہوئے بخشو لوہار کی دکان کے چھپر تلے آن کھڑا ہوا۔ آج پورا نور پور گم صم اور سنسان دکھائی دیتا تھا۔ یوں کہ جیسے کسی آسیب نے ڈیرا ڈال دیا ہو۔ تمام دکانوں کی طرح بخشو لوہار کی دکان بھی آج بند تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں اور دیوانہ چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، فضا میں تیز نسوانی چیخ گونج اٹھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میں اس آواز کو لاکھوں انسانوں کے شور میں پہچان سکتا تھا۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت اپنی گلی کی طرف دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس، ننگے سر کوئی عورت بجلی کی سی رفتار سے میری گلی سے نکل کر بخت خان کی حویلی کی طرف دوڑ گئی۔ وہ ہمیں محض ایک یا دو پل کے لیے دکھائی دی تھی۔

میں اور دیوانہ بھی بے ساختہ اچھل کر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ میں نے اپنی زندگی کی تمام تر توانائیاں اس چند سو فٹ کی دوڑ پر صرف کر دیں۔

وہ غزالہ تھی جسے میں نے بخت خان کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے تھام لیا۔ وہ سخت خوف اور عجلت کے حصار میں تھی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’شہرے! پروین کوں خان دا پتر امیر نواز کھن گیا ہے...... میں سچ آدمی ہاں پر کوئی من کیتے راضی ای نئیں......‘‘

(شہرے! پروین کو خان زادہ امیر نواز کہیں لے گیا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں مگر کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے)

میں بھونچکا رہ گیا۔ قدرے نیچی آواز میں پوچھا۔ ’’تمہیں کیسے پتا چلا ہے اس بات کا؟‘‘

وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’وہ گھر کے پچھواڑے جنگل کے پار امیر نواز سے ملنے جایا کرتی تھی۔ کبھی دن میں، کبھی رات کو...... میں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ملتے دیکھا ہے۔‘‘

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ’’کیا تم یہ بات پہلے نہیں بتا سکتی تھیں؟‘‘

وہ جلدی سے بولی۔ ’’یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم اس نگوڑی کو تلاش کرو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی۔‘‘

کچھ فاصلے پر دیوانہ کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور غزالہ سے پوچھا۔ ’’تم پاگلوں کی طرح گلیوں میں کیوں دوڑتی پھرتی ہو؟‘‘

’’میں نے چاچے سے کہا تھا کہ پروین کو امیر نواز کہیں لے گیا ہے، اسے تلاش کرو۔ پولیس والے نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ وہ مجھے تھانے لے جائے گا۔ میں ڈر کے مارے بھاگ کر ادھر چاچے بخت خان کی حویلی میں جا رہی تھی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تم حویلی میں جاؤ اور چاچے بخت خان سے بات کرو۔ میں گھر جاتا ہوں۔‘‘ میں نے اسے حویلی کی طرف دھکیلا اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ دیوانہ میرے ہم قدم ہو کر بولا۔ ’’کیا بات تھی؟‘‘

اس کے کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی اس لیے میں نے اسے مختصراً بتایا اور اسے گلی میں روک کر گھر میں گھس گیا۔ گھر کا منظر ویسا ہی تھا، جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور ان کی ملی جلی آوازوں کا شور...... شانو نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں جانے کا کہا۔ کمرے میں کریما پاولی، حیات خان اور چاچا چراغ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں سلام کر کے چاچے کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کریما پاولی اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ’’دیکھ چاچا! تجھے میں نے تصویر کے دونوں رخ دکھا دیے ہیں۔ اب تو جیسا چاہے، میں ویسا ہی کروں گا۔ کیوں جی سردار صاحب؟‘‘

حیات خان گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ پیشانی بل زدہ تھی۔ ایک ذرا توقف کے بعد گلا کھنکار کر بولا۔ ’’سیدھی پدھری بات تو یہ ہے کہ میرا پتر ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ غزالہ دھی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔‘‘

میں نے چونک کر حیات خان کو دیکھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ اس کی سفید چادر پر دھبا لگ چکا تھا تبھی اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ چاچے چراغ کا جھکا ہوا سر اٹھا نہیں، بھنچے ہوئے لب وا نہیں ہوئے بلکہ ایک گہری آہ سینے سے خارج ہوئی اور اس نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

کریمے نے بے صبری سے پوچھا۔ ’’تم نے کوئی جواب نہیں دیا چاچا؟‘‘

غیر معمولی تاخیر کے بعد چاچے کی آواز کمرے میں سسکی کی طرح گونجی۔ ’’حیات خان اس گھر کا رکھوالا ہے۔ رکھوالے کا پتر ہی سیندھ لگالے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ میں حیات خان کے پتر کے خلاف پرچا نہیں کٹواتا۔ تم سب لوگ چلے جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔‘‘

حیات خان تڑپ کر بولا۔ ’’نہیں ...... ! اگر تمہیں یقین ہے کہ امیر نواز تیرا مجرم ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں مگر تم یہ نہ کہو کہ رکھوالے کے بیٹے نے گھر میں نقب لگائی ہے۔ اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو میری اور تمہاری رگوں میں ہے۔ وہ کسی کو قتل تو کر سکتا ہے، کسی کے ہاتھ پیر توڑ سکتا ہے مگر...... نہیں چراغ دینا...... نہیں! وہ کسی کی بانہہ کا چور نہیں بن سکتا۔‘‘

چاچے کا جھکا ہوا سر اٹھا۔ نم مگر دہکتی ہوئی آنکھیں حیات خان کے چہرے پر ٹھہر گئیں، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں لفظ لفظ چبا کر بولا۔ ’’خان! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ میرے تن پر ماس نہیں رہا مگر کیا ہوا...... پچکی ہوئی رگوں میں خون اور خون میں غیرت تو موجود ہے ناں! اگر رب سوہنے نے توفیق دی تو میں اپنے مجرم سے نمٹ لوں گا۔ تم میرے مجرم نہیں ہو...... جاؤ! اپنے پتر کو جتنا بھی چھپانا چاہو، میری نظروں سے چھپا لو۔ جاؤ...... مجھے کوئی پرچا ور چا نہیں کٹوانا۔‘‘

حیات خان اور کریما پاولی تا دیر چاچے کو نرم اور لچھے دار گفتگو کے بل پر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر ’اللہ بیلی‘ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ میں نے چاچے کے دونوں لرزیدہ ہاتھ تھام لیے، کہا۔ ’’چاچا! حوصلہ کرو۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہماری بانہہ امیر نواز کے پاس ہے۔ اگر یہ فیصلہ ہو گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔‘‘

چاچے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگا۔ اچھا تھا کیونکہ رونے سے اندر کا غبار کم ہو رہا تھا۔ میرے اندر بھی حبس بھرا ہوا تھا جس میں زار و قطار رونے سے کچھ کمی واقع ہوئی تو میں گھر سے نکل آیا۔ دیوانے کو گلی میں ٹھہرا کر گیا تھا مگر اب وہ گلی میں کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید مایوس ہو کر چلا گیا تھا۔

گھر میں ویرانیاں اپنا تسلط جما چکی تھیں۔ کسی کے حلق سے ایک نوالہ تک نہیں اترا تھا۔ اگر وہ کسی بیماری یا حادثے میں مر جاتی تو گھر پر صرف دکھ کے سائے چھاتے، ندامت اور پریشانی کی آگ ہر ذہن میں دہک نہ اٹھتی۔ نور پور کی قدیم روایتی بستی میں بیٹی یا بہن کا یوں گھر سے جانا خاندان کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دینے کا سبب بنتا تھا۔ چونکہ آج تک اتنا بڑا قصہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا اس لیے میرے گھر سے اٹھنے والے پہلے شعلے نے آن کی آن میں پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ میری اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی۔ اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ اسے چھونے والی ہوا غیرت کی سانسوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اب نجانے کس حال میں تھی؟ یہی خیال اپنی سنگین لپیٹ میں ذہن کو دبوچے رہا اور میں شب بھر جاگتا رہا۔ کبھی کمرے میں اس کے استعمال کی چیزوں کو کھنگالتے، کبھی کھوجیوں کی طرح صحن میں ثبت پیروں کے ہزاروں نشانات میں سے اس کا نقش پا کھوجتے اور کبھی دیوانوں کی طرح نور پور کی گلیوں میں اس کی ناکام تلاش میں گھومتے...... دن چڑھ گیا مگر میری غیرت کا ڈوبا ہوا سورج طلوع نہیں ہوا۔ گھر کی تینوں عورتوں نے اپنے دوپٹے اپنے سروں پر کس کر باندھے ہوئے تھے اور دس بجنے تک چولھے میں آگ نہیں جلائی گئی تھی ہمسایہ گھروں سے ناشتا پہنچایا گیا جسے ان کے بے حد اصرار پر زہر مار کیا گیا۔ مجھ سے تو ایک روٹی بھی معدے میں اتاری نہیں جا سکی۔ کم و بیش سب کا حال ایسا ہی تھا۔

دس بجے کے قریب میں گھر سے نکلا۔ کھالے اور امیر نواز کا پتا کیا۔ دونوں غائب تھے۔ دیوانے کے گھروندے پر جا کر کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، اس کی ہمدردی آمیز باتوں کا ’ہوں، ہاں‘ میں جواب دیتے ہوئے من میں جلتی

ہوئی آگ کو چھیڑتا رہا جو دم بہ دم بجھنے کے بجائے بھڑکتی جا رہی تھی۔ دوپہر تک میں دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پروین یا تو اپنی رضامندی کے ساتھ امیر نواز کے ساتھ چلی گئی تھی یا پھر امیر نواز نے اسے کسی طریقے سے اغوا کرلیا تھا۔ مجھے کچھ تحفظات کا غیر یقینی احساس ہوا بھرے پُرے گھر میں، اتنی خاموشی اور دیدہ دلیری سے جوان لڑکی کو اغوا کیا جانا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ یقینی طور پر کمرے سے یا گھر سے اپنے پیروں پر چل کر نکلی تھی۔ صحن میں یا گلی میں اس کے ساتھ غیر متوقع حالات پیش آئے تھے۔

کوئی بھی ایسے حالات رونما نہیں ہوئے تھے جن کے پیش نظر وہ گھر سے چوری چھپے، رات کی تاریکی میں ہمیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ کرتی۔ میں اسے بے پناہ چاہتا تھا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ چاچا اور چاچی بھی اس کی بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ اسے اتنا اعتماد حاصل تھا کہ اگر وہ امیر نواز سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو کہہ دیتی اور ہم سب مان جاتے۔ امیر نواز نہ تو غیر برادری سے تعلق رکھتا تھا، نہ ہی اوباش فطرت اور مفلس تھا اور نہ ہی ہمارے درمیان دشمنی کی خلیج حائل تھی۔ اگر دیانت داری کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حقیقت تھی کہ اگر سردار حیات خان اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگتا تو ہم بخوشی اسے بانہہ تھما دیتے۔

ہزار دوستی اور تعلقات کے باوجود امیر نواز بخوبی سمجھتا تھا کہ پروین پر میلے ہاتھ تو کجا، میلی نظر بھی ڈالے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے بھی چوری چھپے پروین کو بھگا لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب اس کی پوزیشن اور کردار کو ذہن میں کھنگالا جاتا تو دل اس کی طرف سے تشکیک زدہ ہو جاتا۔ اگر اس کا پروین کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ غائب کیوں تھا؟ کہاں چلا گیا تھا؟

بہر حال یہ طے تھا کہ طویل عرصے سے دونوں چوری چھپے ملتے چلے آ رہے تھے۔ غزالہ ان کی ہم راز تھی۔ پروین اسے اپنے دل کی بات بتا دیا کرتی تھی۔ غزالہ کی حالت زار بہت ابتر تھی۔ گھر میں ہر کوئی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا اور لعن طعن کر رہا تھا۔ میں نے بہ دقت تمام اس سے پروین اور امیر نواز کے مابین تعلقات کی نوعیت دریافت کی تھی۔ اس کی سنائی ہوئی روداد کے مطابق دو سال پہلے امیر نواز نے اسے پہلی مرتبہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ پروین نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی جس سے شہہ پاکر امیر نواز نے ایک خط اسے لکھا۔ پروین نے یہ خط غزالہ کو پڑھایا تھا۔ پھر دونوں اطراف سے خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔ امیر نواز ہر صبح اسکول کے راستے میں اسے دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے موجود ہوا کرتا تھا۔ خطوں کے تبادلے کے نتیجے میں دونوں چوری چھپے ملنے لگے مگر ان کے درمیان دیوانگی آمیز اور بے سروپا باتوں کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان کی چاہت زبانی اظہار تک محدود تھی اور غزالہ کے بقول دونوں نے اپنی اخلاقی حدود کو کبھی عبور نہیں کیا تھا۔

میں نے پروین کو ہمیشہ بچی سمجھا تھا۔ وہ پوری قامت کے ساتھ اس طرح میری نظروں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی کہ میری نظر میں دنیا کی تمام قامتیں بے اعتبار ہوکر رہ گئی تھیں۔ امیر نواز کے بارے میں، میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ اس کی عیاشیاں دیکھی تھیں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنا ماس کھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شاہ جی اور سردار بخت خان کی سوئیاں پروین کے اغوا پر اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ امیر نواز کو اتنا گھٹیا اور بدقماش فطرت سمجھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ خودشش و پنج کا شکار تھے اور میری رہنمائی کرنے سے معذور دکھائی دیتے تھے۔ پولیس والے بے نیل مرام گئے تھے۔ کریماں پادلی یا کوئی بھی اہل کار دوبارہ نور پور میں دکھائی نہیں دیا تھا چونکہ سردار حیات خان کے بیٹے کا نام اس واقعے سے منسلک ہو چکا تھا، اس لیے جو بھی ہوتا، وہ ہمارا ساتھ نہ دیتے۔ اب تو انہیں بڑا مضبوط جواز مل گیا تھا کہ ہم نے پرچا کٹوانے اور قانونی کارروائی کروانے سے بالکل انکار کر دیا تھا البتہ سردار حیات متفکر تھا۔ وہ اس آگ کی تپش اور طاقت کو بخوبی جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ اگر گھر پہنچنے سے قبل مجھے یا چاچے چراغ کو دکھائی دے جاتا تو اس کا زندہ بچنا محال تھا۔

مرگ کی چٹائی دو تین دنوں بعد سمیٹ لی جاتی ہے۔ غیرت کے جنازے پر کبھی مٹی نہیں ڈالی جاتی بلکہ کرید کرید کر شعلوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ میرے گھر کی صورتِ حال بالکل ایسی ہی تھی۔ اس عزت پاش واقعے کو گزرے تین روز ہو گئے مگر نہ تو پروین اور امیر نواز کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی آہ و بکا اور سسکیوں کو قرار آیا۔ بات نور پور سے نکل کر اطراف کے دیہاتوں میں پھیل گئی تھی اور چاچے اور چاچی کے ملنے والوں کی آمد کا ناگوار سلسلہ چل نکلا۔ لوگوں کی ہمدردی بھرے جملے تیز نشتر بن کر دل و دماغ کو چھلنی کرکے رکھ دیتے مگر زبان دانتوں میں رکھ کر سیکڑوں سنا پڑتیں اور یقین دلانا پڑتا کہ وہ گھر سے بھاگی نہیں بلکہ کسی بے غیرت دشمن نے اسے اغوا کیا ہے۔ سردار حیات اور ہمارے گھر میں دشمنی کے

واضح اثرات نمودار ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ بات چیت کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ سردار بخت خان، امان اللہ قریشی اور سائیں دل جیت شاہ افسوس کرنے کے لیے آئے تھے مگر دریام خان اور حیات خان نے دوبارہ ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

جمعہ کے روز، جب سبھی دکانیں بند تھیں اور میں بخشو لوہار کی دکان کے باہر دھرے ہوئے ہماچے پر پہلو کے بل نیم دراز تھا، میری نظروں کے عین سامنے سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ آن رکی۔ میں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں کار سے شناسائی کی ایک موہوم سی رمق جاگی مگر جونہی پچھلا گیٹ کھلا اور میرو شاہ کی شکل دکھائی دی، فوراً یاد آ گیا کہ میں اس کار میں بیٹھ کر میڈم شکیلہ کی کوٹھی سے نکلا تھا اور لاری اڈے پر گیا تھا۔

چونکہ گزشتہ ایام میں میرے ذہن پر ہمہ وقت پروین چھائی رہی تھی اس لیے مجھے میڈم ایک پل کو بھی یاد نہیں آئی تھی۔ میڈم کی دی ہوئی خطیر رقم میرے ٹرنک میں جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ جونہی میرو شاہ کی شکل دکھائی دی، مجھے ملتان میں بیتے ہوئے پُرعذاب لمحات یاد آ گئے۔ میں چارپائی سے اترا اور بانہیں کھولے اپنی جانب آتے میرو شاہ سے لپٹ گیا۔ اب تک شاید کوئی غمگسار نہیں ملا تھا، اس لیے اس سے گلے ملتے ہی آنسو چھلک پڑے اور میں بلک بلک کر رونے لگا۔ میرو شاہ گھبرا گیا۔ مجھے خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر میری گرفت سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”اڑے غنچے! بولے بھی تو...... کس نے تیرے پر ہاتھ ڈالا، جیادتی (زیادتی) کی...... قسم ماڑے کو اپنی ماں کی، خون کر دیوے ہے اس کم جات (کم ذات) کا...... پر تو بولے بھی تو سہی ناں!“

میرے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ نہ میرا رونا تھمتا ہے، نہ ہی میں کچھ بتاتا ہوں تو اس نے ڈرائیور کو بلا لیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور غیر معمولی مستعدی سے کار موڑ لی۔ مجھے پروا نہیں تھی کہ وہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے، جانا چاہیے یا نہیں...... میں تو بس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گردوپیش سے لاتعلق تھا۔ قریشی موڑ سے نکلتے ہی کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ مظفر گڑھ کے قریب ایک جگہ پر میرو شاہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”ماڑے مٹھو! ادھر ایک جانب کو اڑن کھٹولا روک دیوے ہے۔ یہاں سگنلز آ رہے ہیں ماڑے فون پر...... ہاں ادھر ہی روک ناں!“

میں چونکا۔ شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ ہم مظفر گڑھ شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور مضافاتی آبادی کے بکھرے بکھرے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کار رک گئی۔ میرو شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، بولا۔ ”اڑے لاڈے میاں! اب بول بھی دیوے کہ یوں جنانیوں (زنانیوں) کی طرح کیوں ٹسوے بہاوے ہے؟ کیا تکلیف ہووے ہے تیرے کو؟“

میں ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کی طرف سے قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ پروین کی تلاش میں دونوں اپنے تمام تر خلوص اور طاقت کے باوجود میرے کسی کام نہیں آ سکے تھے۔ وہ میری طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ایسے میں میرو شاہ کی آمد میرے لیے بہت بڑا امکانی سہارا ثابت ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کی پروا کیے بغیر اسے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ امیر نواز اور پروین کے بارے میں، جو کچھ سن رکھا تھا، بلاکم و کاست بتا دیا۔ وہ بڑی خاموشی سے سنتا رہا، پھر بولا۔ ”ہائے غنچے! یہ تیرے کو کن مصیبتوں نے دیکھ لیا ہووے۔ ایک سے بھاگے تو دوجی تیار ملت ہے۔ ہائے ہائے! کر ماں والا کسی کو بھی ایسی بےعجتی (بےعزتی) کا منہ نہ دکھاوے تو بھلا ہے۔“

اس دوران اس نے اپنے ننھے سے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ چونکہ وہ میرے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اس لیے اسپیکر سے پھوٹنے والی میڈم کی آواز پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر میرو شاہ نے مختصر الفاظ میں، اپنے مخصوص انداز میں، میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا۔ میڈم نے کچھ پوچھا، کچھ باتیں کیں پھر میرو شاہ نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موبائل فون پکڑا اور کان سے لگایا۔ میڈم کی مترنم اور پُراعتماد آواز سماعت میں اتری۔ ”شہریار! مجھے بہت دکھ ہوا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اب جبکہ ہو چکا ہے تو اس کے ہونے کے دکھ سے نکل کر اس کے ازالے کے لیے توانائیاں صرف کرنا چاہئیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فوراً ہی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ مجھے سن رہی تھی، دیکھ نہیں رہی تھی کہ میرا اوپر نیچے حرکت کرتا ہوا سر اسے نظر آتا۔ میں نے کہا۔ ”جی میڈم!“

”میرے خیال میں تمہاری بہن کو اغوا کیا گیا ہے اور یہ کام سائیں بھی کر سکتا ہے۔ کیا تم نے اس رخ سے سوچا ہے اب تک؟“

میں چونکا۔ ”سائیں؟ یعنی سائیں دل جیت شاہ؟“

''ہاں وہی لیکن اگر اس نے اغوا کیا ہے تو پھر امیر نواز کہاں گیا؟'' میڈم رائے دینے کے بعد خود ہی متضاد سوچ میں الجھ گئی۔ ''میں چند وجوہات کی بنا پر نور پور نہیں آ سکتی وگرنہ وہاں آ کر تمہاری مدد کرتی۔ تم ایسا کرو کہ دل جیت پر پکا ہاتھ ڈالو اور اس سے اگلوانے کی کوشش کرو کہ اس نے تمہاری بہن کو اغوا کرنے کے بعد کس کے حوالے کیا۔ اگر تم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر تمہاری بہن جانے اور میں جانوں، ایک دن میں ہی بازیافت کروا کر تمہارے حوالے کر دوں گی۔''

''مگر میں دل جیت سے کس طرح یہ پوچھ سکتا ہوں؟ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔'' میں نے نیم دلی سے کہا۔

''تم نے یہ کام کس طرح کرنا ہے، یہ تم پر ہی موقوف ہے۔ میں مدد نہیں کر سکتی۔'' وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔ ''یہ بتا دیتی ہوں کہ تمہارے خانزادے بھی اس کے پارٹنر ہیں۔ اس کی پشت پناہی سردار حیدر خان کرتا ہے۔ جو بھی کرتا نہایت رازداری سے کرتا۔''

''میڈم! کیا آپ کو یقین ہے کہ دل جیت نے ہی......''

''ہاں! میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت کمینہ انسان ہے۔'' میڈم کے لہجے میں غیر معمولی نفرت کی آمیزش تھی۔ ''نہ ہی آسانی سے زبان کھولنے والا ہے وہ۔ تم پکا ہاتھ ڈالو گے۔ اپنا کام کرنے کے بعد فوراً میرے پاس چلے آنا ورنہ اس کے اندھے مرید اور حصہ دار خانزادے تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔''

''مگر میڈم! وہ کیوں میری بہن کو اغوا کرے گا؟''

''اس بات کا تمہیں جلد علم ہو جائے گا۔'' میڈم کے لہجے میں قدرے مختلف نوعیت کا چیلنج چھپا ہوا تھا، بولی۔ ''شہریار! وہ الو کا پٹھا آسانی سے کچھ نہیں بتائے گا۔ تمہیں دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔''

''مجھے سچ جھوٹ کا کیسے پتا چلے گا؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تم نے اس سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ اس نے تمہاری بہن کو کس کے حوالے کیا ہے۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ انگلیاں ٹیڑھی کرنے کے ساتھ ساتھ تم اپنے دماغ کے گھوڑوں کو سیدھی راہ پر دوڑا دو گے۔ وہ صرف تین آدمیوں کو سپلائی دیتا ہے۔ سردار حیدر خان، فقیرو مگسی اور جی ایم کو...... اگر ان تینوں کے علاوہ کسی کا نام اس کی زبان پر آئے تو سمجھو کہ جھوٹ بکتا ہے......''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی، اچنبھے سے بولا۔ ''سردار حیدر خان؟''

''فضول حیرانی مت دکھاؤ، تم سب کو جانتے ہو مگر حقیقت میں کسی کو بھی نہیں جانتے۔ یہ دعا کرو کہ اس نے تمہاری بہن کو سردار حیدر خان کے حوالے نہ کیا ہو ورنہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ دوسرے دونوں میری مٹھی میں ہیں۔'' میڈم نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ جو باتیں کہہ چکی ہوں، ان پر عمل کرو اور وقت ضائع نہ کرو ورنہ تمہاری بہن بہت دور چلی جائے گی۔ ممکن ہے دیر ہونے کی صورت میں وہ میری دسترس سے بھی نکل جائے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ بائے!''

میڈم نے فون بند کر دیا اور میں چند لمحوں تک موبائل فون کو کان سے لگائے بیٹھا رہا پھر میرو شاہ کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''میڈم کہتی ہے کہ......''

اس نے میری بات کاٹ دی، بولا۔ ''ماڑے کانوں نے سب کچھ سن لیوت ہے۔ وہ جو کہتی ہے، ٹھیک کہتی ہے۔ اس کے حکم پر عمل کرو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میرو شاہ نے ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کا حکم دیا۔ چوک قریشی پہنچ کر میرو شاہ نے کار رکوائی اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''لے بھئی غنچے! ویگن پر بیٹھ کر نور پور چلا جاوے ہے اور ہاں! تیرے کو اتنا بتا دیوت ہے میرو شاہ کہ جب تک تیرے کو سوچنا ہے، تب تک تیری بہن اس دنیا سے چلی جاوت ہے۔ جو کرنا ہے، ان باجوؤں (بازوؤں) سے کرو۔ تیرے کو میڈم شکیلہ پیار کرے ہے تو اس کا مطلب یہ ہووت کہ تم سے جیادہ (زیادہ) طاقت ور خان جادے (خانزادے) نہ ہووے ہیں۔ میڈم میدان میں نکل آوے تو ان لونڈوں کی ایسی کی تیسی ہو جاوے گی۔ ڈر کاہے کا، رب کی جات (ذات) کا، بندہ تو ایک سات رپے کی گولی کو بھی نہ روکنے کا ہووے...... آجما (آزما) کر دیکھ لیوے ہے۔''

میں کار سے اترنے لگا تو اس نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ بولا۔ ''ارے جالم (ظالم)! تیرے پاس کوئی ٹھا کا شا کا ہووت ہے؟''

ساتھ ہی اس نے داہنی شہادت انگلی کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے پستول کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں تو......''

اس نے جلدی سے قمیص کا اگلا دامن اٹھایا، نیچے پہنے ہوئے سلوکا نما چولے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھا سا پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔ دوسری جیب میں سے بیس کے قریب گولیاں بھی نکال کر میری جھولی میں ڈال دیں بولا۔ ''اڑے لاڈے! یہ

میگ جین (میگزین) والا اصلی ولایتی پستول ہووے ہے، سو گولیاں چلاویں تب بھی گرم نہ ہووے ہے...... لے اب جا! آگ بن جا۔ جو تیرے راستے میں آن کھڑا ہووے، اسے آگ لگا دیوت...... جا ماڑے لاڈے جا!''

میں نے عجیب سے احساسات سے مغلوب ہو کر اسے دیکھا اور پھر احتیاط سے پستول اور گولیوں کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ دونوں سے ہاتھ ملا کر ویگن اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ویگن نور پور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی واپسی میں خاصی دیر تھی۔ میں ویگن اڈے والے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ چائے کا آرڈر دے کر میرو شاہ اور میڈم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اتنا اہم نہیں تھا جتنا ان دونوں نے مجھے اہم بنا دیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اپنی بغلی جیب کو ٹٹولا۔ پستول کی موجودگی کا احساس بڑا جاندار تھا۔ ایک آگ میرے دل میں جل اٹھی تھی۔ دوسری آگ فولادی پرزے کے اندر بھڑک نکلنے کو بے تاب تھی۔ چائے سے پہلے عزت خان اور شیدو پہنچ گئے۔ میرا اترا ہوا چہرہ اور ناگفتہ بہ حلیے کی بدولت وہ فی الفور سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے روایتی جملہ بازی نہیں کی۔ عزت خان نے اپنے لیے چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مستفسر ہوا۔ ''استاد کھالے کا کچھ پتا چلا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شیدو نے کہا۔ ''استاد شہرے! منظور درزی کے پاس جاؤ گے؟''

وہ مجھ سے بالواسطہ طور پر عاشی کو دیکھنے کے لیے جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے منہ بنایا۔ ''نہیں یار! میں نور پور جاؤں گا، تمہارے ساتھ۔''

ویگن کی روانگی کا وقت ہو گیا اور عزت خان نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا جھکا ہوا سر اور ڈھلکا ہوا بدن متحرک ہو گیا۔ طویل سانس حلق میں اتارتے ہوئے ہماچے سے اترا اور ویگن کے پائیدان پر آن کھڑا ہوا۔ شیدو نے میرے لیے ویگن میں بیٹھنے کی جگہ بنانے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک دیا۔ میں کھلی ہوا میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

میں نے پستول اور گولیاں اپنے ٹرنک میں چھپا دیں۔ سبھی گھر والے ڈیرے پر گئے ہوئے تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے مال مویشیوں کی چنتا بھی عنقا تھی۔ انہیں سنبھالنا ضروری تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہمسائیوں نے دو تین دن تک پانی اور چارے کا انتظام کیے رکھا تھا۔ زیادہ دنوں تک اپنا معمول کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ڈیرے کا کام کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ویسے بھی زندگی کی گاڑی کو، جس بھی حال میں ہو، دھکیلنا پڑتا ہے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ یاد آیا، صدف بی بی نے آنے کا کہا تھا مگر نہیں آئی تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ آنا چاہتی بھی تو کس طرح آ سکتی تھی۔ صدف بی بی کی طرف میرا دھیان زیادہ دیر تک نہیں رہ پایا، میں اپنی آگ میں لوٹ آیا۔ میڈم اور میرو شاہ کی ہدایات کے بارے میں سوچنے لگا۔ میڈم اتنی بڑی بات بغیر کسی ثبوت کے کیسے کہہ سکتی تھی کہ پروین کے اغوا کے پیچھے دل جیت شاہ کی کمینگی جاگزین تھی۔ کیا دل جیت اس کا دشمن تھا؟ اور وہ میرے ذریعے سے اپنے دشمن کو زک پہنچانا چاہتی تھی؟

میں نے چاچی وغیرہ کے آنے تک بہت سوچا مگر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں نہ تو میڈم شکیلہ کو اچھی طرح جانتا تھا، نہ دل جیت کو اور نہ ہی خانزادوں کو۔ کھانا زہر مار کیا اور لیٹ گیا۔ نیند حسبِ سابق آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کرتا تو پروین کی شبیہ ابھر کر سامنے آ جاتی۔ کبھی روتی پیٹتی دکھائی دیتی، تو کبھی ایک دم ساکت اور سپاٹ...... وہ بولتی نہیں تھی۔ مجھے بتاتی نہیں تھی کہ وہ کہاں تھی۔ بس یک ٹک مجھے دیکھتی رہتی تھی۔

ایسے میں کھالے کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ ہوتا تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہ چھوڑتا۔ اپنی عقل کے مطابق مشورے اور دلاسا دیتا۔ کوئی راہ نکالنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا...... مگر وہ کہیں جا کر غائب ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ موبی کے غیر متوقع قتل پر خوف زدہ ہو کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ لاہور یا کراچی کی طرف نکل گیا ہو۔ چونکہ وہ ماہر ڈرائیور تھا اس لیے اسے بہ آسانی کہیں بھی نوکری مل سکتی تھی۔ ڈرائیوری کی وسیع و عریض فیلڈ میں رہائش اور طعام کی سہولتیں بہ آسانی حاصل ہو جاتی تھیں۔

میں فطرتاً بزدل نہیں تھا۔ میں نے کالج کے ایام میں اپنی تنظیم کے کارندوں کے ساتھ مل کر خوفناک مشن انجام دیے تھے۔ بہت کچھ سیکھا تھا۔ نور پور میں آتے ہی میں ہر اس کام سے تائب ہو گیا تھا جو میرے لیے یا پروین کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ میری احتیاط روی کام نہیں آئی تھی۔ میری جان سے پیاری پروین اس وقت ناکردہ گناہوں کی پاداش میں نجانے کس عذاب سے گزر رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ دل جیت شاہ کی سرگرمیاں بھلے میری نظر میں مشکوک تھیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ لڑکیوں کو اغوا کرتا بھی تھا تو نور پور سے دور واردات کرتا ہوگا۔ میڈم کی سوچ اس کے برعکس تھی۔ وہ مصر تھی کہ دل جیت نے ہی پروین کو اغوا کیا

ہے۔ نصف شب کا عمل تھا جب کوئی بھی فیصلہ نہ کر پاتے ہوئے میرا دماغ پھٹنے کو آ گیا۔ بے اختیار خود کو لعن طعن کرنے لگا۔ میری جوانی لاحاصل، میری طاقت نامراد...... جو مرد اپنی بیٹی یا بہن کو تحفظ نہ دے سکے، اس کا جینا اور مرنا ایک برابر ہوتا ہے۔ میں نے بے رحمی سے سوچا۔ ''تو کیا مجھے مر جانا چاہیے؟''

کھالا کہتا تھا کہ پڑھا لکھا بندہ کچھ بھی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ بزدل ہوتا ہے۔ سوچنے میں قیمتی وقت ضائع کر دیتا ہے۔ جب پانی سے سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تب اس کے ہڈ پیر ہلتے ہیں اور پھر وہ منہ کی کھا کر اپنی جھلی (بستر) میں چھپ جاتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ''کیا میں واقعی ایسا ہوں؟ پڑھ لکھ کر میں نے اپنے خاندان کو بٹا لگا دیا۔''

میں نے خود کو ٹٹولا۔ دل جیت آسان شکار نہیں تھا۔ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنا تو کجا، اس تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ میں کیا کروں؟ اسی ادھیڑ بن میں غرق تھا کہ صحن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور جست بھرنے کے سے انداز میں باہر کی طرف بھاگا۔ صحن کے شمالی گوشے میں پانی کے گھڑے رکھنے والی گھڑونجی (چوبی اسٹینڈ) پر کسی کو جھکے دیکھا۔ آدھے چاند کی روشنی میں پہلی نظر کو ہی باور ہو گیا کہ وہ شانو تھی۔ وہ ایک گھڑے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا مگر وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ پانی بھر رہی ہوتی تو پانی کٹورے میں ڈال کر سیدھی ہو جاتی...... میں جلدی سے اس کے عقب میں پہنچا۔ پتا چلا کہ وہ گھڑے پر ماتھا لگائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، کہا۔ ''کملی تھی گئی ہیں شانو! میڈے ول ویکھ......''

(شانو! پگلی ہو گئی ہو کیا، میری طرف دیکھو)

اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، سیدھی ہوئی اور پیروں پر پلٹ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے شانو! کیوں رو رہی ہو؟''

یوں، جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو، مجھے یک ٹک دیکھے گئی۔ میرے جھنجوڑنے پر اس نے سرد آہ سینے میں اتاری اور بولی۔ ''تیڈے مان تے اساں ڈوہیں بھیناں آکڑتے ٹردیاں ہاسے...... پر توں تاں اپنی پروین جوگا وی نویں نکتا......''

(ہم دونوں بہنیں تمہارے بھروسے پر اکڑ کر چلا کرتی تھیں۔ آج پتا چلا کہ تم اپنی بہن کو بچانے کے قابل بھی نہیں ہو)

اس کے شعلے اگلتے جملے نے مجھے زمین میں گاڑ دیا۔ مجھ پر ایک نگاہ عجب ڈال کر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ہنسی نے میرے روم روم میں وہ زہر اتار دیا تھا جس نے آن کی آن میں مجھے خاکستر کر دیا تھا۔

میں جو فیصلہ نصف شب تک نہیں کر پایا تھا، اس کے ایک جملے اور خون آشام ہنسی نے کر دیا۔ چاچا چراغ بوڑھا تھا۔ زیادہ زور لگاتا تھا تو کھانسنے لگتا تھا۔ انجر پنجر ہل کر رہ جاتا تھا مگر اس کے کانوں میں پروین کے ساتھ جونہی امیر نواز کا نام پڑا تھا، اس نے حیات خان سے کہہ دیا تھا کہ میں پرچا نہیں کٹواؤں گا بلکہ اپنے مجرم سے خود نمٹوں گا۔ اس کے بوڑھے دل نے غیرت کی آنچ پر جوانی کا پلو تھام لیا تھا۔ میرا جوان دل ابھی اندیشوں میں مبتلا تھا...... مجھے اپنے وجود سے ایک لمحے کو گھن آئی اور میں دانت پیس کر اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میرے انگ انگ میں غیر معمولی مستعدی بھر گئی تھی۔

ملتان کالج کے ہاسٹل میں لی گئی تربیت آج کام آنے والی تھی۔ میں نے میرو شاہ کا دیا ہوا پستول نکالا، اسے بہ نظر احتیاط چیک کیا اور میگزین لوڈ کر کے بغلی جیب میں ڈال لیا۔ ننھا سا جرمن ساختہ پستول دیکھتے ہی اس کی ہلاکت خیزی کی خبر ہوتی تھی۔ یہ آٹو میٹک تھا۔ پہلی گولی چڑھانے کے لیے بولٹ کھینچنا پڑتا تھا۔ پھر خودکار انداز میں گولیاں میگزین سے نکل کر اسٹروک پن کے سامنے آتی جاتی تھیں اور ٹریگر دبانے پر موت بانٹنے لگتی تھیں۔ میں نے اضافی گولیاں بھی اٹھا لیں۔ آنے والے وقت میں کس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، اس خیال کے پیش نظر میں نے میرو شاہ کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی نکالی، پن نکال کر آدھی جیب میں اور آدھی ٹرنک میں رکھ چھوڑی۔ کھالے کا تحفہ نظر آیا تو میں نے خنجر بھی اٹھا لیا۔ وہ تقریباً نو انچ پھل والا دودھاری خنجر تھا جس کا دستہ کلپ لاک والا تھا۔ ہاتھ میں پکڑ کر کلپ چڑھا دیا جاتا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر نہیں سکتا تھا اور نہ ہی چھینا جا سکتا تھا۔ وہ خوبصورت اور نفیس چرمی کور میں لپٹا ہوا تھا اور اسے بہ آسانی پنڈلی کے ساتھ تسموں کی مدد سے باندھا جا سکتا تھا۔ میں نے کھالے کو کئی مرتبہ پنڈلی پر باندھتے ہوئے دیکھ رکھا تھا۔ کرکٹ کھیلنے والے جاگر بوٹ پہنے، منہ پر ڈھاٹا باندھنے کے لیے سیاہ پھولدار صافہ اٹھایا اور ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

چاند اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا جب میں دل جیت کی حویلی نما رہائش گاہ کے عقب میں کھڑا ڈھاٹا

باندھ رہا تھا۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ امیر نواز کون تھا؟ پروین کے ساتھ ہی کیوں غائب ہوا تھا؟ دل جیت کے اثر و رسوخ کی طاقت کیا تھی؟ میں تو بس یہی جانتا تھا کہ مجھے مرنا ہے یا دل جیت سے دریافت کرنا ہے کہ اس نے پروین کو کس بے غیرت کے حوالے کیا تھا۔ مجھے اس سے بھی سروکار نہیں تھا کہ میڈم شکیلہ نے سچ کہا تھا یا اس نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام دل جیت پر لگایا تھا۔

میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں تھام لیا، بولٹ کھینچ کر گولی چڑھائی اور حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے پارکنگ کی دیوار سے جھانک کر مزار کے صحن اور ہال کی کھلی ہوئی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ نہ کوئی شخص دکھائی دیا اور نہ ہی ہال کی بتیاں روشن تھیں۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی اس چھت پر چوروں کی طرح چڑھ چکا تھا۔ پہلے ننگے پیر تھا، بہ آسانی چڑھ گیا تھا۔ اب میں نے اسپورٹس جوگرز پہن رکھے تھے۔ کچھ دقت ہوئی مگر چڑھ گیا۔ احتیاط سے جھانک کر دیکھا۔ سوئے ہوئے محل میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں کمروں اور برآمدوں کی ساجھی منڈیروں پر چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ انہی سیڑھیوں کے نیچے دل جیت کا کمرا تھا جس میں اس وقت وہ اپنی کسی بیوی کے ساتھ محوِ استراحت تھا۔ اس کے کمرے کی بتی گل تھی یا زیرو کا بلب روشن تھا جس کی روشنی باہر تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ میں دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر برآمدے میں آ گیا۔ حویلی تین طرف سے کمروں اور چوتھی جانب سے بڑے ہال سے گھری ہوئی تھی۔ ہال کے ساتھ ہی حویلی سے نکلنے کے لیے بڑا آہنی گیٹ نصب تھا۔

میں اوکھلی میں سر دے چکا تھا۔ سر کو بچانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور بجا طور پر میں اس وقت سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آگ اندھی ہوتی ہے۔ میرے اندر بسیرا کرنے کے بعد اس نے میرے ادراک کی آنکھیں بھی بند کر دی تھیں۔ میں پستول ہاتھ میں لیے دروازے تک پہنچا۔ دھکیل کر دیکھا، میری خوش بختی عروج پر تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا دھکیل کر اندر جھانکا۔ زیرو واٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں جہازی سائز کے بڑے سے بیڈ کے عین وسط میں سائیں دل جیت پہلو کے بل لیٹا دکھائی دیا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ میں بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں سائیں دل جیت کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ہلکی آواز میں گونجنے والے خراٹے اس کی گہری نیند کی خبر دے رہے تھے۔

کمرے کی تعمیر دیہاتی طرز کی تھی جبکہ تزئین جدید خطوط پر کی گئی تھی۔ فرش بہت نرم قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور بیڈ کا چکر کاٹ کر سائیں کے چہرے کے رخ آن کھڑا ہوا۔ وہ گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ میں تیزی سے بیڈ کے دوسری جانب پہنچا۔ چونکہ میں نے ربر کے سول والے اسپورٹس جوگرز پہن رکھے تھے اور فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے میرے چلنے پھرنے سے مطلق آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانے سے پیشتر اس کے کمرے کی طائرانہ تلاشی لینا مناسب جانا۔ بیڈ کے برابر دیوار کے ساتھ قالین کے ہم رنگ صوفے پڑے تھے۔ ایک صوفے پر چھوٹے سائز کی سیاہ چمکدار گن پڑی تھی جس میں میگزین چڑھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک ڈائری اور جیبی رومال دھرا تھا۔ شیشے کی چھوٹی سی تپائی پر بوتل اور نقرئی گلاس پڑا تھا۔ بوتل پر غیر ملکی شراب کا لیبل دیکھ کر لمحہ بھر کو میرے دل میں دل جیت شاہ کے لیے کراہت کا جذبہ نمودار ہوا مگر میں نے اپنی توجہ بٹنے نہیں دی۔ گن اٹھا کر بیڈ کے نیچے رکھ دی تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت میں وہ مجھ پر غلبہ پا کر اپنی گن تلاش نہ کر سکے۔

کمرے میں، بیڈ کے عین سامنے والے گوشے میں خوب صورت ٹی وی ٹرالی میں سجا ہوا اکیس انچ کا ٹی وی اور وی سی آر پڑا تھا۔ ٹی وی ٹرالی پر دونوں کے ریموٹ اور ان گنت وڈیو کیسٹس رکھی تھیں۔ میرے لیے دل جیت کا پینا پلانا اور وڈیو دیکھنے کا شوق حیرت کا سبب تھا۔ اس کا کردار میری نظر میں پہلے ہی مشکوک تھا، آج کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ مذہب اور عقیدے کے نام پر لوگوں کو نہ صرف بے وقوف بناتا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتا تھا۔ ایسے بے ضمیر انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔

لگ بھگ پانچ منٹ کی پر احتیاط جستجو کے بعد میں دل جیت کے بھاری وجود سے نمٹنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ سانڈ کی طرح پلا ہوا انسان تھا۔ اس کا انگوٹھیوں سے آراستہ دایاں ہاتھ کولہے پر دھرا ہوا تھا جبکہ بایاں ہاتھ سر سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی والے چہرے کے نیچے تھا۔ سرہانے کے قریب عمامے دار پگڑی اور تسبیح پڑی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے بیڈ پر چڑھ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ جاگتے ہی مجھے دیکھ کر چیخے گا، اس لیے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہی منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ شاید وہ کھینچ لیے جانے پر نہ جاگتا مگر منہ پر ہاتھ کی موجودگی کے باعث اسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں پھرتی سے اس کے سینے پر چڑھ کر گھٹنوں

کے بل بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے خرخر کی آواز برآمد ہوئی اور مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ جونہی اس نے حیرت اور دہشت کا پہلا مرحلہ عبور کیا، میں نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور ریوالور کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ اس سے پہلے اس نے میرا ریوالور والا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ خوفناک ہتھیار دیکھ کر اس کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا اور غرا کر کہا۔ ”ہاتھ اور زبان کو حرکت دو گے تو گولی مار دوں گا۔“

وہ محض گھبرا کر رہ گیا۔ وہ بہت بری طرح میرے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ اس کی دونوں بانہیں میرے گھٹنوں تلے دبی ہوئی تھیں اور منہ میں پستول کا ایک چوتھائی حصہ دبا ہوا تھا۔ اس کی زبان بند تھی، آنکھیں چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھیں کہ میں کون تھا جو رات کے اس پہر میں اچانک موت بن کر اس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”دل جیت! تم مجھے نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ چالاکی دکھاؤ گے، جھوٹ بولو گے تو گولی چلانے میں دریغ نہیں کروں گا۔ سچ بولو گے تو سانسیں لیتے رہو گے۔“

اس کی گھگھیاہٹ بے معانی تھی۔ میں اسے اچھی طرح خوف زدہ کر کے اپنے مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکے مگر میری تاخیر نے اسے سنبھلنے کا موقع دے دیا۔ اچانک ہی وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں تلے سے نکل گئے۔ اس کا ردِعمل میرے لیے غیر متوقع اور اس کے لیے نہایت خطرناک تھا۔ اس کی اس حرکت سے پستول کا ٹریگر دب سکتا تھا جس کا مطلب اس کی فوری ہلاکت تھی۔ میں نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پستول والے ہاتھ پر پورا وزن ڈال دیا۔ مارے تکلیف کے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گھٹنوں کے نیچے سے نکلنے والے دونوں ہاتھ بے جان سے انداز میں میرے ہاتھ پر آن گرے مگر ان میں اتنی تاب نہیں تھی کہ میرے ہاتھ کو پکڑ کر باہر کھینچ لیتے۔ میں نے اپنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس کی دائیں آنکھ میں چبھو دی۔ اس کے پورے بدن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا۔ ”اگر تم کوئی بھی حرکت کرو گے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی مار دوں گا......“

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اشارے سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنی چبھی ہوئی آنکھ پر جا ٹکا جس سے پانی نکلنے لگا تھا۔

میں اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز رکھتے ہوئے اس کی چھاتی پر سے اترا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کو عقب سے پکڑ لیا اور کھینچ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔ اسی اثنا میں بجلی کی سی مستعدی سے میں نے اس کے منہ میں سے پستول نکالا اور کنپٹی پر رکھ دیا۔

میں اُسے حویلی سے باہر لے کر جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس پر بے تحاشا تشدد کرنا تھا۔ میڈم کے بقول اس نے آسانی سے مجھے پروین کے بارے میں نہیں بتانا تھا۔ تشدد کے نتیجے میں اس کے حلق سے چیخوں کا برآمد ہونا ناگزیر تھا اور اس کی چیخ و پکار سن کر حویلی کے سبھی مکین کمرے کے باہر اکٹھے ہو جاتے۔ نشئی مجاوروں اور گھر والوں کی آمد پر میں بری طرح پھنس سکتا تھا۔ میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔ ”دل جیت! میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا، کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بتا دو گے تو زندہ بچ جاؤ گے، نہیں بتاؤ گے تو کھوپڑی میں سوراخ کر کے چلا جاؤں گا۔“

پستول حلق سے نکلنے کے بعد بھی وہ کئی ثانیوں تک اس قابل نہیں ہو پایا تھا کہ کچھ بول سکتا۔ وہ کچھ دیر تک 'اوغ، اوغ' کی آوازیں نکالتا رہا، پھر نیم مردہ آواز میں بولا۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے گردن چھوڑ دی اور اپنا بازو اس کی بغل سے نکال کر چھاتی پر پھیلا لیا۔ اب وہ پوری طرح میرے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔ اس کے آرام طلب اور غیر ورزشی وجود پر چھایا ہوا نیم خوابیدگی اور خوف کا اثر میری معاونت کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چلو! حویلی سے باہر چلو۔ تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ چلو!“

میں نے دانستہ اپنی آواز خاصی پست رکھی ہوئی تھی تاکہ میری آواز کمرے سے باہر نہ نکل سکے اور کسی سوئے ہوئے کو بیدار نہ کر سکے۔

وہ میری توقع کے برعکس بزدل ثابت ہوا تھا۔ ہتھیلیوں کے بل گھسٹ کر بیڈ سے اترا اور میرے دھکیلنے پر نڈھال قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ اس نے ایک لمحے کو صوفے کی طرف دیکھا تھا۔ میرے خیال میں صوفے پر گن کی عدم موجودگی نے اس کی رہی سہی سکت بھی ختم کر دی تھی۔ ”چٹخنی کھولو...... اور ہاں! اگر کسی کو جگانے کی کوشش کی، منہ سے آواز نکالی تو پھر پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”اچھا!“ اس کے حلق سے کراہ سی برآمد ہوئی اور اس نے بلاچوں وچراں میری ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحوں کے بعد

ہم برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچ گئے۔ میں اس پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اطراف پر بھی تیکھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ کسی پل کچھ بھی ہو سکتا تھا اور میں اپنی کامیابی کو موت آگیں ناکامی میں تبدیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری توقع کے مطابق کوئی مزاحمت نہیں کی اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی آواز پیدا کیے بغیر گیٹ کھولو......“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے چٹخنی کھولی۔ گیٹ کے کنڈے میں گریس یا تیل ڈالا ہوا تھا کیونکہ بہت ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کندھوں کے اوپر سے مزار کی طرف دیکھا۔ کوئی مجاور دکھائی نہیں دیا۔ سب کسی کونے کھدرے میں پڑے خراٹے مار رہے ہوں گے۔ صحن خالی تھا۔ آہستگی سے مین گیٹ بند کرنے کے بعد میں اسے لیے ہال کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھا۔ پارکنگ میں داخل ہونے کے بجائے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس جنگلی بلے کو کہاں لے جا کر پوچھ گچھ کی جائے۔ فوری طور پر اپنے ڈیرے کا خیال آیا۔ وہ رات کو خالی ہوتا تھا۔ اریب قریب کوئی اور ڈیرا نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی کے ساتھ اپنا کام مکمل کر سکتا تھا۔ اسے اپنے ڈیرے پر لے جانے میں محض یہی قباحت تھی کہ ڈیرا یہاں سے خاصا دور تھا۔ وہاں جانے کے سوا کوئی چارا نہ پا کر میں نے اسے مزار کے بیرونی ادھ کھلے گیٹ سے دھکیل کر نکالا اور جنوبی سمت میں پگڈنڈی پر ہانکنا شروع کر دیا۔

اس کی کمر اپنے سینے سے چمٹائے پیدل چلنے کی وجہ سے میں اب تھکنے لگا تھا۔ میں نے اسے روک کر اپنا بازو کھینچ لیا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ میں اپنے مشن میں آدھی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ آدھی کے حصول کے لیے میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسے ہانکتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ اندھیرے میں، پگڈنڈی پر چلتے، گرتے پڑتے سائیں دل جیت کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی تھی اور وہ ہانپنے لگا تھا۔ اس نے راستے میں ایک دو مرتبہ کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر میں نے جھڑک کر خاموش کرا دیا تھا۔

ڈیرے پر رات کو سوائے مال مویشیوں اور اپنے پالتو کتوں کے، کوئی نہیں ہوتا تھا۔ بھانے میں اندھیرے کا راج تھا۔ وہاں دیوار کے حالے میں لالٹین اور ماچس پڑی تھی مگر میں دل جیت کی موجودگی میں لالٹین جلانے کی مہلت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ بکریوں کے لیے تیار کیے گئے چھپر پر نظر جا ٹھہری۔ وہاں بھی اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے دل جیت کو اس سمت چلنے کا حکم دیا۔ وہ چند قدم چلا، پھر نہایت غیر متوقع طور پر رکا اور میرے سمجھنے سوچنے سے پیشتر ساعت بھر میں لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کا دایاں پیر سیدھا پستول کو لگا اور پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ناہموار جگہ پر گر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے میری غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اور اس کی اگلی حرکت پر نظریں جماتا، ایک زوردار مکا میری کنپٹی پر پڑا۔ میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں لڑکھڑا کر پہلے آگے کی سمت بڑھا پھر کمر کے بل زمین پر جا گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ میری طرف بڑھنے کے بجائے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں کی مگر میرا سر بری طرح ... اور میں پھر گرا۔ دوسری مرتبہ بھی میں اپنی تمام تر ... بروئے کار لایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ ناپختہ زمین پر اندھیرے میں اپنی بانہیں پھیلائے پستول تلاش کر رہا تھا۔

میری قسمت میرا ساتھ دے گئی تھی ورنہ اس کا وار بڑا خطرناک تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور پورے وزن کے ساتھ اس پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب کر زمین پر لم لیٹ ہو گیا۔ میں نے پستول کی پروا کیے بغیر اس پر مکوں کی بوچھاڑ کر دی۔ منہ، سر، کنپٹی...... مجھے کوئی امتیاز نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کے منہ سے ہلکی چیخیں برآمد ہونے لگیں تو میں نے ہاتھ روک لیا اور کسی خونخوار درندے کی طرح اس کی بائیں آنکھ میں دونوں انگلیاں گھسیڑ دیں۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی، پھر دوسری چیخ...... پھر وہ بری طرح سر جھٹکنے لگا۔ اس کی آنکھ کا ڈیلا میری ٹیڑھی انگلیوں میں پوری قوت سے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا تو وہ تڑپ کر اٹھا۔ میں کمر کے بل زمین پر گرا۔ اس کی بائیں آنکھ کا ڈیلا میرے ہاتھ میں تھا جسے میں نے ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا۔ اسے دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھ پر سختی سے رکھے بری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے مسلسل کراہیں اور گالیاں نکل رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی اردگرد دیکھا۔ مجھے اندھیرے کی وجہ سے پستول دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اس پر چار حرف بھیجے اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ وہ بڑا خطرناک انسان تھا۔ میں نے اس کی موقع فہمی اور چالاکی کو بزدلی قرار دیا تھا۔ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو اس وقت بازی پلٹ چکی ہوتی اور میں اس کے رحم و کرم پر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔

خنجر ہاتھ میں آتے ہی میں نے دستے کی پن لاک لگا دی تاکہ وہ میرے ہاتھ سے پستول کی طرح چھوٹ کر اندھیرے کی نذر نہ ہو جائے۔ اس کے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے وجود کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے پالتو کتے جاگ کر ہمارے قریب آ کر بھونکنے لگے تھے۔ میں نے انہیں پچکار کر بھگا دیا۔ وہ میری آواز پہچان کر دم ہلاتے ہوئے دور جانے کے بجائے میرے قریب ہو گئے۔ میں نے دل جیت کو دو تین ٹھڈے مارے پھر بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بکریوں کے چھپر کی طرف بڑھا۔ کتے تجسس بھرے انداز میں اس کے دائیں بائیں سونگھتے ہوئے چھپر تک چلے آئے۔ چھپر تلے اندھیرا تھا مگر اتنا گہرا نہیں تھا کہ سرے سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

سائیں دل جیت خاصا وزنی تھا۔ میں نے اسے بہ دقت تمام دیوار کی جڑ میں لا پھینکا۔ اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے اس کے آنکھوں پر دھرے ہوئے ہاتھوں پر لات ماری تو وہ بلبلا اٹھا۔ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

اس کے منہ سے غلیظ مغلظات کی قے برآمد ہوئی تو میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا اور میں نے آن کی آن میں خنجر کے چرکوں سے اسے لہو میں نہلا کر رکھ دیا۔ کتے خون کی بو پر بھڑک اٹھے۔ ایک نے دل جیت پر چھلانگ لگائی تو میں نے اسے لات مار کر پرے پھینکا اور گھٹنوں کے بل دل جیت کے سامنے بیٹھ گیا۔ خنجر کا چمکدار پھل دل جیت کی دائیں آنکھ کے قریب لہرا کر کہا۔ ''دل جیت! میں نے تمہیں کہا تھا کہ چالاکی کرو گے تو رعایت نہیں کروں گا۔ تم نے میری بات نہیں مانی اور ایک آنکھ گنوالی۔''

میں سانس لینے کو رکا، پھر غرایا۔ ''تم بے غیرت اور کمینے انسان ہو۔ اپنی دوسری اور اکلوتی آنکھ بھی گنوا بیٹھو گے۔''

اس کا جسم مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر ان پر طاری دہشت اس کے بدن اور آواز کی غیر معمولی لرزش سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر تکلیف کی شدت سے 'ہائے' نکل گئی۔ میں نے اپنے لہجے میں بے تحاشا سنگینی پروتے ہوئے کہا۔ ''دل جیت! پروین کہاں ہے؟''

یکبارگی اس کا سر اٹھا، چیخا۔ ''کون پروین...... تم کون ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، کیوں میری جان کے دشمن بنے ہو؟''

میں نے جواب دینے کے بجائے خنجر اس کی ران میں گھونپ دیا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے خنجر والا ہاتھ اس کی اکلوتی آنکھ کے سامنے ہوا میں معلق کر دیا، کہا۔ ''دل جیت! کوئی دوسری بات نہ کرو، جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ پروین کہاں ہے؟''

''میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان دانت پیس کر کہا۔ ''تم موت کو آواز دے چکے ہو۔ تم مجھے نہیں......''

میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر بجلی کی طرح کوند کر اس کی دوسری ران میں کھب گیا۔ اس کے حلق سے بڑی دردناک مگر پھٹی پھٹی آواز نکلی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کم بخت دیکھنے میں بہت نازک بدن تھا مگر حقیقت میں بہت سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس نے بے ہوش ہونے میں خاصی دیر کی تھی ورنہ جونہی اس کی آنکھ سے خون کی دھار پھوٹی تھی، بے ہوش ہو کر گر گیا ہوتا۔

بکریوں میں اضطراب پھیل گیا تھا۔ آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگی تھیں اور نیچی آواز میں احتجاج کرنے لگی تھیں۔

میں نے اس کی زخمی آنکھ میں انگلی ماری۔ انگلی خون سے لتھڑ گئی مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ مجھے اس کی بے ہوشی کا یقین ہو گیا۔ کتے اس جگہ پر سر جھکائے کھڑے تھے جہاں میں نے دل جیت کی آنکھ زخمی کی تھی۔ مجھے دیکھے بغیر علم ہو گیا تھا کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے اس کے خون کو چاٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں اٹھا اور بھانے میں گیا۔ جالے میں رکھی ہوئی کیروسین آئل (مٹی کے تیل) والی لالٹین اور ماچس مخصوص گوشے میں رکھی ہوئی پانی کی بالٹی اٹھا لایا۔ بکریوں والے چھپر میں پہنچ کر لالٹین روشن کی اور چھپر کی چھت میں لٹکا دی۔ اب دل جیت کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ اور سیاہ ڈاڑھی خون میں تر تھی جبکہ آدھے چہرے پر پیلاہٹ ثبت تھی۔ میں نے بالٹی کے پانی سے اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں تادیر یہی ورزش کرتا رہا۔ بالآخر اسے ہوش آ گیا اور وہ اپنی اکلوتی آنکھ میں حیرت اور خوف کی پرچھائیاں سمیٹے مجھے دیکھنے لگا۔ میرا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ اگر نہ بھی چھپا ہوتا تب بھی اسے دکھائی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ لالٹین میرے عقب میں روشن تھی۔

''تم کون ہو؟'' اس کی مریل سی آواز سنائی دی۔

''میں تمہاری موت ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ، پروین کہاں ہے؟''

ہوش میں آتے ہی تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ

ہونے لگا تھا۔ میرا سوال سن کر جیسے اسے ہوش آ گیا ہو، سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔“

میڈم نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ ٹیڑھی انگلیوں سے نکلنے والی کھیر تھی۔ میں اپنی انگلیاں ٹیڑھی کر چکا تھا مگر وہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے قسائیوں کے سے انداز میں خنجر والا ہاتھ جھٹکا اور اس کا بایاں کان اڑا دیا۔ وہ بلبلا اٹھا اور کان پر ہاتھ رکھ کر پھر جھٹکے لینے لگا۔ ایسے میں اس کے جسم میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت عود کر آئی کہ اس نے مجھ پر بجلی کی سی سرعت سے حملہ کر دیا۔ اس کا دوہتھڑ میرے سینے پر پڑا اور میں پیچھے جا گرا۔ اگر میں نے خنجر کی پن لاک نہ لگائی ہوتی تو خنجر میرے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ گیا ہوتا۔ وہ کسی سانڈ کی طرح اینڈتا ہوا میری چھاتی پر آن بیٹھا اور اس نے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت میں بلا کی طاقت تھی اور مجھے ایک لمحے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ میں اپنی تمام تر طاقت بروئے کار لا کر بھی اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا نہیں سکتا تھا۔

میں نے اس کے پہلو میں، چھاتی اور چہرے پر ان گنت مکے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ پوری قوت سے میرے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ میری بے پروائی اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بدولت وہ مجھ پر بھاری پڑ گیا تھا۔ میں اپنے جوش وجنوں اور جلد بازی میں مات کھا چکا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے پوری قوت مکے میں سموتے ہوئے اس کی زخمی آنکھ پر وار کیا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی۔ اس کا دایاں ہاتھ آنکھ پر جا لگا، میں نے دوسرا مکا ہاتھ کی پشت پر جڑ دیا۔ وہ بلبلا کر میرے چہرے پر آن گرا۔ میں نے دونوں گھٹنے اس کی پشت کے نیچے زور سے مارے۔ وہ میرے سر سے ہوتا ہوا زمین پر جا گرا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ زیادہ دیر تک اڑا نہیں رہ سکا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں لالٹین اٹھا کر کتوں کے پاس پہنچا۔ کچھ فاصلے پر گوبر کی پاتھیوں کے بیچ پستول پڑا مل گیا۔ میں نے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور کتوں پر نظر ڈالتا ہوا چھپر میں آ گیا۔ وہ ہنوز ساکت پڑا تھا۔

وہ جسیم، قوی الاعضا اور ادھیڑ عمر انسان تھا۔ بگڑتا تو بڑی مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ میں نے ایک بکری کے گلے سے رسی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ سیدھا کیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

اب کے اس نے ہوش میں آنے میں زیادہ دیر نہیں کی بلکہ ہوش میں آتے ہی نان اسٹاپ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے آنکھ کے سامنے خنجر لہرایا، وہ بڑی مکروہ چیخ حلق سے نکال کر بولا۔ ”کتے کے بچے! میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔“

ایک لمحے کو میرا یقین متزلزل ہوا۔ اس کے لہجے نے چغلی کھائی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے وگرنہ اس حالت میں پہنچ کر جان بچانے پر پروین کے اخفا کو ترجیح نہ دیتا۔ پھر میڈم کی بات یاد آ گئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”اب بھی تمہاری جان بخش سکتا ہوں اگر تم بتا دو کہ پروین کہاں ہے؟“

میری آواز میں آگ کی تمام تر لپٹیں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کا دوسرا کان کاٹ دیا۔ اس کے حلق سے نہایت ہلکی سی چیخ نکلی۔ جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے ناک کی پھننگی کاٹ دی، پھر خنجر کی خون آلود نوک اس کی زندہ آنکھ کے ابرو پر رکھ دی، سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”دل جیت! آخری موقع دے رہا ہوں، پھر تم ہمیشہ کے لیے دنیا کو دیکھنے سے محروم ہو جاؤ گے۔“

اس کے کندھے ہلے۔ شاید ہاتھوں کو حرکت دینا چاہتا تھا مگر بندھے ہونے کی وجہ سے بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ جونہی میں نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا، وہ کراہا۔ ”بتاتا ہوں...... مم...... مگر تم کون ہو؟“

میرا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ساکت ہو گیا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ ورنہ......“

”مم...... مم جان...... تم شہرے ہو...... پروین کے بھائی...... ہاں!“ اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ بولا۔ ”پروین کے بھائی ہو...... میں جان گیا...... مگر پروین کا مجھے پتا نہیں...... مجھے مت مارو...... میں کچھ نہیں جانتا......“

میں ٹھٹک گیا۔ وہ اگر کچھ نہیں جانتا تھا تو میں بہت بڑا جرم کر چکا تھا۔ میں اپنی واپسی کی راہ مسدود کر چکا تھا۔ وہ نور پور میں جاتے ہی میرا خاندان سولی پر لٹکا دیتا۔ بھیانک سوچوں کی لمحاتی یلغار نے مجھے سمجھا دیا کہ دل جیت کی زندگی میری موت تھی۔ ایک قبر کا منہ کھل گیا تھا۔ میں اس میں دفن ہوتا یا دل جیت......

فرطِ غیظ سے میری آواز لرز اٹھی۔ ”تو ٹھیک ہے دل جیت...... تم اگر پروین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو تو اوپر جاؤ۔ خدا حافظ! میں پروین کو زمین پر ڈھونڈتا ہوں۔“

میں نے اس کی کٹی ہوئی ناک پر ہاتھ رکھا اور اوپر کی طرف کھینچا۔ گردن کھنچ گئی اور میرا خنجر اس کی گردن پر ٹک

گیا۔ وہ چیخا۔ ”خدا کے لیے...... مجھے مت مارو...... میں بتاتا ہوں۔“

”اب تم بتاؤ یا نہ بتاؤ...... مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“

وہ چیخا۔ ”تم پروین تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“

میرا خنجر پر دباؤ بڑھا اور دانتوں کی کڑکڑاہٹ گونجی۔ ایسے ہی وقت میں دل جیت کے اکڑے ہوئے منہ سے خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ ”وہ حیدر خان کے پاس ہے......“

جونہی اس کے منہ سے حیدر خان کا نام برآمد ہوا، میری دھڑکن جیسے پسلیوں میں ہی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔ میڈم نے سب سے پہلا نام اسی کا لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔

”امیر نواز؟“

اس کی اکلوتی آنکھ میں بے بسی رچ گئی۔ نفی میں سر ہلایا۔

”تم نے پروین کو کیسے اغوا کیا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا مگر اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی بہت کمزور تھی۔ میں اس سے اور بھی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر میڈم شکیلہ نے کہا تھا کہ میرا کام اس کے حلق سے اس شخص کا نام اگلوانا تھا جس کے حوالے اس نے پروین کو کیا تھا۔ وہ پتا چل گیا تھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اب اسے ٹھکانے لگانے کا کام باقی تھا۔ میں جذباتی کیفیت میں بلا سوچے سمجھے اس پر جا پڑا تھا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ یہ سوچا نہیں تھا۔ اب جب وہ بے حس و حرکت میرے سامنے پڑا تھا، میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے پاس ابھی دو گھنٹوں کی مہلت باقی تھی۔ میں نے نلکے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پیا اور چھپر کے باہر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ میں دل جیت کو گھسیٹتا ہوا بخت خان کے پاس لے جاؤں اور چیخ چیخ کر پورے نور پور کو جگا دوں۔ سب کو بتاؤں کہ جس شخص کو انہوں نے دیوتا بنا رکھا تھا وہ کتنا ذلیل اور بے غیرت تھا۔ بخت خان کو ساتھ لے کر اسے تھانے دے آتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔

شاید میں ایسا ہی کرتا مگر ایک زہرخند خیال نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اگر یہ سانپ نور پور میں داخل ہوتے ہی اپنی کینچلی میں لوٹ جاتا اور میری باتوں کو جھٹلا دیتا تو میرا کیا بنتا؟ میری بات پر سوائے ڈاکٹر شاہ جی کے کوئی اعتبار تک نہ کرتا۔ میں نہ صرف تھانے کی سیر کرتا بلکہ میرے عزیز دل جیت کے عتاب کا شکار ہو کر کہیں کے نہ رہتے۔ میں پروین کو حاصل کرنے کے بجائے سالوں دور ہو جاتا۔ جب تک میں جیل سے رہائی پا کر آتا، وہ مٹی میں مل چکی ہوتی یا اپنی موت آپ مر گئی ہوتی۔

میں اپنی لگائی ہوئی آگ میں گھر گیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ دل جیت سے پروین کے بارے معلومات لینے کے بعد اس کا کیا کروں گا؟

میرے اردگرد میرے کتے اچھل کود رہے تھے۔ دل جیت کو اگر زمین میں دباتا تو کتوں نے صبح دم میرا راز فاش کر دینا تھا۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں اچھل پڑا۔ میرے ڈیرے کے پچھواڑے میں بالن (لکڑیوں کا ایندھن) کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ چھ ماہ قبل اپنے رقبے کے درختوں کی چھنٹائی کر کے یہاں لکڑیاں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ تین چار ٹرکوں کا مال تھا۔ میرے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے دل جیت کو ٹھکانے لگانے کا محفوظ ترین طریقہ سوچ لیا تھا۔

مجھے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ میں نے بے ہوش دل جیت کو اپنی پوری قوت صرف کر کے کمر پر اٹھایا اور نپے تلے انداز میں چلتا ہوا پچھواڑے پہنچا۔ اسے ڈھیر کے وسط میں پہنچانا بہت مشکل تھا۔ اسے ڈھیر پر ایک طرف ڈال کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کھینچ کر وہاں تک لے گیا جہاں تک لکڑیوں کے ڈھیر کے اوپر لے جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ اس کی گردن سے خون کا فوارا ابلا اور فضا میں خوفناک خرخراہٹ گونجی۔ میں نے فی الفور ڈھیر پر سے چھلانگ لگا دی تھی وگرنہ میرا منہ سر خون سے لتھڑ جاتے۔ وہ تین چار منٹ تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ اس دوران میں نے بہت سی لکڑیاں اس پر ڈال دیں۔ آنے والے دس پندرہ منٹوں میں، میں نے اس کے مردہ بدن پر کم و بیش سات آٹھ من بالن ڈال دیا۔

بھانے میں سے کسی اٹھائی۔ زمین پر جہاں جہاں اس کا خون گرا تھا، اٹھایا اور لکڑیوں کے ڈھیر پر لا پھینکا۔ اس کی آنکھ کے ڈیلے کو تلاش کیا۔ وہ وہاں نہیں تھا جہاں میں نے پھینکا تھا۔ اردگرد دیکھا۔ دکھائی نہیں دیا تو اندازہ کیا کہ اسے کتے نگل گئے ہوں گے۔ سائیں دل جیت کو گھسیٹنے کے نشانات پھاوڑے کی مدد سے ہموار کیے۔ لالٹین اور بھانے میں رکھا ہوا چاچے چراغ کا حقہ اٹھایا اور پچھواڑے آ گیا۔ لکڑیوں

کے ڈھیر کے اطراف میں خاصا دور دور تک سوکھے پتوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے دیوار کی جڑ کے ساتھ حقہ اس طرح زمین پر لٹایا کہ اس کی چلم زمین پر گر گئی۔ اس میں بجھے ہوئے کوئلے پتوں کے فرش پر پھیل گئے۔ میں نے لالٹین کی تیل والی ٹینکی کا سالخوردہ ڈھکن کھولا، مٹی کے تیل کی ایک دھار چلم سے نکلے ہوئے کوئلوں سے شروع کی اور دل جیت کے لکڑیوں میں دبے ہوئے جسم تک لے گیا۔ لالٹین کی ٹینکی خالی ہو گئی۔ میں جلدی سے بھانے میں رکھی ہوئی مٹی کے تیل والی چھوٹی کین اٹھا لایا۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے بڑی چابکدستی اور مہارت سے لکڑیوں کے ڈھیر پر اس طرح تیل چھڑکا کہ دل جیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

میرا خنجر، لباس اور اسپورٹس جوگرز خون سے تر تھے۔ بھانے میں پڑا ہوا اپنا کام کاج والا لباس اور سوفٹی چپل پہنی اور خون سے لتھڑی ہوئی تمام اشیا کو لکڑیوں کے ڈھیر پر اچھال دیا۔ دیوار کی جڑ میں بیٹھے ہوئے کتے میری حرکات و سکنات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا مالک رات کی تاریکی میں کیا کارنامہ سرانجام دینے جا رہا ہے۔

جب مجھے پوری طرح تسلی ہوئی کہ میں نے دل جیت کے قتل کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تو میں نے حقے کی چلم کے پاس دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ چھوڑ دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کے ڈھیر کی طرف لپکا۔ میں تیل کی کین، لالٹین اور ماچس اٹھائے بھانے میں لوٹ آیا۔ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے سے پیشتر میں نے تنقیدی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ سب کچھ او کے تھا۔ دل مطمئن ہوا تو میں نے پچھواڑے میں جھانکا۔ آگ بڑی تیزی سے پھیل چکی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ آن کی آن میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ ممکن تھا کہ نور پور جاگ جاتا اور ادھر متوجہ ہو جاتا اس لیے فوراً یہاں سے نکل جانا مناسب جانا۔

میں ابھی گھر جانے والی پگڈنڈی پر ہی پہنچا تھا کہ میرے عقب میں تڑتڑاہٹ کی ڈراؤنی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔ آسمان کی طرف لپکتے ہوئے بڑے بڑے شعلوں نے پورے ماحول کو منور کر دیا تھا۔ دل کی تیز دھڑکن کو قدرے تقویت ملی اور میرے قدموں کی حرکت تیز ہو گئی۔ ابھی میں نور پور میں داخل نہیں ہوا تھا کہ گھروں کی بتیاں روشن ہونے لگ گئی تھیں۔ یعنی لوگ جاگ رہے تھے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں میں شور و غوغا بلند ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں بھاگوں تو بھی لوگوں کے نور پور سے نکلنے سے پیشتر اپنے گھر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کچھ سوچ کر میں ایک گھنے درخت پر بندر کی سی پھرتی سے چڑھ کر چھپ گیا۔ عافیت کی یہی ایک صورت بچی تھی کہ جب لوگ دوڑتے ہوئے ڈیرے کی طرف آئیں تو میں ان میں کسی طرح شامل ہو جاؤں۔

لوگوں نے نور پور سے نکلنے میں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دیر لگائی تھی۔ مجھے سائیں کے مزار کی طرف سے آتی ہوئی پہلی ٹولی دکھائی دی، تب تک مجھے درخت کے پتوں میں چھپے ہوئے نصف گھنٹا بیت چکا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ اگر میں نہ رکتا تو پانچ سات منٹ میں اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ انتظار کے اس طویل وقت میں میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحتیں عود کر آئی تھیں اور سینے میں جلتی ہوئی آگ پر اندیشوں اور تفکرات کی اوس پڑنے لگی تھی۔ میں بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اگر کسی صورت دل جیت کے قتل کا انکشاف ہو جائے تو کیا میں بچ جاؤں گا؟ کیا آگ دل جیت کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کے نام و مقام کو بھی نگل لے گی؟

جونہی چاچا چراغ اور اس کے پیچھے دس بارہ آدمیوں پر مشتمل ٹولی درخت کے نیچے سے گزری، پیچھے راستہ صاف دکھائی دیا تو میں فوراً درخت سے اتر آیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی عقبی کھڑکی والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ سائیں دل جیت کا مزار اور حویلی خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی۔ کچھ عرصہ قبل اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ حویلی کے مکین دن چڑھنے سے پیشتر جاگنے کے عادی نہیں تھے۔ آج بھی اسی معمول کے مطابق جاگیں گے اور جب تک دل جیت کی راکھ ہوا میں اڑ چکی ہوگی، تب تک اس کی عدم موجودگی کا علم نہیں ہو پائے گا۔

اپنے پچھواڑے کے جوہڑ پر پہنچا تو مسجد کی جانب سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ دوسری ٹولی میرے ڈیرے کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے یہ بھروسا تھا کہ نور پور کے لوگ بالن کو لگی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ وہ ارد گرد سے پتا ہٹا کر آگ کو بھانے کی طرف جانے سے روکنے پر اپنی توجہ دیں گے۔ بالن گاؤں والوں کے نزدیک قیمتی نہیں تھا۔ بارہا خشک بالن کی آتش زدگی کے واقعات نور پور میں رونما ہو چکے تھے۔ لوگ آگ بجھانے کے بجائے آگ کے پھیلاؤ کو روک کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ خاص تکنیک سے کھڑکی کی اندر کنڈی میں پھنسی ہوئی سلاخ نکالتے ہوئے میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ

لوگ بھانے، چھپر اور ڈیرے کے ناہموار صحن میں خوب چلیں پھریں تاکہ اگر دل جیت اور میری وہاں موجودگی کا کوئی ثبوت میری نظروں سے چھپا رہ گیا ہو تو وہ بھی روند جائے۔

گھر والے جاگ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہیں حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میرا ان سے پہلے جاگنا، باہر جانا اور کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہونا معمول کی بات تھی۔ شانو نے مجھے دیکھ کر ارادتاً نظر انداز کر دیا۔ چاچی کا رویہ بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں ان کے پاس رکے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ چاچی کی قدرے پریشان آواز سنائی دی۔ ''شہرے! آگ اپنے ڈیرے پر لگی ہے ناں؟''

میں نے عقبی چار دیواری کے اوپر دھوئیں کے بڑے مرغولوں اور شعلوں کو دیکھ کر کہا۔ ''ہاں چاچی! میں ادھر جانے ہی لگا تھا کہ چاچے کو افسر علی وغیرہ کے ساتھ جاتا ہوا دیکھ کر پلٹ آیا۔''

شانو نے سر جھکا کر ہولے سے کہا۔ ''ہاں! اسے آگ سے کیا، اس کا تو اندر ہی بجھا ہوا ہے۔''

میں نے ایک نگاہِ شکایت اس پر ڈالی۔ پژمردگی کے عالم میں میں نے انہیں بتایا کہ میں پروین کی تلاش میں مظفر گڑھ جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ مجھے مظفر گڑھ میں پروین کی موجودگی کا شک کیوں گزرا تھا یا کون سا کلیو ہاتھ لگا تھا کہ صبح دم ڈیرے پر بھڑک اٹھنے والی آگ پر قابو پائے بنا میں نور پور سے نکلنا چاہ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر پستول نکالا اور اسے چھت میں موجود ایک خفیہ جگہ پر ٹھکانے لگایا۔ چوبی شہتیر کے اوپر کی جانب قدرتی طور پر ایک بڑی سی کھوہ بنی ہوئی تھی۔ ایک خاص انداز سے ہاتھ ڈال کر وہاں چیز رکھی اور اٹھائی جا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے علاوہ نہ تو کسی کو اس کھوہ کی موجودگی کا علم ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اس میں رکھی ہوئی شے کو نکال سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ اور چہرہ اپنے بالن پر پھینکے ہوئے لباس سے پونچھا تھا۔ ہلکے ہلکے داغ باقی تھے جو صبح کے ملجگے اندھیرے میں واضح دکھائی دینے لگے تھے۔ میں تولیا اٹھائے غسل خانے میں گھس گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد ملتان پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میڈم شکیلہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کو فی الفور اپنی کارگزاری سے مطلع کروں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کیا تھا، یہ بے چینی اور اضطراب بھی نور پور کی حدود سے جلد از جلد نکل جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ چونکہ کھالا موجود نہیں تھا اس لیے ویگن عزت خان ڈرائیور شام کو قریشی موڑ لے گیا ہوگا۔ اس کی آمد میں ابھی کافی دیر تھی۔ اتنی صبح سوائے گوالوں کی سائیکلوں کے کوئی سواری دستیاب نہیں ہو سکتی تھی اور میں اسی لالچ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نور پور کی حدود سے نکل آیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ انور دودھی کا ریہڑا آتے دیکھا۔ اس کے پاس چونکہ زیادہ مقدار میں دودھ اکٹھا ہوتا تھا، اس لیے وہ سائیکل کے بجائے اپنے دبلے پتلے گھوڑے والے ریہڑے پر نور پور اور نواحی بستیوں میں سے دودھ اکٹھا کیا کرتا تھا۔ میں اچھل کر ریہڑے پر چڑھ گیا وہ بولا۔ ''شہرے خان! دھمی ویلے کتھ نکھا وینداں؟''

(شہرے خان! صبح صبح کہاں نکل کھڑے ہوئے؟)

میں نے جھوٹ بول دیا کہ میں قریشی موڑ پر ویگن کے ڈرائیور عزت خان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ گھوڑا ریہڑا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہوا نوری چوک پہنچا۔ انور دودھی نے کہا۔ ''مجھے یہاں کچھ دیر لگے گی۔ اگر چاہو تو بیٹھے رہو، چاہو تو کسی ویگن پر بیٹھ جاؤ۔''

محمود کوٹ اور کوٹ ادو سے آنے والی ویگنیں نوری چوک سے سواریاں اٹھا لیتی تھیں۔ میں ریہڑے سے اتر گیا۔ کچھ دیر کا انتظار سود مند رہا۔ انور دودھی کا ریہڑا ہوٹل پر کھڑا رہا اور میں ایک ویگن کے پائیدان پر چڑھ کر قریشی موڑ سدھار گیا۔ اپنے تئیں میں خطرات کی لپک سے محفوظ ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو قریشی موڑ کے کسی پبلک کال آفس سے میڈم کو فون کر سکتا تھا مگر میں نے بس میں بیٹھ کر وقت بچانے کو ترجیح دی۔ نو بجے کے قریب ملتان کے ڈیرا اڈا سے میں نے میڈم کو فون کیا۔ اس نے مجھے اڈے کے سامنے والے ہوٹل پر بیٹھ کر میرو شاہ کا انتظار کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس کی آواز میں نیند کا خمار جھلکتا تھا۔ وہ یا تو میری فون بیل پر بیدار ہوئی تھی یا کچھ ہی دیر پہلے جاگی تھی۔

میں نے مذکورہ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا کپ حلق سے اتارا۔ نصف گھنٹے بعد سفید ہنڈا اکارڈ کار اور میرو شاہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ جماہیاں لیتے ہوئے اپنی بدمست چال چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ بانہیں کھول کر بولا۔ ''اڑے او غنچے! کچھ کمالا وت یا خالی ہاتھ آوت ہے؟''

میں اس کی بات سمجھ نہ پایا مگر کھلی بانہوں کی دعوت سمجھ میں آ گئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سینے لگا اور بولا۔ ''ماڑے کو بتاوے ناں کہ کوئی کامیابی ہووے یا نہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ الگ ہو کر بولا۔ ''اڑے

جندہ باد (زندہ باد) لاڈے میاں! کمال کر دیوے ہے تم نے۔ چلو! میڈم کو خوش خبری دیوے......"

میں چائے کا بل ادا کر کے ہنڈا اکارڈ کی پچھلی نشست پر میروشاہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آج ڈرائیور بدلا ہوا تھا۔ پہلا ڈرائیور اسمارٹ اور کم گو تھا، یہ فربہی مائل اور خاصا باتونی تھا۔ ڈیرے اڈے سے میڈم کی کوٹھی تک اس کی زبان مسلسل چلتی رہی تھی۔

دس بجے ہم دونوں اسی گیسٹ روم میں تھے۔ میں جلد از جلد میڈم سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے دل جیت کے منہ سے سردار حیدر خان کا نام اگلوا لیا تھا۔ اس فرعون کے شکنجے سے پروین کو نکالنا اس کا کام تھا۔ میروشاہ گیا، تھوڑی دیر میں ہی پلٹ آیا، بولا۔ "ماڑے غنچے! کوئی گڑبڑ ہووے ہے، میڈم ماڑا انتجار (انتظار) کیے بنا کہیں چلی جاوت ہے۔"

مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا۔ اسے جانا ہی تھا تو مجھ سے مل کر چلی جاتی۔ میں نے میروشاہ کے استفسار پر بلا کم و کاست تمام کارروائی کہہ سنائی۔ وہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ میری ران پر زوردار دھپ رسید کر کے چہکا۔ "اڑے جالم غنچے! تیرے کو تو تمغہ دیا جاوے، تیرے کو جھوم کے چوما جاوے...... پہلی واردات اور وہ بھی اتنی جوردار (زوردار)...... ماڑی میڈم سن لیوت تو جھوم جھوم جاوت لاڈے!"

اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اٹھا، قالین پر دھمال کے سے انداز میں رقص کرنے لگا، ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جھومتا ہوا گیا، رک کر بولا۔ "لاڈے میاں جندہ باد...... تیرے کو بڑا ثواب......" پھر ہاتھ لہرا کر گانے لگا۔ "نہ کوئی آرجو (آرزو) نہ کوئی آس ہے، میرے دل یہ بتا کیسا احساس ہے......"

اس نے مجھے تسلی دی، اپنے مخصوص اسلوب میں سمجھایا کہ جو ہو گیا، اچھا ہو گیا ہے، پچھتانا بے سود ہے۔ میں نے حماقت کے دوران کئی دانش مندی کے پھول بھی کھلائے تھے، جن کی بنا پر پولیس مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اگر پولیس کو یہ پتا چل بھی جائے کہ سائیں دل جیت کا قتل میرے ہاتھوں ہوا ہے، تو بھی میڈم سنبھال لے گی اور مجھ پر آنچ نہیں آنے دے گی۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے تک میرے ساتھ رہا، پھر کہیں فون نہ کرنے اور کمرے میں رہ کر میڈم کا انتظار کرنے کی تاکید کر کے رخصت ہو گیا۔

چار بجے کے قریب، جب میں چائے پی رہا تھا، اس کا فون آیا، کہہ رہا تھا۔ "ماڑے غنچے! فکر نہ کرے، ماڑی میڈم سے بات ہووت ہے۔ اسے ساری رام کہانی بول سناوت ہے۔"

اس نے میری جلد بازی پر پانی ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ "بولے تو ہے ناں کہ فکر نہ کرت ہے، میڈم جمہ داری (ذمہ داری) لیوت ہے تو جانو کہ تیری بہن تیرے پاس ہووے ہے۔ ماڑے کو جلدی ہووت، پھر بات کرت...... خوش رہوے لاڈے، خوش!"

دن ڈھل گیا۔ شام میڈم شکیلہ کی محل نما کوٹھی میں دبے پاؤں اتر آئی۔ میں کئی مرتبہ واچ مین سے دریافت کر چکا تھا مگر میڈم ابھی تک پلٹی نہیں تھی۔ نجانے کس مصروفیت میں غرق تھی۔ اگر مجھے میروشاہ نے یہیں رہنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو بعید نہ تھا کہ میں کوٹھی سے نکل کر سردار حیدر خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اگر مجھے پروین تک رسائی حاصل نہ ہوتی تو یقینی طور پر دل جیت کو قتل کرنا بے سود ثابت ہوتا۔

کھانا بڑا پرتکلف تھا مگر حلق سے اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ نور پور کے حالات کس نہج پر تھے؟ کھالا کہاں تھا؟ کیا دل جیت کے قتل کا پتا چلا تھا یا نہیں؟ اگر اس کی لاش شعلوں کے بیچ نظر آ گئی تو چاچا چراغ اور گھر والوں کے ساتھ پولیس اور لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟ بہت سارے سوالات زہریلے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں مسلسل رینگ رہے تھے اور بے چین کر رہے تھے۔

ایک اور خیال نے میرے روم روم میں اضطراب کی گہری لہر دوڑا دی۔ دل جیت کے قتل یا غیاب کا سنتے ہی کہیں سردار حیدر خان میری بہن کو ٹھکانے نہ لگا دے...... میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ جبڑے کڑکڑانے لگے۔ میں بیڈ سے اتر کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا، پھر پلٹا، کھڑکی کا پردہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ سوائے ظاہر شاہ کے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کوٹھی پرسکون تھی، میں پرسکون نہیں تھا۔ میں نے ایک مرتبہ میروشاہ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر دو تین مرتبہ بیل جانے کے باوجود اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔

میڈم رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب کوٹھی میں پہنچی۔ میں گاڑی کے انجن اور مین گیٹ کے کھلنے کی آواز سن کر اچھلا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا۔ سیاہ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر گیٹ عبور کر رہی تھی۔ نصف رات کا عمل، اندھیرا اور فرنٹ اسکرین پر پڑتی ہوئی بڑے بلب کی دودھیا روشنی کے سبب جیپ کے اندر بیٹھے ہوؤں کی شکل دکھائی نہیں دی۔ جیپ چند ہی لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے

جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ جو بھی آیا تھا، اسے گزرتے ہوئے میری نظر میں آنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ پہلے سی خاموشی فضا پر طاری ہو گئی۔ جیپ اور جیپ سے اترنے والوں نے نہ جانے کون سا راستہ اپنایا تھا کہ میری نظروں میں آئے بغیر کوٹھی میں داخل ہو گئے تھے۔ چند منٹوں کے بعد سیڑھیاں اتر کر آتے ہوئے میروشاہ پر نگاہ پڑی تو قدرے طمانیت ہوئی۔ اس نے آہستگی سے مجھے دھکیل کر دروازے سے ہٹایا اور کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "میڈم آئی ہے؟"

اس نے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے کہا۔ "ماڑے کو سانس تو لینے دیوے غنچے!"

وہ دیکھنے میں تھکا ہوا لگتا تھا۔ شاید کسی مشکل 'مشن' پر سے لوٹا تھا۔ وہ کچھ دیر صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز رہا، پھر اٹھ کر بیڈ پر آ گیا بولا۔ "غنچے! آرام سے سو جاوت ہے، سمجھ لیوے ہے کہ تیرے کام کا آدھا حصہ مکمل ہو جاوے ہے......"

میں نے پوچھا۔ "کچھ بتاؤ تو سہی، میں بڑا پریشان ہوں۔"

اس نے میری ٹھوڑی پر ہلکی سی چٹکی بھری، بولا۔ "کہا ناں لاڈے میاں! سو جاوت ہے۔"

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل مضطرب تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں خاموش نہیں رہ پاؤں گا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھایا کہ میں آرام سے سو جاؤں۔ چونکہ میڈم شکیلہ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں تھی، میری مدد کرنا بھی چاہتی تھی اس لیے اس نے ایک نئے طریقے سے میری بہن کی بازیابی کی کامیاب کوشش کی تھی۔

میروشاہ نے بتایا کہ میڈم نے کبھی کسی کام میں اتنی لگن اور پھرتی نہیں دکھائی جتنی وہ آج متحرک رہی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کی بہتیری کوشش کی، مگر اس نے کچھ پھوٹ کر نہیں دیا۔ جب زچ ہو گیا تو بولا۔ "کیا ماڑا سر کھاوت ہے، تیرے کو بہن چاہوے یا میرا سر چاہوے، آرام کرو اور ماڑے کو بھی گھڑی دو گھڑی آنکھ میٹھی کرنے دیوے۔"

کچھ دیر لیٹا، پھر کچھ سوچ کر اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "اب کہاں کی تیاری ہے؟"

وہ قدرے بھنا کر بولا۔ "ہم ساتھ والے کمرے میں جاوت ہیں، تم ادھر سو دے ہے۔"

وہ میرے روکنے اور ڈسٹرب نہ کرنے کی تاکید کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید یہ ان کے طریق کار کا بنیادی حصہ تھا۔

چونکہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے میں بے آرامی سے بیڈ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ آنکھیں میچ کر زبردستی سونے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔ اس کار بے سود سے تھکا تو دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ آہستہ روی سے چلتا ہوا گیلری کے آخری سرے پر واقع دروازے تک آیا، کھولا اور باہر لان میں ٹہلنے لگا۔ بے دھیانی میں لان عبور کر کے کوٹھی کی بیرونی دیوار تک چلا گیا۔ چاردیواری سے پشت ٹکا کر کھڑا ہوا تو اپنے سامنے کوٹھی کے فرسٹ فلور پر سرخ روشنی سے معمور کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی دکھائی دی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ بہ غور دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ کوئی عورت تھی جو کھڑکی کے پٹ سے کندھا ٹکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا جبکہ بال ہوا میں اڑ کر اس کی نسوانیت پر دلیلیں لا رہے تھے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا یا میری موجودگی اس کے نزدیک لائق توجہ نہیں تھی، جبھی تو اس کے ساکت وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

وہ کون تھی؟ فوری طور پر میرا ذہن میڈم کی طرف گیا۔ پھر سوچا کہ اسے رات کے اس سمے میں یوں کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اس حیرت کدے میں اور کون رہتا ہے۔ اس کے خاندان کے افراد یا ملازمین؟

میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے میری موجودگی کی خبر ہو گئی۔ فضا میں ایک نہایت باریک آواز گونجی۔ "اے! کون ہو تم؟"

اس کا مخاطب میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ آواز نے تائید کر دی تھی کہ وہ میڈم نہیں، کوئی اور تھی۔

میرے جواب دینے سے پیشتر کوٹھی کے بیرونی لان سے ظاہر خان کی آواز سنائی دی۔ "اوئے نامراد کا بچہ! کون ہے تو؟"

میں جلدی سے بولا۔ "میں...... میں شہریار ہوں۔"

وہ اچانک عقب سے نکل کر میرے سامنے آ گیا، مجھے دیکھ کر بیزار انداز میں بولا۔ "ام سمجھا کوئی چور آ گئی ہے۔ تم ادھر کیا کرتے ہو؟"

اس نے فرسٹ فلور کی ادھ کھلی کھڑکی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ شاید اس کے کانوں میں عورت کی آواز نہیں پڑی تھی۔

"نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا، تھوڑی چہل قدمی کر لوں۔"

"اچھا، اچھا...... دوبارہ چہل قدمی کرنی ہو تو مجھ کو گیسٹ

پر بتا کر ادھر آنا۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے!'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

وہ اپنی گن کندھے پر ڈالتے ہوئے پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیوار کی ٹیک چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر گھاس پر چلنے لگا۔ ایسے میں پھر فرسٹ فلور کی کھلی کھڑکی بول پڑی۔ ''اے! تم کون ہو؟''

میں نے سر اٹھایا۔ وہ دکھائی نہیں دی۔ اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ میں نے قدرے نیچی آواز میں جواب دیا۔ ''میں شہر یار ہوں۔''

''وہ تو میں سن چکی ہوں۔'' اس کی مترنم آواز کانوں میں رس گھول گئی۔ ''کیا تمہیں میڈم نے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا رکھا ہے؟''

میں نے عادتاً اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اتنے فاصلے پر موجود ہونے کے باعث وہ میرا ہلتا ہوا سر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''جی!''

اس کی آواز میں بلاشبہ بڑی کشش تھی۔ کسی بھی شخص کو اپنے پاس کھینچ لینے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔ آسمان کی ڈھلانوں پر پھسلتی رات کے اس پہر میں میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ بولتی رہے، میں جواب دیتا رہوں۔ میں گھاس کی خنکی جذب کرتا ہوا کسی بت کی طرح وہیں ایستادہ تھا، وہ اپنی جگہ پر سرخ روشنی مائل اندھیرے کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

چند گھڑیاں یوں ہی بیت گئیں۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''کس کمرے میں رہائش پذیر ہو؟''

میں نے بتایا۔ ''لائبریری کے سامنے والے کمرے میں۔''

''اکیلے ہو؟''

''ہاں! مگر تم کون ہو؟''

''اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ میں آ کر بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔'' اس کی قدرے مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا، اپنی حیرت کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

اس کے کہے ہوئے جملے کی معنویت کو سمجھتے ہی میری سانس رکنے لگی۔ وہ کون تھی؟ میرے کمرے میں کیوں آنا چاہتی تھی؟ اگر میڈم کو پتا چل گیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ ان گنت سوالات نے ایک دم میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں گیسٹ روم کے بیڈ میں دھنس کر دھڑکتے دل سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے گیلری میں جھانک کر دیکھا۔ لمبی گیلری کے عین وسط میں ایک انرجی سیور روشن تھا جس کی خوابیدہ سی روشنی میں کوئی وجود متحرک نہیں تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس عورت کی گیسٹ روم میں آمد میرے لیے کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ میں دودھ کا جلا تھا، چھاچھ سے ڈر رہا تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیند جو پہلے ہی روٹھی ہوئی تھی، اب تو کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ مترنم آواز نے آنے کا کہا تھا، وقت کا تعین نہیں کیا تھا مگر ہر پل اس کے چلے آنے کے خوف میں جاگ رہا تھا۔ میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ ایک دوجے کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ محض ہیولے دیکھے تھے۔ کسی ہیولے کی طرف یوں متوجہ ہونا اور بڑھنا غیر فطری اور غیر دانش مندانہ فعل تھا۔ اسے کیا مجبوری لاحق تھی کہ وہ خطرات مول لے کر میرے پاس آنا چاہتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنا آسان ہوتا ہے۔ سیڑھیاں اترنا بڑا تکلیف دہ اور اندھا اقدام ہوتا ہے۔

کافی دیر گزر گئی۔ وہ نہیں آئی تو مجھے عافیت کا احساس ہوا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ غنودگی عارضی ثابت ہوئی اور دروازے پر ہونے والی بہت مدھم دستک نے مجھے اچھل کر بیڈ سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری دستک نے غلط فہمی کے شائبے کو دور کر دیا اور میں غیر معتدل سانسوں کو سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ آواز پیدا ہونے کے خوف سے میں نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے قفل کھولا۔ لیور گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہوئے چرچراتا تھا اس لیے اسے نہایت احتیاط سے کھولنا ضروری تھا۔ دروازہ کھلا، ایک اور حیرت کدہ میری نظروں کے سامنے سجا ہوا تھا۔ کھڑکی میں دکھائی دینے والا، نسوانی ہیولا بھری پری اور خوب صورت جوانی کی چولی اوڑھے مجھے دم بخود کرنے لگا تھا۔ میں اسے دیکھ کر یک دم ساکت ہو گیا تھا۔

اس نے چوروں کی طرح اردگرد دیکھا پھر مجھے دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اسی حالت میں ایستادہ ہو گیا جبکہ وہ دروازہ لاک کر کے پلٹی، مجھ پر نگاہ ڈال کر بولی۔ ''تمہی لان میں کھڑے تھے ناں؟''

اس کی آواز نے یقین دلایا کہ کھڑکی میں وہی کھڑی تھی۔ میں نے تھوک نگلا۔ ''ہاں...... آں...... مگر تم کون ہو، یہاں کیوں آئی ہو؟ کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔ پلیز! تم واپس چلی جاؤ۔''

اس نے شاکی نگاہ سے مجھے گھورا۔ جواب دینے کے بجائے بیڈ کے کونے پر ٹک گئی۔ مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا میرا آنا تمہیں اچھا نہیں لگا؟''

میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نائٹ سوٹ، بکھری ہوئی زلفیں اور کھلی بانہیں مجھے مدعو کر کے مبہوت کیے دے رہی تھیں۔ ملیح جلد، تیکھے نقوش اور میک اپ سے بے نیاز، خمار آلود چہرہ کسی بھی زندہ آفت سے کم نہیں تھا۔ اس کے حسن کی تاب میڈم کی آب و چمک سے کم تھی مگر خیرہ کن تھی۔

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''تم میڈم کی کیا لگتی ہو؟''

وہ مجھے سرتاپا دیکھ رہی تھی۔ دلچسپی ہویدا کر رہی تھی۔ خود کھلی کتاب تھی، مجھے کھولنے کا ارادہ آشکار کر رہی تھی۔ ایک ادا سے بولی۔ ''یہاں کوئی بھی میڈم کا کچھ نہیں لگتا۔ جیسے تم یہاں لائے گئے ہو، ایسے ہی مجھے بھی ایک سال پہلے یہاں لایا گیا تھا۔''

میں اس کی بات میں پنہاں مفہوم کو بھانپ نہیں پایا تھا بولا۔ ''مگر میں تو از خود یہاں آیا ہوں۔''

''بہ ظاہر میں بھی اپنے پیروں پر چل کر یہاں آئی تھی۔'' وہ بولی پھر میری اضطرابی کیفیت کو دیکھ کر مسکرائی۔ ''فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ سبھی سو رہے ہیں۔ ظاہر خان جاگتا ہے جس کا جاگنا یا سونا ایک برابر ہوتا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کھل کر بات کرو۔''

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم اب چلی جاؤ۔ اگر میڈم کو پتا چل گیا تو مجھے گھر سے نکال دے گی۔''

''تم میڈم کی فکر نہ کرو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔''

''کہاں گئی ہے؟''

''وہ بتا کر نہیں جاتی کہ کہاں جا رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو سونے کے لیے آ جاتی ہے۔ اب تک اگر آ گئی ہے تو اپنے کمرے میں ہوگی۔ وہ ٹوہ لینے کی عادی نہیں ہے۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی کاٹ عیاں ہونے لگی۔ ''یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اتنا کہ ہمارا ملنا کوئی معانی نہیں رکھتا۔''

وہ غیر محسوس انداز میں کھسک کر میرے بہت قریب ہو گئی۔ اس کی موجودگی اور غیر معمولی قربت مجھ پر اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ ایک عجیب سی سرشاری ہولے ہولے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں کمرے سے نکل کر دور بھاگ جاؤں مگر شاید یہ اختیار بھی میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا، سہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم کتنے اچھے ہو شہر یار! یہی نام بتایا تھا ناں تم نے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لبوں پر زبان پھیری۔ جتنا کھسک سکتا تھا، کھسکا مگر ہمارے بیچ فاصلہ پیدا نہ ہو سکا۔ ایک کراہ نما آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی۔ ''مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پرے ہٹو۔''

وہ چند لمحوں تک یک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر کھسک کر چند بالشت کی دوری پر چلی گئی بولی۔ ''میں شاید تمہیں اچھی نہیں لگی۔ یہ تو دلوں کا سودا ہوتا ہے۔ طے پا گیا تو ٹھیک ورنہ...... خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر باتیں تو کر سکتے ہیں ناں؟''

میں نے بہ عجلت کہا۔ ''ہاں! مگر تم وہیں بیٹھی رہو گی۔''

اس نے ایک ذرا مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر باتیں کرنے لگی۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی۔ کوئی نصف گھنٹا یونہی گزر گیا۔ مجھے اس کی آمد کی غرض و غایت کا پتا نہ چلا۔ محض باتیں کرنے کے ارادے سے اس کا آنا بعید از یقین تھا۔

''تم نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔''

''اب پوچھ لیتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سونیا ہے۔''

میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا تھا کہا۔ ''خوب صورت نام ہے۔''

''کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟'' وہ اٹھلائی۔

میں نے آنکھیں چرا لیں، پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کام

مرزا جی دوائی کی شیشی لیے ہوئے ڈسپنسری میں داخل ہوئے اور اس کمپاؤنڈر سے جس نے انھیں ان کی ساس کے لیے مکسچر بنا کر دیا تھا کہنے لگے۔ ''غالباً تم سے مکسچر بنانے میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں جہاں کونین لکھا ہوا ہے وہاں تم نے خواب آور دوا شامل کر دی ہے۔''

کمپاؤنڈر نے غور سے نسخہ دیکھا، نسخہ دیکھتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو دوست؟'' مرزا جی نے کہا۔ ''میں تو صرف معلوم کرنے آیا ہوں کہ مجھے مزید کتنی رقم دینا چاہیے۔''

GGC

کرتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں میڈم کا حکم بجالاتی ہوں۔"

"وہ تم سے کیا کام لیتی ہے؟"

وہ مسکرائی، بولی۔ "تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"میرے پاس کیا کرنے آئی ہو؟"

"تمہیں ملنے کے لیے آئی ہوں۔ اگر تم چاہو گے تو آئندہ بھی آتی رہوں گی۔ برا مناؤ گے تو کبھی نہیں آؤں گی۔" اس نے براہ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

میں کوئی بھی جواب نہ دے پایا، وہ بولی۔ "کیا تمہارے دل میں نیکی کرنے کا جذبہ موجود ہے؟"

میں نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھا، بولا۔ "میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں کچھ کہنا نہیں، تمہیں اپنے کمرے میں لے کر جانا چاہتی ہوں۔" وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔

"مگر کیوں؟" میں گھبرا سا گیا۔

"یہ تو تمہیں وہیں جا کر ہی پتا چلے گا۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو......؟"

"کیا یہاں کسی نے دیکھا ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"یہ تو گیسٹ ہاؤس ہے۔"

"یہ ساری کوٹھی ہی گیسٹ ہاؤس ہے۔ ڈرو مت، چلو میرے ساتھ۔ تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ گیلری میں پہنچ کر اس نے میری کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا۔ اپنا آدھا وزن مجھ پر ڈال کر اٹھلائی، بولی۔ "دیکھو! عورت کیسے مرد کو اپنے پیچھے چلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔"

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہارا رویہ یہی رہا تو میں لوٹ جاؤں گا۔"

اس نے ایک ذرا مسکرا کر میری بات مان لی۔ گیلری کے آخری سرے پر کشادہ سیڑھیاں اوپر جاتی نظر آئیں۔ ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے فرسٹ فلور پر آئے۔ بڑا ہال کمرا خالی تھا۔ اسے عبور کر کے ہم ایک کارپٹڈ گیلری میں داخل ہوئے۔ یہ گیلری بھی آخری سرے تک خالی تھی۔ شاید رات کے اس پہر میں کسی کے بیدار ہونے کا احتمال نہیں تھا، اس لیے وہ کمال اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا کمرا گیلری کے آخر میں واقع تھا۔

اس کے کمرے کی آرائش ویسی ہی تھی، جیسی میرے گیسٹ روم کی تھی۔ اندر سرخ رنگ کا نائٹ بلب روشن تھا جس کی مدھم روشنی میں، پہلی نظر میں کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔ آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو پتا چلا کہ سونیا کے بیڈ پر کوئی لڑکی سو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں رہتی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے سرگوشی کی۔ "یہ میری نئی روم میٹ ہے۔ میڈم نے اسے ایک گھنٹا قبل میری تحویل میں دیا ہے۔"

شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ سونے والی ہماری آوازوں کے سبب بیدار ہو جائے، تبھی رازدارانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے کیا دکھانے کے لیے یہاں لائی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "ہاں! تم مجھے کیا دکھانا چاہتی تھیں؟"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور تقریباً کھینچتے ہوئے بیڈ کی دوسری طرف لے گئی۔ اب سونے والی لڑکی کا چہرہ میری جانب تھا۔ روشنی کم تھی۔ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اسے دیکھ لیا، اب کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پلٹ کر دروازے کے دائیں جانب دیوار میں نصب سوئچ بورڈ تک گئی۔ ایک بٹن پش کیا۔ کمرا یک بارگی روشنی سے معمور ہو گیا اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے فوراً آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے ہاتھ ہٹائے۔ ناگاہ، نظر خوابیدہ چہرے پر پڑی تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ میرے پورے بدن کا خون میری آنکھوں میں سمٹنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگوں نے اچانک میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلو کے بل لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما تھی جس پر کھالا جی جان سے فریفتہ تھا۔ میں نے گردن موڑ کر سونیا کو دیکھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولی۔ "یہ کون ہے، میں نہیں جانتی۔ یہاں تک کیسے پہنچی، میں نہیں جانتی۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ شکل سے معصوم اور اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے خوابیدہ اسما کے چہرے کو غور سے دیکھا، نیند کے گہرے استغراق میں تھی۔ تابندہ چہرے پر زلفیں بکھر کر سایہ کر رہی تھیں۔ میں نے چند لمحوں میں بہت سوچا مگر اس کی یہاں موجودگی کا سبب سجھائی نہ دیا۔ اس کا میڈم سے کیا تعلق تھا؟ یہ بھی نہ کھلنے والا عقدہ تھا۔ ایسے میں میرے کندھے پر

اسکاٹ لینڈ والے

صرف کنجوسی میں شہرت نہیں رکھتے بلکہ ان کی بذلہ سنجی و ظرافت بھی مشہور ہے۔ ایک ریفری نے ایک قصہ سنایا۔

"جنوبی امریکہ کی ایک فٹ بال ٹیم ایڈنبرا میں اسکاٹ لینڈ کی قومی ٹیم سے میچ کھیل رہی تھی۔ میں ریفری تھا۔ مقابلہ بڑا زبردست تھا۔ لوگ بار بار میرے فیصلے پر اعتراض کرتے۔ اسکاٹ لینڈی صفر کے مقابلے میں چار گول سے ہار گئے۔ جب میدان سے جانے لگے تو ایک کھلاڑی بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

"ریفری! تمہارا کتا کہاں ہے؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کتا؟ کونسا کتا؟"

وہ شخص طنز آمیز انداز میں بولا۔ "کمال ہے۔ میں نے آج تک کسی اندھے کو بغیر کتے کے نہیں دیکھا۔"

مرسلہ: [illegible] لائبریری، [illegible]، کراچی

لمس آن ٹھہرا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ سونیا نے اپنا چہرہ میرے کندھے پر ٹکا دیا تھا اور آنکھیں موند کر مسکرا رہی تھی۔ میں آہستگی سے ہٹ گیا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی، بولی۔ "قریب آتی ہوں تو دور چلے جاتے ہو۔ دور ہو جاؤں گی تو قریب آنے کے لیے ترسو گے۔"

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سو رہی ہے؟"

اس نے ایک ادا سے سر ہلایا۔ "نہیں، بے ہوش ہے۔ پھولوں کی سیج پر سوئی تھی، ہوش میں آئے گی تو خود کو غلاظت کے ڈھیر پر دیکھ کر آدھی مر جائے گی۔"

سونیا اپنے لہجے سے بہت پڑھی لکھی لگتی تھی۔ باتیں بھی الجھی الجھی کرتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"بتایا تو ہے......" وہ اٹھلائی۔

اس کے انگ انگ میں شوخی اور شباب کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنبھلنے کا موقع دیے بغیر قریب ہو کر حواس پر چھانے لگتی تھی۔ وہ خوب صورتی میں کسی طور بھی اسما سے کم نہیں تھی مگر میری تمام تر توجہ اسما کی جانب مبذول تھی۔ میں نے کہا۔ "اگر تم اسے جانتی نہیں ہو تو پھر یہ بے ہوشی کی حالت میں تمہارے کمرے میں کیوں لیٹی ہوئی ہے؟"

"میڈم نے اسے میری تحویل میں دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا خیال رکھوں۔ اسے کمرے سے ایک پل کے لیے بھی باہر نہ جانے دوں۔"

"تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟" میں مخمصے میں پڑ گیا۔ "میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

میرے سوال پر اس کے چہرے پر اداسی کی ایک پرچھائیں لہرائی، بولی۔ "بہت سال پہلے، میں ایسے ہی شبانہ نام کی ایک لڑکی کی تحویل میں آئی تھی۔ سفید چادر والے بیڈ پر سوئی تھی، دھبوں سے اٹے ہوئے بیڈ پر بیدار ہوئی۔ تب سے آج تک واپسی کی راہ نہیں ملی۔"

"تو؟" میں کچھ نہ سمجھ پایا۔

"میں تمہیں نہیں جانتی۔ اسے نہیں جانتی۔ مگر تم دونوں کی شکلیں بتاتی ہیں کہ تم اچھے اور شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہو۔ بھٹک کر ادھر آ نکلے ہو یا بھٹکائے گئے ہو۔ آج واپس چلے جاؤ گے تو زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤ گے، یہیں کے ہو جاؤ گے تو تمام عمر کانٹوں سے الجھتے رہو گے۔"

میں چند قدم پیچھے ہٹ کر آرام دہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے میرے پیروں میں فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ بولی۔ "سچ کہتی ہوں۔ یہاں جو بھی لایا جاتا ہے، اسے یہی سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوئی سمجھ جاتا ہے، کوئی مجھے احمق سمجھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ بنگلا میڈم کا ہے۔ میڈم کا حکم چلتا ہے۔ وہ ہماری سانسیں اپنی مٹھی میں دبائے رکھتی ہے۔"

میں عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ میڈم شکیلہ میری محسنہ تھی۔ سونیا کے چہرے پر سچی عبارت پڑھنے کے باوجود بھی دل میڈم کی طرف سے میلا نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر یقین کرنا محال تھا تو اِس کی بات کو رد کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "تم میڈم کے ساتھ رہتی ہو، میڈم کا کھاتی پہنتی ہو، اسی کو ڈستی ہو، یہ کیا ہے؟"

اس نے جلدی سے کہا۔ "میں اس کا نہیں، وہ میرا کمایا ہوا مال کھاتی ہے۔ رہی بات ڈسنے کی، تو میرے ڈسنے سے ایک معصوم لڑکی اپنی دنیا میں پلٹ جائے، کیا بری بات ہے؟"

"کیا پہلے بھی تم نے ایسا کیا ہے؟"

"ہاں! میں دو تین لڑکیوں کو اس جہنم کدے سے نکال چکی ہوں۔"

"یہاں ایسا کیا ہے جس کی بنا پر تم اتنی خوب صورت کوٹھی کو جہنم کدہ قرار دے رہی ہو؟"

وہ قدرے زچ ہو کر بولی۔ "تم اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہو؟ سیدھی سی بات ہے، یہاں ہر وقت جسم کی آگ دہکتی رہتی ہے جس پر میڈم کی دیگچی چڑھی رہتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، کیا تم اس لڑکی کی مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اس کی مدد کیوں کرنا چاہوں گا؟" میں اب بھی شدید الجھن میں تھا۔

"نیکی اور برائی کی فلاسفی کو مانتے نہیں ہو، کیا تم مسلمان نہیں ہو؟" وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولی۔ "میں بتا رہی ہوں کہ یہ گناہ کی دلدل ہے۔ میرا جسم لاکھوں ہزاروں میں بکتا ہے جس میں سے مجھے بھی راتب ملتا ہے۔ اس کا بدن بھی شوکیس میں لگا دیا جائے گا۔ لاکھوں کمائے گی مگر صرف میڈم کے لیے۔ ہر رات مرے گی، ہر صبح جیے گی۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گی مگر کٹے پروں والے کبوتر کی طرح یہیں چکراتی رہے گی۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمہارا جسم، خون اور تمام طاقتیں میڈم کے ہاتھ گروی رکھی جائیں گی۔ وہ تمہارے ہاتھوں میں گن پکڑا کر اپنے دشمنوں کو گولی مارے گی۔ تمہارے ہاتھوں منشیات کی سپلائی دے کر ہزاروں گھروں کے چراغ بجھائے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے، کیا تم نے خدا کے سامنے پیش نہیں ہونا حشر کے دن؟"

میرے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا۔ وہ بڑی روانی سے اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ گئی تھی جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میڈم اتنے قبیح کام کرتی تھی، حیرت کی بات تھی۔ اگر میں نے اسے معصوم اور کاروباری خاتون سمجھا تھا تو یہ میری فاش غلطی تھی کیونکہ میں اس کا رسوخ دیکھ چکا تھا۔ یہ دبدبہ، یہ دولت، عام اور صاف ستھرے کاروبار سے حاصل نہیں ہوتی۔ کسی بھی تاجر کے سامنے شہر کا ایک تھانیدار اس طرح سر نہیں جھکاتا جس طرح میڈم کے سامنے میں نے تھانیدار کا جھکا ہوا سر دیکھا تھا۔ مجھے سونیا کے کمرے میں آئے کافی دیر گزر گئی تھی۔ کسی نے بھی دخل نہیں دیا تھا۔ کوٹھی کے سبھی مکین خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ یہ وہ لمحے تھے جب مجھے جان سے پیاری پروین کا اغوا، سائیں دل جیت کا قتل اور کھالے کا غیاب مضطرب نہیں کر رہا تھا بلکہ میں ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اسما بہ دستور بے ہوش تھی۔ میں کرسی سے اٹھا، سونیا سے بچ کر بیڈ کے پاس آیا اور اسما کو بہ غور دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ تیکھے نقوش، گھنگھریالی سیاہ دراز زلفیں، بلیچ جلد اور گلاب کی طرح کھلا کھلا رنگ...... میں نے پلٹ کر سونیا کو دیکھا۔ اس کا حسن چودھویں کے ڈھلے ہوئے چاند کی طرح آنکھوں میں کھب رہا تھا، وہ بولی۔ "یہ دیکھ رہے ہو کہ ہم دونوں میں سے زیادہ خوب صورت کون ہے؟"

اس کے لہجے میں استہزاء اور شرارت کے عناصر غالب تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔ "سچ کہتی ہوں، آج یہ خوب صورت ہے کیونکہ اس کا دامن اجلا ہے۔ کل میں خوب صورت قرار پاؤں گی کیونکہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کی سوار ہوں گی۔ میری مانو، اسے لے کر کوٹھی سے نکل جاؤ۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں پناہ مل جائے گی۔ زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے گا۔ اس کے ساتھ شادی کر لینا۔ چونکہ اسے میڈم یہاں لائی ہے اور جسے میڈم گھر سے اٹھا لائے، اس کی واپسی کے تمام راستے بند ہوتے ہیں۔ یہ واپس اپنے گھر گئی تو اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے گا۔"

اس کے لہجے میں خوفناک سنگینی اتر آئی۔ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "خاموش کیوں ہو؟ کیا مرد نہیں ہو؟ زندگی میں ایسا موقع ایک مرتبہ ملتا ہے۔ آدمی ادھر ہو جائے تو دنیا چمن زار دکھائی دیتی ہے۔ اُدھر ہو جائے تو آگ کی لپٹوں سے عمر بھر کا واسطہ پڑ جاتا ہے۔"

میں نے اپنا رخ سوئی ہوئی اسما کی طرف کر لیا۔ خوابیدگی کے عالم میں وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں سونیا کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو رہا تھا، میرے ذہن میں سائیں دل جیت کے منہ سے آخری ساعتوں میں نکلا ہوا لفظ گونج اٹھا "حیدر خان......"

وہ سردار حیدر خان کی بیٹی تھی جس نے میری بہن کو سائیں دل جیت کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ نفرت کی ایک آتش فشانی لہر میرے تن بدن میں اتر گئی۔ ایسی لہروں کے مقابل میں کوئی اور جذباتی کیفیت یا ہمدردی کا جذبہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ایک بند عقدہ وا ہونے لگا۔ ممکن تھا، میڈم نے اسما کو پروین کی بازیابی کے لیے اغوا کیا ہو؟ وہ سردار حیدر خان سے اسما کے بدلے میں پروین کو مانگنا چاہتی ہو؟...... یہ خیال آتے ہی میرے ذہن میں سونیا کا بیان کیا ہوا تمام تر فلسفہ ہوا ہو گیا۔ میرے جبڑے کے اعصاب تن گئے، سر تنبیہی انداز

میں ہل گیا، پلٹ کر بولا۔ "سونیا! میں اس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میڈم میری محسنہ ہے، احسان کا بدلہ احسان سے دینا ہماری روایات میں شامل ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "کیا میں نے اب تک جو بکواس کی ہے، وہ سب فضول رہی؟"

"نہیں......" میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم بہت اچھی لڑکی ہو مگر میں تمہارے اچھے خیالات پر 'شاباش' کہنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا تم میڈم کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں! میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"خواہ اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے؟"

"تمہاری زندگی تباہ ہو گئی، بقول تمہارے تو یہ کیا آسمان سے اتری ہوئی ہے؟" میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"ایک نہ ایک دن تو تم میڈم کو چھوڑ ہی جاؤ گے، تب؟"

"چھوڑ کر جانے سے پہلے میڈم کو بتا دوں گا۔"

"وہ تمہیں گولی مار کر سڑک پر پھینکوا دے گی، جانے نہیں دے گی۔" وہ پورے تیقن سے بولی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ "کیا مطلب؟"

"یہاں کی دنیا کے راز تمہارے سینے میں ہیں جو کسی وقت ثبوت بن کر میڈم کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں گے۔ میڈم بانس کو جلا دیتی ہے تاکہ اس کے نام کی بانسری بجنے کا خطرہ نہ رہے۔" وہ مجھے ڈرانے کے سے انداز میں بولی۔

خوف کی ایک لہر میرے بدن میں اتر گئی مگر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی اس کمزوری کو آشکار نہیں ہونے دیا بولا۔ "پروا نہیں...... میں مرنا قبول کر لوں گا مگر منافقت کی سانس پھیپھڑوں میں نہیں اتاروں گا۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

وہ برق کی سی تیزی سے میرے پہلو سے نکل کر میرے اور دروازے کے بیچ حائل ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "اب کیا ہے؟"

وہ ادا سے بولی۔ "نیکی نہیں کرنا چاہتے، نہ سہی، گناہ ہی کر لو۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

اس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکیلا۔ پسپا نہیں کر پائی تو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "طاقت ہے مگر فتح کا جذبہ نہیں، تم کیسے مرد ہو؟"

میں نے کہا۔ "مجھے جانے دو، اگر میرو شاہ جاگ گیا تو مجھے موجود نہ پا کر پریشان ہو جائے گا۔"

اس نے ہونٹ سکیڑے، بولی۔ "اس کی فکر نہ کرو، وہ سکڑا عاشق گھوڑے گدھے بیچ کر سوتا ہے۔ سر پر بم پھٹے، تب بھی نہیں جاگے گا۔"

وہ مجھے پسپائی پر مجبور نہیں کر پائی تھی۔ ناکامی کی خفت مٹانے کے لیے میرے سینے میں سر چھپانے کی کوشش میں مجھ سے چمٹ گئی۔ کھالے کی بہن بلو نے مجھے اپنی جوانی سے روشناس کرایا تھا، سمجھایا تھا کہ جوانی کی آگ کی اپنی تمازت ہوتی ہے، جلاتی ہے تو خاکستر نہیں کرتی بلکہ شعلہ بنا دیتی ہے۔ خالدہ عرف بلو کی تمازت اور تھی۔ سونیا کی لپک بہت گرم تھی کہ لمحوں میں پورے بدن میں اتر گئی۔ میری سانس غیر معتدل ہونے لگی۔ میں نے سنبھل کر دامن چھڑانا چاہا مگر اس کی گرفت کو وارفتگی نے مضبوط کر دیا تھا۔ میں نے جب کہا کہ 'چھوڑو مجھے، جانے دو' تو میری آواز میری سماعت کو بھی کمزور لگی۔

وہ اپنا چہرہ میری چھاتی پر رگڑ رہی تھی اور مجھے جہانِ حسن کی آوارگی پر اکسا رہی تھی۔ شاید وہ میرے اندر جلتے بجھتے کرب کے شعلوں سے آگاہ نہیں تھی جن کی آنچ مجھے کسی اور طرف مائل نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایسے میں اچانک میرے اندر کا سلگتا ہوا انسان جاگ اٹھا اور میں نے اس کی بانہیں کھول کر پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا لگی اور تشنہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے غلط کہا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں تالی کی آواز گونجی۔ میں بڑی تیزی سے پلٹا۔ پہلے گمان گزرا تھا کہ اسما جاگ گئی ہے مگر آنکھوں کے سامنے میڈم کو کھڑا دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کے لبوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ نے جیسے میرے قدموں کو قالین سے چپکا دیا تھا۔ اس کے اجلے اور آراستہ وجود کے پیچھے دو کمروں کے درمیانی دروازے پر لٹکا ہوا بیز پردہ لہرا رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجا رہی تھی۔ ہاتھ تھمے تو زبان نے حرکت کی۔ "ویل ڈن شہریار! تم خوب صورت ہو، اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور مخلص بھی ہو۔"

اس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ نصف شب تک چلنے والا رومانوی تحرک اور نیکی کا پرچار محض ڈراما تھا۔ یہ ایک طرح کا امتحان تھا جس میں، میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اتاری۔ میڈم

کی سرخ آنکھوں والا چہرہ دیکھا۔ پھر گردن موڑ کر چوکھٹ سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے، ساکت بدن کھڑی سونیا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ چند لمحے پیشتر نظر آنے والے تاثرات معدوم ہو چکے تھے۔ وہ اب نہ تو فریفتہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی آتش شباب سے ہاری ہوئی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے میڈم کو مخاطب کیا۔ ''میڈم! یہ سب کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''تمہارا اشارہ اسما کی طرف ہے یا سونیا کی طرف؟''

میں چونکا۔ ''میرا مطلب، آپ کی یہاں موجودگی سے ہے۔''

اس کے گلابی لبوں سے جلترنگ سی بج اٹھی، پھر مترنم گھنٹیاں تھم گئیں، بولی۔ ''سونیا! تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

سونیا نے جانے میں دیر نہیں کی۔ میڈم نے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود صوفے پر ٹک گئی، بولی۔ ''شہریار! اسے جانتے ہو؟''

اس کا اشارہ بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی اسما کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ''جی! یہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما ہے۔ اسی سے ملنے کے لیے تو میں اور کھالا ملتان آئے تھے۔''

''میں نے اسے اغوا کروایا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ کچھ دیر تک گھورتی رہی، پھر ہونٹوں پر انداز عجب سے زبان پھیرنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''جی!''

وہ چونکی۔ ''ہاں تو شہریار! میں نے اسے اغوا کرایا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں سردار حیدر خان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی تمہاری بہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ جاؤں گی تو اس کے خونخوار کارندے گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ اگر وہاں سے بچ کر آ گئی تو میرے بڑے مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہر بڑے کے پیچھے ایک اور بڑا موجود ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ میں لگام تھامے کھڑا ہوتا ہے۔ میرے پیچھے بھی ایسی طاقتیں موجود ہیں۔ وہی طاقتیں سردار حیدر خان کی رسی کو دراز کرتی ہیں۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی، ساتھ انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔ ''ایک تیسری پارٹی کو بیچ میں ڈال کر میں نے اسما کو حیدر خان کی ملتان والی کوٹھی سے اغوا کرالیا ہے۔ وہ پارٹی اغوا برائے تاوان کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ حیدر خان سے رابطہ کر رہی ہے۔ رابطہ ہونے پر اسما کے بدلے تمہاری بہن کو مانگے گی۔ ملنے پر مجھے پہنچا دے گی اور اسما کو اپنی تحویل میں لے لے گی۔ اسما کے ساتھ پندرہ لاکھ روپے بھی اس کوٹھی سے جائیں گے۔''

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ میڈم نے میری خاطر اوکھلی میں سر ڈال دیا تھا۔ میری آنکھوں میں ممنونیت کے تاثرات جھلک اٹھے۔ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ''میڈم! میں آپ کے احسانات کا بدلہ شاید کبھی نہیں چکا پاؤں گا۔''

''اگر احسان کا بدلہ محبت میں طلب کیا جائے تو؟''

میرا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اٹھا، میڈم کو دیکھا، دلچسپی آمیز مسکراہٹ چہرے پر ناچ رہی تھی اور وہ یک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں قدرے گھبرا گیا، بولا۔ ''جی میڈم! میں سمجھا نہیں۔''

وہ بولی۔ ''انسان جس سے محبت کرتا ہے، اسے دھوکا نہیں دیتا۔ اسے چھوڑ کر نہیں جاتا۔ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکتے ہو؟''

اس کی فرمائش کو پورا کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''جی میڈم! میں کوشش کروں گا کہ آپ کو ناراض نہ کروں۔ ویسے میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تم کس قابل ہو، یہ میں جانتی ہوں۔ تمہیں کس قابل کرنا ہے، یہ میرے ساتھی جانتے ہیں۔ اب تم جاؤ، آرام کرو، اور ہاں! کسی سے، حتیٰ کہ اپنے دوست کھالے سے بھی اسما کا تذکرہ نہیں کرو گے۔ اگر سردار حیدر خان کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ اسما یہاں ہے تو اس کے غنڈے بھیڑیوں کی طرح یہاں دوڑے چلے آئیں گے۔ منزل ہاتھ میں آ کر دور ہو جائے گی۔''

میں نے 'یس میڈم' کہا اور گراؤنڈ فلور پر واقع اپنے گیسٹ روم میں جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔ میڈم کی آواز سنائی دی۔ ''اب تم اس کمرے میں بھی نہیں آؤ گے۔ اگر اسما نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر تم پر نور پور کی فضا تنگ ہو جائے گی۔''

مجھے اس بات کا خیال نہیں تھا، میڈم شکیلہ کی تاکید پر مجھے جھٹکا سا لگا۔ اسما بے ہوش پڑی تھی۔ اگر جاگ رہی ہوتی تو مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیتی اور پھر سردار حیدر خان کو میرے گھر تک پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگتی۔

میں نے جاتے ہوئے ممنون نظر سے میڈم کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ اسما کے چہرے پر نئے سرے سے کھیلنے لگا تھا اور نظریں

اس کے گلابی چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں۔

گراؤنڈ فلور کے گیسٹ روم میں پہنچ کر میں گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر لیٹا۔ جب سے پروین نظروں سے اوجھل ہوئی تھی، پہلی مرتبہ اطمینان کی سانس سینے میں اتری تھی۔ دل کو تسلی ہوئی تھی کہ اسما کے اغوا کا سنتے ہی سردار حیدر خان کی اونچے شملے والی پگ زمیں بوس ہو جائے گی اور وہ اپنی بانہہ لینے کے لیے پروین کو بلاتردد بالواسطہ طور پر میڈم کے حوالے کر دے گا۔ میرے دل میں بے اختیار میڈم کے لیے احترام اور عقیدت کے جذبات ہلکورے لینے لگے۔ سونیا نے اس کے بارے میں جو بتایا، وہ درست بھی تھا تو بھی وہ میرے لیے قابلِ احترام تھی، میری محسنہ تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے قتل کے متوقع مقدمے میں مکھن سے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ مجھے سائیں دل جیت والا مضبوط کلیو دیا تھا۔ وگرنہ میں اگر تمام عمر بھی سر پٹختا رہتا تو اپنی پروین تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ طے تھا کہ میں سردار حیدر خان تو کجا، سردار حیات خان پر بھی ہاتھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے میری خاطر اتنے بڑے اور طاقتور آدمی سے ٹکر لے لی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت نازک اندام تھی، جبکہ عملی طور پر وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اتنی طاقت رکھتی تھی کہ سردار حیدر خان کی مونچھ پکڑ کر اپنی ایڑی کے نیچے دبا سکتی تھی، یہ تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ میں اس کی آزمائش کے کڑے امتحان میں سرخرو ہوا تھا۔ اس کی ذہانت اور چالاکی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے بجا طور پر علم تھا کہ میرا دیہاتی پن مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا گیا تھا۔ اگر میں چالاک بننے کی کوشش کرتا تو اس وقت میں یہاں نہ ہوتا بلکہ دھتکار دیا گیا ہوتا یا کہیں پڑا زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔ یہ طے تھا کہ میڈم جیسی دکھائی دیتی تھی، ویسی تھی نہیں۔ اس کے کارنامے عیاں کرتے تھے کہ وہ بہت زیرک، تیز فہم اور سفاک عورت تھی۔ اگر وہ میری خاطر سردار حیدر خان کی غیرت کو چرکہ لگا سکتی تھی تو مجھ سے بدگمان ہو کر میرا پتا بھی کاٹ سکتی تھی۔

میں اب بھی خطرات کی زد میں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ دل جیت کی نعش راکھ بن کر دنیا سے غائب ہو گئی تھی یا نشانِ عبرت بن کر اپنے قاتل کو تلاش کرتی پھرتی تھی۔ مجھے اس کی بیویوں اور کم سن بیٹوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، مجھے وریام خان، حیدر خان اور دل جیت کے بدقماش اور چہیتے بدمعاشوں کا خوف لاحق تھا جو رات کے اندھیرے میں کسی بھی وقت موت کے ہرکارے بن کر میرے گھر میں اتر سکتے تھے۔ چونکہ میرے علاوہ گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جو ظلم کی ایسی تند ہوا کے سامنے چند سیکنڈ بھی ٹھہر سکے، اس لیے میرا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اگر اس کی نعش بالن کے ساتھ جل کر راکھ بن گئی تھی تو پھر اس کے غیاب کا مسئلہ نور پور میں پورے شدومد سے کھڑا ہوگا۔ چہ میگوئیوں کا بازار گرم ہوگا اور پولیس کا آنا جانا لگا ہوگا۔ ایک دھڑکا یہ بھی تھا کہ میری عدم موجودگی میری ذات کو مشکوک نہ بنا چکی ہو۔ میں گیسٹ روم میں پڑے ہوئے فون پر بخت خان سے رابطہ کر کے نور پور کے حالات کے بارے میں پوچھ سکتا تھا مگر میرو شاہ اور میڈم نے مجھے کہیں فون کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے کمرے کی کسی طریقے سے نگرانی بھی کی جا رہی ہو اور ابھی میرا آزمائشی مرحلہ ختم نہ ہوا ہو۔

اسما کو دیکھ کر دل میں جاگنے والا پہلا احساس ہمدردی کا تھا۔ تب میں نے اسے کھالے کی نظروں سے دیکھا تھا۔ جونہی مجھے اس کے وجود کے تاوان میں ملتی ہوئی پروین کی شکل دکھائی دی، میرے دل میں اس کے لیے کدورت اور نفرت کے جذبات امڈ آئے تھے۔ وہ فرعون کی بیٹی تھی۔ وہ زہریلے سانپ کی بیٹی تھی۔ انسانی لبادے میں خطرناک ناگن تھی جو کسی پل ڈس کر زندگی کی ڈور کاٹ سکتی تھی۔

ذہنی رو بدلی اور اس نے مجھے آن واحد میں میڈم، سونیا اور اسما کے چہروں کے تسلط سے نکال کر نور پور کی تازہ دم گلیوں میں پہنچا دیا جہاں شانو، صدف بی بی اور غزالہ کے معصوم چہروں کی راجواڑیاں قائم تھیں۔ صدف بی بی یاد آئی تو اس کا ملتفت ہونا پہلو میں کچوکے لگانے لگا۔ کھالے کے گھر میں پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کے بعد جب میں اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں نے غزالہ کو چھیڑنے کی غرض سے مصنوعی تفاخر کے ساتھ کہا تھا کہ صدف بی بی بہت اچھی ہیں اور مجھے بہت غور سے دیکھتی ہیں تو اس کا منہ بن گیا تھا۔ پھر اس نے تنہائی پاتے ہی کہہ دیا۔ ”شہریار! اسکول کی کڑیاں تمہاری تعریفیں کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ کسی ’نمازن پرہیزن‘ ماں نے تمہیں جنا ہے۔“

”اور تم کیا کہتی ہو؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

اس نے میری طرف بے ساختگی سے دیکھا۔ فخر کا جذبہ انگ انگ سے عیاں ہو گیا، بولی۔ ”میرا شہرا تو جگ سے وکھرا (جداگانہ) ہے۔ کڑیاں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔“

”اور اگر میں بلو کے خطرناک حملے میں ہار جاتا تو؟“

وہ وثوق سے بولی۔ ”تو بھی مرا سوہنا رب میری محبت کی لاج رکھتا اور تمہیں اس کل موہی کے چنگل سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیتا۔“

محبت کا سفر یقین کی راہ پر جاری رہتا ہے۔ جونہی بھروسا اٹھ جاتا ہے، پیر شل ہونے لگتے ہیں۔ اس کا پُریقین لہجہ اور ستائش بھری نگاہ سے مجھے نئی توانائی مل رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے صدف بی بی نے بلوایا تھا۔ مجھ سے نکی نکی (چھوٹی چھوٹی) باتیں پوچھتی رہی۔ میں نے سارا واقعہ کھول سنایا تو پتا ہے اس نے کیا کہا تھا؟“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا کہا تھا؟“

”اس نے کہا تھا کہ شالا میں شہرے کی ’منگ‘ ہوتی۔“ غزالہ کی آنکھوں میں شرارت بھر گئی۔

سارا نور پور جانتا تھا کہ غزالہ میری منگ (منگیتر) تھی۔ مجھے اس کی یہ بات سن کر تعجب ہوا۔ کہاں میں، کہاں صدف بی بی۔ سوائے ایک ننھے سے رقعے کے کوئی تعلق استوار نہیں ہوا تھا۔ غزالہ میرے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ پروین نے جھانکا۔ غزالہ کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم کھالے سے ملے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ تو کر سکتے ہو کہ اسے باہر مل لیا کرو، اس کے گھر نہ جایا کرو۔ سچی شہرے! میرا دل اب بھی کانپ اٹھتا ہے جب میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آتا ہے۔ تمہیں چارپائی پر بے ہوش پڑے دیکھ کر میری جان نکل گئی تھی۔“

میری بند آنکھوں کے عقب میں پروین، غزالہ اور کھالے کی صورتیں گڈمڈ ہونے لگیں، نجانے کس وقت نیند آئی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ میں جلدی سے میرو شاہ کے کمرے کی طرف لپکا۔ خالی کمرا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میرو شاہ نجانے کس وقت چلا گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میرو شاہ تو دکھائی نہیں دیا البتہ انسپکٹر اظہر سفید نٹھے کے کلف شدہ سوٹ میں ملبوس ظاہر خان کی معیت میں مین گیٹ میں داخل ہوتا نظر آیا۔ میں چونکا۔ اس کی یہاں آمد بلاجواز نہیں تھی۔ وہ اکیلا تھا، سرکاری گاڑی میں نہیں تھا یا اگر ایسا نہیں تھا تو گاڑی اور اس کے ساتھی گیٹ کے باہر ہی رک گئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے مرکزی گیٹ کے سامنے بنے ہوئے آرائشی برآمدے میں داخل ہوتے ہی دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کمرے کے دروازے میں ظاہر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا۔ ”خان! وہ میرو شاہ دکھائی نہیں دیتا۔“

اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ چڑی مار کا بچہ اباسیاں (جماہیاں) لیتا ہوا دپان (دفعان) ہو گیا اے......“

وہ کہاں چلا گیا تھا؟ کم بخت کے آنے جانے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ مجھے بے عنوان اضطراب نے آن گھیرا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ تھانیدار کیوں آیا ہے؟“

”امارے کو کیا پتا ...... میڈم صاب سے ملنے آئی اے۔“

اس نے جاتے ہوئے کہا۔ آدھی بات سنائی دی، آدھی گیلری میں ہی تحلیل ہو گئی۔ میں ناشتا کر ہی رہا تھا کہ کھڑکی کے راستے ظاہر خان اور انسپکٹر اظہر کی باتوں کی ملی جلی آوازیں کانوں میں پڑیں جن سے معلوم ہوا کہ انسپکٹر اظہر میڈم شکیلہ سے ملنے کے بعد رخصت ہو رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی مختصر ملاقات میں اس نے میڈم سے کیا کہا ہوگا؟ پھر سر جھٹکا اور ناشتے میں مشغول ہو گیا۔ وہ کیوں ملے، یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ ظاہر خان برتن سمیٹ کر اوجھل ہوا تو میڈم کا بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں مخصوص صوفے پر بڑے پُرسکون انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں صوفے پر ٹک سا گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر کے بعد گویا ہوئی۔ ”شہریار! میں بہت بری طرح پھنس گئی ہوں۔“

”جی؟“ میں چونکا، میڈم کو دیکھا، بولا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

اس کے دل ربا چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا تھا۔

مجھے چند لمحوں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”میں نے افضل نیازی کے گروپ کو اسما کے اغوا کا ٹاسک دیا تھا۔ پندرہ لاکھ میں سودا ہوا تھا۔ افضل وعدہ نبھانے والا آدمی ہے۔ اس نے ہتھیلی پر سرسوں جما کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہاں تک تو معاملہ بالکل درست تھا۔ ابھی انسپکٹر اظہر نے آ کر اطلاع دی ہے کہ افضل نیازی کو بھرے بازار میں اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کاروں کا طریق کار اور دیدہ دلیری چغلی کھاتی ہے کہ وہ سردار حیدر خان کے تربیت یافتہ لوگ تھے۔“

میری پیشانی بھی شکن آلود ہو گئی۔ میڈم شکیلہ کی پریشانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اگر سردار حیدر خان اتنے مختصر وقت میں میڈم کی ہائر کی ہوئی پارٹی کے سربراہ تک پہنچ گیا تھا تو وہ میڈم تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”اب کیا ہوگا میڈم؟“

میڈم نے فی الفور میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنی

گداز اور گل فام انگلیوں سے کھیلتی رہی، سوچتی رہی، توقف کے بعد بولی۔ ”افضل نیازی معمولی آدمی نہیں ہے مگر وہ حیدر خان کے غیظ و غضب کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر پائے گا اور میرا نام بتا دے گا۔ حیدر خان کا گرگا، استاد ببلو، پہلے ہی مجھ سے خار رکھتا ہے۔ اپنے مالک کی شہہ پر بھوکے کتّے کی طرح میری طرف دوڑ پڑے گا۔“

میں نے تفکر و استعجاب آمیز انداز میں کہا۔ ”کیا حیدر خان اتنا ہی طاقت ور ہے؟“

”ہاں! وہ بہت بڑا فرعون ہے۔ ایک طرف تو اس نے بیلے میں اپنے گرگوں کی فوج پال رکھی ہے، دوسری طرف سیکڑوں سیاست دان اس کی مٹھی میں ہیں۔“

وہ بیک وقت متفکر بھی تھی، پریشان بھی اور خوفزدہ بھی...... میرا دیہاتی پن عود کر آیا، کہا۔ ”میڈم! آپ خوفزدہ نہ ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ پر آنے والی آنچ اپنے بدن پر روکوں گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، یقین نہیں آیا تو آنکھوں ہی آنکھوں سے کریدنے لگی، بولی۔ ”میں خوفزدہ نہیں ہوں، پریشان ہوں۔ حیدر خان اور اس کا گرگا مجھ سے ذاتی پرخاش رکھتے ہیں۔ چونکہ کچھ مفادات کے معاملے ہیں کہ ہم نے آج تک ایک دوسرے پر اسلحہ نہیں تانا۔ مگر شہریار! یہ زندگی، عام دنیا کی زندگی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اپنے ہاتھ سے اپنے وفاداروں کو گولی مارنا پڑتی ہے کبھی اپنی جان دے کر ان کی حفاظت بھی کرنا پڑتی ہے۔ میرا گروپ بڑا مضبوط ہے۔ مجھ پر میرے جاں نثار انگلی نہیں اٹھنے دیں گے، کوئی گن اٹھانے کی جرأت کیسے کرے گا مگر یہ لوگ بہت قیمتی ہیں۔ ایک بھی مارا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔“

میں نے اسے بہ غور دیکھا۔ وہ دیکھنے میں معصوم، حقیقت میں بہت گھاگ تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے دائیں پہلو میں صوفے پر پڑا ہوا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ننھے اسپیکر سے ابھرنے والی آواز سنتی رہی، پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولی۔ ”کیا تم لوگوں نے اپنے باس کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کیا اب تک؟“

دوسری طرف کی بات سن کر طعنہ زن لہجے میں بولی۔ ”تم لوگوں پر آنچ آئے تو نیازی بھڑک اٹھتا ہے۔ خون کا بازار گرم کر دیتا ہے۔ ایک تم ہو کہ وہ بھرے بازار میں اغوا ہو گیا اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔“

موبائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی توجیہہ سننے کے بعد قدرے استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”ارے واہ! پولیس ڈیپارٹمنٹ کو پتا چل گیا ہے کہ افضل نیازی کو سردار حیدر خان نے اغوا کرایا ہے اور تمہیں پتا نہیں چل رہا...... کیا خوب! تم لوگ میری فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو اور اگر نمک حلال ہو تو شام ڈھلنے سے پیشتر اپنے باس کو ڈھونڈ نکالو ورنہ تم سب لوگ بے موت مارے جاؤ گے۔“

اس نے مخاطب کا مکمل جملہ سنے بغیر فون کان سے ہٹا لیا اور اسکرین کو گھورنے لگی۔ ایسے میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ”افضل خان کا چہیتا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ ان کے باس کے اغوا میں کس کا ہاتھ تھا۔ ابھی پوچھتے پھرتے ہیں، جب کبھی اس تک پہنچ پائے تو گلی سڑی نعش کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

میں چونکہ میڈم کے مقابلے میں خود کو نہایت بونا تصور کرتا تھا، ان معاملات میں تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے اس کی مدد کرنے یا کوئی اچھا مشورہ دینے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھ پر توجہ دیے بغیر کئی لوگوں سے فون پر رابطہ کیا اور مختلف ہدایات دیں۔ اس کی باتوں سے میں صرف یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ اس نے تمام لوگوں کو پوزیشنیں بدلنے، اپنے دفاع میں قلعہ بند ہونے اور اسلحہ سنبھال لینے کے ہنگامی احکامات صادر کیے تھے۔ اس نے میروشاہ کو فون کیا، کہا۔ ”میروشاہ! تم کسی نہ کسی طرح استاد ببلو کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ محتاط انداز میں نگرانی کرو۔ وہ جب بھی اپنے غنڈے لے کر اڈے سے نکلے، مجھے بتا دینا۔ میں سی ٹو میں جا رہی ہوں۔ سبھی لوگوں کو میں نے سی ون اور سی تھری میں جانے کا حکم دے دیا ہے۔ اوکے؟“

میروشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہا جسے سن کر میڈم کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی بولی۔ ”تم کبھی بھی انسان نہیں بن سکتے۔ جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو ورنہ ہم اپنا نقصان کر بیٹھیں گے۔“

فون بند کر کے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”ہاہ! میڈم کی آنکھ کے ایک اشارے پر میروشاہ استاد ببلو اور حیدر خان کی ایسی تیسی کر دے گا...... کم بخت سنجیدہ بات کرے تب بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ وہ میروشاہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔

میڈم ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ سرسری انداز میں چہار سو دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ایسے میں رک گئی۔ کھالا میرے ساتھ ہوتا تو یہی کہتا کہ یوں جیسے دنیا ایک نقطے پر رک گئی ہو...... میری طرف بہ غور دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شہریار! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اگر چاہو تو واپسی کا راستہ اب بھی کھلا ہے۔ چاہو تو میرا ساتھ دو۔“

اس نے میری وجہ سے دردِ سر مول لیا تھا، جس سے ٹکرانا نہیں چاہتی تھی، اسی سے ٹکراؤ میری وجہ سے ہونے چلا تھا۔ کیسے لوٹ جاتا۔ کھڑا ہو کر مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میڈم! مجھے آپ کی دنیا اچھی نہیں لگی مگر آپ سے اچھا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کے احسانات کے بار تلے دبا ہوں۔ جان دے سکتا ہوں، چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

وہ بڑے جاندار انداز میں مسکرائی، ایک ذرا لہرائی، بولی۔ ”دیکھ لو...... گولیوں کے شور میں اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ خون بہنے لگے تو جسم ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے۔ پھر انسان پچھتاووں کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ اکثر پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملتی ہماری دنیا میں۔“

اس کی آنکھوں سے ہویدا تاثرات نے میرا دل یکبارگی دھڑکا دیا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی، اتنی ہی خوب صورت باتیں کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی، یونیورسٹی لیول کی لڑکی تھی۔ ہر رنگ میں پیاری لگتی تھی۔ خدا جانے کن حالات کے تحت وہ اس مقام پر پہنچی تھی کہ آنکھوں کے اشاروں سے قتل کے احکامات صادر کرتی تھی۔ اس کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ کے پیش نظر اس کے کردار اور افعال کی مظاہر کہانیوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”میڈم! میرے ماں باپ کسی ظالم بھیڑیے نے برسوں پہلے قتل کر دیے تھے۔ مجھے نہ تو قتل کی وجہ معلوم ہو سکی، نہ میرا ہاتھ قاتل کی گردن تک پہنچ پایا۔ والدین کے بعد میرا دنیا میں ایک ہی رشتہ بچا تھا، وہ تھا بہن کا۔ بہن سائیں دل جیت کے ہاتھوں سے گزر کر سردار حیدر تک پہنچ گئی ہے۔ خدا جانے کس حال میں ہے، زندہ ہے، مردہ ہے یا مردوں سے بھی بدتر ہے۔ اگر وہ مل گئی تو اس کے بارے میں سوچوں گا۔ نہیں ملی تو پھر سردار حیدر خان کی گردن ناپوں گا۔ کہیں زندگی میں ماں باپ کا قاتل مل گیا تو اس سے حساب کتاب کروں گا۔ بس...... یہی میری زندگی ہے...... یہی زندگی کا مقصد...... رہی بات جذبات کی، تو کل تک کھالا تھا، ڈاکٹر شاہ جی تھا اور میری منگیتر تھی۔ آج آپ ہیں، میروشاہ ہے اور میں...... کل کیا ہوگا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جب مجھ پر اعتماد نہ رہے، مجھے کہہ دیجیے گا۔ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گا۔ جانے کے بعد آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے قتل نہ کروایے گا، بلکہ مجھے اپنی زندگی کے مقاصد پورے کرنے کی مہلت دیجیے گا۔“

میری گفتگو لہجے کی سختی سے شروع ہوئی تھی، نادیدہ آنسوؤں کی نمی پر منتج ہوئی۔ وہ مجھے بہ غور دیکھتی رہی، قریب آئی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”شہریار! تم بہت سچے انسان ہو، سمجھ گئی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ آئی لو یو شہر!“

میرے ہاتھوں پر اس کے گداز ہاتھوں کا لمس...... کانوں میں اترا ہوا جملہ ’آئی لو یو شہر!‘...... میرے لیے نہایت غیر متوقع تھے۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ زبان تھم گئی۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تمہاری بہن تمہیں ضرور ملے گی مگر تم اسے نور پور میں نہیں رکھ سکو گے۔ کیونکہ سردار حیدر خان ناکامی پر تلملا کر، اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے تمہیں اور تمہاری بہن کو مروا دے گا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ تم اس کے گرگوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دعا کرو، تمہاری بہن جلد ہاتھ لگ جائے اور میں تمہیں انسانوں کے اس جنگل میں، دور اس شہر میں، کہیں چھپا دوں۔“

اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا اور مسکرا کر بولی۔ ”کم آن...... ہمیں قلعہ بند ہونا ہے کیونکہ کسی وقت بھی میروشاہ کی کال آ سکتی ہے۔“

میں اس کے عقب میں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ گیلری خالی تھی۔ چند لمحوں بعد پتا چلا کہ فرسٹ فلور بھی خالی تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر آئے۔ گیسٹ ہاؤس کی مشرقی گیلری میں آخری کمرے کے دروازے تک چلے گئے۔ اس کمرے کے بالمقابل باتھ روم تھا جس کا واش بیسن گیلری میں نصب تھا۔ وہ جھکی اور واش بیسن کے پانی والے زیریں پائپ کے سامنے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ پائپ اور دیوار کے بیچ میں ہاتھ ڈالا، کلائی موڑی اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ یہ بالکل اسی نوع کا کمرا تھا، جس طرح کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ جہازی سائز کے بیڈ کا چکر کاٹ کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔ میں بیڈ کے پاس ہی رک گیا۔

وہ باتھ روم میں چند لمحوں تک مصروف رہی، پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”شہریار! کم آن......“

میں باتھ روم میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ فلش کے پار، دو فٹ چوڑائی کی حامل سیڑھیاں موجود تھیں۔ میڈم دوسرے زینے پر کھڑی پلٹ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے نقشِ پا پر چلتا ہوا سیڑھیوں تک آیا۔ اس نے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر مجھے نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں دیواروں کے مابین محض دو فٹ کا

فاصلہ تھا۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں گزر سکتا۔ میری ہچکچاہٹ پر بولی۔ ''گزر جاؤ ناں...... میں نے یہ راستہ بند کرنا ہے۔''

میں نے بچ کر گزرنا چاہا مگر اس کے دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے بدن سے رگڑ کھاتا ہوا بہ مشکل گزر پایا۔ یہ مرحلہ بڑا جاں گسل تھا۔ جب میں تین چار سیڑھیاں اتر کر رکا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ بیٹھی، دیوار کی جڑ میں 'کچھ' کر رہی تھی۔ میری حیرت دوچند ہوئی جب میں نے دائیں ہاتھ والی دیوار کو آہستہ سے سرکتے ہوئے سیڑھیوں اور باتھ روم کے درمیان حائل ہوتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے سیڑھیوں کے سامنے آف وائٹ کلر کی دیوار چن دی گئی ہو۔ زیرو واٹ کا بلب روشن نہ ہوتا تو کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وہ راستہ مسدود ہونے کے بعد بھی چند لمحے دیوار کی جڑ میں بیٹھی رہی، پھر کھڑی ہو کر زینے اترنے لگی۔ زینوں کا اختتام ایک کشادہ کمرے میں ہوا جو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ہموار چھت میں تین ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ پہلی نظر میں 'اسٹور' محسوس ہوا کیونکہ کئی کریٹ سائز کی چوبی پیٹیاں، عام استعمال کا گھریلو سامان اور پولی پراپلین کے تھیلے ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میڈم نے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''اسٹور کا دروازہ کھولو۔''

میں نے چونک کر چہار سو دیکھا۔ سوائے سیڑھیوں کے خلا کے کوئی دروازہ نہیں تھا۔ تب مبہوت رہ گیا جب چوبی پیٹیوں کے عقب میں پندرہ سولہ فٹ لمبی دیوار آہستگی سے دائیں ہاتھ کھسکنے لگی اور نکڑ میں ایک خلا نمودار ہو گیا۔ دو ضرب تیرہ فٹ چوڑے خلا کے پار ایک طویل گیلری دکھائی دی۔ میڈم نے گیلری میں قدم رکھا ہی تھا کہ فائر کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ وہ چونک کر پلٹی، بولی۔ ''ہری اپ شہریار! اٹیک ہو گیا ہے۔''

فائر کی آواز تیز نہیں تھی مگر پہچان لی جانے والی تھی۔ میں نے گیلری میں داخل ہونے میں دیر نہیں کی اور بھاگنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی میڈم شکیلہ کے عقب میں پہنچ گیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو دیوار سرک کر خلا کو بند کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں فائرنگ کی ہلکی مگر مسلسل آوازیں ہمارے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میڈم نے ٹھیک کہا تھا کہ کوٹھی پر سردار حیدر خان کے گرگوں کا حملہ ہو گیا تھا۔

تقریباً تین سو فٹ لمبی گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دودھیا بلب روشن تھے۔ گیلری کا دوسرا سرا بند تھا۔ ہم ابھی نصف فاصلہ طے کر پائے تھے۔ گیلری کو بند کرنے والی دیوار بھی بائیں ہاتھ سرکنے لگی۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک اس نے جتنا ہٹنا تھا، ہٹ گئی اور ہمارے گزرنے کی جگہ بن گئی۔ گیلری ایک بارہ ضرب چودہ فٹ کے کمرے میں کھلی تھی جو عجیب ساخت کی گتے کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں ابھی اپنی حیرت میں گم تھا کہ بھول بھلیوں کا ایک اور مرحلہ شروع ہو گیا۔

ہمارا سفر ایک فلیٹ نما عمارت میں اختتام پذیر ہوا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں گیسٹ ہاؤس سے کم و بیش آٹھ سو فٹ دور اور سطح زمین سے بیس بائیس فٹ کی گہرائی میں کھڑا تھا۔ پہلے کمرے اور گیلری میں فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تھے، فائرنگ کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ شاید فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ گیلریوں میں گھٹن کا احساس ہوتا تھا مگر یہاں کی فضا حبس آلود نہیں تھی۔ یہاں چار کمرے تھے جن کے نیم وا دروازوں سے ملی جلی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ دس پندرہ یا اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ یہاں موجود تھے۔

میڈم شکیلہ نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ دس ضرب آٹھ سائز کی ٹی وی لاؤنج نما گیلری میں کھلنے والے چاروں میں سے آخری دروازہ عبور کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں نے تقلید کی۔ کمرا اتنا بڑا نہیں تھا۔ مجھے داہنی دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دوسری دیوار تک گئی۔ چوبی میز پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ وہ سوئچ بورڈ پر کئی بٹن پش کرنے کے بعد کمپیوٹر کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسے میں اس کی پشت میری جانب تھی۔

میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا، سخت لہجے میں بولی۔ ''تم استاد ببلو کو ٹریس کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہو، ڈینگیں مارنے کے علاوہ تمہاری تمام صلاحیتیں زنگ پکڑنے لگی ہیں۔''

وہ یقیناً میرو شاہ سے بات کر رہی تھی۔

''ہاں تو! کوٹھی پر حملہ ہو چکا ہے۔ فائرنگ کی آواز میں نے سنی ہے۔''

میرو شاہ کی بات سن کر بولی۔ ''میرا فکر نہ کرو، میں سی ٹو میں پہنچ چکی ہوں۔ سبھی لوگ محفوظ ہیں۔ تم حملہ آوروں سے دور رہو۔ جو کرتے ہیں، کرنے دو۔''

ایسے ہی وقت میں کمپیوٹر آن ہو گیا۔ میڈم کا ہاتھ ماؤس پر متحرک ہو گیا۔ وہ میرو شاہ کو ہدایات بھی دے رہی تھی اور کمپیوٹر پر مختلف ونڈوز بھی کھولتی جاتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں مانیٹر کی اسکرین پر چار چوکھٹوں میں چار مختلف مناظر بیدار ہو

گئے۔ ایک منظر میرا دیکھا ہوا تھا۔ کوٹھی کا کھلا ہوا مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا جس کے پار تین گاڑیاں سڑک پر کھڑی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی کرولا کار تھی جبکہ دو سفید رنگ کے فور ویل ڈبل کیبن ڈالے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ سبھی گاڑیاں، مین گیٹ کا واچ مین کیبن اور برآمدے کی طرف آتی ہوئی چوڑی روش خالی تھی۔ کوئی ذی نفس اسکرین پر متحرک نہیں تھا۔ دوسرے مناظر میرے نزدیک اجنبی تھے۔

میڈم فون پر میرو شاہ سے مخاطب تھی۔ ''میرو شاہ! سبھی لوگ کوٹھی میں داخل ہو چکے ہیں۔ تم پٹرولنگ اور ایلیٹ فورسز کو فون پر اطلاع دو۔ ان میں سے کوئی بھی بچ کر نہ جائے۔ ایک آدمی کو ایسی پوزیشن پر تعینات کرو جہاں سے وہ کسی کی نگاہ میں نہ آئے اور آسانی سے کسی پولیس آفیسر کا نشانہ لے سکے۔''

پھر بولی۔ ''ہاں ہاں! جب تک کوئی پولیس والا نہیں گرے گا، مقابلے میں جان نہیں پڑے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کسی اور کا نمبر ملا لیا۔ وہ اس وقت پوری طرح متحرک تھی۔ فون کان سے لگائے میری طرف پلٹی اور ہاتھ کے اشارے سے پانی طلب کیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے ایک کونے میں پورٹیبل فریج موجود تھا۔ اسے مؤدبانہ انداز میں پانی کا گلاس پیش کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ وہ کسی پولیس آفیسر سے محوِ کلام تھی۔

کمپیوٹر اسکرین پر پھیلے ہوئے مناظر قریب سے اور اجاگر ہو گئے۔ چاروں چوکھٹوں میں ماہرانہ انداز میں نقل و حرکت کرتے ہوئے گن بردار نظر آئے۔ چونکہ میڈم فون پر باتیں کر رہی تھی، اس لیے میں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ خاموش رہنا بھی مشکل تھا۔ گن برداروں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی۔ ان کی حرکات سے عیاں مشاقی ان کے عزائم کو آشکار کرتی تھی۔ وہ میڈم کو تلاش کر رہے تھے مگر خالی کمرے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ ایسے میں میڈم نے فون پر بچھی ہوئی بساط لپیٹ لی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ ''کوٹھی میں نصب شدہ کیمروں نے اب تک دس آدمیوں کو ٹریس کر لیا ہے۔ ان میں استاد ببلو شامل نہیں ہے۔ اگر بروقت پولیس پہنچ جائے تو مزہ آ جائے......''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ لوگ یہاں تک نہیں پہنچ سکتے؟''

وہ قدرے تفاخر سے بولی۔ ''نہیں شہر! وہ اگلے جنم میں بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ جگہ 'سی ٹو' کہلاتی ہے۔ ایسی ہی دو محفوظ پناہ گاہیں اور بھی ہیں جنہیں 'سی ون' اور 'سی تھری' کہا جاتا ہے۔ یہ کوڈ ورڈز ہیں تاکہ کسی سننے والے کو لوکیشن کا پتا نہ چل سکے۔''

میری نظر مانیٹر کی اسکرین پر مرکوز تھی۔ مین گیٹ والی 'ونڈو' پر مجھے پولیس کی موبائل وین رکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے فوراً میڈم کی توجہ اس جانب دلائی۔ اس نے دیکھا تو لبوں پر ایک دل فریب مسکراہٹ ابھر آئی۔ ماؤس کی مدد سے 'ونڈو' کو مانیٹر کی پوری اسکرین پر پھیلاتے ہوئے چہکی۔ ''اب مزہ آئے گا شہریار!''

مانیٹر کے پہلوؤں میں نصب اسپیکرز میں سے پولیس وین کے ہوٹر کی ہلکی ہلکی آواز ابھرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میدان کارزار سج گیا۔ دو طرفہ فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا اور جو سین بھی کوٹھی میں نصب شدہ کیمروں کی نظر میں محفوظ ہوتا، ہم تک پہنچ جاتا۔

میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ میڈم اسکرین میں مستغرق تھی۔ چونکہ میں اسکرین پر متحرک لوگوں کی سرگرمیوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے قابل نہیں تھا، اس لیے جلد ہی اکتا گیا۔

میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ''میڈم! میں گھوم پھر کر 'سی ٹو' دیکھ لوں؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''ہاں! کیوں نہیں...... یہاں تمہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔''

اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ میری وہاں موجودگی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میں کمرے سے نکلا، لاؤنج نما ہال میں اِدھر اُدھر دیکھ کر ساتھ والے کمرے کے دروازے پر جا رکا۔ کان لگائے مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ کمرا خالی تھا یا کمرے میں موجود لوگ قطعی طور پر خاموش تھے۔ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو دروازے کے عین سامنے ڈریسنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی عورت کی پشت دکھائی دی۔ آئینے میں چہرہ سجا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سونیا تھی۔ میں نے انگلی کی ضرب سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے آئینے میں دیکھا، مسکرا کر بولی۔ ''یس کم آن......''

کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ پڑا تھا جس پر سیدھے رخ اسما پڑی تھی۔ گزشتہ رات کی طرح وہ گہری نیند میں تھی۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سونیا کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا چہرہ سنوار رہی تھی۔ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں میری کشش یہاں لائی ہے یا اس بے ہوش لڑکی کی؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بولی۔ ''تمہارے پاس دینے کے لیے جواب نہیں ہے''

یا جواب دینا نہیں چاہتے ہو؟“
میں نے کہا۔”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“
وہ بولی۔”میڈم کیا کر رہی ہیں؟“
”کمپیوٹر پر بیٹھی ہے۔“
”اچھا!“ اس نے یوں کہا جیسے وہ سمجھ گئی ہو کہ میڈم کمپیوٹر پر کیا کر رہی تھی، بولی۔”تم کہاں سے آئے ہو؟“
میں نے کہا۔”گاؤں سے!“
اس کا بالوں میں برش پھیرتا ہاتھ رک گیا، مسکرائی۔”گاؤں کا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوگا؟“
میں نے کہا۔”نہیں......اس کا کوئی نام نہیں ہے۔“
اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی مگر اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ آنکھوں سے سمجھا دیا کہ جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ بالوں کو کاندھے پر پھیلاتے ہوئے بولی۔”کیا اس لڑکی کا چہرہ دیکھ کر تمہارے دل کی دنیا زیر و زبر نہیں ہوتی؟“
میں نے کہا۔”اس میں ایسی کیا بات ہے؟“
وہ مسکرائی۔”یہ تو کوئی مرد ہی بتا سکتا ہے۔“
”تمہارا تجربہ بھی تو کچھ کہتا ہوگا؟“
”نہیں......میں اپنے سوا کسی کے بارے نہیں سوچتی۔“
”پھر اپنے سوا کسی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟“
”بس! ویسے ہی۔“ وہ کھسیا کر بولی۔”کیا تم ہمیشہ یہیں رہو گے؟“
”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ میں نے کندھے اچکائے۔”میں اپنے حال کو نہیں جانتا، مستقبل کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتا ہوں۔“
”ہوں......“ اس نے ہنکارا بھرا، پھر ہاتھ روک کر کریدتی ہوئی نگاہوں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا، بولی۔”تم بڑے ہینڈسم ہو۔“
میں نے کہا۔”تم بھی کم نہیں ہو۔“
”تبھی مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیتے ہو؟“ اس کے لہجے میں شرارت عیاں تھی۔ میں نے آنکھیں چرا لیں، پوچھا۔”کیا میڈم کا اصل نام ’شکیلہ‘ ہی ہے؟“
وہ بولی۔”کیا یہ سوال میری طرف دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا؟“
میں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ، جوانی کا شرارت آمیز دعوت نامہ بنا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدہ رہتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولی۔”اس کا نام ’میڈم شکیلہ‘ ہی ہے۔“

صاف عیاں تھا کہ وہ مجھے ٹرخا رہی تھی۔ میں مصر نہیں ہوا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اجنبی مگر حلیے سے ملازم دکھائی دینے والا شخص کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مؤدبانہ انداز میں بولا۔”آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔“
میں سونیا کے کمرے سے نکل کر میڈم کے پاس پہنچا۔ وہ بہ دستور کمپیوٹر کے سامنے براجمان تھی۔ مجھے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کی بورڈ کے پاس پڑا ہوا موبائل فون بجا۔ اس نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی، بولی۔”ہاں میرو شاہ! کیا رپورٹ ہے؟“
دوسری طرف کی آواز سن کر میڈم کا چہرہ کھل اٹھا۔ ’او کے‘ کہہ کر فون بند کر دیا اور بولی۔”خس کم جہاں پاک، کوٹھی پر حملہ کرنے والوں میں سے دو آدمی پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ باقی دم دبا کر فرار ہو گئے۔ گڈ نیوز!“
اس نے جلدی جلدی ماؤس کو حرکت دی۔ کسی اور کیمرے کا ’آئی کون‘ کلک کیا۔ ایک اور منظر کھل گیا۔ کیمرے کی طرف پیٹھ کیے گٹھے ہوئے جسم والا ایک شخص کاندھے پر گن لٹکائے کھڑا تھا اور چوکس انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔
میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا اور نفرت آمیز انداز میں بولی۔”ایک مفرور حملہ آور کوٹھی کی عقبی گلی میں کھڑا ہے۔ تم لوگ گلی کے دہانے پر پہنچ جاؤ۔ گلی سے نکلتے ہی اسے غائب کر دیا جائے۔“
کال منقطع کر کے خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔”کاش! اس کیمرے کے ساتھ آٹو گن بھی نصب ہوتی جو ایک بٹن دبانے پر اس حرام زادے کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی۔“
ایسا ممکن تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔ میری نظریں اس چاق چوبند مفرور کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھ رکھا تھا۔ ایک تو ونڈو میں نظر آنے والی تصویر کافی حد تک دھندلائی ہوئی تھی، دوسرا میں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اچانک وہ کیمرے کی طرف پلٹا۔ اب اس کا چہرہ سامنے تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے تمام تر بدن کا خون سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گیا ہو۔ میری سانس رکنے کو آ گئی اور میں بے اختیار چیخ پڑا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ



چشم کم

نسیم جاوید سید

بینائی کا دھوکا... دانائیوں کا بھروسا بہت کم لوگوں کو راس آتا ہے مگر... جسے راس آجائے وہ ”پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں“ کے مترادف ہوتا ہے... اگرچہ یہ مقدروں کا کھیل ہے مگر موقع سے فائدہ اٹھانے والا مقدر کا کھلاڑی بن جاتا ہے... اور اس ہنر میں اسے کمال حاصل تھا۔

حماقتوں کے بھنور سے ابھرنے والے ایک خوش قسمت کا ماجرا

اس روز میں بے حد پریشان تھا۔
میں نے وائلٹ سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اسے ساتھ لے کر پہلے ڈنر کے لیے کسی اچھے سے ہوٹل میں جاؤں گا اور پھر مل کر کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے......لیکن میرے باس مسٹر پیری نے یہ کہہ کر سارے پروگرام کا ستیاناس مار دیا کہ حاضر اسٹاک کی مکمل فہرست فوری طور پر درکار ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن اس ملازمت کے بغیر میں وائلٹ سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وائلٹ، مس امریکا نہیں تھی بلکہ خوب موٹے موٹے عدسوں کا چشمہ استعمال کرنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس کے آتشی رنگ کے بال اور ناک کا خفیف سا خم مجھے اتنا پسند تھا کہ ان کا خیال ذہن میں لاتے ہی میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ مسٹر پیری کی حکم عدولی ممکن نہیں تھی اور فہرست تیار کرنے کے لیے تین گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت درکار تھا۔ میں نے وائلٹ کو فون کیا اور بے بسی ظاہر کردی۔ توقع کے مطابق اس نے نہ صرف میری معذرت قبول کرلی بلکہ یہ دعوت بھی دے دی کہ واپسی میں اس کی دکان سے ہوتا جاؤں۔ اس نے ہلکے پھلکے کھانے کی تیاری کا وعدہ کیا تھا اس لیے میں نے اقرار کرلیا۔

میں جیولری کی جس دکان پر ملازم تھا اس کا مالک مسٹر پیری ایک کٹھور سا آدمی تھا۔ ہر وقت کام میں گدھوں کی طرح جتار کھنے کے باوجود نہ تو تنخواہ بڑھا رہا تھا اور نہ ہی اوور ٹائم دینے پر کبھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ میں دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوستا ہوا فہرست تیار کرتا رہا حتیٰ کہ ساڑھے آٹھ بجے اس کام سے فارغ ہوگیا۔

ابھی میں جانے کی تیاری ہی کررہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھایا تو مسٹر پیری کی منحوس آواز سنائی دی۔ ''ہیلو جارج...... کہو...... کام کیسا جارہا ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''فہرست تیار ہوچکی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب......'' اس نے کہا۔ اس سے زیادہ تعریف اس شخص سے متوقع بھی نہیں تھی۔ ''دیکھو، میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ میری میز پر ایک پیکٹ رکھا ہے۔ میں اسے ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ ٹیکسی پکڑو اور میرے ہاں پہنچادو۔ کرایہ میں ادا کردوں گا۔''

میں جبڑے بھینچے کھڑا رہا۔

وہ شہر کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے باوجود نصف گھنٹے سے زیادہ وقت لگنے کا امکان تھا گویا میں وائلٹ سے کیے ہوئے دوسرے وعدے کو بھی پورا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مسٹر پیری شاید میری جان ہی جلانے کے درپے تھا۔

''بحث نہ کرو۔ اس پیکٹ میں ایک تحفہ ہے جو میں آج رات اپنی بیوی کو دینا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ مسٹر پیری کی دراز سے پیکٹ نکال کر میں باہر آگیا۔ آس پاس کوئی ٹیکسی دکھائی نہ دی تو میں پیدل ہی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں دکان سے ایک بلاک کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ میں چاروں خانے چت گرگیا۔ جب حواس قدرے بحال ہوئے تو خود کو دو غنڈوں کے نرغے میں پایا۔

وہ میری جامہ تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن میں ہاتھ پاؤں مار کر نہ صرف اپنی جیبوں کو ان کی دسترس سے دور کرنے کی کوشش کررہا تھا بلکہ خود کو ان کے گھونسوں اور ٹھوکروں سے بھی بچا رہا تھا۔ اچانک ان میں سے ایک نے میرے نرخرے پر بازو جمایا تو میری مدافعانہ کارروائی یکایک دم توڑ گئی۔

دوسرے نے پے درپے میرے پیٹ میں ٹھوکریں ماریں۔ پھر نہ صرف میری تلاشی لی گئی بلکہ جیبیں تک ادھیڑ ڈالیں۔ پیکٹ اور میرا بٹوا حاصل کرنے کے بعد دونوں غنڈے بھاگ نکلے میں نے بہ مشکل خود کو فٹ پاتھ سے اٹھایا۔ اس وقت تک دونوں غنڈے نگاہوں سے اوجھل ہوچکے تھے۔

میرے کپڑے پھٹ گئے تھے اور مجھے خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ میں دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا میرے بٹوے میں آخری پونجی بیس ڈالر تھی، وہ ضائع ہوچکی تھی اور مسٹر پیری کا پیکٹ بھی مجھ سے چھن چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس صورت حال میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟

چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی ذہنی حالت کو سنبھالا اور سب سے پہلے قریبی ٹیلیفون بوتھ تک پہنچا۔ جیب میں تھوڑی سی ریزگاری تھی اسے استعمال کرکے میں نے کانپتے ہاتھوں سے مسٹر پیری کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور صورت حال بتانے لگا۔

''کیا بک رہے ہو؟'' اس کی دہاڑ سنائی دی۔ ''جانتے ہو اس پیکٹ میں کیا تھا۔ اس میں چار سو ڈالرز کے ہیرے تھے۔ ایک کنگن تھا اور ایک قیمتی انگوٹھی تھی۔''

''میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی، مسٹر پیری لیکن......''

''یہ نقصان تمہیں پورا کرنا پڑے گا، جارج۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں اس سلسلے میں کل صبح تم سے بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامنے پر مجبور ہوگیا میں نے اس منحوس پیکٹ کے لیے گھونسے اور لاتیں برداشت کی تھیں اور مرتے مرتے بچا تھا لیکن مسٹر پیری کو اپنے ہیروں اور زیورات ہی سے دلچسپی تھی۔ اس نے یہ تک

نہیں پوچھا کہ خود میں کس حال میں ہوں؟ کہیں میں زخمی تو نہیں ہوگیا؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور پیٹ میں درد کی لہروں کا بسیرا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے گھر پہنچ کر سیدھا بستر پر لیٹ جانا چاہیے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس صورتِ حال میں وائلٹ ہی سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔

فون کرنے کے بعد اتنی ریزگاری تھی کہ میں بس کے ذریعے وائلٹ کی دکان تک پہنچ سکتا تھا۔ شہر کے وسطی حصے میں وہ پھولوں کی ایک دکان پر ملازم تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ گھبرائی ہوئی میری طرف دوڑ پڑی۔

''اوہ جارج۔ یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟'' اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر ایک کاؤچ میں لٹا دیا۔

''دو غنڈوں سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔'' میں نے کراہ کر بتایا۔

''زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟''

میں نے اسے اطمینان دلایا کہ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں البتہ انہوں نے میرا انجر پنجر ضرور ڈھیلا کردیا ہے۔ اس نے تولیا بھگو کر میرا چہرہ صاف کیا۔

میں نے مسٹر پیری کے پیکٹ سے اس کے پاس پہنچنے تک سب کچھ تفصیل سے بتادیا اور یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ مسٹر پیری کے ہاں کل میری ملازمت کا آخری دن ہوگا۔

''مسٹر پیری کو اس پیکٹ کی آج ہی رات ضرورت تھی؟'' وائلٹ نے چونک کر دریافت کیا۔ ''اور وہ اپنی بیوی کو تحفہ دینا چاہتا تھا؟''

''ہاں...... شاید مسز پیری کی سالگرہ کا چکر ہے۔''

وہ نہایت انہماک سے میرے چہرے کو پونچھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں ملازمت سے نکال دے گا؟''

''ممکن ہے وہ اس پیکٹ کی رقم میرے ذمے ڈال دے...... یا پھر ممکن ہے ملازمت سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اس رقم کا بھی تقاضا کردے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے، وائلٹ!'' میں نے بے بسی سے کہا۔

وائلٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''تم فکر نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بھیگا ہوا تولیا ایک طرف رکھ دیا اور بولی ''ایک بار تم نے تذکرہ کیا تھا کہ وہ کچھ آوارہ قسم کا آدمی ہے۔

روزگار

ٹیلی ویژن پر ایک دیہاتی کا انٹرویو پیش ہورہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''ہمارے قصبے کے لوگ بے حد خوشحال ہیں اور ان کی صحت بھی اچھی ہے، یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ برس سے ہمارے قصبے میں صرف ایک آدمی کی موت واقع ہوئی ہے۔''

انٹرویو لینے والا یہ سن کر بہت حیران ہوا، اس نے پوچھا۔ ''بہت خوب! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ بدنصیب شخص کون تھا اور اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟''

دیہاتی نے جواب دیا۔ ''جناب! وہ ہمارے قصبے کا واحد ڈاکٹر تھا اور اس کی موت فاقوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

مراسلہ نگار...... طیبہ طاہر، دادو

بہرحال، تم اس کی بیوی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''صرف اتنا کہ وہ سماجی کاموں میں الجھی رہنے والی ایک ایسی عورت تھی جس کا زیادہ تر وقت تقریریں کرنے میں صرف ہوتا ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' وائلٹ نے ہنس کر کہا ''سماجی شخصیت ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی خبر شائع ہوتی رہتی ہے...... اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ آج رات وہ اپنے گھر پر موجود نہیں ہے بلکہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے میں نے شام کے اخبار میں یہ خبر تفصیل سے پڑھی تھی۔''

میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ......''

''اور سنو......'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''اس نے سرِشام ہی فون کرکے کہا تھا کہ رات آٹھ بجے اس کے ہاں درجن بھر تازہ گلاب بھجوادیے جائیں۔ میں نے کال تو ریسیو نہیں کی تھی البتہ جو گل دستے بھجوائے جارہے تھے، ان پر لگی ہوئی پتے کی پرچیاں ضرور پڑھی تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا......''

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس کی بیوی شہر

سے باہر لگی ہوئی تھی اور وہ کسی اور کو اپنے ہاں مدعو کیے ہوئے تھے ......کوئی ایسی عورت جسے وہ نہ صرف قیمتی کنگن بلکہ انگوٹھی اور گلاب بھی تحفے میں دینا چاہتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وائلٹ نے اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل چٹکیوں میں حل کر دی تھی۔

''کیا تمہیں یقین ہے ڈارلنگ کہ فون مسٹر پیری نے کیا تھا؟'' میں نے شبہے کی آخری لہر بھی ذہن سے نکالنے کے لیے تصدیق چاہی۔

''میں نے گل دستے پر ایڈریس کی سلپ دیکھی تھی، مسٹر رابرٹ پیری......دی ویسٹ پارک آرمز لکھا تھا۔''

میں نے اسے خوشی سے لپٹا لیا۔ میرے سر کا درد اور پیٹ میں اٹھنے والے مروڑ یکا یک ختم ہو گئے تھے۔ ''ٹھیک ہے ......'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''مجھے ٹیکسی کے کرایے کے لیے کچھ رقم ادھار دے دو......اور میں جا رہا ہوں۔''

☆☆☆☆

بیس منٹ بعد میں مسٹر پیری کے دروازے پر کھڑا بے حد پرجوش تھا۔ اس دوران میں نے نہ جانے کیا کیا منصوبے بنا ڈالے تھے۔ میں نے اپارٹمنٹ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

مسٹر پیری نے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے راستے میں حائل ہوتا میں کندھے کے زور سے اسے ہٹاتا ہوا سیدھا خواب گاہ میں جا پہنچا۔ وہ عقب میں چیختا ہی رہ گیا تھا۔

خواب گاہ میں ایک میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ دو گلاس بھرے ہوئے تھے اور قریب ہی برف کی ڈلیوں سے بھرا ہوا برتن تھا۔ دیوان پر ایک سرخ بالوں والی حسینہ دراز تھی اور اس کی حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ گلاب البتہ خواب گاہ میں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''جارج ......!'' مسٹر پیری نے گرج کر کہا۔ ''آخر تمہاری اس حرکت کا کیا مقصد ہے؟''

میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ......کل ہمارے درمیان جو بات چیت ہونے کا امکان ہے، میں اس سلسلے میں تصدیق کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔''

مسٹر پیری کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ نگاہیں چرانے لگا جبکہ سرخ بالوں والی حسینہ اب بھی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے مزید کچھ کہے سنے بغیر بیرونی دروازے کا رخ کیا اور وہاں سے فاتحانہ انداز میں واپس آ گیا۔

گھر پہنچ کر میں نے وائلٹ کو فون پر اطلاع دی کہ معاملہ ہماری توقع کے عین مطابق ہی ثابت ہوا ہے۔ وہ جواباً خوشی سے چیخ پڑی اور خود میرا بھی جی چاہا کہ خوشی سے گھنٹوں چیختا ہی رہوں۔

اگلے روز مسٹر پیری نے شوروم میں قدم رکھا تو اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے اپنے دفتر میں جا گھسا۔ دس بجے کے قریب اس نے مجھے بلایا تو اس کے نقش و نگار معمول کے مطابق تھے اور لہجہ بھی قدرے سخت تھا۔

''جارج......میں اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، جو کل رات تمہیں پیش آیا تھا۔ میرا خیال ہے پولیس جلد ہی ان غنڈوں کا سراغ لگا کر ہماری اشیا برآمد کر لے گی۔ بہرحال مجھے افسوس ہے کہ میں نے رات فون پر تم سے سخت کلامی کی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

میں نے اسے اپنی بہترین مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے، جناب! کیا میں اپنی تنخواہ میں کچھ اضافے کی بھی توقع کر سکتا ہوں؟''

اس کے جبڑے ایک لمحے کو تن کر ڈھیلے پڑ گئے۔ ''اوہ، ہاں تمہاری کارکردگی قابل اطمینان ہے، پچیس ڈالرز فی ہفتہ......''

''پچاس ڈالر، جناب!'' میں نے جلدی سے کہا۔

ایک بار پھر اس کے جبڑوں میں تناؤ اور پھر ڈھیلا پن پیدا ہوا......پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے پچاس ڈالر کا اضافہ ہی سہی......''

☆☆☆

اس رات میں نے وائلٹ کے ساتھ خوب شاندار جشن منایا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ ہی شراب پی تھی اور خاصا بہک رہا تھا۔ وائلٹ بھی بات بے بات ہنس رہی تھی۔ اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ ''لیکن ڈارلنگ ......رات میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد ڈیلیوری رجسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گلاب کا آرڈر کسی اور مسٹر پیری نے دیا تھا تم تو جانتے ہی ہو کہ میری نگاہ خاصی کمزور ہے۔ میں نے ایسٹ پارک آرمز کو ویسٹ پارک پڑھا تھا۔''

چند لمحوں تک میں سب کچھ بھول کر وائلٹ کو حیرت سے دیکھتا رہا......پھر اس کی کمزور بینائی کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرنے لگا۔



حضرت سلیمان علیہ السلام

رضوانہ ساجد

جب سے تخلیقِ کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراج انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاحِ اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن وانس، چرند پرند آپ علیہ السلام کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات

کلام پاک میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ یہ ضرور ملتا ہے کہ خدا نے آپؑ کی آزمائش کی تھی اور آپؑ پر ابتلا کا ایک دور گزرا تھا۔ سورۂ ص کی آیات اس پر شاہد ہیں۔

''اور بے شک! ہم نے سلیمان علیہ السلام کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسم پھر وہ اللہ کی جانب

رجوع ہوا۔ کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے۔ بے شبہ تو ہی بخشنے والا ہے۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتا تھا۔''

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو آزمائش پیش آئی وہ کیا تھی۔ صرف یہ اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا۔ احادیث میں بھی کوئی تفصیل نہیں ملتی البتہ مفسرین نے دو آرا قائم کی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سخت علیل ہو گئے تھے۔ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم ہے بے روح۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آپ ''انشاء اللہ'' کہنا بھول گئے تھے جس پر سزا کے مستحق ہوئے۔

اسرائیلی روایات نے اس آزمائش کے واقعے کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا ہے۔ تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا۔ اس کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا، بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی لہٰذا خدائے تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کے لیے وہ تخت سلطنت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی انگشتری جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جرادہ کے ذریعے شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی اور وہ مچھلی شکار ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

یہ قصے اس لیے رواج پا گئے کہ اہل کتاب میں ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتا اور ان کی شان و شوکت کو جادو کا کرشمہ سمجھتا ہے جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ طاقت دی گئی تھی کہ آپ جنات سے کام لیتے تھے۔ ہوا پر سفر کرتے تھے اور چرند پرند کی بولیاں سمجھتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ استسقا کے لیے میدان میں نکلے۔ راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کیے یہ دعا مانگ رہی ہے۔

''خدایا ہم بھی تیری مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج۔ ہم کو بارش سے محروم نہ کر۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہ صرف اس آواز کو سن لیا بلکہ وہ جو کہہ رہی تھی اسے بھی سمجھ لیا۔ آپ نے واپس آ کر قوم سے فرمایا۔ چلو ایک حیوان کی دعا نے ہمارا کام کر دیا۔ اب تمہاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔

یہ جادو کے کرشمے نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو معجزات عطا کیے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک لشکر جرار تھا جس میں جفاکش اور بہادر لوگ شامل تھے۔ باربرداری اور سفری ذرائع کے لیے جنات آپ کے مطیع بنا دیے گئے تھے۔ ہدہد پرندہ آپ کے قاصد کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

آپ نے جنات کی مدد سے ایک نہایت شاندار اور وسیع و عریض فرش تیار کروایا تھا۔ یہ فرش اتنا وسیع تھا جس پر تمام دربار بیٹھ جاتا تھا۔ جب آپ حکم دیتے تھے جنات اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا لے جاتے تھے۔ اسی فرش پر آپ کا تخت بھی نصب تھا۔

اس فرش کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ اس پر بیٹھ کر ایک ماہ کی راہ ایک دن میں طے کر لیتے تھے۔ چار ہزار علما آپ کے دائیں جانب اور چار ہزار امرا اور وزرا آپ کے بائیں طرف دست بدست کھڑے رہتے تھے۔ اسی طرح چار ہزار جن اور پریاں بھی دربار میں حاضر رہتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انہیں اپنے فرمان لکھواتے تھے اور مختلف امور کی تفصیلات اور شکایات سنتے تھے۔

دربار سلیمانی پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا۔ جنات، پرند، منصب دار سب حاضر خدمت تھے۔ آپ نے کسی کام کے لیے ہدہد کو طلب کیا لیکن وہ غیر حاضر تھا۔

''میں ہدہد کو غیر حاضر پاتا ہوں۔ وہ ایسی گستاخی کا مرتکب کیسے ہوا کہ میری اجازت کے بغیر دربار میں موجود نہیں۔''

پھر آپ اپنے وزیر برخیاہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''میں ہدہد کو سخت عذاب دوں گا۔ اسے ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائے۔''

توکل

حضرت ابو عمر تحیل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ 40 سال تک خدا کی رضا کے علاوہ اس سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔

ایک مرتبہ آپ کی صاحب زادی شدید علیل ہو گئیں مسلسل علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا چنانچہ ایک رات ان کے شوہر عبدالرحمن سلمی نے ان سے کہا کہ تمہارا علاج تمہارے والد کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ تمہارے والد نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ چالیس سال تک خدا کی رضا کے سوا کچھ طلب نہ کروں گا اور اس عہد کو چالیس سال گزر چکے ہیں لہٰذا وہ نقص عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دیں تو یقیناً صحت یاب ہو جاؤ گی گو نقص عہد گناہ ہے لیکن اس سے تمہیں صحت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر وہ آدھی رات کو ہی اپنے والد کے گھر پہنچ گئیں اور جب آپ نے پوچھا کہ ''عقد کے بعد سے تم یہاں بیس سال تک کبھی نہیں آئیں پھر آج آنے کی کیا وجہ ہے۔''

صاحب زادی نے عرض کیا کہ ''اس کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے آپ جیسا عظیم المرتبت باپ اور عبدالرحمن سلمی جیسا شوہر عطا کیا ہے اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں زندگی سے زیادہ کوئی عزیز شے نہیں ہوتی اور مجھے بھی بہ تقاضائے بشریت اپنی زندگی عزیز ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی ہی کی بدولت مجھے آپ کا اور شوہر کا دیدار ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے خدا سے یہ عہد کیا ہے کہ چالیس سال تک تیری رضا کے علاوہ اور کچھ طلب نہیں کروں گا۔ لہٰذا میں آپ کو آپ ہی کے عہد کا واسطہ دے کر عرض کرتی ہوں کہ آپ نقص عہد کر کے میرے حق میں دعائے صحت فرما دیں۔'' لیکن فرمایا آپ نے کہ ''نقص عہد کسی طرح جائز نہیں خواہ وہ بندے ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو پھر خدا سے نقص عہد کرنا بہت ہی باعث ملامت ہے اور اگر میں نقص عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دوں اور تم صحت یاب ہو جاؤ پھر بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی اور جب موت کی آمد میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تو پھر اب یا کچھ عرصے بعد موت آنے میں کیا فرق پڑتا ہے۔ لہٰذا میں اس گناہ کا مرتکب ہونا مناسب نہیں سمجھتا۔'' اس جواب سے آپ کی صاحب زادی کو یقین ہو گیا کہ اب میرا وقت آ چکا ہے اور صحت یابی ممکن نہیں لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور آپ کی وفات کے بعد بھی چالیس سال زندہ رہیں۔ .... (حکایت اولیا سے اقتباس)

ابھی آپ کے حکم کی گونج کم نہیں ہوئی تھی کہ ہدہد کے پروں کی آواز آئی اور وہ زمین پر اتر کر تخت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے باز پرس کی۔

''میں حکم دے چکا ہوں۔ تجھے ذبح کر دوں گا یا پھر تو معقول وجہ بتا کہ دربار سے کیوں غیر حاضر تھا۔''

''اے بادشاہ! میری غیر حاضری کی وجہ جان لے۔ اس کے بعد جو سزا ہوگی مجھے منظور ہے۔''

''اگر تیرے پاس کوئی معقول وجہ ہے تو ضرور بتا۔''

ہدہد نے کہنا شروع کیا۔ ''میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے۔ میرا گزر یمن کے مشرقی علاقے میں ہوا۔ وہاں میں نے سبا نام کا ایک شہر دیکھا۔ شہر کیا ہے سونے اور چاندی کا خزانہ ہے۔ یہاں ایک ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اس کا تخت نہایت بیش قیمت ہے۔ صرف اس تخت کو دیکھ کر ہی اس قوم کی خوش حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اخلاقی طور پر سبا کے رہنے والے بہت گرے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں اور خدائے واحد کو بھولے ہوئے ہیں۔''

''اگر تو اپنی بات میں سچا ہے تو میں ملکۂ سبا کو دین حق کی قبولیت کی دعوت دوں گا۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتی تو پھر میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ تیرے جھوٹ سچ کا امتحان ابھی ہو جائے گا۔ اگر تو سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو ملکہ تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اپنے درباریوں سے اس کے متعلق کیا گفتگو کرتی ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط لکھ کر ہدہد کے حوالے کر دیا۔

''یہ خط سلیمان علیہ السلام کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم میرے پاس خدا کے فرماں بردار ہو کر آؤ۔''

سبا کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصے یمن کے مشرقی علاقے میں تھا اور دارالحکومت کا نام مآرب تھا۔ اس کو شہر سبا بھی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقا تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا جس پر مغائر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبا نے یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے۔ سبا کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصہ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں۔

قوم سبا ایک طاقتور اور تاجر قوم تھی۔ ان کے دیار و مسکن میں قیمتی دھاتیں ہیرے، جواہرات، ریشم اور مسالے بہ کثرت ملتے تھے۔ نیز ہندوستان کا مال یمن کے ساحل پر اترتا تھا جہاں سے یہ لوگ ہندوستانی مال شام و فلسطین، مصر وغیرہ لے جاتے تھے۔ قوم سبا دولت و حکومت کے نشے میں اللہ تعالیٰ کو بھول چکی تھی اور وہ تمام برائیاں جو قوم عاد و ثمود میں تھیں، ان میں بھی موجود تھیں۔

قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے واقعے میں یہ نہیں بتایا ہے کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا مگر عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور اہل حبشہ جن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے ہیں ملکہ کا نام ''ماکدہ'' بتاتے ہیں۔

جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور انجیل میں ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے یوسیفوس کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی ملکہ تھی اور اہل حبش اس کو حبشی نژاد سمجھتے ہیں۔

ان روایات میں اہل تحقیق یوسیفوس کی روایت کو غلط سمجھتے ہیں اور باقی دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت کے حصے تھے۔

شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمراں عورتوں کے نام ملتے ہیں لہٰذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکۂ سبا اسی حصے سے تعلق رکھتی تھی۔

قرآن نے اس ملکہ کا نام لیے بغیر اس کا ذکر کیا ہے۔

''سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا پھر کہا میں نے ہدہد کو نہیں دیکھا یا وہ موجود نہیں۔ میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا کوئی صاف دلیل لائے۔ سلیمان علیہ السلام تھوڑی دیر ٹھہرے کہ ہدہد آ کر گویا ہوا۔ مجھے وہ معلوم ہے جو آپ کو نہیں معلوم۔ میں سبا سے ایک سچی خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو سبا پر حکومت کرتی ہے۔ اس کو ہر شے عنایت کی گئی ہے۔ اس کا ایک بڑا تخت ہے۔ میں نے اس عورت کو اور اس کی رعایا کو خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے دیکھا۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں اچھے کر کے دکھائے ہیں۔ صحیح راستے سے ان کو باز رکھا ہے۔ وہ راہ کو نہیں پاتے کہ خدا کو وہ سجدہ کریں جو آسمانوں سے اور زمین سے چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا ہم دیکھتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا جھوٹا ہے۔ میرا یہ خط لے جا۔ ان کے پاس ڈال دے۔ پھر ان سے الگ ہٹ کے دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔''

ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے گرامی نامے کو اپنی چونچ میں دبایا اور شہر سبا کی جانب پرواز کر گیا۔ کچھ دیر ملکہ کے محل کے اوپر چکر کاٹتا رہا پھر ایک روشن دان کے ذریعے ملکہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ ملکہ اس وقت محو استراحت تھی۔ ہدہد نے خط ملکہ کی چھاتی پر رکھ دیا اور خود روشن دان میں بیٹھ کر ملکہ کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ملکہ بیدار ہوئی تو چھاتی پر خط پڑا دیکھ کر حیران ہوئی۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ خواب گاہ میں کوئی آیا نہ گیا پھر یہ خط کہاں سے آیا۔ اس نے کنیزوں کو بلایا سب نے یہی بتایا کہ دروازے بند تھے۔ اس نے پریشان ہو کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر ثبت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت طاقتور بادشاہ ہیں۔ اس خط کو اس نے ایک دھمکی ہی سمجھا۔ اس خط میں ''مسلمین'' کا لفظ دیکھ کر وہ یہ سمجھی کہ دوسرے قاہر بادشاہوں کی طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کا ماتحت ہو جانا قبول کر لوں۔ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکی۔

ملکہ سبا نے اسی وقت ارکان دولت کا اجلاس طلب کیا اور خط ان کے سامنے رکھ دیا۔

''اے میرے ارکان دولت! میں کوئی کام تمہارے مشورے کے بغیر نہیں کرتی۔ اس خط کی عبارت تم نے سن لی۔ اب تم میں سے کوئی مجھے یہ بتائے کہ ان کے بارے میں تم کتنا جانتے ہو؟''

ان میں سے چند عہدے دار حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے ملکہ کو بتایا کہ وہ نہایت طاقتور اور جلیل القدر فرماں رواں ہیں۔ دین موسوی کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور خود کو نبی کہتے ہیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب تم لوگ مجھے مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں اس کی اطاعت قبول کر لوں۔ اس نے خط میں یہی لکھا ہے؟''

ارکان دولت نے اس کی مخالفت کی۔ ''ہمیں اس سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ملک کو بچانے کے لیے ہم جان کی بازی لگا دیں گے۔ ہمارے پاس جنگی قوت کی کمی نہیں۔ ہم بھرپور مقابلہ کریں گے۔''

''میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کا پیغام ہمارے پاس عجیب طرح سے پہنچا ہے۔ اس کی طاقت کا ہمیں غلط اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ بادشاہوں کا قاعدہ رہا ہے کہ جب وہ کسی ملک پر حملہ کرتے ہیں تو اسے لوٹ لیتے ہیں۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کرتے ہیں اور ہر طرح کی بربادی لاتے ہیں۔ لہٰذا سلیمانؑ کے بارے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ میں اپنا ایک ایلچی سلیمانؑ کے پاس بھیجوں۔ وہ بیش بہا تحائف لے کر جائے اور سلیمانؑ کی خدمت میں پیش کرے۔ شاید وہ اس سے راضی ہو جائے۔'' ملکہ بلقیس نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح ہمیں اس کی شان و شوکت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ ہمارا ایلچی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے گا۔''

تمام درباریوں نے اس مشورے کو صائب سمجھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا مخصوص پرندہ ہدہد ایک گوشے میں دبکا بیٹھا تھا اور ساری گفتگو سن رہا تھا۔ وہ وہاں سے اڑا اور مسافت طے کرتا ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا۔ ملکہ بلقیس کے دربار کی تمام کیفیات بیان کر دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ ان کی طرف سے ایک ایلچی پہنچنے والا ہے۔

کئی مہینوں کی مسافت طے کر کے بلقیس کا ایلچی حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تحائف سے لدے اونٹ دیکھے تو آپؑ کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ مقصد یہ تھا ہی نہیں جو بلقیس نے سمجھا تھا۔

آپؑ نے فرمایا۔ ''تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا۔ کیا تم اس غرض سے میرے پاس آئے ہو کہ ان تحائف کے ذریعے جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو مجھ کو پھسلاؤ۔ ان تحائف کی میرے نزدیک کیا اہمیت ہے۔ مجھے دولت سے خریدنے آئے ہو جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے اس کے مقابلے میں تمہاری یہ بیش بہا دولت قطعاً ہیچ ہے۔ تم اپنے ہدایہ واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ تمہارے ملک پر حملہ کروں گا کہ تم اس کی مدافعت سے عاجز رہو گے اور پھر میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کر دوں گا۔''

قاصد اپنا سامنہ لے کر واپس چلا گیا۔ ملکہ قاصد کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور پوچھنے لگی کہ وہ کیا پیغام لایا ہے۔

قاصد نے اس کے سامنے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کی شان و شوکت کا نقشہ سا کھینچ کر رکھ دیا۔ یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ اگر جلد ہی کوئی انتظام نہیں کیا گیا تو وہ حملہ کر دیں گے۔

''سلیمان علیہ السلام کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں بلکہ جن اور حیوانات بھی ان کے تابع فرمان اور مسخر ہیں۔'' یہ سن کر ملکہ بلقیس نے طے کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ خود جائے اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا انہیں یقین دلائے۔

وہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب روانہ ہوئی۔

بائبل میں مذکور ہے۔

''اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان علیہ السلام کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ یروشلم میں آئی۔ اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے ہوئے تھے اور جب وہ سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں گفتگو کی۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کے سب سوالوں کے جواب دیے اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان علیہ السلام کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور ان کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جن سے خداوند کے گھر کو جایا جاتا تھا کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ سلیمانؑ نے اسے اپنی شاہانہ سخاوت سے عنایت کیا اور وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔''

ملکہ بلقیس ملک سبا سے جانب یروشلم روانہ ہوئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی کے ذریعے معلوم ہوگیا کہ ملکہ سبا حاضر خدمت ہو رہی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟''

ایک دیوپیکر جن اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ''میں آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے تخت کو لاسکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ اس کے بیش بہا سامان کے لیے امین ہوں۔ ہرگز خیانت نہیں کروں گا۔''

یہ دعویٰ ابھی گردش میں تھا کہ ایک عفریت جن نے عجب دعویٰ کر دیا۔ ''میں آنکھ جھپکتے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں'' اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے گردن گھمائی تو ملکہ سبا کا تخت قریب رکھے دیکھا۔

''حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب تخت اپنے پاس رکھے دیکھا تو کہا۔ ''یہ اس خدا کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں کہ ناشکری کرتا ہوں اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو خدا بے پروا اور بزرگ ہے۔'' (نمل)

یہ تخت کوئی معمولی تخت نہیں تھا۔ اس کے پائے یاقوت کے تھے اور اس کے تخت کا طول و عرض تیس گز تھا۔ آپؑ نے اس تخت کو دیکھا اور حکم جاری کیا۔

''اس تخت کی صورت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اتنی نشانیوں کے بعد بھی وہ پیغام حق پر ایمان لاتی ہے یا نہیں۔''

یہ تخت یمن میں بہ حفاظت مقفل کمروں میں تھا جہاں سے اظہار معجزہ کے لیے پل کے پل میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے منگوالیا تاکہ ملکہ سبا حقیقت پر ایمان لے آئے۔

سید سلیمان ندوی کی رائے یہ ہے کہ ملکہ سبا نے تحفے کے طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا، ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہوگی۔ انہوں نے نہ جانے یہ رائے کیسے قائم کرلی ورنہ قرآن نے سورۂ نمل میں صاف کہہ دیا۔

''سلیمان (علیہ السلام) نے کہا۔ ''اے درباریو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس (بلقیس) کا تخت لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرماں بردار ہوکر آ پہنچے۔ ان میں سے ایک دیوپیکر جن نے کہا۔ میں اس کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے لاسکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا۔

''میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کرسکتا ہوں۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بنایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے قاصدوں کی معرفت جو ہدایہ بھیجے گئے، ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں اور وہ قاصد واپس بھی گئے اور غالباً حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ تحائف واپس بھی جھنجھ دیے اور پھر یہ بھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس اعجاز کو دیکھ کر اس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ملکہ کا امتحان لینے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام اس تخت میں تبدیلی کا حکم بھی دیتے ہیں۔ کسی کے دیے ہوئے تحفے میں تبدیلی کون کرتا ہے۔

اس تخت کا معاملہ بے شک و شبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا نشان تھا۔

کچھ عرصے کے سفر کے بعد جب ملکہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں رکھے تخت کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ یہ تخت تو وہ یمن میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ بھی ایک جیسے بنے سات محلوں میں سے ایک میں مقفل تھا۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟

''یوں حیرانی سے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا یہ تمہارا تخت ہے؟''

''ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ یقیناً میرا ہی ہے۔''

بلقیس عقل مند تھی۔ وہ آپؑ کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ تو چکی تھی۔ شک بھی ہوگیا تھا کہ تخت اسی کا ہے۔ حیران بھی ہو رہی تھی کہ اس کے آنے سے قبل یہ تخت یہاں کیسے پہنچ گیا لیکن ابھی وہ اپنی فرماں برداری کے اعلان سے ہچکچا رہی تھی۔

اس کے آنے سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک عمارت بنوائی تھی جو شیشے کی تھی۔ فرش کے نیچے پانی چلتا رہتا

تھا۔ اس کی چھت بھی شیشے کی تھی۔ فرش کے نیچے پانی میں مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس عمارت میں اپنے شاہی تخت پر جلوہ افروز تھے۔ شیشے کے نیچے سے پانی ایسی آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا کہ شیشہ درمیان میں نظر ہی نہ آتا تھا۔

ملکہ محل میں داخل ہوئی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا۔ اس نے گھبرا کر اپنے لباس کو پنڈلیوں سے اوپر کرلیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ ''لباس بچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ پانی نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہی ہو۔ یہ محل اور اس کا صحن چمکتے ہوئے شیشے کا ہے۔ اس لیے تم دھوکا کھا گئیں۔''

بلقیس اس جملے پر سخت خفیف ہوئی۔ ملکہ کا ملک یمن صنعت و حرفت کے لیے مشہور تھا لیکن ایسی کاریگری اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

پے در پے دو تین واقعات ایسے ہوئے تھے کہ اس (ملکہ) کے قوائے عقلی بیدار ہونے لگے۔ سبا سے تخت کا آجانا، اس میں تبدیلی ہونا اور اب فرش کو پانی سمجھنا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی کہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ بے نظیر طاقت اور معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تنہا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مجھ سے اپنی تابعداری اور فرماں برداری کے طالب نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دینا ان کا مقصد ہے۔

یہ خیال آنا تھا کہ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ایک شرم سار اور نادم انسان کی طرح درگاہ الٰہی میں یہ اقرار کیا۔ ''پروردگار! آج تک میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتی رہی لیکن اب میں سلیمانؑ کے ساتھ ہوکر صرف ایک خدا ہی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔''

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قوم سبا بھی ایمان لے آئی تھی یا یہ بلقیس کا انفرادی فعل تھا۔ اس لیے کہ جب وہ سبا سے چلی تھی تو اس نے اپنے ارکان دولت سے مشورہ کیا تھا لیکن دربار حضرت سلیمان علیہ السلام میں آکر اس نے صیغہ واحد استعمال کیا۔ ''میں ایمان لاتی ہوں۔'' البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں جو مذہب بادشاہوں کا ہوتا تھا اسی پر عام رعایا چلتی تھی لہٰذا قوم سبا نے بھی کواکب پرستی کو چھوڑ کر دین موسوی اختیار کرلیا ہوگا۔

✂✂✂

ملکہ سبا آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس مہمان کی حیثیت سے وہ رہی تھی اور آپؑ کے معجزات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ جنات، ہوا، پرندے سب آپؑ کے مطیع ہیں۔ آپؑ کے تخت کو ہوا میں سفر کرتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔

ایک دن وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہنے لگی کہ مجھے بھی اشتیاق ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپؑ کے تخت پر بیٹھوں اور ہوا میں اڑتی پھروں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی خواہش پوری کی۔ تخت پر بلقیس بھی بیٹھی، حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اور دیگر عمائدین سلطنت بھی۔ آپؑ نے ہوا کو حکم دیا۔ ہوا تخت کے نیچے پہنچی اور فرش نما تخت کو بلند کر دیا۔ پھر وہ اس طرح ہوا میں تیرنے لگا جیسے کشتی پانی میں تیرتی ہے۔ پھر ایک جزیرے پر نظر پڑی تو ملکہ بلقیس نے اس جزیرے پر اترنے کی ضد کی۔ ہوا کو حکم ہوا اور تخت اس جزیرے پر اتر گیا۔ یہ جزیرہ سات سمندروں کے بیچ تھا اور ظاہر ہے یہاں اس سے پہلے کوئی نہیں آیا ہوگا۔

ابھی اس تخت کو اترے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ یہاں کا سبزہ آنکھوں کو رونق بخش ہی رہا تھا کہ عجیب الخلقت گھوڑے نظر آئے۔ ان گھوڑوں کے پر نکلے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ اڑ بھی سکتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ فوراً ہو بھی گیا۔ ان گھوڑوں کی نظر جیسے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام اور دیگر لوگوں پر پڑی تو اس طرح اڑ گئے جیسے پرندے اڑتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو گھوڑے بہت پسند تھے۔ آپؑ کے اصطبل میں ہر رنگ و نسل کے گھوڑے موجود تھے لیکن ایسے گھوڑے کبھی کسی نے نہیں دیکھے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کو تکتے رہ گئے اور گھوڑے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا جی اچاٹ ہوگیا۔ انہوں نے اسی وقت واپسی کا حکم دے دیا لیکن ایک فکر اپنے ساتھ

لائے کہ یہ گھوڑے کس طرح انہیں مل سکتے ہیں۔ آپؑ نے یروشلم پہنچتے ہی جنوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور انہیں حکم دیا کر فلاں جزیرے میں جو گھوڑے نظر آئے تھے، انہیں پکڑ کر لاؤ اور جتنے ہیں سب لے آؤ۔ ان جنوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ تو خشکی کے جن ہیں۔ وہ جزیرہ سات سمندروں کے بیچ ہے لہٰذا آپؑ ان جنوں کو بلایئے جن کی حکومت سمندروں پر ہے۔ سمندروں سے تعلق رکھنے والے جنوں کا بادشاہ آپؑ کی اطاعت سے منحرف ہو کر سمندر کی تہ میں کہیں چھپ گیا تھا۔ ان گھوڑوں پر وہی قابو پا سکتا تھا اور اسے گرفتار کرنا مشکل تھا۔ خشکی کے جنوں نے آپؑ کی یہ مشکل بھی حل کر دی۔ ان جنوں نے سمندر کے جن تک یہ خبر پہنچا دی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب ہم بھی آزاد ہیں اور تو بھی۔ وہ جن اس فریب میں آ گیا اور باہر نکل آیا۔ خشکی کے جنوں نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا دیا۔ سمندری جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھا تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے اپنا انجام نظر آ رہا تھا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے کمال فراخدلی سے اسے معاف کر دیا لیکن اس شرط پر کہ وہ ان گھوڑوں کو پکڑ کر لائے گا۔ ان گھوڑوں کا معاملہ شاید اتنا مشکل تھا کہ جنوں کا وہ بادشاہ بھی وعدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اسے اپنے انجام کی بھی فکر تھی۔ اسے وعدہ کرنا پڑا۔

جنوں کے بادشاہ نے کسی ترکیب سے چالیس گھوڑے پکڑے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا۔

عصر سے کچھ پہلے کا وقت تھا کہ یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو قریب سے دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ کبھی ایک گھوڑے کے قریب جاتے تھے، کبھی دوسرے کو دیکھتے تھے۔ یہ خیال بھی دل کو خوش کر رہا تھا کہ ایسے نایاب گھوڑے میرے سوا کس کے پاس ہوں گے۔ اس محویت میں اتنی دیر ہو گئی کہ عصر کا وقت نکل گیا۔

اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے۔ ”اے سلیمان! دنیا کے مال نے تمہیں اتنا مشغول کر دیا کہ نماز عصر بھی ادا نہ کر سکے۔ اللہ کو تمہاری یہ مشغولیت پسند نہیں آئی۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے استغفار کی اور سجدے میں گر کر دیر تک روتے رہے۔ پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ جب وہ ان گھوڑوں پر بیٹھ کر جہاد کریں گے تو اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔ اللہ تعالیٰ بھی ضرور خوش ہو جائے گا۔

مسلم مفسرین نے اوپر بیان کردہ واقعہ کہیں نہیں لکھا۔ یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں یہ تفصیل ضرور ملتی ہے لیکن اس واقعے کا ہلکا سا اشارہ قرآن میں ضرور ملتا ہے۔

”جب اس (سلیمان) کے سامنے اصیل اور سبک رو گھوڑے پیش کیے گئے تو وہ کہنے لگا کہ بے شک! میری محبت مال (جہاد کے گھوڑے) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے اوجھل ہو گئے (حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردن چھونے لگا۔“ (سورہ ص)

حضرت علیؓ کی تفسیر کے مطابق اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جہاد کی مہم پیش آئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ اصطبل سے گھوڑوں کو لایا جائے۔ گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عصر کی نماز کا وقت جاتا رہا اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوئی تو فرمایا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ مال کی محبت یادِ خدا پر غالب آ گئی اور اس غصے میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یادِ خدا کی محبت میں ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق جو حسن بصری کی سند سے منقول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلے میں جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کیے گئے اور ان کی دیکھ بھال میں نماز کا وقت نکل گیا تو آپؑ نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ ”آئندہ تم ذکر اللہ سے غفلت کا باعث نہ بننا۔“

ایک اور روایت اس طرح بھی بیان ہوئی ہے۔ ”ایک مہم کے موقع پر ایک شام کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کیے گئے تو آپؑ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور ان کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا۔ اس لیے آپؑ نے جب ان سب کو اصیل، سبک رو، خوش رو پایا تو آپؑ پر مسرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے۔ ”ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ

اللہ کا فضل

حضرت حبیب بن عجمی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کے پاس اکثر ضرورت مند لوگ آتے تھے اور آپ ان کے لیے دعا فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ اپنے کرم و احسان سے ان کی مشکلیں آسان فرما دیتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ ”میرا بیٹا عرصے سے مفقود الخبر ہے۔ آپ میری امداد فرمایئے تاکہ میرا بیٹا مجھے مل جائے۔“

آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”تمہارے پاس کچھ چاندی ہے؟“

عورت نے عرض کیا ”میرے پاس دو درہم ہیں۔“

آپ نے وہ درہم لے کر خیرات کر دیے اور فرمایا ”جاؤ تمہارا بیٹا گھر پہنچ گیا ہے۔“

عورت افتاں و خیزاں گھر پہنچی تو دیکھا کہ لڑکا گھر میں بیٹھا ہوا ہے، وہ اپنے بیٹے سے چمٹ گئی اور حالات معلوم کرنے لگی۔ لڑکے نے بتایا کہ میں اس وقت کرمان میں تھا اور تعلیم حاصل کر رہا تھا ایک ضرورت سے بازار آیا۔ یکایک ایک تیز آندھی آئی اور ہوا کے اس طوفان میں میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ اس وقت میں نے ایک پروقار آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے ”ہوا! اس لڑکے کو اڑا کر اس کے گھر لے جا۔“ میں ہوا کے بازوؤں پر تیر رہا تھا اور ایک حقیر پرزۂ کاغذ کی طرح ہوا کے سہارے اڑا جا رہا تھا کہ آندھی کا زور کم ہوا اور میرے پاؤں زمین پر لگے، میں نے ہوش و حواس درست کرنے کے بعد دیکھا تو اپنے مکان کے قریب کھڑا تھا۔ میری مسرت اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں فوراً بھاگ کر اندر آ گیا۔

عورت نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پیغام مسرت سنایا تو حضرت نے فرمایا ”جو کچھ ہوتا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کے حکم سے ہوتا ہے، خدا نے تم پر احسان کیا ہے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی کامیابی و کارفرمائی کا تصور بھی اپنے دل میں کبھی نہ لانا اور ہمیشہ اسی کی اطاعت و فرمانبرداری اور رضا جوئی کی کوشش کرنا، خدا ہی تمہارا مددگار ہے اور اسی کے فضل و کرم سے تمہارے تمام امور سرانجام پائیں گے۔“ .... (حکایاتِ اولیا سے اقتباس)

ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے، اصطبل کو روانہ ہو گئے چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے۔ آپؑ نے حکم دیا، ان کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محبت اور آلات جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردن پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور ایک ماہر فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔

✂✂✂

قوم سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفے کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر کی قدرت و طاقت کواکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب ان میں سب سے بڑا اور کائنات پر اثر انداز ہے اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔ بلقیس بھی اسی کواکب پرستی میں مبتلا تھی اور اسی لیے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ سمجھی تھی تو صرف یہ کہ دوسرے دنیا دار بادشاہوں کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اس کی دولت و مملکت کے خواہاں ہیں اور اسے اپنا ماتحت بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھا کہ وہ کافرہ ہے، بت پرست ہے۔ وہ انہیں محض بادشاہ سمجھتی ہے، نبی نہیں۔ اسی لیے آپؑ نے اس کا تخت ملک یمن سے منگوایا تا کہ وہ ان کی نبوت کی قائل ہو جائے۔ بلقیس نے اپنے تخت کو دیکھا۔ اس کی بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھا تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ بادشاہت سے بالاتر کوئی اور ہی واقعہ ہے۔ پھر پے در پے ایسے واقعات ہوتے رہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی قائل ہو گئی۔ سمجھ گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی پشت پر خدائے تعالیٰ کی وہ طاقت ہے جو پیغمبرانہ جاہ و جلال کے ساتھ ”نشان الٰہی“ کے نام سے وابستہ رہتی ہے۔

وہ اپنے قدیم فعل پر شرمسار ہوئی اور آپؑ کی نبوت پر ایمان لے آئی۔

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا (بلقیس) سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دے دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے

تھے لیکن قرآن حکیم اور احادیث میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

✂✂✂

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دولت و ثروت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آپؑ دولت اور حکمت میں زمین کے سب بادشاہوں سے سبقت لے گئے تھے اور سارا جہان آپؑ کے دیدار کا طالب تھا تاکہ اس ... حکمت کو جو خدا نے ان کے دل میں ڈالی تھی سنے۔

اسرائیل کی تاریخ کے کسی دور میں ایسی خوشحالی پھر کبھی نہ ہوئی جیسی حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہوئی۔ امن وسکون ہوا تو تجارت کو بھی فروغ ملا۔ بحری بیڑے حیرام کے بحری بیڑے کے ساتھ ترسیس کو جاتے تھے (ترسیس اندلس میں تھا) ترسیس سے سونا چاندی اور ہاتھی دانت آتے تھے۔ مصر سے گھوڑوں کی تجارت کی جاتی تھی۔

ملک میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔

ہر سال آپؑ کے پاس باہر سے جو سونا آتا تھا اس کی مقدار چھ سو چھیاسٹھ قنطار یعنی تقریباً آٹھ سو من تھی۔ توریت میں ہے۔ ''سلیمانؑ بادشاہ نے سونا گھڑ کر دو سو ڈھالیں بنائیں۔ چھ سو مثقال سونا ایک ڈھال میں لگا اور اس نے گھڑے ہوئے سونے کی سو سپریں بنائیں۔ ایک ایک سپر میں ڈیڑھ سیر سونا لگا۔ ماسوا ان کے بادشاہ نے ہاتھی دانت کا ایک بڑا تخت بنایا اور اس پر سونا چڑھایا۔ اس تخت پر چھ سیڑھیاں تھیں اور تخت کے اوپر کا حصہ پیچھے سے گول تھا اور بیٹھنے کی جگہ کی دونوں طرف ٹیکیں تھیں اور ٹیکوں کے پاس دو شیر کھڑے تھے اور ان چھ سیڑھیوں کے ادھر ادھر بارہ شیر کھڑے تھے۔ کسی سلطنت میں ایسا کبھی نہیں سنا تھا۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ کے پینے کے سب برتن سونے کے تھے۔ چاندی کا ایک بھی نہیں تھا کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس کی کچھ قدر نہ تھی۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک ہزار چار سو رتھ اور بارہ ہزار سوار تھے جن کو آپؑ نے رتھوں کے شہروں میں اور یروشلم میں رکھا اور بادشاہ نے یروشلم میں چاندی کو تو ایسا کر دیا جیسے پتھر اور دیودار (قیمتی لکڑی) کو ایسا جیسے گولر کے درخت ہوتے ہیں اور جو گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تھے وہ مصر سے منگوائے گئے تھے اور بادشاہ کے سوداگر ایک ایک جھنڈ کی قیمت لگا کر ان کے جھنڈ کے جھنڈ خرید لیا کرتے تھے۔

آپؑ کی سلطنت کی وسعت یہ تھی۔ شمال مشرق میں دریائے فرات تک، جنوب مشرق میں یمن تک، مغرب میں فلسطینیوں کے ملک اور بحر روم تک شمال میں تکلیل تک اور جنوب میں مصر کی حدود تک۔

خوش حالی اور وسعت کا یہ حال ہوا تو انہوں نے فرعون مصر کی بیٹی سے شادی کی۔ اس سے آپؑ کی حدود سلطنت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ کی حکومت کا کچھ علاقہ کسی زمانے میں فرعون کی عمل داری میں شامل ہو گیا تھا۔ آپؑ کی شادی فرعون کی بیٹی سے ہوئی تو وہ یہ علاقہ اپنے ساتھ جہیز میں لے آئی۔

اس کے بعد تو آپؑ کی بادشاہت کا جواب ہی نہیں تھا۔

بشری تقاضا ہوا۔ جی میں یہ آئی کہ دنیا کو بھی تو معلوم ہو میری سلطنت کیسی وسیع ہے۔ میرے اختیارات اور میری دولت کا کوئی جواب ہی نہیں۔

آپؑ سوچنے لگے کہ اس شان و شوکت کا مظاہرہ کس طرح کیا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مخلوق خداوندی کی دعوت کی جائے۔ اس دعوت میں صرف انسان نہیں ''اجنہ'' بھی شامل ہوں۔ جنات جس کثرت سے دنیا میں آباد ہیں اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنی دولت پر اعتماد تھا کہ وہ ضرور اس ضیافت کا اہتمام کر سکیں گے۔

اعلان ہو گیا کہ جملہ مخلوق مقررہ دن مقررہ میدان میں جمع ہو۔ ان سب کو کھانا حضرت سلیمان علیہ السلام دیں گے۔

اس علان کے بعد آپؑ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ بڑی بڑی دیگیں تیار کریں۔ جنوں نے دیگیں تیار کر دیں۔ کہا جاتا ہے ان دیگوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی اور ہر دیگ ایک بڑے تالاب سے بھی بڑی تھی۔

ہزاروں جانور ذبح ہوئے۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت



نمکین لاش

مختار آزاد

جو پودے دھوپ میں جل کر پلتے ہیں ان کی چھائوں میں ٹھنڈک نہیں ملتی۔ وہ جو پل پل محبت کو ترسا تھا... جس کے دل میں نفرت کا الائو روشن تھا، جانے وہ کس لمحے کی گرفت میں تھا کہ لہو کی تڑپ نے اسے بے چین کر ڈالا۔ یہ اور بات کہ دھوپ میں جلنے کا رشتہ اس نے ہمیشہ برقرار رکھا کہ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔

غرض کی اس دنیا میں ایک ہراساں چہرے پر لکھی تحریر

نمک میں دبی لاش کی دریافت اور باپ سے وکی کی ملاقات، یہ دونوں باتیں ایک ہی صبح کی ہیں۔ نہ کیپٹن ولیم کوفن کے قلیوں کو نمک کے ڈھیر میں دبی لاش ملتی اور نہ ہی وکی سے باپ کی ملاقات ہوتی۔ یہ دونوں باتیں اتفاقی تھیں۔

وہ موسمِ بہار کی خوشگوار صبح تھی جس وقت کیپٹن ولیم کے ایک قلی نے لنگر انداز جہاز کے عرشے پر لدے نمک کے بڑے سے ڈھیر میں دبی لاش کو دیکھا، اُس وقت کیپٹن کا بیٹا وکی سامنے ساحل سے کچھ دوری پر بنے گھر کے لان میں بیٹھا سکون سے

کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے پیٹھ پر دھوپ کی تپش گراں گزری تو کرسی گھسیٹ کر پورچ میں آ گیا۔ یہ گھر اس کے نانا نے بنایا تھا۔ جزیرے پر بنا، پرانی وضع قطع کا یہ گھر اسے بہت پسند تھا۔ اس نے اپنی عمر کے ابتدائی بارہ برس یہیں گزارے تھے۔ بعد میں اس کے پاپا پڑھنے کے لیے اسے امریکی ریاست میساچوسٹس کے شہر سیلم لے گئے تھے۔ پڑھائی وہ کب کی چھوڑ چکا تھا اور اب کھلے سمندر میں ماہی گیری کرنے والے بحری جہاز پر ملازم تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ چھٹیاں گزارنے یہیں آتا تھا۔ کئی مہینوں کے تھکا دینے والے کام سے اس بار اسے لمبی چھٹی ملی تو وہ تازہ دم ہونے کے لیے یہاں آ گیا۔ اب اس کا ارادہ اگلے تین ہفتے تک یہیں آرام کرنے کا تھا۔

وکی کے نانا کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ بے آف آئی لینڈ پر بنے اس گھر کے پورچ کے سامنے لان تھا۔ چھوٹی چار دیواری کے باہر سامنے سمندر تھا جس کی موجیں ساحل سے ٹکراتیں تو کانوں کو بھلی لگنے والی آوازیں اُسے اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں۔ ساحل پہ تاحدِ نگاہ ناریل اور دوسرے ساحلی درختوں کے جھنڈ تھے اور جب سرسراتی ہوا اُن سے ٹکراتی تو فضا میں جلترنگ بج اٹھتے۔ چھٹیوں میں وکی کا پسندیدہ مشغلہ کتابیں پڑھنا تھا۔ وہ بند کمرے کے بجائے کھلے ماحول میں مطالعے کا عادی تھا۔ اُس روز بھی وہ ایک سفرنامہ پڑھ رہا تھا۔ موسم بہار کا تھا مگر اُس روز جزیرے پر کچھ زیادہ گرمی ہو گئی تھی۔ وہ سورج کے رُخ پر پشت کیے بیٹھا تھا۔ گرمی سے اس کی پیٹھ میں خارش ہونے لگی تھی۔ وہ پورچ میں بیٹھا پیٹھ کھجا رہا تھا، اس کی نظریں ساحل کی طرف اٹھیں۔

اسی دوران ایک کشتی ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت ساحل پہ اِکا دُکا کشتیاں ہی کھڑی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ جیٹی پر پہنچ گئی۔ ایک شخص کشتی سے اتر کر اس کا رسّا کھونٹے سے باندھنے لگا۔ ایک بڑی عمر کا مرد کشتی سے اترا وہ کافی چوڑے کاندھے، لمبے قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں والا شخص تھا۔ آہستہ آہستہ وہ شخص آگے بڑھنے لگا۔ وکی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑا اور نزدیک آیا تو فاصلہ ہونے کے باوجود وہ اُس شخص کو پہچان گیا۔ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس شخص سے اس کے بچپن کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔ یہ اس کا باپ تھا۔ آخری بار اس نے اپنے ڈیڈی کو تقریباً پونے دو سال پہلے دیکھا تھا۔

وکی ماں کی طرف سے نسلاً پولی نیشیائی قبیلے کی ایک شاخ ماؤری سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اس کا باپ امریکی تھا۔ وہ جہاز راں تھا اور میساچوسٹس سے یورپ اور مشرقِ بعید کے ساحلی علاقوں تک تجارت کرتا تھا۔ وہ ایک جگہ سے سامان خریدتا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں بیچ دیتا تھا۔ وکی کی ماں اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک نانا، نانی نے اس کی پرورش کی تھی۔ وکی کا باپ کیپٹن ولیم میساچوسٹس میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتا تھا جو امریکی تھی۔ وکی کی دیکھ بھال اور پرورش میں سب سے زیادہ کردار اُس کے نانا، نانی کا تھا۔ اسی لیے وہ بھی ان سے بہت قریب تھا۔ لڑکپن کے جن دنوں میں وہ میساچوسٹس میں باپ کے ساتھ رہ رہا تھا، تب اس کی سوتیلی ماں ہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ کیپٹن ولیم ہمیشہ سفر پر جاتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کی اچھی دیکھ بھال کی تاکید کر کے جاتا اور پھر ڈیڑھ دو سال کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔

کیپٹن ولیم جب بھی میساچوسٹس میں واقع اپنے گھر لوٹتا تو ڈھیر سارے تحائف، مزے مزے کی باتیں اور ایک دو نئی بولیاں ضرور سیکھ کر آتا تھا۔ زباں دانی کے معاملے میں وہ بہت ہوشیار تھا۔ کہتا تھا کہ جیسا دیس ہو، ویسا بھیس نہ بدلو تو کاروبار پر منفی اثر پڑتا ہے۔ وہ وکی کو اپنے بحری سفر کے قصے اتنے مزے لے کر سناتا کہ اس کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائی لیتی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے مگر کیپٹن ولیم کا کہنا تھا کہ اس طرح پڑھائی کا حرج ہوگا۔ باپ کے سنائے ہوئے سمندری سفر کے یہی قصے تھے کہ وہ بڑا ہو کر ماہی گیر بن گیا اور مہینوں سمندر میں رہ کر مچھلی کا شکار کرنے لگا۔

یہ بات تو وکی کو معلوم تھی کہ اس کا باپ ہر بیس ماہ بعد ایک بار ضرور بے آف آئی لینڈ میں بہ ظاہر اپنے سسرالیوں سے ملنے آتا ہے۔ مگر درحقیقت یہاں اس کا بڑا سا گودام تھا۔ جس کی وجہ سے آنا جانا اس کی مجبوری بھی تھی۔

جب سے وکی نے عملی زندگی شروع کی تھی، تب سے ان باپ بیٹوں کی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب وکی نے دیکھا کہ گھر کی طرف آنے والا اس کا باپ ہی ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ ڈھیروں تحائف اور قصے لے کر یہاں آیا ہوگا۔ اُسے امید ہوگی کہ رشتہ دار اُس سے مل کر خوش ہوں گے مگر یہ بات کیپٹن ولیم کے لیے حیرت کا سبب بنے گی کہ اُس کا بیٹا بھی یہیں پر تھا۔ دونوں کے لیے یہ ملاقات ایک اتفاق ہی تھی مگر کیپٹن یہاں خوشی خوشی نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک مصیبت میں گرفتار تھا اور اب اس سے نکلنے کے لیے وہ اپنے سابق سسر سے مدد مانگنے آ رہا تھا۔

"ارے تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" کیپٹن ولیم گھر میں داخل ہوا تو بیٹے کو دیکھ کر چونک گیا۔

"مطالعہ۔" وکی نے سادگی سے جواب دیا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں بحری سفر کے پس منظر میں لکھا ہوا جوناتھن سوئفٹ کا سفرنامہ تھا۔

"پڑھتے جاؤ۔" اُس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا اور گھر کے داخلی دروازے کے قریب بچھی بنچ پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ یہ گھرانا ماؤری عقیدے پر سختی سے کاربند تھا۔ دوسرے ماؤری باشندوں کی طرح ان کے گھر میں بھی جوتے پہن کر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

کیپٹن ولیم ہینڈسم مرد تھا مگر جب اسے بیٹھا ہوا دیکھو تب اس کے بڑھتے وزن کا احساس ہوتا تھا۔ جوتے اتارتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی ایک ابرو اوپر اور دوسری نیچے تھی۔ اُس وقت وہ نہایت چالاک نظر آ رہا تھا۔ "اب تم کافی بڑے ہو گئے ہو۔" کیپٹن نے وکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بیک وقت خوف اور تشویش جھلک رہے تھے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تمہاری سوتیلی ماں کہہ رہی تھی کہ اس نے تمہیں مزید پڑھنے کے لیے کالج بھیج دیا ہے تاکہ تم مشنری میں اسسٹنٹ بن سکو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے جوتے اتار کر بنچ کے نیچے رکھے اور پھر وکی کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ "اس نے مجھ سے پورا سچ نہیں کہا تھا۔" کیپٹن ولیم نے یہ بات عجیب سے لہجے میں کہی تھی۔

"انہوں نے آپ سے ٹھیک کہا تھا۔" وکی نے یہ سن کر فوراً جواب دیا۔ اسے باپ کی بات کافی عجیب لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ سوتیلی ماں کے حوالے سے اس کا باپ کسی غلط فہمی کا شکار ہے، تبھی وہ یہ کہہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سوتیلی ماں قطعی جھوٹی نہیں ہے۔

"اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی تو پھر تم کالج کے بجائے یہاں کیوں چلے آئے؟" کیپٹن ولیم نے بھویں چڑھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے؟" اُس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا پچھلے سوا سال سے ماہی گیری کر رہا تھا۔

"کچھ کرنے کا ارادہ نہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "ویسے بھی میں کبھی گریجویشن نہیں کر پاتا۔" یہ کہہ کر اس نے باپ کی طرف دیکھا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "کیا کبھی آپ نے کوئی چیتا دیکھا ہے؟"

کیپٹن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف دکھائی دینے لگے۔ وکی معصومانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے چیتے سے خاصا لگاؤ تھا۔ اس نے بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی۔ وہ نظم چیتے کے بارے میں تھی:

چیتے او چیتے!
تیری چمکیلی آنکھیں
جیسے جنگل کی اندھیری رات میں روشن ہوں دو دیے۔

یہ نظم اسے اتنی بھائی کہ اُس کے بعد سے تو وہ چیتے کا دیوانہ ہو گیا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ ماؤری افسانوی داستانوں کی طرح چیتا بھی کوئی قصہ ہے یا پھر وہ کوئی عظیم المرتبت روحانی شخصیت ہے۔ یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ چیتا تو ایک جیتا جاگتا، گوشت پوست کا بنا ہوا جنگلی درندہ ہے۔

"کبھی نہیں دیکھا میں نے اپنی زندگی میں۔" کیپٹن کی بھویں بہ دستور تنی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد سخت لہجے میں جواب دیا۔ "ارے یاد آیا۔" چند لمحوں کے بعد اس کی تنی ہوئی بھویں ذرا ڈھیلی پڑیں اور اس نے قدرے نرم لہجے میں وکی سے کہا۔ "ایک بار موقع ملا تھا چیتا دیکھنے کا مگر میں دیکھ نہیں پایا۔"

"کب...؟" وکی نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔

"اُن دنوں میں منیلا میں تھا، جب سلطان برونائی نے وہاں کا دورہ کیا۔" کیپٹن ولیم نے قصہ گوئی کے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "اُس موقعے پر سلطان کو بہ طورِ تحفہ چیتوں کا ایک جوڑا پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں انہیں ایک پنجرے میں قید کر کے پارک میں رکھا گیا تھا تاکہ لوگ انہیں دیکھ سکیں۔ میں بھی دیکھنے جاتا مگر اُس روز مجھے بہت کام تھا۔ ویسے بھی وہ صرف ایک دن کے لیے وہاں رکھے گئے تھے۔" یہ کہہ کر اس نے پاؤں پسارے اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگا۔

"اچھا چھوڑیں چیتے کو، یہ بتائیں آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟" وکی نے باپ سے پوچھا۔

"میں کورو سے ملنے آیا ہوں۔" یہ وکی کے نانا کا خاندانی نام تھا۔ "دراصل مجھے ایک پادری کی ضرورت ہے جو جہاز پر مذہبی رسومات ادا کر سکے۔"

"کیا تم نوٹنگا سے ملنے آئے ہو؟" وکی نے یہ سنتے ہی سوال کیا۔ یہ ماؤری قبیلے کے مذہبی پیشوا کا لقب تھا۔

"کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کیپٹن ولیم نے جواب دیا۔ "بس اسے پادری ہونا چاہیے اور وہ مذہبی رسومات اور دعائیں کروا سکتا ہو۔" اس کے لہجے

سے بیزاری جھلک رہی تھی۔
''ہوا کیا ہے؟''
''میں چاہتا ہوں کہ کوئی پادری آ کر میرے جہاز پر دعا کروائے، جس سے آسیبی قوتیں بھاگ جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''وہ بھاگتی ہیں یا نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، کم از کم وہ اپنی دعا سے میرے توہم پرست قلیوں کو ضرور مطمئن کر دے۔''
''تو جہاز پر کچھ ہو گیا ہے؟''
''میں نے منیلا میں قلیوں کی ایک کھیپ بھرتی کی تھی۔'' کیپٹن نے کہنا شروع کیا۔ ''ان میں سے ایک نے جہاز پر لدے سامان میں ایک لاش دیکھی ہے اور اب سب پریشان ہیں۔''
''کیا جہاز پر کوئی قتل ہو گیا ہے؟'' وکی نے قطع کلامی کی۔
''فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ لاش ضرور ملی ہے۔'' کیپٹن ولیم نے اس انداز میں کہا جیسے وہ تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ''قلیوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ آسیبی قوتوں کا کیا دھرا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ڈر کے مارے جہاز چھوڑ دیں۔ اس وقت میں نئے قلی بھرتی کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ کاروباری مجبوری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور گہری سانس بھر کر کہنے لگا۔ ''اب کوئی پادری ہی ان کے دل کا ڈر دور کر سکتا ہے۔''
''میں انہیں لے کر آتا ہوں۔'' وکی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور گھر کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں اس کا نانا کورو کلہاڑے سے لکڑی پھاڑ رہا تھا۔ کورو خاصا بوڑھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے خاصا چھوٹا لگتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی وہ ایسے سخت کام کر لیتا تھا۔
وکی کو دیکھتے ہی اس نے کلہاڑا چلانا بند کیا۔ جب اس نے بتایا کہ کیپٹن اس سے ملنے آیا ہے تو اس نے رومال سے چہرے کا پسینا صاف کیا۔ گلے کے بٹن بند کیے، کالر درست کیا اور آستینیں نیچی کرتا ہوا اس کے ساتھ پورچ کی طرف چل دیا۔
''کیا تم اپنی روایات بھول گئے ہو؟'' کورو نے چلتے چلتے وکی سے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''وہ گھر کے سامنے والے حصے سے داخل ہوا ہے تو ہمارا معزز مہمان ہے۔'' اس نے وکی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ماؤری تہذیب ہے کہ جب کوئی شخص گھر کے سامنے والے حصے سے اندر داخل ہو تو اس کا روایتی طریقے سے استقبال کرتے ہیں، اس سے چائے کا پوچھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور وکی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہو گا؟''
''نہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔
''چلو۔'' یہ سنتے ہی کورو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔
کیپٹن اور کورو بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ماؤری لوگوں کی طرح ایک دوسرے کی ناک سے ناک رگڑ کر مبارک باد دی۔ کیپٹن نے اس کی خدمت میں بیش قیمت پائپ تمباکو اور دیگر چیزیں بہ طور تحفہ پیش کیں اور پھر تینوں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وکی کی نانی چینک میں اُبلتے ہوئے پانی میں پتی ڈال کر ماؤری لوگوں کی مخصوص چائے تیار کر رہی تھی اُس معزز مہمان کے لیے جو کبھی اُس کا داماد بھی تھا۔ وکی جانتا تھا کہ اس کا باپ یہاں کیوں آیا ہے لیکن اس نے ابھی تک مطلب کی بات نہیں کی تھی۔ اسے چائے کا انتظار تھا۔ ماؤری باشندے اس وقت تک مہمان سے آمد کا مدعا نہیں معلوم کرتے، جب تک وہ اُن کے ہاں کی چائے نہ پی لے۔ یہ بات کیپٹن بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ چائے ختم ہوئی تو کیپٹن نے سکھ کی سانس لی۔ اب وہ کام کی بات کر سکتا تھا۔
''مگر ایک مسئلہ ہے...'' کیپٹن ولیم کی ساری بات سن کر کورو کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''فرض کرو کہ تمہارے قلی نوٹنگا کی دعا اور رسومات سے متاثر نہ ہوئے تو...'' اس نے کیپٹن کی طرف گہری نظروں سے دیکھا، وہ خاموش تھا۔
''اگر ایسا ہوا تو وہ بہت ہتک محسوس کرے گا۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کورو نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ ''وہ اس جزیرے کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے۔ سب لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن تمہارے قلی اجنبی ہیں، وہ نوٹنگا اور اس کے مقام سے ناواقف ہیں۔ اسی لیے میں ڈر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر کورو چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔
کیپٹن ولیم کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں باری باری اپنی دونوں بھوؤں میں سے ایک کو کبھی اوپر تو کبھی دوسری کو نیچے کر رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر پادری نے دعا نہ کروائی تو قلی جہاز چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسا ہوا تو وہ جہاز پر لدا سامان اگلی منزل تک وقت پر نہیں پہنچا

پائے گا۔ کیپٹن کو قلیوں کی نہیں، اپنے نقصان کی فکر تھی۔ کورو خاموش تھا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیپٹن اس کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
''ٹھیک ہے...'' کافی دیر بعد کورو نے سر اٹھایا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ اب جو بھی ہو، تمہاری مدد تو کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''میں اور نوٹنگا دوپہر کو تمہارے جہاز پر پہنچتے ہیں۔''
''میں انتظار کروں گا۔'' کیپٹن نے کورو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
وکی اپنے باپ کے ساتھ باہر تک آیا۔ وہ اب تک اس ادھیڑ بن میں تھا کہ جہاز پر لدے سامان میں لاش کہاں سے آئی؟ وہ جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

لنچ کے بعد کورو، نوٹنگا اور وکی جیٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ صبح کی نسبت اب وہاں کئی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ جب وہ ایک کشتی کے ذریعے کیپٹن ولیم کے جہاز پر پہنچے تو وہاں پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ چھوٹے قد اور تانبے جیسی رنگت والے کئی قلی عرشے پر موجود تھے مگر اس کے باوجود وہاں معنیٰ خیز خاموشی طاری تھی۔ قلیوں کے چہروں پر بھی تشویش نظر آ رہی تھی۔
''خوش آمدید۔'' جیسے ہی کیپٹن کو اطلاع ملی وہ ان کے استقبال کے لیے پہنچ گیا۔ وکی ان سے دو قدم پیچھے کھڑا خاموشی سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاز سامان سے لدا ہوا تھا۔ کیپٹن نے شاید عملے کو مطلع کر دیا تھا، اس لیے ان کی آمد کے ساتھ ہی عرشے پر منیلا کے قلی جمع ہونے لگے۔ جن کے چہروں سے دل میں چھپا خوف عیاں ہو رہا تھا۔
''وہ شیطان کہاں ہے؟'' نوٹنگا نے گہری نظروں سے کیپٹن کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا اشارہ لاش کی طرف تھا مگر اس کے کہنے کا انداز مختلف تھا۔ اُس وقت تک لگ بھگ سارے قلی جمع ہو چکے تھے۔
''وہ شیطان نہیں، لاش ہے؟'' کیپٹن نے وضاحت کی۔ اُسے ڈر تھا کہ پادری کے منہ سے لاش کے لیے شیطان کا لفظ سن کر قلی... مزید خوف زدہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کیپٹن نے بہ آوازِ بلند کہا تاکہ سارے قلی سن لیں۔
''اچھا...'' نوٹنگا نے کیپٹن کی بات سن کر بے تاثر لہجے میں کہا۔
''اچھا تو وہ لاش کہاں ہے؟'' کورو نے مداخلت کی۔
''وہاں، اُس طرف۔'' کیپٹن نے عرشے کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ہر طرف سامان لدا ہوا تھا۔
''چلو...'' نوٹنگا نے قدم آگے بڑھایا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سب لوگ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل دیے۔ وکی بھی تجسس بھری نظروں سے اِردگرد دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔
وہاں نمک کے بہت بڑے ڈھیر میں واقعی ایک لاش موجود تھی۔ لاش کا نچلا دھڑ نمک کے ڈھیر میں دفن تھا تاہم اوپری نصف حصہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ مرنے والے کے چہرے پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی جس میں اُس کا زرد چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے نائٹ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر پہلی نظر میں تاثر ابھرتا تھا کہ موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہو۔
وکی بھی دوسروں کی طرح لاش کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے اب تک کئی مُردے دیکھے تھے مگر تابوت میں لیٹے اور تدفین کے لباس میں ملبوس۔ پہلی بار وہ ایسی لاش دیکھ رہا تھا جسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ تابوت میں لیٹنے کے لیے بالکل تیار تھی۔
''یہ لاش کس شے میں دبی ہوئی ہے؟'' وکی نے اپنے باپ کے کان میں کہا۔
''اوہ...'' یہ سن کر کیپٹن ولیم نے گردن موڑی اور بیٹے کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بتایا تو تھا نمک ہے۔''
''مگر یہ تو گلابی اور بھورا مائل ہے؟'' وکی نے پھر سوال کیا۔
''یہ خام سمندری نمک ہے۔'' کیپٹن نے سرگوشی کی۔ ''اسے کھانے کے قابل بنانے کے لیے مشینوں سے صاف کیا جاتا ہے۔''
''نمک۔'' یہ سن کر وکی نے خود کلامی کی۔ جہاز پر نمک لادنے کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ صرف پُرتعیش سامان کی ترسیل و تجارت کرتا تھا مگر نمک...؟ ''یہ آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اس نے نمک کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''میں نے اسے جنوبی امریکا کی بندرگاہ کلاؤ سے خریدا تھا، سڈنی میں بیچنے کے لیے۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ ''یہ وہاں کافی مہنگا ہے اور اسے کینگرو کی کھالوں کو خشک کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب میں کلاؤ سے چلا تو یہ سوچ کر خرید لیا کہ سڈنی میں بیچ کر بھاری منافع کماؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لیے شاطر تاجر کی چمک ابھر آئی تھی۔ ''مگر یہ لاش... اب یہ مصیبت ختم ہو تو

آگے سفر کروں۔'' کیپٹن ولیم نے سرگوشی میں کہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''لاش کے علاوہ کچھ اور بھی ملا ہے؟'' وکی نے سوال کیا۔

''ہاں...'' کیپٹن نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اس کے سوا یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہاز سے کئی سیر وزنی سونے کی وہ پانچ اینٹیں بھی غائب ہیں، جو مخمل کی تھیلی میں لپٹی ہوئی تھیں اور انہیں یورپ پہنچانا تھا۔ ریکارڈ میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ وہ سونا کہیں پر اتارا گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ چوری کرلیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاؤ سے روانہ ہونے کے بعد جب پڑتال کی گئی تو ایک قلی بھی غائب تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''اس وقت تو میرے لیے یہ گمشدگی اہم نہیں تھی مگر اب یقین ہے کہ وہی چور تھا۔''

''اوہ، ایک بار پھر...'' وکی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' کیپٹن نے استفساریہ نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔

''اسی طرح ایک بار پہلے بھی جہاز سے سونا چوری ہوا تھا۔ یہ 1820ء کی بات ہے۔'' وکی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اب یہ کیا قصہ ہے؟'' کیپٹن نے وکی کو بازو سے پکڑا اور ایک طرف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''پتا ہے یہ کون سا دور ہے... 1899ء' ویسے تم کس کی بات کررہے تھے۔''

''یہ ایک سچا قصہ ہے۔ سائمن بولیور کے سپاہی لیما کی جانب پیش قدمی کررہے تھے۔'' وکی نے قصہ سنانا شروع کیا۔ ''وائسرائے جانتا تھا کہ اُس وقت لیما کی بندرگاہ پر ایک جہاز تیار کھڑا ہے جس پر شاہ اسپین کے خزانے کے لیے سونا لدا ہوا تھا۔ وائسرائے نے اسپین اطلاع کی اور پھر شاہی انتظامیہ نے اُس وقت کے مشہور جہازراں کیپٹن میرے ڈیئر کو بھیجا۔ اس نے جہاز پر سے سارا سونا اتروا کر اپنے جہاز پر لادا اور پناما چل دیا لیکن پھر بھی وہ خزانہ بچا نہیں۔ بحری قزاقوں نے راستے میں اُس جہاز پر دھاوا بول دیا۔''

''اور سارا سونا لوٹ کر ایک جزیرے پر دفن کردیا۔ اب بھی اگر کوئی وہ جگہ تلاش کرکے کھدائی کرے تو سونا حاصل کرسکتا ہے۔'' کیپٹن نے قطع کلامی کی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بات کچھ ٹھیک ہے اور کچھ نہیں۔'' وکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قزاقوں نے سونا لوٹ کر واقعی کسی جزیرے پر دفن کردیا تھا مگر وہ بچ نہیں پائے۔ اس حملے کی اطلاع ملتے ہی اسپین کی بحری فوج کے جہازوں نے قزاقوں کی تلاش شروع کردی۔ انہوں نے کیپٹن میرے ڈیئر کو بھی اپنا یرغمال بنا رکھا تھا۔ ایک مقام پر دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ تمام قزاق مارے گئے۔ صرف کیپٹن کو بچالیا گیا مگر وہ بہت بیمار اور خوف زدہ تھا۔ صرف کیپٹن جانتا تھا کہ قزاقوں نے سونا کس جزیرے پر دفن کیا تھا مگر قزاقوں کی قید سے رہائی کے فوراً بعد وہ سخت بخار میں مبتلا ہوا اور پھر کچھ ہی دن بعد بنا زبان کھولے مرگیا۔'' یہ کہہ کر وکی نے باپ کی طرف دیکھا۔ ''صرف کیپٹن ہی جانتا تھا کہ خزانہ کہاں دفن ہے۔''

''کہانی خوب ہے۔'' کیپٹن نے سامنے کی طرف دیکھا۔ کوروا اور نوٹنگا اب تک لاش کا معائنہ کررہے تھے۔ ان کے گرد سہمے ہوئے قلی کھڑے تھے۔ ''تو تم اس احمقانہ کہانی پر یقین کرتے ہو۔'' کیپٹن کا انداز طنزیہ تھا۔

''کیوں نہیں۔'' وکی نے فوراً جواب دیا۔ ''میں نے یہ کہانی اپنے بچپن میں سنی تھی مگر افسوس...'' یہ کہہ کر اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے آپ کو بچپن میں نہ تو کہانیاں سننے کا موقع ملا اور نہ ہی آپ نے پڑھی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ''خیر جانے دیجیے اس بات کو۔''

''یہاں معاملہ یہ ہے کہ جہاز پر لاش موجود ہے۔ قلی سہمے ہوئے ہیں، سونے کی پانچ اینٹیں چوری کرلی گئی ہیں، جن کی مالیت ایک لاکھ ڈالرز سے اوپر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ملازم بھی غائب ہے۔ امکان یہی ہے کہ چوری اسی لالچی ملازم نے کی ہے۔'' کیپٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسے میں تم ہو کہ نہ جانے کیا قصہ سنا رہے ہو۔''

''خیر... اگر ہم 1820ء کی طرف واپس پلٹیں تو ایک قصہ ہے، جس میں ملازم اسی طرح مالک کا سونا چوری کرلیتا ہے مگر جانے دیجیے۔'' وکی نے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر اچانک اس لاش کا انکشاف کیسے ہوا؟'' وکی نے انگلی سے اُس طرف اشارہ کیا جہاں نمک کے ڈھیر میں آدھی لاش دفن تھی۔

''میں بے آف آئی لینڈ پر یہ نمک اتروا رہا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' وکی نے قطع کلامی کی۔ ''آپ نے تو اسے سڈنی لے جانے کے لیے خریدا تھا۔''

''ہاں...'' کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے سڈنی لے کر گیا تھا مگر وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ آسٹریلیا میں ان دنوں کینگرو کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ان کا شکار عارضی طور پر روک دیا گیا ہے۔ اسی لیے وہاں نمک کی مانگ اور دام، دونوں بہت گر گئے ہیں۔ فیصلہ کیا کہ یہیں اتروا کر اپنے گوداموں میں رکھوا دیتا ہوں۔ جیسے ہی سڈنی میں اس

کی طلب بڑھے گی، یہاں سے لے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''مجھے یہاں سے تیل لے کر نیویارک پہنچنا تھا۔ نمک نے بھی اتنی جگہ گھیری ہوئی ہے، اگر یہ لاش...''

''کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ جہاز پر نمک کے ڈھیر میں ایک لاش دبی ہوئی ہے؟'' وکی نے قطع کلامی۔

''غلط...'' اس نے فوراً وکی کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بات جانتا تھا۔''

''کیا؟'' وکی نے حیرت سے کہا۔ ''آپ جانتے تھے کہ لاش... مگر کیسے؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''اس لیے کہ میں نے ہی لاش نمک کے ڈھیر میں دبائی تھی۔''

''تو جب آپ کے آدمی نمک اتار رہے تھے تو آپ نے انہیں منع کیوں نہیں کیا؟'' وکی نے استفساریہ لہجے میں کہا۔ ''اس طرح یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔''

کیپٹن نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''میں لاش کا تذکرہ کرکے اس احمقانہ صورتِ حال کا مزید چرچا نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''یہ ماجرا کیا ہے؟'' وکی نے حیرانی سے کہا۔ پہلے تو وہ اس لاش کو پُراسرار قتل سمجھ رہا تھا مگر اب یہ سن کر تو وہ مزید پریشان ہوگیا تھا کہ اس کے باپ کو لاش کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا۔

''یہ سب اس کسٹم ہاؤس افسر کا کیا دھرا ہے۔'' کیپٹن نے غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا تھا؟''

''جب میں کلاؤ سے نکلنے والا تھا، تب کسٹم ہاؤس کا ایک افسر میرے پاس آیا۔'' کیپٹن نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا اور سامنے نظر ڈالی۔ نوٹنگا کچھ دعائیں پڑھ رہا تھا، باقی تمام لوگ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ ''اس افسر کے ساتھ ایک بوڑھا جوڑا تھا۔ اس نے ہی بتایا کہ مرد کا نام سائیلون ٹوباتھ ہے اور وہ عورت اس کی بیوی اینا تھی۔ ٹوباتھ کو سڈنی پہنچنا تھا۔ اسے بخار بھی تھا۔ وہ کئی روز سے بندرگاہ پر تھے مگر انہیں کوئی جہاز نہیں ملا تھا اور نہ ہی آنے والے ہفتوں میں کسی مسافر بردار بحری جہاز کی آمد متوقع تھی۔ اس افسر نے بتایا کہ امریکی حکومت نے مسٹر ٹوباتھ کو سڈنی میں امریکا کا کمرشل ایجنٹ مقرر کیا ہے اور ان کا پہنچنا بہت ضروری ہے۔ کسٹم افسر جانتا تھا کہ میں نمک لے کر سڈنی جارہا ہوں۔ میں نے اس کی درخواست یہ سوچ کر مان لی کہ چلو امریکی بھائی کی مدد کررہا ہوں اور وہ بھی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ ٹوباتھ کی مدد کا مطلب حکومت کی مدد کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور غصیلی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھا۔ ''لیکن مدد کے چکر میں اب خود پھنس گیا ہوں۔''

باپ کی بات سن کر وکی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے باپ کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ٹوباتھ کی مدد میں فائدہ نظر آیا ہوگا، تبھی انہیں سوار کرلیا۔ لیکن خود کیپٹن ولیم کی بھی یہی سوچ تھی مگر مسافر کی موت کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔

''ویسے میری نظر میں یہ شرم ناک بات تھی کہ دورانِ سفر انتقال کرجانے والے معزز شہری اور اعلیٰ امریکی عہدیدار کی لاش کی یوں بے توقیری ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وکی نے کیپٹن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ''یہاں تو ان کی لاش کا مذاق بنا ہوا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔'' یہ سن کر کیپٹن نے کہا۔ ''مگر جو کچھ ہوا، وہ اُس کی بیوی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ تو کلاؤ سے چلتے ہی میرے لیے عذابِ جان بن گئی تھی۔ ہر وقت بک بک، ہر بات میں کیڑے نکالنا، تنگ آگیا تھا میں اس سے۔ اسی لیے اسے اوپری عرشے پر ٹھہرا دیا تھا۔''

''مگر ان کی موت کیسے ہوئی؟'' وکی نے پوچھا۔

''ہم تین ہفتے پہلے کلاؤ سے نکلے تھے، وہ وہیں پر بخار میں مبتلا تھے۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''راستے میں ان کی طبیعت مزید خراب ہوگئی اور وہ چل بسے۔ میں لاش کو کینوس میں لپیٹ کر سمندر بُرد کرنے والا تھا لیکن اس کا اصرار تھا کہ اس کے شوہر کی لاش کو محفوظ کروں اور کسی طرح جلد سے جلد سڈنی پہنچا دوں، جہاں اس کی مہذبانہ انداز میں تدفین کی جاسکے۔ اسی لیے میں نے خاموشی سے لاش کو نمک کے ڈھیر میں دبا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے سوا لاش کو محفوظ کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''تو یہ بات تھی۔'' وکی نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب تو اسے حُسنِ اتفاق ہی کہیں گے کہ مال بردار جہاز پر ایک معزز امریکی افسر کی لاش بھی لدی ہوئی تھی۔'' وکی نے خودکلامی کی۔ بیٹے کی بات سن کر کیپٹن کی ابرو پر ہلکی سی جنبش ہوئی۔

''مسز ٹوباتھ کہاں ہیں؟'' وکی نے کچھ دیر خاموشی کے بعد پوچھا۔

''سڈنی میں۔'' کیپٹن نے سادگی سے جواب دیا۔

''کیا...؟'' یہ سنتے ہی حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا

''تو آپ سڈنی ہو کر آرہے ہیں؟'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے کیپٹن کو دیکھا۔

''ہاں...'' کیپٹن نے مختصر سا جواب دیا۔

''تو پھر یہ...'' وکی نے لاش کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہی سوچ کر تو میں پریشان ہوں۔'' کیپٹن نے جواب دیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''سڈنی پہنچ کر مسز اپنا ٹوباتھ ساحل پر موجود سرکاری مہمان خانے میں منتقل ہوگئی تھی۔ میں خوش تھا کہ چلو جان چھوٹی۔ میں نے دو تین ملاحوں کو اس کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا تھا۔ دو دن بعد اس نے ایک شاندار تابوت اور کچھ لوگ اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ مسٹر ٹوباتھ کی میت انہیں دے دی جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ نمک کے ڈھیر سے لاش نکال لیں۔ کچھ دیر بعد وہ میت لے کر چلے گئے۔ میں نے خود دیکھا تھا کہ چادر میں لپٹی لاش تابوت میں رکھی تھی۔ دوسرے دن سڈنی میں ہی ان کی مہذبانہ انداز میں تدفین کردی گئی۔ سڈنی میں تو نمک فروخت نہیں کیا تھا۔ اسی لیے آج صبح یہاں نمک کی منتقلی کروا رہا تھا کہ یہ کمبخت...'' اس نے دانت پیستے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ایک منٹ۔'' وکی نے ہتھیلی سے اپنی پیشانی دباتے ہوئے کہا۔ ''آپ مسٹر ٹوباتھ کو پہچانتے تھے؟''

''بالکل پہچانتا تھا۔''

''تو یہ لاش انہی کی ہے؟''

یہ سن کر کیپٹن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایک بات سمجھ نہیں آرہی۔'' وکی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''اگر مسٹر ٹوباتھ کی لاش سڈنی بندرگاہ پر اتاری گئی اور پھر وہاں تدفین بھی ہوچکی تو اُن کی یہ لاش یہاں کیوں موجود ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ لاش ٹوباتھ کی ہے تو پھر جہاز پر سے تابوت میں جو لاش لے جائی گئی تھی، وہ کس کی تھی؟''

''میرے بچے... یہی سوال تو مجھے پریشان کیے جارہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کیپٹن نے نظریں اس پر مرکوز کردیں۔

''تو ڈیڈی آپ کو یقین ہے کہ اُس تابوت میں جو لاش لے جائی گئی، وہ مسٹر ٹوباتھ کی ہی تھی؟''

''اُس وقت تو سو فیصد یقین تھا۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ ''اُس یقین کی ٹھوس وجہ بھی ہے۔ جو لوگ لاش تابوت میں لے جارہے تھے، انہوں نے مجھ سے آکر پوچھا تھا کہ مرحوم کی کلائی پر جو بریسلٹ ہے، کیا اُسے اتارنا ہے؟'' یہ کہہ کر کیپٹن مڑا۔ ''یہ ٹھوس وجہ تھی یقین کرنے کی ورنہ انہیں کیسے یہ بات معلوم ہوسکتی تھی کہ لاش کی کلائی پہ بریسلٹ ہے؟''

''تو آپ نے اُن سے کیا کہا تھا؟'' وکی نے پوچھا۔

''دیکھو میرے سامنے اُس کی تدفین ہوئی تھی۔ لاش پرانی تھی، نمک میں خشک ہوچکی تھی۔ اس لیے کسی نے چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''ویسے بھی میں مطمئن تھا کہ اُس بڈھے کھوسٹ جوڑے سے جان چھوٹی۔ یہ تو اب پتا چلا ہے کہ اس تابوت میں لاش کسی اور کی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ ''اب یہ مشورہ مت دینا کہ میں سڈنی واپس جاؤں اور قبر کھود کر اس تابوت میں اصلی مسٹر ٹوباتھ کی لاش دفن کردوں۔'' صاف ظاہر تھا کہ کیپٹن کو صبح سے جس طرح کی صورتِ حال کا سامنا تھا، اس کے باعث اس کا لہجہ نہایت تلخ ہوچکا تھا۔ اب تو وہ اپنے اس بیٹے کی باتوں کو بھی بکواس سمجھ رہا تھا جس سے اس کی ملاقات دو برس بعد ہوئی تھی۔

''کیا آپ نے مسز ٹوباتھ سے یہ بات کہی تھی کہ وہ بند تابوت میں موجود لاش کو دفنانے سے پہلے کم از کم اس کی تصدیق تو کرلیں کہ آیا...''

''نہیں کہی تھی یہ بات اُس منحوس بڑھیا سے۔'' کیپٹن نے چڑ کر کہا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔''

''تو اب اس لاش کا کیا کریں گے؟''

''یہ ایک بار پھر دفن ہونے والی ہے۔'' کیپٹن نے تلخی سے کہا۔

''ایک بار پھر...'' وکی نے خودکلامی کی۔

''میں مذاق نہیں کررہا۔'' کیپٹن نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تابوت کا آرڈر دے دیا ہے اور وہ پہنچنے ہی والا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بندرگاہ کی طرف نظر دوڑائی۔ ''میں امریکا کے تجارتی ایجنٹ اور معزز شخصیت مسٹر ٹوباتھ سائلون کی لاش کو جزیرے پر نامعلوم ملاح کی حیثیت سے دفنانے جارہا ہوں اور پھر کبھی کوئی یہ بات نہیں جان پائے گا کہ مسٹر ٹوباتھ سڈنی میں دفن ہوئے تھے یا...'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر وکی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسٹر ٹوباتھ کی اس پُراسرار اور گمنام تدفین کے ساتھ ہی یہ راز بھی ہمیشہ کے لیے ایک راز ہی رہ جائے گا کہ سڈنی میں اس کے نام پر دفن کیے گئے تابوت میں کس کی لاش تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر بندرگاہ کی طرف دیکھا۔ وہاں کافی تعداد میں کشتیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک کشتی تیزی سے ان کے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ وہی کشتی تھی جو کیپٹن ولیم کے آرڈر پر تابوت لے کر پہنچ رہی تھی تاکہ لاش سے پیچھا چھڑانے کے لیے جلد از جلد اس کی تدفین کردی جائے۔

نوٹنگا کے مذہبی پیشوا کے حلیے، دعاؤں اور مذہبی باتوں کے باعث ملاحوں کا خوف بڑی حد تک دور ہوچکا تھا۔ انہوں نے نوٹنگا کے کہنے پر لاش کو نمک کے ڈھیر سے نکال کر قریب بچھی ترپال پر لٹا دیا تھا۔ مرحوم کے دونوں ہاتھ سینے پر دھرے تھے۔ گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ تابوت لانے والی کشتی کو دیکھ کر کیپٹن، بیٹے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تاکہ اسے اوپر لانے کے لیے انتظام کرواسکے۔

وکی آگے بڑھا۔ کورو اور نوٹنگا لاش کے پاس کھڑے تھے۔ نوٹنگا آنکھیں بند کیے بہ دستور منہ ہی میں منہ میں کچھ کلمات بدبدا رہا تھا۔ وہ لاش کو دیکھنا چاہتا تھا جیسے ہی اس کی پہلی نظر پڑی، اس کے جسم میں خوف کی سرسراہٹ دوڑ گئی۔ کئی ہفتوں تک نمک میں دبے رہنے کے باعث لاش کسی حد تک سوکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ نمک میں دبے رہنے کے بعد لاش بہت خوفناک ہوچکی تھی۔ اس وقت مرحوم ٹوباتھ کسی خوف ناک بھوت سے کسی صورت کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وکی سمجھ گیا کہ قلی کیوں خوف زدہ تھے۔ اگر وہ بھی حقیقت جانے بغیر یہ لاش دیکھ لیتا تو وہ ان سے کسی طور کم خوف زدہ ہرگز نہیں ہوتا۔

تابوت اوپر پہنچ چکا تھا۔ کیپٹن ولیم ترپال کا ایک نیا ٹکڑا لے آیا۔ لاش کو اس میں لپیٹ کر تابوت میں رکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھٹیا سے تابوت کے اوپری ڈھکن میں کیلیں ٹھونک کر اسے بند کردیا گیا۔ اس کے بعد نوٹنگا نے دعا کروائی اور پھر جہاز کو پاک کرنے کے لیے ادھر اُدھر مقدس پانی کے چھینٹے مارے۔ تابوت لانے والوں نے بڑی آسانی سے اسے اٹھایا اور پھر رسے سے باندھ کر نیچے کھڑی کشتی میں اتارنے لگے۔ وکی عرشے پر کھڑا تابوت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ قلی بھی وہیں کھڑے تھے۔ اب ان کے چہرے کسی حد تک مطمئن نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد تابوت لے جانے والی کشتی سب کی نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی۔ کیپٹن ولیم کے حکم پر ملاح نوٹنگا کو لے کر جہاز کے نچلے حصے کی طرف چل دیے تاکہ وہ انہیں نمک میں دبی روح کے آسیب سے پاک کرسکے۔ وکی عرشے پر اکیلا کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور تنقیدی نظروں سے نمک کے بڑے سے ڈھیر کا جائزہ لینے لگا۔

جہاں سے ٹوباتھ کی لاش ملی، وہ مقام سامان کی منتقلی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وکی نہایت گہری نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں کئی بیلچے تھے۔ اس نے ایک بیلچہ اٹھایا اور نمک کے ڈھیر میں مارا۔ اس نے کئی بار اِدھر سے اُدھر بیلچہ چلایا مگر اسے ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا جس سے لگے کہ اس ڈھیر میں دوسری لاش بھی ہوسکتی ہے۔ البتہ ڈھیر کی اوپری سطح سے نمک تیزی سے نیچے کی طرف پھسل کر گرنے لگا تھا۔ وکی نے بیلچہ رکھ دیا اور فرش کا جائزہ لینے لگا۔

ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا جہاز کے عرشے کا وہ فرش بالکل صاف ستھرا تھا۔ بہ ظاہر وہاں اسے ایسا کوئی معمولی سا دھبا بھی نظر نہیں آیا، جس سے شک ہو کہ وہاں پر کسی شخص کو قتل کیا گیا ہو۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ اس کے باوجود وہ فرش پر بیٹھ کر تنقیدی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ''شاید ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ نوٹنگا بھی اپنا کام ختم کرنے والا ہوگا۔

مسٹر ٹوباتھ کا تابوت چلے جانے کے لگ بھگ گھنٹا بھر بعد وہ سب واپس جانے والے تھے۔ اُس وقت نوٹنگا بہ طور مذہبی پیشوا اپنی الوداعی تقریر کررہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر قلیوں کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ جہاز ہر قسم کی بدروح سے پاک ہوچکا ہے۔ وکی نے محسوس کیا کہ قلیوں کے چہرے پر کچھ اطمینان نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

''بڑی مشکل میں ہوں۔'' دوسرے دن صبح کے دس بج رہے تھے، جب ایک بار پھر کیپٹن ولیم، کورو کے گھر پہنچا۔ اس وقت کورو بھی وکی کے ساتھ پورچ میں موجود تھا۔ اس نے کورو کو دیکھتے ہی پریشانی کے عالم میں کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا۔ ''تم جوتے اتار کر اندر آؤ، پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرسکتے ہیں۔''

''نہیں نہیں، آپ بیٹھیں، یہیں بات کرتے ہیں۔'' کیپٹن نے کہا اور کرسی کی طرف بڑھا۔ اس وقت وکی زمین پر رکھی ایک بڑی سی ٹرے میں نمک کی ایک چھوٹی سی ڈھیری بنا کر، اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نمک وہ جہاز سے واپسی پر ایک تھیلے میں بھر کر ساتھ لایا تھا۔ ''اور تم کیا کررہے ہو اس آسیبی نمک کے ساتھ؟'' کیپٹن نے بیٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہ دستور نمک پر نظریں گڑائے بیٹھا تھا۔

''بہت پریشان کیا ہے اس منحوس بڈھے کی لاش نے۔'' کیپٹن، کورو کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہی اسے اپنا نیا دُکھڑا سنانے لگا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ مذہبی رسومات کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا مگر کچھ نہیں ہوا۔ وہ اب بھی نمک

اتارنے سے انکاری ہیں۔ کہتے ہیں کہ نمک آسیب زدہ ہے۔ وہ اس کے قریب ہی نہیں جا رہے۔ کچھ تو یہاں تک بکواس کر رہے ہیں کہ پورا جہاز ہی آسیب زدہ ہو گیا ہے۔ مرنے والے کی روح آسیب بن کر اِدھر اُدھر گھوم رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور نہایت زہر آلود لہجے میں کہنے لگا۔ ''ان کم بختوں کو جہاز سے خوف آ رہا ہے، نمک اتارنے میں انہیں آسیب کا خطرہ ہے لیکن میرا راشن ٹھونستے ہوئے انہیں کوئی ڈر نہیں لگتا... حرام خور کہیں کے۔'' وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ ''کچھ کیجیے، ان کی وجہ سے میرا بہت نقصان ہو سکتا ہے۔'' اس نے کورو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اِدھر کیپٹن ولیم اپنے سابق سسر سے باتیں کر رہا تھا، اُدھر دوسری طرف وکی بہ دستور نمک کی ڈھیری پر نظریں گڑائے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے چوکور ٹکڑے کو اہرام کی شکل میں بنائی گئی ڈھیری کی تہ میں دبا دیا تھا۔ دانے دار نمک کی ڈھیری آہستہ آہستہ ٹرے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ آخر سارا نمک ٹرے میں پھیل گیا اور نمک کے بیچ سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا چوکور ٹکڑا جھلکنے لگا۔ وکی نے ایک بار پھر اس ٹکڑے کو نیچے رکھا اور دوبارہ اس پر نمک کی ڈھیری بنانے لگا۔ کورو سے گفتگو کے دوران کیپٹن ولیم نے کئی بار گردن موڑ کر بیٹے کو دیکھا مگر سمجھ نہیں پایا کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے۔ ایک بار پھر سارا نمک ٹرے میں پھیل گیا اور تہ میں چھپا چوکور ٹکڑا نمودار ہو گیا۔

''سڈنی میں مسٹر ٹوباتھ کی لاش لے جانے والوں نے بریسلٹ کے متعلق کیا کہا تھا؟'' کورو گھر کے اندر چائے لینے گیا تھا۔ تب وکی نے نمک کی ڈھیری سے نظریں اٹھا کر باپ کو دیکھا اور پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' کیپٹن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ لوگ نمک کے ڈھیر کو کھود کر صرف یہ دیکھنے کے لیے آئے تھے کہ لاش نے کیا کچھ پہنا ہوا تھا اور کہیں وہ نمک کے ڈھیر میں تو نہیں گر گیا۔'' اس کے لہجے میں پوشیدہ ناگواری صاف جھلک رہی تھی۔

''اگر آپ اس بارے میں کچھ یاد کر کے بتا سکیں تو مناسب ہوگا۔'' وکی نے باپ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار نظر آ رہا تھا۔

''تم سمجھتے ہو کہ اُس وقت مجھے صرف یہی ایک کام تھا جو یہ بات یاد رکھتا کہ لاش نے بریسلٹ کس طرح کا پہنا ہوا تھا۔'' وہ بہ دستور تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''ویسے بھی جب وہ لاش لے جا رہے تھے تو میں نے جان بوجھ کر اُسے نہیں دیکھا۔ میں اس لاش کو اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ مزید دیکھنے کے تصور سے ہی اُبکائی آتی تھی۔''

''مگر وہ بریسلٹ...'' وکی نے مداخلت کی۔

''بریسلٹ۔'' کیپٹن نے دہرایا اور کچھ سوچنے لگا۔ وکی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''ہاں یاد آیا۔ اُن میں سے ایک شخص کہہ رہا تھا کہ وہ بریسلٹ سلور رنگ کا تھا لیکن دوسرا کہہ رہا تھا کہ نہیں سنہری جیسا یا شاید سیاہ مائل تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور وکی کو دیکھنے لگا۔ ''میں نے یہ سنا تو سہی مگر اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اس لیے ان سے اس بارے میں کوئی بحث نہیں کی۔''

''حیرت ہے۔'' وکی نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ سونے یا چاندی کا تھا تو بہت قیمتی ہوگا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ انہوں نے ایک لاش کی کلائی میں قیمتی بریسلٹ دیکھا مگر اسے چوری کرنے کے بجائے اس کا انکشاف کرتے رہے۔ ان سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ سڈنی کے لوگ تو اپنی بے ایمانی، مجرمانہ سرگرمیوں اور چوری چکاری کی خاندانی تاریخ رکھتے ہیں۔''

''اے لڑکے...'' کیپٹن نے بیٹے کو پکارا۔ ''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں کہ سڈنی والے ایسے ہی ہیں مگر مرنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ جب زندہ تھا تو لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ یہ بات وہ بھی جان چکے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے وہ ٹوباتھ کی لاش کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے، ورنہ کوئی اور خاص بات نہیں تھی۔''

''کیا وہ زیورات وغیرہ پہنتا تھا؟'' وکی نے پوچھا۔

''میرے خیال میں تو شاید نہیں۔'' کیپٹن نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے میں نے اسے کبھی بریسلٹ وغیرہ پہنے نہیں دیکھا تھا، البتہ اس کی ٹائی پن سونے کی تھی اور اس کے بیچ ننھا سا ہیرا جڑا تھا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جب اس کا انتقال ہوا، تب وہ ٹائی پن نہیں لگایا ہوا تھا۔''

''تو کیا موت کے وقت آپ اس کے پاس تھے؟'' وکی نے سوال کیا۔

''بدقسمتی سے ہاں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''صرف میں ہی نہیں، موت کے وقت اس کی بیوی بھی بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پورچ کی چھت کو گھورنے لگا۔ ''جب ٹوباتھ نے آخری سانس لی تو میں نے اپنے چند آدمیوں کو ترپال لینے بھیجا تا کہ اس میں لپیٹ کر لاش سمندر میں بہا دوں مگر اس کی بیوہ نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اگر وہ شور نہ مچاتی تو یہ مسئلہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اسی کے زور دینے پر میں نے مسٹر ٹوباتھ کے کپڑے اتار کر انہیں گاؤن پہنایا اور لاش کو نمک کے ڈھیر میں دبا دیا جہاں تم بھی اسے دیکھ چکے ہو۔''

وکی کی نظریں نمک کی ڈھیری پر مرکوز تھیں۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر اس نے سر اٹھا کر کیپٹن کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم یہ سوچ سکتے ہو کہ نمک کے ڈھیر میں دو لاشیں تھیں۔ ایک تم نے دبائی اور دوسری لاش اس وقت دبائی گئی، جب جہاز پر نمک لادا جا رہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''یا پھر لد چکا تھا۔''

''نمک میرے آدمیوں کی نظروں کے سامنے کلاؤ بندرگاہ پر لادا گیا تھا۔'' اس نے یقینی لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کلاؤ کی بندرگاہ پر جب نمک لادا جا چکا تھا، تب اس ڈھیر میں کسی نے خفیہ طور پر ایک لاش دبا دی تھی۔'' وکی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''او کے۔'' بیٹے کی بات سن کر کیپٹن کے منہ سے نکلا۔ ''سنو... مجھے یاد آیا، جب جہاز پر نمک لادا جا رہا تھا، تب ایک آدمی ایسا تھا جو دن میں بھی کام کرتا تھا اور رات کو بھی اوور ٹائم لگاتا تھا۔ رات کو تو وہ عرشے پر تنہا ہوتا تھا۔ میں نے ایک دو بار اسے دیکھا۔ وہ تندہی سے نمک کو درست طریقے سے رکھنے میں مصروف تھا۔ ممکن ہے کہ وہی...''

''تو آپ کے خیال میں جب جہاز کلاؤ سے چلا تو اس وقت نمک کے بہت بڑے ڈھیر میں ایک لاش موجود تھی جو کسی حادثے کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے یا پھر سوچی سمجھی سازش۔''

''ایسا ممکن ہے۔'' کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اب اسے بیٹے کے دلائل میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ ''اکثر ملاح شراب کے نشے میں دھت ہو کر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ ویسے وہ اجنبی بھی رات کو کام کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی ملاح نے اسے غصے میں آ کر قتل کر دیا ہو۔ ممکن ہے کہ سڈنی کے ساحل پر جو لاش اتاری گئی، وہ اسی کی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور بیٹے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ''اے سنو... کلاؤ سے چلتے وقت میرے عملے کا ایک آدمی کم تھا۔ یہ بات ہمیں دو دن بعد پتا چلی تھی۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے اچانک یہ بات اُسے یاد آ گئی ہو۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری لاش اُسی کی ہو۔'' وکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے جہاں تک بریسلٹ کی بات ہے تو عام طور پر جہازی مزدور اور قلی اس قسم کی چیزیں نہیں پہنتے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ وہ ضرور کسی چمک دار دھات کا بنا ہوگا۔ لاش نکالتے وقت وہ سورج کی روشنی سے چمکا ہوگا، تبھی اُن کی نظروں میں آیا ہوگا۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''ویسے جب وہ مجھ سے بریسلٹ کے بارے میں کہنے آئے تھے، تب میں نے انہیں ڈانٹ کر کہا تھا کہ سب کچھ دفع کرو، لاش اٹھاؤ اور جلدی سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''ویسے مردوں کا کلائی میں اس طرح کی چیزیں پہننا تو خاصا پرانا فیشن ہو گیا ہے، اب تو شاذ ہی کوئی مرد بریسلٹ پہنتا ہو۔'' وکی نے کہا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے بھی ٹرے میں موجود نمک کی ڈھیری پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ دانے دار نمک آہستہ آہستہ ٹرے میں پھیلتا جا رہا تھا۔ ''اس بارے میں میری ایک تجویز ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سر اوپر کیا اور بات مکمل کر کے کیپٹن کو دیکھنے لگا۔

''وہ کیا؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''اگر میں کہوں کہ جہاز پر دوبارہ جانا...''

''تم جب بھی میرے جہاز پر آؤ گے، مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔'' کیپٹن نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور جھٹ سے بول اٹھا۔ یہ سن کر وکی خاموش رہا۔ ''کیا خیال ہے ابھی چلیں جہاز پر؟'' کوئی جواب نہ پا کر کیپٹن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد وکی سے پوچھا۔

''چلیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ٹرے میں سارا نمک پھیل چکا تھا۔ لکڑی کا ٹکڑا ایک بار پھر نمک کے بیچوں بیچ دکھائی دینے لگا تھا۔

جہاز کے عرشے پر سب کچھ کل جیسا ہی تھا، کچھ نہیں بدلا تھا۔ بس ایک فرق تھا، کل نمک کے پہاڑ نما ڈھیر میں ایک لاش موجود تھی مگر اب وہ منوں مٹی تلے دفن ہو چکی تھی۔ باقی کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ نمک کے اُس ڈھیر سے کچھ فاصلے پر بچھے ترپال کے ٹکڑے پر منیلا کے قلی بیٹھے اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی نظر جب کیپٹن کے ساتھ آنے والے اجنبی نوجوان پر پڑی تو وہ سب خاموش ہو گئے۔ اُن میں سے کئی قلی اُسے پہچان گئے۔ وہ کل بھی اسے دیکھ چکے تھے۔ کئی ایسے تھے جو اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کسی کے علم میں نہیں تھا کہ کیپٹن ولیم کے ساتھ آنے والا نوجوان اس کا بیٹا تھا، جو باپ کو مشکل سے نکالنے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کر رہا ہے۔

وکی ان قلیوں کے پاس جا کر گھٹنوں کے بل لکڑی کے

فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ان سے پرتگیزی زبان میں بات کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر وہ سب ہونقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھے جارہے تھے۔

اُن سے گفتگو میں ناکام ہونے پر وہ کھڑا ہوا اور کیپٹن سے کہنے لگا۔ ''ان سے کہو کہ یہاں نمک کے ڈھیر کے نیچے کچھ دبا ہوا ہے، جو اسے نکال کر لائے گا، اسے سونے کا سکہ انعام میں ملے گا۔'' اس نے قلیوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ایک اور لاش تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہو؟'' کیپٹن نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''نہیں، یہاں ایک تھیلا اور زنجیر دبی ہوئی ہے۔'' اس نے ڈھیر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ وکی کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

''اور جو وہ تھیلا ڈھونڈ کر نکال لائے گا، اُسے میں سونے کا سکہ انعام میں دوں گا۔'' کیپٹن نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

وکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہارے خیال میں کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں، جتنا تم سمجھ رہے ہو؟'' اُس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ طنز اور غصہ صاف نظر آرہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ سونے کے ایک سکے کے بدلے جو کچھ ملے گا، وہ آپ کے لیے بہت قیمتی ہوگا۔'' وکی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

کیپٹن نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور سامنے دیکھا۔ قلیوں کا سپروائزر کھڑا تھا۔ بوریوں میں نمک بھروانے کی ذمے داری اس کی تھی۔ وہ بھی کام نہ ہونے کی وجہ سے پریشان نظر آرہا تھا۔ کیپٹن نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور پھر وکی کی بات دُہرادی۔

''میں ابھی انہیں کہتا ہوں۔'' سپروائزر نے کہا اور تیزی سے قلیوں کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس کی بات ختم ہوئی، ترپال پر بیٹھے قلیوں نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سب حرکت میں آگئے۔ کچھ ہی دیر میں عرشے پر لگا نمک کا بڑا سا ڈھیر بوریوں میں بھر بھر کر ریکنگ کے ساتھ ترتیب سے رکھا جارہا تھا۔ تمام قلی نہایت جوش سے کام کررہے تھے۔ سونے کا ایک سکہ انعام میں ملنے کی آس نے ان کے تمام وسوسوں، خوف اور خود ساختہ آسیب کو دور بھگا دیا تھا۔ مزدور جتنی تیزی سے ہاتھ چلا رہے تھے، اسے دیکھ کر وکی کو یقین ہوگیا کہ سونے کا ایک سکہ اُن کے لیے کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہوگا۔ نمک کو بوریوں میں بھرتا دیکھ کر کیپٹن ولیم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ دونوں باپ بیٹا عرشے پر کرسی ڈالے بیٹھے قلیوں کو کام کرتا دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت کیپٹن کے ماتھے کی ہر شکن غائب ہوچکی تھی۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ انعام کے لالچ میں قلی دوپہر کا کھانا بھی بھول چکے تھے۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ انعام اسی کو ملے۔ پانچ گھنٹے کے اندر اندر تقریباً سارا نمک بوریوں میں بھر چکا تھا۔ ریکنگ کے ساتھ ساتھ دور دور تک صرف بوریاں رکھی نظر آرہی تھیں۔ کیپٹن ولیم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی البتہ وکی کا چہرہ بے تاثر تھا۔ کیپٹن خوش تھا کہ اس کے بیٹے کی عقلمندی کام آگئی۔ اب عرشے پر بہت تھوڑا نمک رہ گیا تھا اور پھر قلیوں کا شور گونجا۔ ''یہ مل گیا۔'' وہ خوشی کے مارے چلا رہے تھے۔

یہ سن کر کیپٹن نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آرہی تھی۔ ''آئیں۔'' وکی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں نمک والی جگہ پر پہنچنے لگے۔ عرشے پر اب نمک کی صرف ایک موٹی پرت ہی باقی رہ گئی تھی۔ کیپٹن اور وکی کو آتا دیکھ کر قلیوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ وہ ایک طرف ہوکر انہیں راستہ دے رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹا قریب پہنچے اور جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ مستطیل شکل کا ایک چمڑے کا بڑا سا تھیلا۔ گلابی مائل بھورے سمندری نمک میں بالکل صاف نظر آرہا تھا۔

''اسے باہر نکلوائیں۔'' وکی نے کچھ دیر تک بیگ کو بہ غور دیکھنے کے بعد کیپٹن سے کہا۔

''اوکے۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔ ''اسے باہر نکالو۔'' اس نے حکم دیا۔

کیپٹن کا حکم سنتے ہی سارے قلی بیلچے لے کر تھیلے کے اطراف سے نمک صاف کرنے لگے۔

جیسے ہی نمک صاف ہوا، تھیلے کے ساتھ ایک موٹی سے سفید زنجیر بھی نظر آئی۔ اس کا ایک سرا تھیلے میں جبکہ دوسرا لمبائی میں کافی آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر زنجیر کو پکڑ کر کھینچا جاتا تو تھیلا خود بخود نمک کے ڈھیر سے باہر نکل آتا۔

''زنجیر علیحدہ کرکے تھیلا کیبن میں پہنچا دو۔'' وکی نے سپروائزر کو حکم دیا۔ یہ سن کر کیپٹن نے بھی سپروائزر کی طرف دیکھا اور ہاں میں سر ہلا کر اسے اشارہ کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اب بیٹے کی ذہانت کا قائل ہوگیا تھا۔

اُس وقت وہاں موجود ہر شخص کی آنکھوں میں سوال تھے۔ ہر شخص یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ تھیلے میں کیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ کیپٹن اسے یہیں کھولے گا۔ کیپٹن بھی اُن کا تجسس









سمجھ گیا تھا مگر وکی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا اٹھوایا اور کیپٹن کے کمرے میں لے آیا۔ سارے لوگ واپس بھیج دیے گئے۔ اس نے کمرے کی کنڈی لگائی۔ تھیلا کمرے میں موجود بڑی سی میز کے بیچوں بیچ رکھا تھا۔ کیپٹن کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ اب کیپٹن کو محسوس ہورہا تھا کہ اس کا بیٹا زیادہ عقلمند ہے۔ اس کی عقلمندی کی وجہ سے ہی سارا نمک بوریوں میں بھرا گیا تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہ کر منتظر تھا کہ خود وکی کیا کہتا ہے۔ وہ دونوں گہری نظروں سے چرمی تھیلے کا جائزہ لے رہے تھے۔

''اس میں ایک نہیں، کئی تالے لگے ہوئے ہیں۔'' وکی نے نظریں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''انہیں توڑ دیتے ہیں۔'' کیپٹن نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں...'' وکی نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے یہاں سے لے کر جانا ہوگا۔ نیچے کشتی اتروادیں، ہم اسے لے کر چلتے ہیں۔'' کیپٹن جاننا چاہتا تھا کہ کہاں اور کیوں مگر وہ خاموش رہا۔ اسے اب اپنے بیٹے کی ذہانت پر پورا یقین آچکا تھا۔ کچھ دیر بعد تین چار قلی نیچے کھڑی کشتی میں رسّے کی مدد سے تھیلے کو اُتار رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد کشتی ساحل پر پہنچ گئی۔

''بہتر ہے کہ جہاں مناسب سمجھو، وہاں اس تھیلے کو لے جاکر کھول لو۔'' ساحل پر پہنچنے کے بعد وکی نے کیپٹن سے کہا۔ ''میرے خیال میں جہاز پر تھیلا کھولنا مناسب نہیں تھا، اسی لیے میں آپ کو ساتھ لے کر آیا۔ اب آپ کی مرضی، جو چاہیں وہ کریں۔''

''کیا مطلب...'' کیپٹن نے حیرانی سے کہا۔

''بہتر ہے کہ اسے اپنے گودام میں لے جاکر کھولیں۔'' وکی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میرا کام ختم ہوگیا۔'' یہ کہہ کر وکی چھلانگ مار کر کشتی سے اترا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت وکی کو اپنی مرحومہ ماں بہت یاد آرہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کے باپ کی وجہ سے اُس کی ماں کو کتنی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ اسے یاد کرتے کرتے سسکتی ہوئی مرگئی مگر کیپٹن تو دو سال کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ اس کا بچپن باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی طرح گزرا۔ وہ اپنے باپ کے بہت قریب نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے باپ کی مدد کی۔ اس لیے کہ وہ اُس وقت مشکل میں تھا۔ اس نے اپنے باپ کو درپیش دو مشکلات کا خاتمہ اپنی ذہانت سے کردیا تھا مگر وہ سمجھتا تھا کہ اب اس کا کام ختم ہوگیا ہے، اسی لیے وہ کیپٹن کو چھوڑ کر تنہا گھر جارہا تھا۔

کیپٹن ساحل پہ کھڑا وکی کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اس کے دل میں بیٹے کی محبت جاگی تھی۔ کیپٹن خالص دنیا دار بندہ تھا۔ اس کی زندگی میں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اُس وقت۔ وکی کو جاتا دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ بیٹے کو آواز دے کر روکنا چاہتا تھا مگر اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُسے روک سکے۔

وکی اس کی نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا مگر پھر بھی کیپٹن ساحل پہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے نم پلکوں کو

صاف کیا۔ ''اِدھر آؤ۔'' اس نے قریب موجود قلی کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ ''یہ تھیلا کشتی سے اتار کر میرے ساتھ لے کر چلو۔''

کچھ دیر بعد کیپٹن تھیلا لے کر اپنے گودام کی طرف جارہا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد کیپٹن ولیم اپنے بیٹے کو تلاش کرتا ہوا جزیرے کے قبرستان میں پہنچا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بچھی لکڑی کی بنچ پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔

''اے وکی۔'' کیپٹن اسے دیکھتے ہی چلایا۔

باپ کی آواز سن کر اس نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ ''آپ...'' اس نے حیران نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانتے ہو، اُس تھیلے میں کیا تھا؟'' کیپٹن نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''اندازہ ہے۔''

''اس میں سونے کی وہ پانچوں اینٹیں موجود تھیں جو چوری ہوگئی تھیں۔'' کیپٹن کا چہرہ خوشی سے تمتمارہا تھا۔ ''ہر اینٹ چار سیر وزنی تھی۔ میں تو بہت مشکل میں تھا کہ اب ڈلیوری لینے والوں کو کیا جواب دوں گا مگر تم نے مجھے بہت بڑی پریشانی سے بچالیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بھی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''یہ سب کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''ضرورت ہے۔'' کیپٹن نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہاری وجہ سے نہ صرف گمشدہ سونا ملا بلکہ نمک بھی آسانی سے گودام میں منتقل ہوگیا۔ تم نے میری دونوں مشکلیں آسانی سے حل کردیں۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کہنے لگا۔ ''مگر تمہیں یہ شک کیسے ہوا کہ...''

''شک نہیں، ایک مفروضا تھا جسے تجربے نے درست ثابت کیا اور مسئلہ حل ہوگیا۔''

''مگر کیسے؟ میں صرف یہی سوچ رہا ہوں۔'' کیپٹن نے کہا۔

''نمک میں چھپا خزانہ نمک نے ہی حل کیا۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں نے بہت آسانی سے پتا چلالیا تھا کہ نمک میں دو لاشیں ہی نہیں کچھ اور بھی دفن کیا گیا تھا۔ وہ ایسا کچھ تھا کہ جس کی وجہ سے مسٹر ٹوباتھ کی لاش مل جانے کے باوجود بھی نمک کا پہاڑ نما ڈھیر اپنی جگہ ٹھہر نہیں پارہا تھا۔''

''کیا...'' کیپٹن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''سادہ سی بات ہے۔'' وکی نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ کے جہاز سے سونا چوری ہوا۔ چور کا قتل ہوا، لاش نمک میں دبائی گئی، قاتل فرار ہوا... اور یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں عرشے پر ہی ہوا تھا، وہ بھی جہاز کی کلاؤ بندرگاہ سے روانگی سے صرف ایک دو روز پہلے۔'' یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ ''سونا اس وقت چوری کیا گیا تھا جب جہاز کلاؤ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تھا۔''

''یہ سب کچھ تم کیسے جانتے ہو؟'' کیپٹن نے حیرت سے کہا۔

''مفروضا...'' وکی نے مسکرا کر کہا۔

''مگر......'' کیپٹن نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''تم نے صرف ایک مفروضے کی بنیاد پر سونا کیسے تلاش کرلیا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''بتاتا ہوں۔'' وکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نمک کا ڈھیر اہرام کی شکل میں تھا اور اس کے اوپر سے دانے دار نمک نہایت غیر محسوس انداز میں نیچے کی طرف لڑھک رہا تھا۔ جب پہلی دفعہ میں نے اس پر توجہ دی تو میرا شک بہت جلد یقین میں بدلنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب تک اس ڈھیر کی تہ میں ایسا کچھ دفن ہے، جس کی وجہ سے ڈھیر اندر سے غیر مستحکم ہے۔ اسی لیے دانے دار نمک بہ دستور عرشے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ میں نے گھر آکر بار بار یہ تجربہ کیا۔ جب اس کی تہ سے لکڑی کا ٹکڑا نکل آتا تو ڈھیری پر سے نمک پھسلنا بند ہوجاتا۔ دوبارہ رکھنے پر وہ پھر پھسلنے لگتا، بس! اسی سادہ سی بات نے سمجھا دیا کہ اب بھی اُس ڈھیر کے اندر کوئی شے موجود ہے۔''

''تو وہ دوسری لاش، جو سڈنی پر اتاری گئی تھی؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''وہ کلاؤ کی بندرگاہ پر سونا چوری کرنے والے آپ کے ملازم کی تھی، جو آپ کے بقول واپسی پر غائب تھا۔''

''اُسے کس نے مارا ہوگا؟''

''پہلے صرف یہ بات بتائیں کہ روانگی سے کتنے دن پہلے ٹوباتھ جہاز پر سوار ہوا تھا؟'' وکی نے سوال کیا۔

''شاید تین دن پہلے۔ کسٹم افسر نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور بندرگاہ پر رہنے کا اچھا انتظام نہیں۔ اسی لیے میں نے اسے جہاز پر سوار کروالیا اور رہنے کے لیے پُرآسائش کیبن دے دیا۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔

''سونا چرانے والے نے ٹوباتھ کو متمول شخص جان کر اسے بیچنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی آمادگی ظاہر کی اور پھر اس نے یہ سونا خریدا نہیں، لوٹ لیا۔''

’’کیسے؟‘‘ کیپٹن نے قطع کلامی کی۔

’’چور نے نمک لادتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے سونا تہ میں چھپا کر اسے ایک زنجیر سے باندھ دیا تھا۔‘‘ وکی نے بتانا شروع کیا۔ ’’جب ٹوباتھ نے خریدنے سے پہلے اُسے دیکھنا چاہا تو اس چور نے جگہ بتادی۔ اس کے بعد ٹوباتھ نے روانگی سے ایک دو رات پہلے اسے عرشے پر بلوایا اور وہاں چور کی موت منتظر تھی۔ ٹوباتھ نے کلاؤ کے اُس مزدور کے ہاتھوں معاوضہ دے کر چور کو قتل کروادیا، جو رات کو کام کرتا تھا۔ لاش بھی اسی مزدور نے نمک میں دبائی تھی۔‘‘

’’تم قتل کی بات کس طرح کہہ سکتے ہو؟‘‘ کیپٹن نے قطع کلامی کی۔

’’اس لیے کہ ساگوان کی لکڑی سے بنے فرش پر کچھ ایسے دھبے ہیں جو خون کے ہیں مگر وہ اتنے دھندلا گئے ہیں کہ انہیں دیکھنا یا شناخت کرنا ممکن نہیں۔‘‘ وکی نے جواب دیا۔ ’’یہ وہی مقتول چور ہے جو اب سڈنی میں ٹوباتھ کے نام پر بنی قبر میں سو رہا ہے۔‘‘

’’اوہ میرے خدا...‘‘ کیپٹن نے سر تھام لیا۔

’’اور وہ بریسلٹ...‘‘ وکی نے کہنا شروع کیا۔ ’’وہ بریسلٹ نہیں، زنجیر کی کڑی تھی جو نمک کے ڈھیر میں کنارے پر جھلک رہی تھی۔ اسے وہ لوگ بریسلٹ سمجھے تھے مگر آپ کے ڈانٹنے پر انہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔‘‘

’’دیکھو، مجھے اب اس قصے میں کوئی دلچسپی نہیں۔‘‘ کیپٹن بیٹے کے انکشافات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کافی دیر خاموشی کے بعد اس نے منہ کھولا اور بیزاری سے کہا۔ ’’مجھے سونا واپس مل گیا۔ نمک گودام میں پہنچ گیا۔ لاشوں سے بھی جان چھوٹ گئی۔ اب لعنت بھیجو ان سب پر۔‘‘

’’ویسے ایک بات ہے۔‘‘ وکی نے رازداری سے کہا۔ ’’مسٹر ٹوباتھ امریکی تجارتی ایجنٹ نہیں، کوئی جعلساز تھا۔‘‘

’’یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟‘‘ کیپٹن نے اسے گھور کر دیکھا۔

’’اگر وہ واقعی کوئی اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہوتا تو اس کی بیوی لاش امریکا لے جانے کی ضد کرتی، اسے سڈنی میں دفن نہیں کرواتی۔‘‘ یہ کہہ کر وکی نے اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ’’اب وہ کچھ عرصہ امریکی عہدیدار کی بیوہ کے نام پر سڈنی میں گزارے گی اور لوگوں کی ہمدردیاں اور ممکن ہے اُن کا مال بھی ہتھیانے کی کوشش کرے گی۔ دونوں ہی جعلسازی میں برابر کے شریک تھے۔‘‘

’’چلو... صحیح جگہ پہنچ گئی وہ۔ سڈنی تو ہے ہی مجرموں کا گڑھ۔‘‘ کیپٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’اور چوری شدہ سامان بھی ٹھیک جگہ پہنچ گیا۔‘‘ وکی نے لقمہ دیا۔

’’ہاں... تمہارا مفروضہ بھی کمال کا ہے۔‘‘

’’نہیں تو سب کچھ تجربے سے سچ کر دکھاؤں۔‘‘

’’کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ اس نے ترنت جواب دیا۔ ’’جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہوا، وہ بھول جاؤ۔‘‘

’’مگر میرے ساتھ جو ہوا، اُسے بھلانا ممکن نہیں۔‘‘ وکی نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

یہ سن کر کیپٹن نے شرمندہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ’’میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ میساچوسٹس چلو۔‘‘ کیپٹن نے اچانک سنجیدہ لہجے میں بات شروع کردی۔ ’’تمہاری سوتیلی ماں اب تمہارا اور زیادہ خیال رکھے گی۔ تم مشنری کالج میں داخلہ لو اور اپنی تعلیم مکمل کرو۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ وکی نے تڑپ کر کہا۔ ’’آپ کی طرح مجھے بھی سمندر اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے کام سے خوش ہوں۔‘‘

’’جانتا ہوں۔ کورو نے مجھ سب کچھ بتادیا ہے۔‘‘ کیپٹن نے کہا۔ ’’تمہیں جہاز رانی پسند ہے تو پھر میرے جہاز پر آجاؤ، وہ تمہارا ہی تو ہے۔‘‘

’’ہرگز نہیں، مال برداری اور ماہی گیری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔‘‘

’’آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟‘‘ کیپٹن نے زچ ہو کر کہا۔

’’آپ... ڈیڈی، آپ۔‘‘

’’کیا...‘‘

’’جب مجھے آپ کی ضرورت تھی، اُس وقت آپ مجھ سے دور تھے۔‘‘ وکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’اب آپ جان چکے ہیں کہ آپ کو میری ضرورت ہے مگر نہیں...‘‘ یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی آنکھوں میں جھانکا۔ ’’مجھے اب آزادی کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور قبرستان کے بیچوں بیچ گزرنے والی پگڈنڈی پر چلتا ہوا باہر نکلنے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ کیپٹن کی آنکھیں نم تھیں۔

’’واقعی بہت دیر ہوگئی ہے۔‘‘ وکی کو نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر اس نے خود کلامی کی۔ لمحہ بھر میں وہ جہاز رانی ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میساچوسٹس میں اس کی دوسری بیوی اور تین سال کا بیٹا منتظر تھا۔ اب وہ ماضی کی غلطی کو ایک بار پھر دُہرانا نہیں چاہتا تھا۔



عمدہ سبق

سلیم انور

کائنات کے رمز کو پالینا اگرچہ بہت بڑا ہنر ہے مگر یہ کب ضروری ہے کہ ہر ایک کو اس سے واقفیت بھی ہو۔ دنیا کے تمام شاطروں میں ایک قدر تو لازمی مشترک ہوتی ہے اور... وہ ہے ان کا ٹھنڈا مزاج... جس کے ذریعے وہ اپنے مخالف کو ٹھنڈی مار، مار کر بازی اپنے حق میں پلٹ لیتے ہیں مگر وہ تو انتہائی گرم مزاج ثابت ہو رہی تھی... پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی چال نہ لڑکھڑاتی... جبکہ اسے منہ کے بل گرانے والا انتہائی مضحکہ خیز شخصیت کا مالک تھا مگر اسے کب اپنی پروا تھی۔

سیدھی انگلی سے ڈھیر سارا گھی نکالنے والا ایک شاطر فنکار

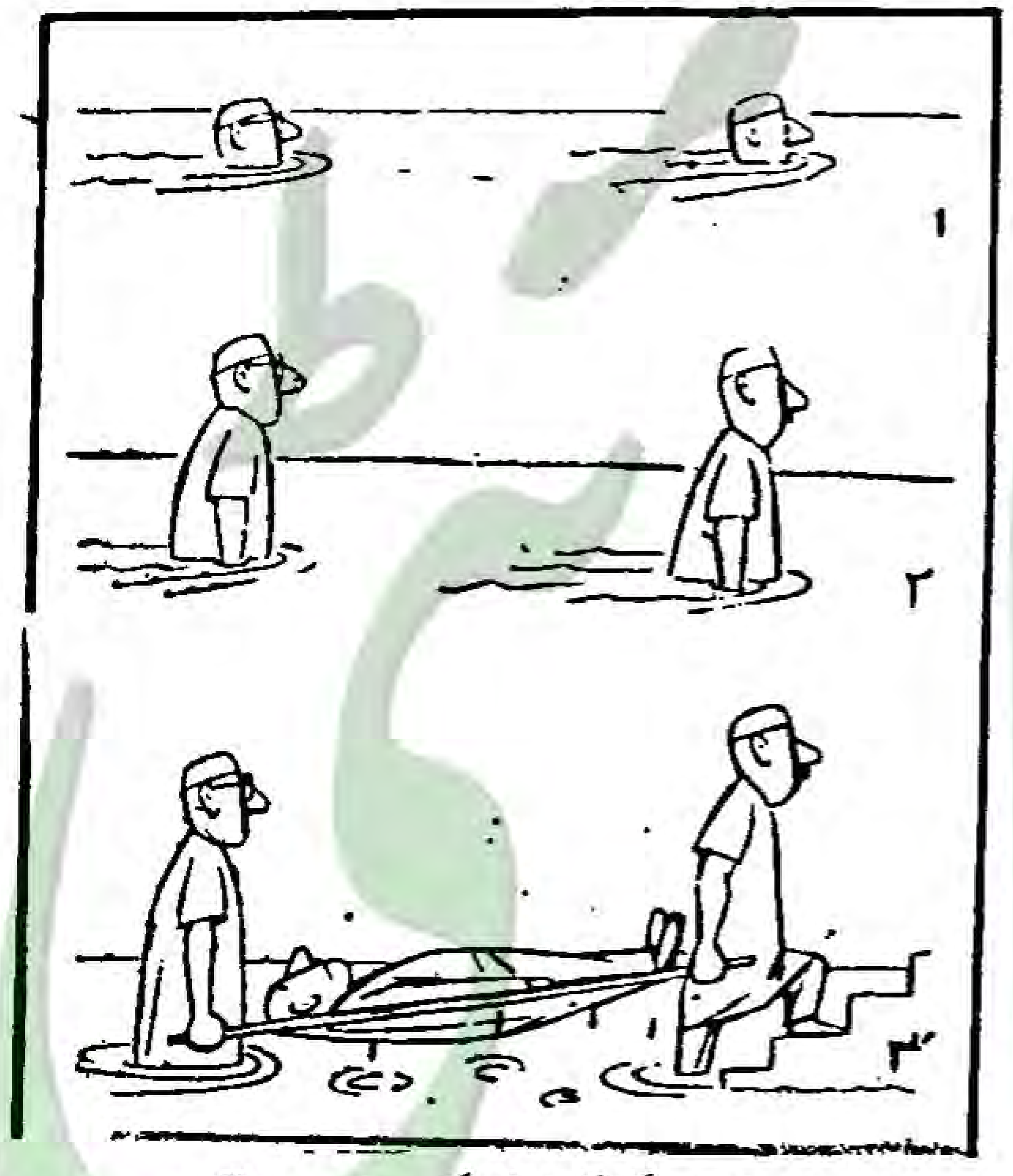
کرسٹی باہر نکلنے کے لیے ابھی بیرونی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اس کا بھائی بوبی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ بوبی کو دیکھتے ہی کرسٹی پریشان ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے کرسٹی نے سوچا کہ اسے کچھ شبہ ہوگیا ہے کیونکہ جن نظروں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا انہیں مشکوک ہی کہا جاسکتا تھا لیکن پھر کرسٹی نے اس خیال کو اپنے اعصابی دباؤ کا واہمہ سمجھ کر ذہن سے فوراً ہی جھٹک دیا۔

بوبی کو کسی طور یہ گمان نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اس رات

اپنے شوہر کو قتل کرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔
''کہیں جارہی ہو؟'' بوبی نے پوچھا۔
کرسٹی کا بے ساختہ یہ جواب دینے کو جی چاہا۔ ''بھلا میں اور کیوں دروازہ کھولنے جارہی تھی؟'' لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی زبان ہونٹوں تلے دبالی۔ وہ بوبی کو یہ نہیں بتاسکتی تھی کہ وہ کہاں جارہی ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی جھوٹ بولنا چاہ رہی تھی کہ جسے بعد میں یاد رکھنا پڑتا اور اگر اس کے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ اس کی بہن اپ سیٹ ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح ایک باوفا، گرویدہ، چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے دیر تک رک جائے گا اور اس کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔
یہ دو ہفتے پہلے کی بات تھی جب بوبی کہیں جاتے ہوئے کرسٹی کے پاس یہ بتانے کے لیے رکا تھا کہ اس کا شوہر رچرڈ اس کے ساتھ بے وفائی کررہا ہے۔ بوبی نے بتایا کہ رچرڈ دفتر میں دیر تک کام کرنے کے بارے میں مسلسل جھوٹ بول رہا ہے۔ کرسٹی نے پہلے تو بوبی کی بات پر یقین کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن جب بوبی نے یہ بتایا کہ اس لڑکی کو اس کے شوہر سے خود اس نے ہی متعارف کرایا تھا اور یہ کہ وہ دونوں ابتدا ہی سے ایک دوسرے سے باقاعدگی سے ملاقاتیں کر رہے ہیں تو پھر کرسٹی کے لیے اس کی بات ماننے سے انکار کرنا مشکل ہوگیا۔
اس بات کو مہینے ہوچکے تھے کہ اس کا شوہر رچرڈ ہفتے میں کئی راتوں کو دفتر میں دیر تک کام کیا کرتا تھا اور کئی بار تو نصف شب کے بعد گھر لوٹتا تھا۔ بوبی کے رچرڈ کی بے وفائی کے بارے میں بتانے سے پہلے کرسٹی کو رچرڈ پر ترس آیا کرتا تھا۔ وہ اس کے باس پر غصے کا اظہار تک کرچکی تھی کہ وہ کام کے معاملے میں رچرڈ کے معیار اور کمپنی کے لیے ہمہ تن انہماک اور یکسوئی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن بوبی نے کرسٹی کے ذہن میں شک کا ایک بیج بو دیا تھا۔
سو اگلی مرتبہ جب رچرڈ نے فون پر یہ بتایا کہ اسے دفتر میں دیر ہوجائے گی تو کرسٹی نے اس کا پسندیدہ ڈنر تیار کرنے اور اس کے دفتر پہنچانے کی پیشکش کردی۔
رچرڈ نے اعتراض کیا۔
کرسٹی اصرار کرتی رہی پھر ان کے درمیان خوب بحث رہی۔ رچرڈ کی ہچکچاہٹ اور اسے روکنے کی کوشش نے کہ وہ ڈنر تیار کرکے اس کے دفتر نہ لائے، کرسٹی کے شبہ کو مزید تقویت دے دی۔
اپنے بھائی بوبی کی حوصلہ افزائی پر بالآخر کرسٹی نے

اپنے شبہ سے ہار مان لی اور پھر ایک سہ پہر رچرڈ کے دفتر کی چھٹی کے معمول کے وقت سے ذرا پہلے کار ڈرائیو کرکے رچرڈ کو چیک کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی کار رچرڈ کے دفتر سے نزدیک ایسے مقام پر پارک کردی کہ جب وہ کام سے رخصت ہوکر باہر نکلے تو اس کی نگاہ میں رہے۔ البتہ خود اتنے فاصلے پر تھی کہ رچرڈ کی نگاہ اس کی کار پر نہ پڑسکے۔
رچرڈ اس رات قدرے دیر تک کام کرتا رہا کیونکہ چھٹی کے وقت وہ باہر نہیں نکلا تھا۔
کرسٹی اپنی کار میں بیٹھی اس کے دفتر سے نکلنے کا انتظار کرتی رہی۔
پھر سات بجے کے قریب رچرڈ اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ البتہ اس کا رخ اپنے گھر کی جانب نہیں تھا۔
کرسٹی نے اس کا پیچھا کرنے کی زحمت نہیں کی کیونکہ بوبی اسے اس لڑکی کے گھر کا پتا بتا چکا تھا جس سے رچرڈ معاشقہ لڑا رہا تھا۔ کرسٹی دس منٹ تک وہیں کار میں بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ پھر اس لڑکی کے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔ اسے پتا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ رچرڈ کی کار وہاں پہلے سے موجود تھی۔
کرسٹی نے اپنی کار فاصلے پر پارک کردی اور پیدل چلتے ہوئے اس مکان کے ڈرائیووے میں موجود رچرڈ کی کار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کھڑکی کے پاس جاپہنچی جس میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔
اس نے چھپ کر کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔
اس کا شوہر ایک کاؤچ پر تنہا بیٹھا ٹیلی وژن پر باسکٹ بال کا میچ دیکھ رہا تھا۔
کرسٹی وہاں سے پلٹ آئی۔ پھر وہ لگ بھگ ہر گھنٹے بعد اس گھر کے سامنے سے کار میں گزرتی رہی۔ جب گیارہ بج کر چند منٹ پر وہ اس گھر کے سامنے سے گزری تو اسے ڈرائیووے میں ایک اور کار کھڑی دکھائی دی۔
کرسٹی نے تھوڑی دور جاکر اپنی کار روک دی اور سڑک کے کنارے پارک کرنے کے بعد کار سے اتر کر پیدل اس مکان کی جانب چل پڑی۔ وہ دبے پاؤں اسی کھڑکی کے پاس جاپہنچی اور چوری چھپے اندر جھانکنے لگی۔
اس کا شوہر رچرڈ بدستور کاؤچ پر موجود تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ تنہا نہیں تھا اور نہ ہی ٹیلی وژن... دیکھ رہا تھا۔
اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا جب اس رات کرسٹی

نے اپنے شوہر رچرڈ کو اس کاؤچ پر بوبی کی آوارہ دوست کے ہمراہ گل چھرے اڑاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے کرسٹی عملی قدم اٹھانے کے انتظامات میں مصروف رہی تھی۔
اس نے اس معاملے میں نہ تو اپنے شوہر سے کوئی باز پرس کی تھی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ مڈبھیڑ سے گریز کررہی تھی کیونکہ اس طرح وہ سرپرائز برباد ہوجاتا جس کا منصوبہ اس نے اپنے شوہر کے لیے بنایا تھا۔ لیکن اس وقت بوبی دروازے میں اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اور اگر وہ فوری طور پر گھر سے نہ نکلتی تو اس شخص سے ملاقات کے طے شدہ وقت پر پہنچنے میں اسے دیر ہوسکتی تھی جس کی خدمات اس نے اپنے شوہر رچرڈ کو وہ سبق سکھانے کے لیے مستعار لی تھیں جسے وہ کبھی فراموش نہ کرپائے۔
اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بوبی پر چیخنا شروع کردے۔ اسے کھری کھری سنا ڈالے کہ وہ وبالِ جان، دخل اندازی کا عادی، احمق اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اگر وہ اس قسم کے شدید غصے کا اظہار کرتی تو وہ اسے یاد رکھ سکتا تھا۔ وہ اس سے یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ جب وہ اطراف میں موجود ہوتا ہے تو اسے اس سے کس حد تک نفرت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس بات کو بھی یاد رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بات بھی اس کے ذہن میں ایک خلش بنی رہتی۔ اس نے اپنے یہ جذبات کسی اور دن کے لیے بچا کر رکھ لیے۔
کرسٹی نے بوبی کو کچھ بھی کہنے سنانے کی جرأت نہیں کی کیونکہ اگر بعد میں پولیس اس کے رویے کے بارے میں بوبی سے پوچھ گچھ کرتی تو اسے یہ تمام باتیں یاد آسکتی تھیں۔
''بوبی، پلیز!'' کرسٹی نے یہ کہتے ہوئے بوبی کو ہلکا سا دھکا دیا تاکہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔
''رچرڈ آج کل پھر دیر سے گھر آرہا ہے، ہے نا؟'' بوبی نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا اور جس انداز سے اس نے یہ بات کہی تو یوں لگا جیسے اس کا مطلب ہو۔ ''میں تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتاچکا ہوں۔''
کرسٹی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سوال کا کیا جواب دے کہ بوبی کو کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔ وہ بولی۔ ''اس نے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ اسے دیر تک کام کرنا پڑے گا۔''
''جیسس کرسٹی! تم جانتی ہو کہ یہ ایک جھوٹ ہے۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ تم خود وہاں جاؤ اور ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑلو۔ اس معاملے کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔'' بوبی نے کہا۔



یہ اس بحث کے آغاز کا ایک عذر ہوتا تھا جو ہر رات بوبی اور اس کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب بوبی نے اسے رچرڈ کی چیٹنگ کے بارے میں بتایا تھا۔
اس وقت بھی اس موضوع پر بحث نے کرسٹی کو اس قدر اشتعال دلادیا کہ وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔ اس نے بوبی کو راستے سے دھکیلتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے اور بولی۔ ''میں آج شب یہ کام نہیں کرسکتی، بوبی۔''
اس نے اپنے لہجے میں بے پروائی کا عنصر نمایاں رکھا تھا تاکہ بوبی کو یہ بات لازمی یاد رہے کہ اس موقع پر اس کا رویہ کیسا رہا تھا۔
کرسٹی کا ہاتھ اپنی کار کے دروازے کے ہینڈل پر تھا جب اسے بوبی کی معذرت کے الفاظ سنائی دیے۔ لیکن اب قدرے دیر ہوچکی تھی۔ کرسٹی نے اپنی کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔ اس نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ بوبی بھی اپنی کار میں سوار ہورہا تھا۔
کرسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے یقین آگیا کہ جب وہ گھر لوٹے گی تو بوبی وہاں موجود نہیں ہوگا۔
بوبی سے پیچھا چھڑانے کے بعد کرسٹی بے مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی۔ وہ اپنے سیل فون پر کسی کال کی منتظر تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ فون کال اس سے مس تو نہیں ہوگئی؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے تابی میں اضافہ ہورہا تھا۔
اس وقت آٹھ بجنے والے تھے جب اسے وہ فون کال موصول ہوئی۔

کرسٹی نے اس شخص کا چہرہ تو نہیں دیکھا تھا مگر اس کی گمبھیر آواز سے اسے پہچان گئی۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ملاقات کے لیے جگہ کا انتخاب خود کرسٹی نے کیا تھا۔ وہ ایک گندے علاقے میں ایک چھوٹا سا غلیظ ٹھیا تھا جسے عام مزدوروں کا بار کہہ سکتے تھے اور چند ایک متشدد قسم کے لوگ اس کے باقاعدہ گاہکوں میں شامل تھے۔ وہ ان بدنصیبوں کی آماجگاہ تھی جو کسی پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ وہ دوسرے گاہکوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے میں مگن رہتے تھے۔

کرسٹی کو یقین تھا کہ یہاں اس کی آمد کو کوئی بھی یاد نہیں رکھے گا اور نہ ہی اسے یہاں اس قسم کی غلیظ جگہ پر اپنے کسی دوست سے مڈبھیڑ کا خدشہ تھا۔

نک عین اسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ موجود ہوگا۔ وہ کمرے کے آخر میں ایک بوتھ تھا جہاں روشنی بھی بے حد کم تھی۔ اس کے سامنے میز پر دو گلاس تھے جن میں مشروب موجود تھا۔ ان میں سے ایک گلاس کرسٹی کے لیے تھا۔

کرسٹی اس کے مقابل میز پر دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ یہ ہدایات کرسٹی نے پہلے ہی نک کو دے رکھی تھیں تاکہ وہاں پر موجود گاہکوں کی جانب اس کی پیٹھ رہے۔ وہ کسی قسم کا چانس نہیں لینا چاہتی تھی کہ کوئی اس کے چہرے کو یاد رکھ سکے۔

نک سے دوبدو ملاقات کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ نک کو دیکھ کر کرسٹی کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کہیں سے بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسے کہ پیشہ ور قاتل ہوتے ہیں۔ پستہ قد اور گول مٹول ہونے کے علاوہ اس کے چہرے کی رنگت سیاہ اور آنکھیں پژمردہ تھیں۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا، سستا اور فرسودہ تھا۔

اس سے قبل کہ کرسٹی کچھ کہتی، نک نے اس کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر سوال کھینچ مارا۔ ”میں تمہارے تاثرات سے دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہارے اعتماد پر پورا نہیں اترا ہوں، لیڈی اور دوسری جانب تم نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کے لیے میری خدمات مستعار لی ہیں۔ تم اس صورتِ حال میں کس طرح مفاہمت کرو گی؟“

کرسٹی کسی طور خود بھی نک جیسے ایک کمتر شخص سے اخلاقیات کے بارے میں بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی، لہٰذا اس نے موضوع بدلنے کو ترجیح دی۔

”میرا شوہر وہاں آٹھ بجے موجود ہوگا۔“ کرسٹی نے کہا۔

”کیا تم کچھ بھول نہیں رہی ہو؟“ نک نے کہا۔

کرسٹی نے اسے ایک دبیز سا لفافہ تھما دیا۔ نک نے لفافہ کھولا اور نوٹوں کی گڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ البتہ نوٹ گننے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ پھر اس نے نوٹوں کی گڈی واپس لفافے میں رکھ دی اور اپنے سامنے میز پر موجود گلاسوں میں سے ایک کرسٹی کی جانب بڑھا دیا۔

”میں نہیں پیوں گی۔“ کرسٹی نے اس گلاس کو منہ لگانے والے افراد کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ ساتھ ہی وہ گلاس واپس نک کی جانب کھسکا دیا۔

”تم زیادہ دوستانہ مزاج کی حامل نہیں ہو۔ ہے نا؟“ نک نے قدرے رکھائی سے کہا۔ اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے اس توقع پر دیدہ دلیری دکھائی تھی کہ شاید کرسٹی اس کی دوستی کی پیشکش کو قبول کر لے گی۔ لیکن کرسٹی کی بے اعتنائی کے سبب اس نے موضوع بدل لیا کیونکہ کرسٹی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”مجھے وہ پتا درکار ہے؟“

کرسٹی نے اپنے پرس میں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور میز پر نک کی جانب کھسکاتے ہوئے بولی۔ ”وہ گیارہ بجے کام سے گھر لوٹتی ہے لیکن وہ آٹھ بجے وہاں موجود ہوگا۔ اس وقت جب باسکٹ بال گیم کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ کبھی کوئی گیم مس نہیں کرتا۔“

کرسٹی بات کرتے کرتے رک گئی۔ اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ اپنی زندگی کے ایک ایسے باب کی بابت نک سے کیوں بات کر رہی تھی جس کا اسے علم نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں نک اس بات کو دوستی کی پیشکش سے تعبیر نہ کر لے۔

نک اپنی بے کیف، تاثرات سے عاری گہری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ کرسٹی کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ اسے گھورنے کے بجائے زبان سے کچھ کہہ دے۔

اور تب وہ بول پڑا۔

اس کی آواز پُرسکون اور جذبات سے عاری تھی جیسے کہ موسم کے بارے میں تبصرہ کر رہا ہو۔ ”وہ آج شب کے گیم کے آخری حصے کو دیکھنے سے محروم رہ جائے گا۔“

کرسٹی اسے اپنے مشروب کی چسکیاں لیتے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک سرد مزاج پستہ قد آدمی تھا جس کا چہرہ غیر دلکش اور بیزار کن تھا۔ پھر کرسٹی کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اس مجہول شخص کے سامنے اس گھٹیا شراب خانے میں کیوں بیٹھی

ہوئی ہے۔ اسے خود پر غصہ آگیا۔ جب وہ گویا ہوئی تو اپنی آواز کی شدت پر اسے خود بھی حیرانی ہوئی۔

”تم اسے فوراً یا آسانی سے مرنے نہیں دینا۔ اسے تکلیف میں بتلا کرنا۔ کیا سمجھے؟“

اس بات پر وہ مسکرادیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہلکا سا تمسخر تھا جیسے اس کے غصے پر وہ محظوظ ہوا ہو۔

”تو تم چاہتی ہو کہ میں اسے ایک سبق دوں؟ یہی بات ہے نا؟“

”اگر یہ کام میں خود کرسکتی تو خود ہی کرلیتی۔“ کرسٹی نے کہا۔

”تو پھر ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ تم وہاں آکر خود دیکھ لو کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟“ نک نے مشورہ دیا۔

رچرڈ کی دردناک موت اور رحم کی بھیک کا تصور کرسٹی کے لیے نہایت اطمینان کا باعث تھا لیکن ایک سفاکانہ خون آلودہ قتل کا منظر اسے قابلِ دید نہیں لگ رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”بس مجھے فون کرلینا جب تم ......“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ اسے قتل جیسے الفاظ منہ سے ادا کرتے ہوئے ایک بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔

نک نے دوسرا گلاس ہاتھ میں اٹھایا اور سیلیوٹ کرنے کے انداز میں اسے کرسٹی کی جانب کرتے ہوئے اپنے منہ سے لگایا اور پھر غٹاغٹ مشروب حلق میں اتارلیا۔ کرسٹی کو اس کی اس بدتہذیبی پر غصہ آگیا اور وہ اسے گھورنے لگی۔

نک کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تمسخرانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”اور تم بقیہ رقم وہاں لے کر آجانا۔“ اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اس بارے میں کسی قسم کی بحث کا خواہاں نہیں ہے۔

پھر اس نے کرسٹی سے کہا کہ وہ کہیں چلی جائے اور اس کی فون کال کا انتظار کرے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چند مڑے تڑے نوٹ میز پر ڈال دیے اور وہاں سے چلا گیا۔

کرسٹی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ان دونوں کو وہاں سے اکٹھے نکلتے ہوئے دیکھ لے اور بعد میں اسے شناخت کرلے۔ گو ایسا ممکن تو نہیں تھا لیکن احتیاط ضروری تھی۔ اس لیے وہ کوئی چانس نہیں لینا چاہتی تھی۔

وہ اپنے سیل فون پر پانچ منٹ تک کسی کال کا انتظار کرتی رہی پھر اٹھ کر اس گھٹیا بار سے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ ایک بار پھر اسی علاقے میں اپنی کار میں بے مقصد گھومتی رہی اور اپنے سیل فون کی گھنٹی بجنے کا بے تابی سے انتظار کررہی تھی۔ اسے بھروسا تھا کہ جب اگلی مرتبہ وہ نک کی آواز سنے گی تو وہ یقیناً رچرڈ، اس کے غصے اور اس کی بے باکی سے نجات حاصل کرچکی ہوگی ...... ماسوائے رچرڈ کی دولت کے۔

وہ بار بار اپنا سیل فون چیک کررہی تھی کہ وہ واقعی آن ہے یا نہیں۔ یا اس کی بیٹری تو ڈیڈ نہیں ہوگئی۔ یا اس نے اتفاقاً یا بے دھیانی میں سیل فون کے رنگر کو آف تو نہیں کردیا۔

بالآخر جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو بوکھلاہٹ کے عالم میں اس نے کار کا اسٹیئرنگ آنے والی لین کی جانب گھما دیا اور اس کی کار سامنے سے آتی ہوئی ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

یہ فون کال نک کی تھی جو اسے باقی رقم لانے کو کہہ رہا تھا۔ کرسٹی نے اس کے الفاظ پر دھیان نہیں دیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ بس گمبھیر آواز اس بات کا اشارہ تھی کہ رچرڈ کا کام تمام ہوگیا ہے لیکن یہ وقت جشن منانے کا نہیں تھا۔ ابھی اس قابلِ نفرت شخص کو اس کے گھٹیا فعل کی ادائیگی بھی کرنا تھی۔

وہ اب اس آخری ناخوش گوار فعل کو سرانجام دینے کے لیے بے چین تھی تاکہ اسے مکمل سکون مل جائے اور وہ اپنے انتقام سے بھرپور لطف اندوز ہوسکے۔

کرسٹی نے کار کا رخ رچرڈ کی گرل فرینڈ کے گھر کی جانب موڑ دیا۔

جب وہ وہاں پہنچی تو قدرے حواس باختہ تھی۔ اس نے اپنی کار سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کردی۔ مکان کے کچن کے عقبی دروازے کا رخ کرنے سے پہلے اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے تاکہ نک کے ساتھ ایک اور میٹنگ کے لیے خود کو تیار کرسکے اور اس منظر کا سامنا کرسکے جو اندر اس کی آمد کا منتظر تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ معمول کے قدموں سے چلتے ہوئے تاکہ کسی پڑوسی کو شک نہ ہو، مکان کے کچن کے عقبی دروازے پر پہنچ گئی اور دو مرتبہ دستک دی۔

☗ ☗ ☗

جب نک نے کچن کے دروازے پر دستک سنی تو اس نے کھڑکی سے چھپ کر جھانکا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ دستک دینے والی شخصیت کرسٹی کی ہے تب وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو کرسٹی تیزی سے اندر آگئی اور اس کے پاس سے گزرتے ہوئے یوں گھر کے اندر چلی گئی جیسے کوئی اس کا پیچھا کررہا ہو۔

اندرونی کمرے میں پہنچ کر وہ پلٹی تو یوں لگا جیسے وہ کوئی خوفزدہ بچی ہو۔ وہ بے چینی سے اپنا پرس گھما رہی تھی اور چور نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب نک نے بقیہ رقم کا مطالبہ کیا تو کرسٹی نے اپنے پرس میں سے ایک لفافہ نکالا اور اسے کچن کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

پھر بولی۔ ”میں لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

نک لفافہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو کرسٹی سمٹ کر ایک جانب ہوگئی۔ وہ اس کے نزدیک جانے سے ڈر رہی تھی۔

نک نے لفافہ کھول کر اس میں موجود نوٹوں کی گڈی کو پہلے کی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا، البتہ نوٹ گننے کی کوشش نہیں کی۔

پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اسے کھول کر اس میں موجود تھوڑا سا سیال مادہ کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر انڈیل دیا۔ پھر وہ دونوں ایک لمحے کے لیے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کرسٹی اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہے لیکن اسے ہچکچاہٹ سی محسوس ہورہی ہے۔

پھر جس وقت کرسٹی نے دروازے کی جانب دوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت تک دیر ہوچکی تھی۔ وہ زیادہ دور پہنچ نہیں پائی۔

نک نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کمر کے گرد لپٹاتے ہوئے اسے جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ میں موجود کپڑا اس کے منہ پر رکھ دیا۔

کرسٹی نے اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے چند لمحوں تک ہاتھ پیر مارے لیکن پھر کلوروفارم نے اسے مغلوب کردیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

نک نے کرسٹی کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا اور اسے لے کر بیڈروم کی جانب چل پڑا۔ اس نے بے ہوش کرسٹی کو بیڈ پر لٹا دیا اور پھر اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ پھر بیڈ کے کنارے موجود کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب کرسٹی نے کراہنا شروع کیا تو نک نے اٹھ کر کرسٹی کے چہرے پر طمانچے لگائے تاکہ اسے ہوش آجائے۔

کرسٹی نے چند مرتبہ آنکھیں جھپکائیں، پھر حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جب اس کے ذہن پر چھائی دھندلاہٹ چھٹ گئی اور اسے سب کچھ واضح دکھائی دینے لگا تو اس نے اپنے ہاتھ پیر میں بندھی رسّی سے خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کردی۔

لیکن پھر جب اس نے بیڈ پر اپنے برابر میں کسی اور کو بے حس و حرکت موجود پایا تو اچانک گھبرا کر پیچھے سمٹ گئی۔

نک اپنی گمبھیر آواز میں بولا۔ ”ہاں، یہ تمہارا شوہر ہے۔“

پھر وہ چند لمحے انتظار کرتا رہا تاکہ یہ بات واضح طور پر کرسٹی کے ذہن میں سما جائے کہ وہ واقعی اس کا شوہر ہے جو بیڈ پر اس کے برابر میں موجود ہے۔ قدرے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”اگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس کی سانسیں چل رہی ہیں۔ مجھے اس کو دو تین مرتبہ کلوفارم سنگھانا پڑا ہے۔ لیکن جہاں تک اسے قتل کرنے کی بات ہے تو میں بتادوں کہ میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔“

یہ سن کر کرسٹی نے خود کو آزاد کرانے کے لیے ایک بار پھر ہاتھ پیر چلانے شروع کردیے۔ نک اطمینان سے بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

بالآخر کرسٹی نے تھک کر خود ہی ہار مان لی اور ہاتھ پیر مارنا بند کردیے۔

”تم نے کئی ایک غلطیاں کی ہیں۔“ نک نے کہا۔ ”ایسی غلطیاں جن کی وجہ سے تم پکڑی جاسکتی تھیں۔ لہٰذا تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں نے تمہیں جیل جانے سے بچالیا اور تمہیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ میں خود کو بجلی کی کرسی پر پہنچانے کا خطرہ کیوں کرمول لیتا جبکہ میں کسی کو قتل کیے بغیر ہی تمہاری رقم اینٹھ سکتا تھا؟“

یہ کہہ کر نک اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے نکلنے لگا۔

لیکن پھر دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور پلٹ کر بولا۔ ”میری خواہش ہے کہ کاش میں اس وقت تک یہاں موجود ہوتا جب تمہارے شوہر کو ہوش آئے گا۔ اس لیے کہ اسے بے ہوش کرنے سے پیشتر میں نے اسے بتادیا تھا کہ تم نے اسے قتل کرانے کے لیے میری خدمات اجرت پر حاصل کی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں اسے ظرافت کا کوئی پہلو دکھائی دے گا اور پھر جب اس کی گرل فرینڈ اپنے گھر واپس آئے گی اور تم دونوں کو اپنے بیڈ پر یکجا دیکھے گی تو...... ویل مجھے امید ہے کہ اس صورت حال سے تم سب کو ایک عمدہ سبق سیکھنے کو مل جائے گا۔ گڈ بائی!“

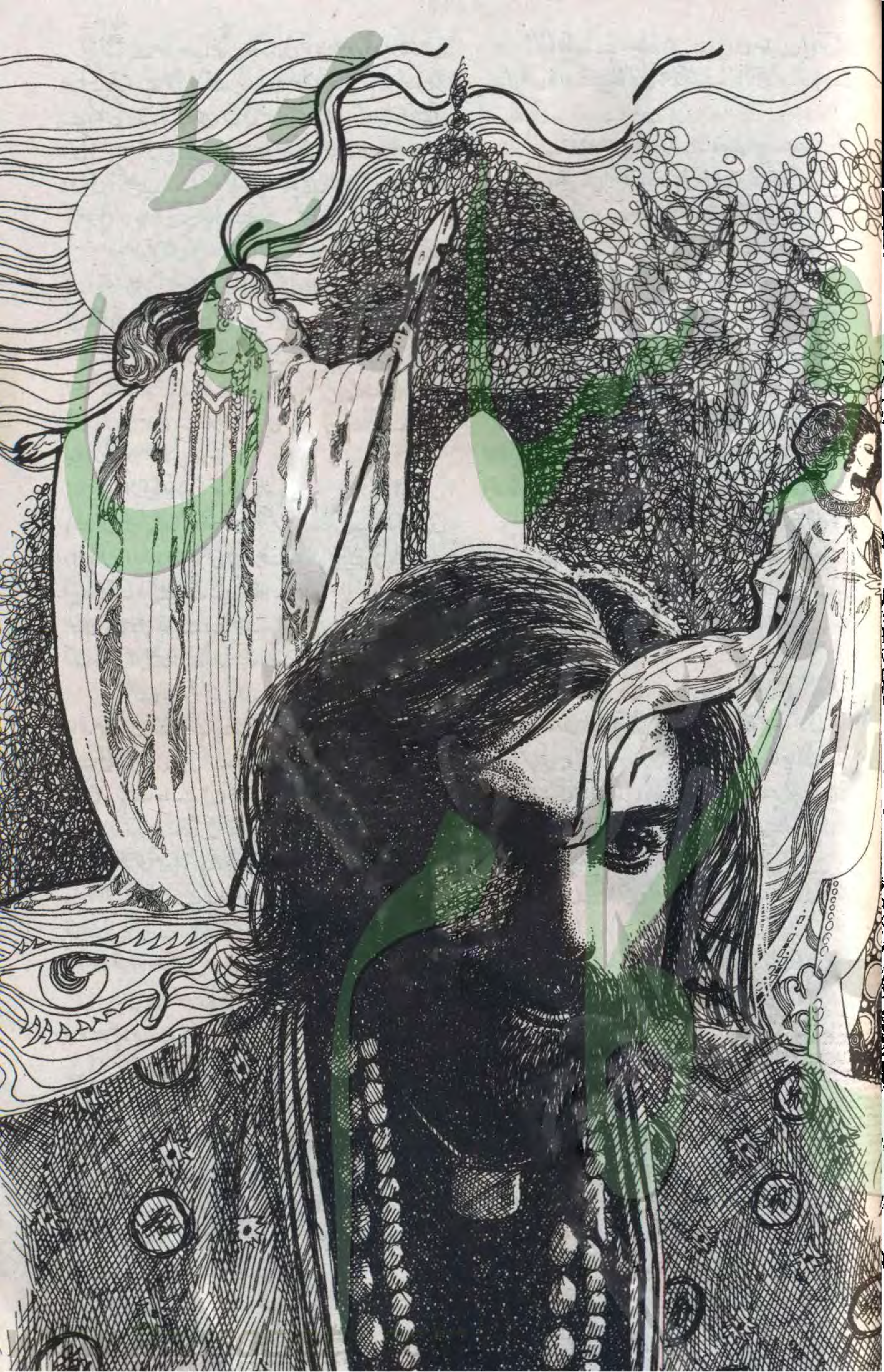
یہ کہہ کر نک، کرسٹی کو حیران اور ششدر چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔

در اور دروازہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جب زندگی اپنے مقصد اور مرکز سے ہٹ جائے تو کوئی خواب پورا نہیں ہوتا... اور جب یہ ادراک ہوجائے کہ زمین وآسمان کے درمیان فاصلہ ہمیشگی لیے ہوئے ہے تو بستی بستی صحرا صحرا ایک خلش کہیں بھی چین نہیں لینے دیتی... وہ جو حسن کا پیکر تھی... کتنے ہی دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں میں خواب کے مانند تھی... وہ جو اپنے بابل کے اونچے شملے کا مان تھی، جانے کیسے ایک فقیر سے آس لگا بیٹھی۔ وہ زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں کو تو ہنس کر سہ گئی مگر اس بار دل کو ایسا روگ لگا تھا جس نے تمام خواہشوں کو آزمائشوں میں بدل ڈالا۔ انسان خوش گمانی کی منزل پہ کھڑا ہو یا اداس راہوں میں گم ہو... اکثر تذبذب کا شکار ہوجاتا ہے... حتیٰ کہ زندگی "کیا کرے اور کیا نہ کرے" کی عملی تفسیر بن کر سود وزیاں سے بے نیاز ہوجاتی ہے۔ وہ بھی جب اپنے محبوب کے دل پر دستک دیتے دیتے ہار گئی تو اپنی اونچی پیشانی کو انتہائی عاجزی سے اس در پہ جھکا دیا، جہاں کوئی دل سے مانگے اور نامراد لوٹے، ایسا وہاں دستور نہیں... اور جب اس کی بکھری ہوئی زندگی بھی ایک مرکز پہ سمٹ گئی تو منزل بھی خود چل کر اس کے دروازے پر دستک دینے چلی آئی... اور بس یہی انہونی اس کی زندگی کا حاصل ٹھہری۔

جھرنوں کے مانند بہتے جذبات میں تلاطم برپا کردینے والی ایک ہنگامہ خیز داستان





سنا ہے مور جب خوش اور اپنی خوب صورتی پر نازاں ہوتا ہے تو اپنے خوش رنگ پروں کا گول چھاتا سا بنا کر ناچتا ہے، لیکن جب اپنے پیروں کی طرف سر جھکا کے دیکھتا ہے تو ان کی بدصورتی پر اس قدر رنجیدہ اور دل گرفتہ ہوجاتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور اس کی مادہ وہ آنسو پی کر سہاگن بن جاتی ہے۔

وہ مور تو نہیں تھی، نہ ہی اس کے پاؤں بدصورت تھے، بلکہ وہ تو سرتاپا حسن کا مکمل شاہکار تھی، ادائے حسن دل آرا کا پیکر، سیم تن اور گل بدن تھی وہ۔ لیکن...... باوصف اس کے وہ اپنے حسن و جمال میں کوئی ان دیکھی خامی کو بھی محسوس کرتی تھی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ یکتائے حسن اور بے عیب تھی، خامی شاید اس کی سوچ کے انداز میں تھی کہ وہ من کے بجائے تن کی بدصورتی کو ڈھونڈتی رہ جاتی۔

''اڑی سورٹھ! تو ہی کچھ بتا دے، آخر مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟'' وہ تنگ آکر اپنے قریب کھڑی اپنی رازداں اور خادمۂ خاص کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگتی۔ ''میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے گوٹھ کے کتنے ہی گبرو اور کڑیل جوان اپنا دل تھامے بے تاب رہتے ہیں، مگر ایک وہ ہے کہ......'' پھر جیسے اسے فوراً کچھ یاد آجاتا، کہتی......

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری امارت سے، میرے خاندان یا میرے باپ سے ڈرتا ہو؟'' پھر وہ خود ہی گویا اپنی بات کی توجیہہ بھی پیش کرنے لگتی۔ ''مگر وہ کیا! سب ہی اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں کہ میں کسی اتنے بڑے یا بھرے پرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی جو جدی پشتی زمینداری کرتا ہو، نہ ہی میرا باپ کوئی روایتی یا جابر قسم کا بارسوخ وڈیرا ہے، سبھی کو معلوم ہے کہ زمیندار حاجی خدا بخش کیا تھا، کون تھا اور اب کیا ہے۔ ایک معمولی سا ہاری اور کھیت مزدور ہی ہوا کرتا تھا وہ، سرکار کی طرف سے زمین کا ایک ٹکڑا ملا تھا اسے جس پر اس نے خود رہا کی (کھیت مزدوری) کرکے اسے سو سے چھ سو جریب تک پہنچا دیا۔ پھر میں اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی، ماں میری مرگئی، باپ اب بوڑھا ہوکے چارپائی سے جالگا، تیرا باپ سائین رکھیو بھی مرگیا تو تجھے ہم نے رکھ لیا۔ مرضی میری چلتی ہے اب، فیصلہ میرا ہے اپنی زندگی کرنے کا کہ میں چاہے کسی بادشاہ زاد کو اپنا جیون سفر سونپ دوں، چاہے کسی غریب ہاری (کسان) کو اپنی تقدیر کا مالک بنا لوں، میں خود مختار ہوں۔ پھر کیوں؟...... سورٹھ! کیوں......؟ پھر کیوں نہیں وہ میرے طرف مائل ہوتا ہے؟'' وہ آخر میں بے اختیار قریب کھڑی اپنی خادمہ سورٹھ کو جھنجوڑ ڈالتی۔

''وہ ملنگ ہے، اللہ والا ہے، بی بی سائین! وہ سمجھتا ہے کہ اس کا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔'' بالآخر سورٹھ ڈرتے ڈرتے کہتی۔

''ہے جوڑ، اس کا اور میرا۔ وہ جوان ہے، میں بھی جوان ہوں، عمر میں صرف دو سال ہی بڑا ہے وہ مجھ سے، یہ ٹھیک ہے وہ ملنگ ہے، اللہ والا ہے، بابا کالی چادر والے آستانے کا فقیر ہے مگر وہ ایک مرد بھی ہے، ایک جوان اور بھرپور مرد، تم نے دیکھا نہیں اسے، کس قدر خوبرو اور وجیہہ ہے وہ، کیا اس کے دل میں امنگوں بھرے جذبات نہیں ہوں گے؟ کیا اس کے من میں تمناؤں کے سوتے نہیں پھوٹتے ہوں گے......؟''

''توبہ......توبہ...... بی بی سائین! کیوں کفر تولتی ہو، بھلا ایک مجاور فقیر کا ان باتوں سے کیا کام؟'' سورٹھ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ تلا کرنے لگتی، مگر وہ نہیں چپ ہوتی، کہتی۔

''میں نے کیا، کسی نے بھی آج تک ایک نوجوان کو کسی آستانے یا درگاہ کا مجاور یا مسند نشین فقیر بنتے نہیں دیکھا ہے، اسے وہاں اس کی مرضی کے خلاف زبردستی بٹھا دیا گیا ہے۔''

''بس کرو بی بی سائین! بس کرو، اللہ سائین سے ڈرو، تم کفر بول رہی ہو۔''

''میں کفر نہیں بول رہی ہوں۔'' سائین کہتی۔ ''میں تو اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اس سے محبت کرتی ہوں میں، اس کی بیوی بن کر وہاں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، میں یہ نہیں کہتی ہوں کہ وہ بابا کالی چادر والے مرشد سائین کا آستانہ چھوڑ دے، مانتی ہوں وہ نیک انسان ہے مگر شادی کرنا تو کوئی گناہ نہیں۔''

''مگر بی بی سائین! وہ آپ کی طرف مائل بھی تو نہیں ہو رہا، فقیر لوگ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔''

سائین نے ہمیشہ کی طرح اس کی یہ دلیل بھی قبول نہ کی، وہ آج پھر اس سے ملنے اور شوق دید کی پیاس بجھانے، دل کا کشکول لیے، بابا کالی چادر والے کی درگاہ میں جانے کے لیے تیار تھی۔

⊙⊙⊙

سائین جوڑیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے...... کی درگاہ میں اس وقت روح پرور خاموشی طاری تھی، وہاں اس وقت چند ہی زائرین موجود تھے، کچھ عبادت میں مصروف تھے۔ چند لوگ پھول نچھاور کر رہے تھے، لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو سے درگاہ کا ماحول مہک رہا تھا، بڑا سکون ملتا تھا یہاں۔ ایک فرش مسند پر ایک نوجوان ملنگ

آنکھیں موندے دوزانوں بیٹھا تھا۔ اس کی ڈاڑھی سیاہ چمکدار اور گھنی تھی، سر کے بال لمبے، کاندھوں تک آتے تھے۔ صحت اچھی تھی، رنگ سرخ و سپید تھا، چہرے پر معصومیت اور نور تھا جہاں روحانیت کا عنصر غالب نظر آتا تھا کشادہ پیشانی پر گول نشان تھا جو کثرت عبادت کا نتیجہ تھا، درگاہ میں زیارت اور منتوں مرادوں کے لیے جتنے بھی سائلین مرد، عورت آیا کرتے تھے، وہ اس نوجوان ملنگ فقیر کی خوب صورتی سے ضرور متاثر ہوتے تھے، وہ اس کی شخصیت میں روحانیت کا جلال بھی محسوس کرتے تھے، اس کی آواز بھی سنتے، اس کا صوفیانہ راگ بھی سنا کرتے، سر دھنا کرتے۔

وہ عورت سرتاپا سفید لباس میں ملفوف تھی، آنکھیں اس کی بڑی بڑی اور بلوریں تھیں جن میں اداسی کی پرچھائیاں، چہرے سے ظاہر ہوتی ویرانی دل سے بڑی گہری مماثلت رکھتی تھیں، ایک چاند جیسا گول داغ اس کی سپید پیشانی پر بھی چسپاں نظر آتا تھا، وہ پینتیس کے لپیٹے میں تھی، چہرے سے ازلی اداسی ضرور جھلکتی محسوس ہوتی تھی، مگر یہ پتا بھی چلتا تھا کہ یہاں کبھی حسن دل آرا کی رعنائیاں بھی تھیں، مگر اس وقت وہ ایک پہلو سے سرتاپا کفنائی ہوئی لاش کی غمازی بھی کرتی تھی۔

وہ قبر پر پھول اور چادر چڑھانے کے بعد ایک حجرے کی طرف بڑھی، وہاں دو خدام موجود تھے، عورت نے ان کی طرف دیکھا۔ ایک خادم نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی اور حجرے کی چوکھٹ پر جھولتے ہوئے سیاہ رنگ کے پردے کو ایک طرف سرکایا اور اندر داخل ہوگئی۔

سامنے سادہ سی مسند پر وہ نوجوان ملنگ ساون آلتی پالتی مارے براجمان تھا، کچھ عورتیں بھی بیٹھی تھیں اس کے سامنے، وہ ان کی حاجت روائی میں زیرلب کچھ پڑھ رہا تھا کچھ سے دھیمے لہجے میں بات بھی کرلیتا تھا۔ وہ سفید پوش عورت بھی ایک جانب سر جھکائے دوزانوں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر گزری، اب حجرے میں صرف وہ سفید پوش عورت تھی اور وہ ملنگ ساون فقیر تھا، اس نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے سفید پوش عورت کو اپنے سامنے ذرا قریب سرک آنے کا کہا۔ اس کے بعد اس...... نوجوان ملنگ ساون نے کچھ زیرلب پڑھ کر عورت پر پھونک ماری، پھر پرجلال سی آواز میں بولا۔

''اللہ سائیں تجھ پر، تیرے حال پر رحم کرے، مگر تیرا صبر بھی ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے، تو اب تک اللہ کی رضا پر راضی ہے اور اس کٹھن گھڑی میں تو نے اب تک ایک قابل رحم زندگی گزاری ہے، رب سائین تجھے اس ایک ایک گھڑی کا اجر دے گا کہ تو ایسے برے اور کڑے حالات میں بھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ سے امید لگائے رکھی، چڑھتے دریا پہ بند باندھنے سے وہ منہ زور ہوکے ابل بھی پڑتا ہے اور سب کچھ تہس نہس کر ڈالتا ہے۔ بیس برس کی عمر میں تجھ پر جو ظلم کیا گیا تو نے تب سے آج تک یہ پندرہ برس کمال صبر سے بتائے، ہوس و طمع کے مارے جابروں نے تیری دنیا کی پندرہ بہاریں خزاں میں بدل دیں مگر درحقیقت انہوں نے خود اپنی آخرت خراب کر ڈالی لیکن تیری عاقبت سنور گئی اب بھی اسی طرح صبر و تحمل کے ساتھ میری نصیحت پر عمل کرتی رہنا، کسی بھی پراگندگی سے خود کو پاک رکھنا، کبھی نفس اور خواہشات کو خود پر سوار مت کرنا، سیدھی راہ سے کبھی مت بھٹکنا، یہ مت سمجھنا کہ تیری جوانی کی پندرہ حسین بہاریں خزاں کی نذر کردی گئیں، ہرگز نہیں، تیری ان پندرہ بہاروں کی خزاں نے تیری آخرت کی کھیتی سنوار دی ہے، وہ آخرت جو ایک نیک انسان کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے جبکہ یہ زندگی دنیاوی اور عارضی ہے، پس! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، مرشد سائیں جوڑیل شاہ کی دعاؤں کے طفیل نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی تو سرخرو رہے گی، ایک بات یاد رکھنا، انسان چاہے جتنا بڑا ہی جابر و طاقت ور ہو، بے انتہا دولت کا مالک ہو، مقدر ہر حال میں اس کا دو گز زمین ہی ہے، اس پر بھی وہ شکر کرے کہ یہ دو گز زمین اسے نصیب ہوجائے۔''

ملنگ ساون اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا، سفید پوش عورت نے اپنا غم ناک چہرہ اٹھایا اس کی کشادہ آنکھوں میں برسوں کا کرب اور دکھ، بے کراں سمندر کی طرح موجزن نظر آتا تھا۔ پھر اس کے لب مرتعش ہوئے، بولی ''ملنگ سائیں! میں ایک کمزور انسان بھی ہوں مگر یہ شاید آپ کی دعاؤں اور وظیفوں کا طفیل ہے کہ اب تک مجھ گناہ گار کے پائے استقلال میں لغزش تک نہ آئی، میں اللہ سائیں کی رضا پر شاکر و راضی ہوں، مجھے کسی سے کوئی گلا نہیں، میرا اپنے رب سائین پر پورا اور بھرپور آسرا ہے۔ لیکن سائیں! ایک بے چینی، ایک خلش میرے اندر کانٹے کی طرح چبھتی ہے، میری ذات سے کسی کو کسی قسم کا ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے یہ مجھے منظور نہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔''

اس کی بات پر پہلی بار نوجوان ملنگ ساون نے نظر اٹھا کے عورت کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھا اور پوچھا۔ ''پوچھ سکتا ہوں وہ کون ہے؟''

''مجھ سے محبت کرتا ہے، ایک غریب شخص ہے وہ۔'' عورت نے نہایت ہولے سے مگر واضح لفظوں میں کہا۔

''سمجھتی ہے تو کہ وہ سچا انسان ہے؟''

''ہاں! ورنہ میں اس کا ذکر تک کرنا بھی معیوب سمجھتی۔'' عورت نے گہرے لہجے میں کہا۔ پوچھا گیا۔

''یہ سب حقیقت جاننے کے باوجود......؟'' ملنگ ساون کا لہجہ کچھ غیر یقینی سی حیرت لیے ہوئے تھا۔

''ہاں!''

ملنگ ساون نے چند ثانیے کے لیے جذب کی سی کیفیت میں خاموشی اختیار کیے رکھی پھر بولا۔ ''سچے اور نیک انسان پر اللہ سائیں کی رحمت ہو...... ہم اس کے لیے دعا ہی کرسکتے ہیں۔ پر تیرا اپنا من اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ مناسب لگے تو بتادو۔''

''وہ سچا آدمی ہے۔'' عورت نے ہولے سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھ پر جبر کرنے والوں کی بربریت کا شکار نہ ہوجائے، اس لیے میں اس سے پہلوتہی کیے ہوئے ہوں کہ اس میں ہی اس کی جان کی امان سمجھتی ہوں، مگر وہ نہیں مانتا۔''

''اسے کبھی میرے پاس بھیج دینا۔'' ملنگ ساون نے کہا اور عورت نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

●●●

وہ بے دلی کے ساتھ اوطاق کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھا، اس کا نام خالق داد تھا، عمر تیئس چوبیس کے درمیان تھی، دبلا پتلا مگر دراز قامت تھا۔ کاٹھی مضبوط نظر آتی تھی۔ رنگ سانولا تھا، باریک مونچھیں تھیں، سر پر شیشے کے کام والی سرخ ٹوپی تھی، وہ حویلی کے پرانے خدمت گار داد محمد کا اکلوتا بیٹا تھا، داد محمد خود بھی ابھی جوان ہی نظر آتا تھا، دونوں باپ بیٹے ساتھ دیکھنے پر بھائی نظر آتے تھے، چھوٹی عمر کی شادیوں میں یہی ہوتا ہے۔ خالق داد کی ماں یعنی داد محمد کی بیوی حیاتاں بھی جوان ہی تھی، وہ ایک خوب صورت عورت تھی، وہ حویلی کے زنان خانے کی چاکری پر مامور تھی۔

جب خالق داد نے ایک روز باپ سے کہا تھا۔

''پیو! آج سے میں بھی تیرے ساتھ کام پہ جاؤں گا۔'' تو اس کی بات سن کر داد محمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے آتا بھی کیسے، کام سے تو خالق داد عرف خالقو کو گویا خدا واسطے کا بیر تھا، وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا، لاڈلا تھا، پھر باپ بھی اس کا وڈیرا الف خان کی حویلی کا چاکر خاص یعنی جدی پشتی خدمت گار تھا اور یہ معمولی بات اور چھوٹی نوکری نہ تھی، اجرت کے علاوہ ''اجرتِ خاص'' سے بھی نوازا جاتا تھا، یہی سبب تھا کہ یہ تینوں کسی روایتی تنگ دستی یا غربت کا شکار نہ تھے۔

غریب کی خوشحالی یہی ہوتی ہے کہ دو وقت کی روٹی ملتی رہے، رہنے کو سرکنڈوں کی چھت اور بس۔

خالق داد عرف خالقو اس طرح کی بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا، کوئی کام نہ کرتا، نہ باپ کچھ کہتا نہ ماں۔ وہ تو اسے خوش فکر دیکھ دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہتی تھی، لیکن ایک روز اچانک جانے کیا ہوا کہ خالقو نے یہ بات باپ سے کہہ ڈالی۔

''کیوں پٹ خالقو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟'' باپ کو پریشانی سی ہوئی۔

''میں ٹھیک ہوں پیو!'' خالقو نے کہا۔ ''بس! آج سے میں بھی تیرے ساتھ کام پہ جایا کروں گا۔''

باپ نے سمجھا شاید بیٹا کام میں دل لگانا چاہتا ہے، وہ اسے حویلی لے چلا۔ یوں خالقو نے اوطاق کی جھاڑ پونچھ کا کام سنبھال لیا، وہاں آتے جاتے مہمانوں وغیرہ کی خدمت چاکری کرتا، اس طرح حویلی کے اندر بھی اسے جانے کا موقع ملتا رہتا، یہ راز صرف خالقو ہی جانتا تھا کہ اس نے گوٹھ کی آزاد اور خوش فکر فضا میں یاروں دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹا، آوارہ گردی اور کادو جکھرانی کے چھپر نما چائے خانے میں آنا تک اچانک کیوں چھوڑ دیا تھا۔

اس پر جہاں حیاتاں اور داد محمد کو حیرت تھی وہاں خالقو کے دوستوں کو بھی زبردست اچنبھا ہوا تھا، اور تو اور خالقو نے تو دوستوں سے ملنا تک چھوڑ دیا تھا۔

آخر وہ راز کیا تھا جس سے صرف خالقو ہی واقف تھا، اس حیرت انگیز تبدیلی کا سبب رات کا وہ نصف پہر تھا جب حویلی سے اچانک بلاوا آگیا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی ان کے لیے حویلی سے اس طرح کے راتوں کے اچانک بلاوے آتے رہتے تھے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس روز داد محمد کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اس لیے حویلی سے آنے والے چاکر کے ہمراہ خالقو کو ہی جانا پڑا تھا۔ حویلی پہنچ کر پتا چلا تھا کہ وہاں کی بجلی شارٹ سرکٹ کی وجہ سے خراب ہوگئی تھی، اگست کا مہینا تھا، ایسے میں فضا گھٹن، حبس زدہ ہوجایا کرتی ہے اور مچھر الگ تنگ کرتے ہیں، لہٰذا حویلی کے مکینوں کو ''جھلنی'' دینا تھی تاکہ وہ آرام و سکون سے نیند پوری کر سکیں، حالانکہ ٹریکٹر کے انجن سے بڑا جنریٹر بھی بنوایا گیا تھا جو ڈیزل سے چلتا تھا مگر آج وہ بھی خراب تھا، جھلنی مقامی زبان میں ہوا پہنچانے کو کہتے ہیں، پرانے وقتوں کا یہ طریقہ آج بھی دور دراز کے گاؤں گوٹھوں میں رائج تھا۔

کھلی جگہ کے وسط میں ایک درخت جیسا موٹا گول تنا گاڑ دیا جاتا تھا اور ایک چرخی یا گراری کی مدد سے اس کے اوپری سرے پر تقریباً دس سے بیس فٹ لمبا اور لچکدار بانس ''دو پنکھ'' کی طرح نصب کر دیا جاتا تھا اور پھر بانس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لمبا سا کپڑا باندھ کر جھلا دیا جاتا تھا، اس کے بعد وسط میں گڑھے ہوئے موٹے تنے کے گرد ایک گدھے کے گلے میں رسی ڈال کے اسے ہنکایا جاتا تھا، گدھا تنے کے گرد گھومتا جاتا اور دو پنکھ بانس بھی متحرک ہوجاتا یوں اس کے نیچے چارپائیوں پہ سوئے ہوئے افراد کو ہوا لگتی اور وہ سکون سے سوتے رہتے، یوں گدھا ساری رات تنے کے گرد طواف کرتا رہتا تھا، مگر ایک قباحت ہوتی تھی کہ ایک تو گدھا کبھی کبھار رک جایا کرتا تھا تو کسی کی بھی آنکھ گرمی سے کھل جاتی تو وہ چارپائی کے قریب رکھی چھڑی اس کی ''پشتک'' پہ رسید کر دیتا اور یوں گدھا دوبارہ حرکت میں آجاتا، گدھا گندگی بھی کرتا تھا، پیشاب اور لید کرتا جس سے بدبو ہوا کرتی تھی، مگر لوگ اس کے بھی عادی تھے، تاہم بڑے زمیندار ٹائپ گھروں میں گدھے کی جگہ انسان کو ''جھلنی'' میں جوتا جاتا تھا، چنانچہ خالقو کو بھی اس مقصد کے لیے وہاں بلایا گیا تھا۔

ایک انسان کے لیے جھلنی لگانا بڑا اکسی اور مشقت کے علاوہ بیزار کن اور تھکا دینے والا کام ہوا کرتا تھا، خالقو کے لیے تو یہ کام قیامت کی گھڑی کے مترادف تھا مگر وہ مجبور تھا لیکن درحقیقت کام سے دور بھاگنے والے داد محمد کے لاڈلے بیٹے خالقو نے اسی روز سے ہی حیرت انگیز طور پر کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی، اس کی ایک بڑی خاص اور ''معنی خیز'' وجہ تھی۔

جب اسے حویلی کے کشادہ صحن میں جھلنی کھدیڑنے پر لگایا گیا تو وہ نہایت بیزار کن انداز میں چوبی دستہ پکڑ کے تنے کے گرد گھومتا رہا، تھک جاتا تو تھوڑا سستا لیتا اور پھر طواف کرنا شروع کر دیتا۔

حویلی کے مکین بڑے آرام سے بڑی بڑی منقش پایوں والی چارپائیوں پہ سوئے ہوئے تھے، خالقو بے چارہ اسی طرح صبح تک ان سب کو دستی پنکھا جھلتا رہا، تب اس دوران اس کی نگاہ ایک قریب بچھی چارپائی پہ پڑی اور پھر جیسے وہ خود بھی ''سکتے'' میں آگیا۔ کسی نے عجیب اور بھرپور انداز میں چارپائی پر کروٹ بدلی تھی اور وہ زور سے چرچرائی تھی۔

چوبی جھلنی کی ابھرنے والی مخصوص مگر یکساں بیزار کن ''چک چوں...... چک چوں'' تاروں بھرے آسمان تلے سناٹے میں عجیب سی محسوس ہو رہی تھی، ایسے میں قریب بچھی چارپائی پر کسی نے کروٹ بدلی تو بے اختیار طواف کرتے ہوئے خالقو کی نگاہ وہاں پڑی تھی۔

کروٹ بدلنے سے چادر سرک گئی تھی اور کسی لالہ گل کے نرم و نازک وجود کا گوشۂ نہاں عیاں ہوا تھا جھلنی کا طواف کرتے ہوئے خالقو کے نہ صرف قدم بلکہ دل بھی تھم سا گیا تھا۔ وہ رخ روشن چہرہ، چادر کی اوٹ سے کسی بدلی کے عقب سے ابھرتے طباق چاند ہی کی طرح طلوع ہوا تھا اور خالقو کے اندر تک اپنی خیرہ کن ضوفشانیاں بکھیر گیا تھا۔ رات کے اس دم بہ خود پہر میں گویا ایک طلسم ہوشربا تھا جو خالقو پر طاری ہوگیا تھا۔ معاً خالقو کو احساس ہوا کہ اس کے رکنے سے ہوا تھم گئی تھی جس کے باعث بند آنکھوں والے چاند چہرہ وجود میں بے چینی سی واقع ہو رہی تھی، کہیں یہ نظارہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجائے، اس خیال سے آپوں آپ اس کے قدم حرکت کرنے لگے، جھلنی پر لگی چادر نے معلق اور رکی ہوئی ہوا کو تھپک کے رقصاں کیا اور ہر پھیرے پہ خالقو اس رخ روشن کا نظارہ کرتا گیا۔ کہاں تو اسے یہ کام حد سے زیادہ تھکا دینے والا، قیامت کی گھڑی جیسا محسوس ہو رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ وہ ایک گھنٹے میں ہی تھک کے چور ہوگیا تھا، مشقت طلب کام میں یکسانیت اور بوریت بھی شامل ہوجائے تو وہ کام مزید جان توڑ بن جاتا ہے، مگر اب دیدار حسن نے تو گویا تن مردہ میں صور پھونکنے کا کام کیا تھا اور پھر جانے کتنے ہی گھنٹے رات بھر کے بیت گئے، خالقو کو کب اس کا کوئی احساس رہا، وہ تو شوق دید میں اس طرح جانے کب تک چلتے رہنے کا قصد کر چکا تھا۔

سحر ہوتے ہی مکین جاگنے لگے تو خالقو نے سر جھکا لیا، پھر اسے وہاں سے جانے کا کہا گیا۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلا آیا۔ نظارۂ حسن محو ہوتے ہی یکدم اس کا پورا وجود تھکن سے چٹخنے لگا۔ وہ گھر آ کے چارپائی پر گر گیا۔

سہ پہر تک وہ بے سدھ سویا رہا۔ جاگا تو طبیعت میں عجیب کسلمندی اور بوجھل سی آنکھوں میں اکتاہٹ تھی، مگر نیم غنودہ دل و دماغ پر وہی چہرہ ابھرا تو وجود کا سارا تکدر جاتا رہا۔ وہ کھو کے رہ گیا۔ وہ تصور ہی تصور میں اس چہرۂ ماہ تاب کی کشیدہ کاری کرتا رہا، تب پھر معاً ہی عقل و خرد کا احساس بیدار ہوا تو اس نے ٹہوکا دیا۔

''خالقو! تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، تو کہاں، وہ کہاں۔ وہ آسمان، تو زمین، وہ بلند و بالا حویلی کی چھت اور تو سرکنڈوں کی جھونپڑی کا ٹوٹا ہوا چھپرا۔ ہوش کر، اپنی اوقات

دیکھ اور اس کی حیثیت پہچان۔ عقل وخرد کے اس طرح کھدیڑنے پر مایوسی نے اس پر غلبہ پایا اور وہ اداس سا ہوگیا۔ مگر پھر اس روز کے بعد یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے گھر سے باہر نکلنا کم کرتے کرتے تقریباً ترک کردیا۔ دوست گھر آنے لگے تو ان سے بھی نہ ملتا۔ جی بے قرار رہنے لگا اور وجہ وہی پری چہرہ تھی۔ وہ کسی نصابی سبق بن کے اندر ہی اندر اسے ہر روز دہرایا کرتا، تمام جزئیات کے ساتھ، گول چہرہ، دودھ میں گلاب ملا رنگ، ہونٹوں کی ملکوتی بناوٹ ملائم حوروں جیسی تصوراتی خوبصورت جلد، بند آنکھوں پر پلکوں کی سیاہ گھنی لکیر اور ابرو چشم کی آفرینی بناوٹ...... وہ بھولے نہیں بھول پا رہا تھا اس چہرے کو...... کئی بار ذہن سے جھٹکنے کی کوشش بھی کی تھی وہ جیسے ہر روز افق سے طلوع ہو کے سامنے آتا رہتا۔

دل بے چین کو جب بے قراری نے ادھ موا کر ڈالا تو سرکشی نے آتش فشاں سے ابلتے بھڑکتے لاوے کا روپ دھار لیا۔ بالآخر دل نے دماغ سے بغاوت کرتے ہوئے باور کرادیا کہ یہی محبت ہے، یہی وہ جذبۂ دل ہے جو اونچ نیچ ذات پات، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

تب اس نے باپ سے کہہ کر خود کو حویلی کے مستقل چاکروں میں شامل کرالیا۔

باپ داد محمد اور اس کی بیوی حیاتاں کا شمار چونکہ حویلی کے خاص خدمت گاروں میں ہوتا تھا جو اندر کے کام سنبھالتے تھے، اس لیے خالقو کو بھی حویلی کے اندر کا کام بھی ملتا رہتا تھا، باہر کے خدمت گاروں کو "اندر" آنے کی ممانعت تھی۔

خالقو سے کبھی کبھار اوطاق کی صفائی، جھاڑ پونچھ کا کام بھی لیا جاتا تھا اور اگر وڈیرے الف خان کے کوئی قریبی عزیز یا دوستوں کو اندر حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا تو خالقو کو مکمل طور پر ان کی خدمت داری سونپ دی جاتی تھی اور یوں خالقو راتوں تک حویلی کے اندر مہمان خانے میں رہتا تھا۔

اس روز بھی حویلی کے اندر دیر تک رہنے کا موقع ہاتھ آیا۔

شہر سے وڈیرے الف خان کا ایک بچپن کا دوست مع اپنی فیملی کے ان کے ہاں چند روز کے لیے رہنے آیا۔ یہ ایک بڑا بیوروکریٹ افسر تھا، وہ اکثر تکور اور کالے بھٹ تیتروں کے شکار کے لیے آتا رہتا تھا، جبکہ وڈیرا الف خان بھی شہر اپنے بیوی بچوں سمیت اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ شنید تھی کہ بچپن کے ان دونوں دوستوں کے درمیان دور کی رشتے داری بھی تھی اس لیے دونوں خاندانوں کے لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے۔

بہرطور...... جس موقعے کی خالقو کو تلاش تھی، وہ اسے مل ہی گیا تھا۔ وہ اب صبح ہوتے ہی حویلی چلا جاتا تھا اور کام میں مصروف ہوجاتا۔ رفتہ رفتہ اس نے مہمان کمروں کے علاوہ بھی دیگر کمروں کی صفائی ستھرائی اپنے ذمے لے لی تھی اب حویلی کا کوئی فرد بھی اس کے لیے اجنبی نہ رہا تھا، وہ سب کو پہچاننے لگا تھا اور اس چہرے کو بھی جس نے ہوش وخرد کی دنیا سے بیگانہ کردیا تھا۔ ہاں! وہ چہرہ اب اس کا خوب اچھی طرح آشنا ہوگیا تھا مگر اس کربیہ حقیقت کے ساتھ کہ...... نور خاتون نامی اس چہرے کو "ونی" کیا جاچکا تھا، یعنی اس کا قرآن سے نکاح کردیا گیا تھا (نعوذ باللہ)

خالقو کو یہ تلخ حقیقت جان کر بہت دکھ ہوا تھا، نور زادی اس سے پانچ سال بڑی تھی، پچیس سال کی عمر میں اسے "ونی" کردیا گیا تھا۔

خالقو کو یہ بات اب معلوم ہوئی تھی۔ وہ اب پریشان سا رہنے لگا تھا۔ بے شک نور کے ساتھ اور بھی تلخ حقیقتیں نتھی تھیں، سب سے بڑی اور تلخ حقیقت تو یہ تھی کہ نور خاتون وڈیرے الف خان کی بیٹی تھی، جبکہ اس کے مقابلے میں خالقو ایک نوکر تھا، پھر وہ ونی بھی کردی گئی تھی۔ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا تو حاصل کرنے سے پہلے ہی وڈیرے الف خان کے بھیڑیا صفت کارندے اسے گولیوں سے بھون کر لاش کسی ویرانے میں پھینک دیتے۔ ان سارے سفاک حقائق کے باوجود خالقو کے سر پر عشق نامراد کا بھوت بہ دستور سوار تھا۔

فطرتاً وہ بڑا جی دار تھا، کوئی شے پسند کرلیتا تو اسے حاصل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا تھا اور اگر ایسے کسی "معاملے" میں جب وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا تو یہی احساس محرومی خود کار نظام کے تحت سرکشی میں تبدیل ہوجاتا اور اس سرکشی کا سبب ہی تھا کہ اس روز شام کے پہر اس کی مڈبھیڑ نور خاتون سے ہو ہی گئی۔

وہ اس وقت مہمان خانے کے کمروں کی صفائی ستھرائی اور رات کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا کہ حویلی کے ایک قدرے ویران کنج میں اس کا نور خاتون سے سامنا ہوگیا۔ کیا دیکھتا ہے، وہ عقب میں بنی ایک قدرتی جھیل کی طرف کھلنے والے دریچے سے لگی کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ حسبِ معمول اس نے سفید رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

"بی بی جی! آ...... آپ رو رہی ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" قریب پہنچ کر خالقو نے بالآخر اسے مخاطب کرنے کی جرأت کر ہی لی۔ اس کی آواز پر نور خاتون نے چونک کر دریچے کے باہر سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

اونچا لانبا قد، بڑی بڑی آنکھیں، گھنے بال، لمبی قلمیں، چوڑے شانوں اور فراخ پیشانی والا یہ معمولی نوکر...... اس کے لیے نامانوس تو ہرگز نہ تھا لیکن...... اب یہ شاید نسوانی وجدان کا کمال تھا کہ...... وہ اس کی بات میں چھپی ہمدردی کی تہ میں انسیت محسوس کیے بغیر نہ رہی تھی۔

ادھر اچانک ہی خالقو کو یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کہہ ڈالی تھی، شاید بی بی جی نے برا منایا ہے لہٰذا نور خاتون کی چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے دوران ہی وہ بول پڑا۔

"معافی چاہتا ہوں بی بی جی! شاید میں نے غلط بات کہہ دی۔"

"نہیں، تم نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔" نور خاتون اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کی طرح اس کی آواز بھی اداس تھی۔ نور خاتون نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں کے نمناک گوشے پونچھ ڈالے، اب اسے سامنے سر جھکائے کھڑے خالقو کا چہرہ صاف دکھائی دیا۔ جانے کیوں نور خاتون کو اس کے چہرے پر بھی اداسی کی رمق محسوس ہوئی، جو اسے اپنی اندر کی غمناکی کا پرتو لگی۔

"آ...... آپ...... کی طبیعت خراب ہے تو آپ جاکر آرام کرلیں، کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔" خالقو نے اس طرح جھکے سر سے کہا۔ آج پہلی بار وہ بی بی جی سے بات کررہا تھا، اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا، مگر یہ بھی درست تھا کہ بی بی جی کو سوگوار دیکھ کر وہ خود بھی رنجیدہ سا ہوگیا تھا۔ ادھر نور خاتون پہلی بار اسے غور سے تکنے لگی، اس کا نسوانی وجدان کہہ رہا تھا کہ اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے جو مرد کھڑا تھا۔ اس کی وجود خالی از علت نہ تھا، اس کے چہرے پر نور خاتون کو دبی دبی سے ہلچل محسوس ہورہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔

"پھر یہ آنسو؟ اور یہ آپ کا اس قدر اداس چہرہ......؟" بے اختیار خالقو کے منہ سے نکلا تھا، ساتھ ہی اس نے اپنا چہرہ بھی دوسری جانب کرلیا تھا، اسے اپنا دل بے طرح دھڑکتا محسوس ہورہا تھا، سمجھتا تھا وہ ایک چوری جسارت کرنے جارہا تھا۔ نور خاتون کو اس کی بات میں پھر کچھ محسوس ہوا، وہ ایک بار پھر اسے یک ٹک تکنے لگی نظروں میں گہرائی اتری تو دل کے یکتارے نے سازِ الفت چھیڑا، ابھی یہ ساز خفیہ تھا مگر اندیشۂ لگاوٹ کا پتا ضرور دیتا تھا۔

"بی بی جی! شاید مجھ سے پھر کوئی غلطی ہوگئی؟" بی بی جی کی یک لمحہ خاموشی پر خالقو نے کہا تو اس بار نور خاتون اس کے اس بھولپن پر بے اختیار مسکرا دی۔ اداسی کے اڑے اڑے رنگ میں کھلی مسکراہٹ عجب تاثر دیتی تھی۔

"نہیں، تم کوئی غلطی نہیں کررہے۔"

"سچ بی بی جی!" خالقو کو یک گونہ مسرت محسوس ہوئی۔

"ہاں۔" نور خاتون نے ہولے سے کہا۔ اب وہ نگاہوں سے گویا مسکرا رہی تھی۔

"تم چاچا داد محمد کے بیٹے ہونا؟"

"جی، بی بی جی۔" خالقو کو اس کا سوال پوچھنا اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"خالق داد، مگر مجھے پیار سے خالقو کہتے ہیں۔" اس نے بڑے اشتیاق سے بتایا۔

پہلی خاموش ملاقات کے بعد بی بی جی سے یہ دوسری بار ملاقات بھرپور تھی خالقو کے لیے۔ وہ سارا دن شاداں وفرحاں رہا، گھنٹوں تنہائی میں وہ بی بی جی کا تصور کرتا رہا، زیرِلب بار بار اس کے سوال اور اپنے جواب دہراتا رہا جیسے اسے کسی ڈرامے کا اسکرپٹ پکڑا دیا گیا ہو اور وہ تنہائی میں مکالمے بول بول کے حفظ کررہا ہو۔ اسے یہی محسوس ہوتا جیسے بی بی جی ہنوز اس کے سامنے کھڑی ہو، کتنی لطافت تھی اس کے دیکھنے کے انداز میں، کسی انسیت بھرا دھیما پن تھا اس کے لہجے میں، بی بی جی کے اندر کون سا غم تھا وہ ہر وقت اداس کیوں رہتی تھی رنجیدگی کیوں ان کے چہرے، ان آنکھوں میں گویا برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھی؟ یہ بھلا کون نہیں جانتا ہوگا، یہ حقیقت بھی بھلا کسی سے چھپی رہی تھی کہ نور خاتون کو ونی کردیا گیا تھا۔ خالقو بھی جانتا تھا، مگر پھر بھی اس نے بی بی جی سے اس کی اداسی، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی وجہ پوچھی تھی، اس کا ایک مقصد تھا، وہ چاہتا تھا کہ بی بی جی اسے اپنا غم آشنا کرے، اسے بتائے کہ وہ کیوں ہر وقت غمزدہ رہتی ہے؟ تاکہ وہ بھی اس کے جواب میں کچھ اس سے کہہ سکے، وہ اس موقعے کی تلاش میں تھا جو اسے میسر بھی آیا تھا۔

"تم مجھ سے بار بار یہ سوال کیوں کرتے ہو کہ میں اداس اور غمگین سی کیوں رہتی ہوں؟" نور خاتون نے اس

روز اس کے وہی سوال دہرانے پر پوچھ لیا۔

’’اس لیے بی بی جی! کہ میں آپ کا دکھ جانتا ہوں۔‘‘ خالقو نے بڑا حوصلہ کیا تھا۔

’’تو پھر؟ جانتے ہو تو بار بار پوچھنے کا مطلب؟‘‘

’’اسی لیے بی بی جی! کہ آپ کے ساتھ جو بات غلط ہوئی ہے، اس کا آپ کو احساس جگا سکوں۔‘‘

’’یہاں صحیح غلط کسے نظر آتا ہے، خالقو!‘‘ نور خاتون کے ہونٹوں پہ تلخ مسکراہٹ تھی۔

’’یہاں تو فقط اپنی مرضی اور حکم مسلط کیا جاتا ہے۔‘‘

’’آپ کو ایسے مکروہ حکم پر سر نہیں جھکانا چاہیے تھا بی بی جی!‘‘

’’تو کیا کرتی میں؟‘‘

’’صاف انکار کر سکتی تھیں آپ، اس حویلی میں آپ کے اپنوں نے آپ کو ساری عمر کے لیے زندہ درگور کرنے کا سامان کر ڈالا اور آپ خاموش رہیں۔‘‘

’’ہم عورتوں کی کیا حیثیت ہے حکم عدولی کرنے کی۔‘‘

’’اور اگر آپ کے ساتھ کوئی مرد ہو، تب......؟‘‘ خالقو نے یہ کہہ کر نور خاتون کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں پہلے حیرت، بے تاثر مسرت اور پھر آخر میں خوف کا عنصر غالب آگیا۔

’’جواب دیں بی بی جی؟‘‘ خالقو نے بہ دستور نور خاتون کے چہرے پہ نظریں گاڑی ہوئی تھیں۔

نور خاتون کو خالقو کی آنکھوں میں آتش نمرود میں دیوانہ وار کود پڑنے کی سرکشی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی، بولی۔ ’’کک......کون مرد؟‘‘

نور خاتون کے اٹکتے ہوئے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اس ’’مرد‘‘ کو جان گئی تھی۔

’’میں۔‘‘ خالقو نے جیسے خم ٹھونکے۔

’’تت......تم......‘‘

’’ہاں بی بی جی! میں آپ کو وہ مرد بن کے دکھا سکتا ہوں جو آپ کو اس قبیح اور خودساختہ روایتوں کی زنجیر سے آزاد کرا کے خوشیوں اور مسرتوں بھری زندگی دے سکتا ہے، جو آپ کا اور ہر عورت کا حق ہے۔‘‘

خالقو کی بات پر ایک لمحے کے لیے نور خاتون کے اندر کی روایتی عورت فخر سے پھول گئی تھی، لیکن پھر سماج زدہ عورت نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ خوف زدہ ہوگئی، بولی۔

’’ہم بے دردی سے مار دیے جائیں گے، نہیں جانتے تم کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟‘‘

’’میں صرف یہ جانتا ہوں تم اللہ سائیں کی بنائی ہوئی ایک حسین مورت ہو اور ایسی ہی حسین زندگی تمہارا مقدر ہونا چاہیے۔‘‘ خالقو نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ’’اور میں مرنے سے نہیں ڈرتا، کیا تم موت سے ڈرتی ہو؟‘‘ اس نے آخر میں نور خاتون سے پوچھا تو اس کے گداز سے، اداسی لیے ہونٹوں پر بے تاثر مسکراہٹ ابھری، بولی۔

’’جو روز موت سے بدتر زندگی کا مزہ چکھ رہا ہو، بھلا وہ ایک دن کی موت سے کیوں ڈرے گا، ایک دن کی موت تو مجھ بدنصیب کا نصیب بنا دے گی۔‘‘ اس کے جواب پر خالقو کے اندر تک دکھ بھر گیا، اس نے بے قرار ہو کے نور خاتون کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ نور خاتون کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خالقو، اس کی پھٹی پھٹی مگر دلکشی کا تاثر دیتی آنکھوں میں محبت پاش نظریں جما کے بولا۔

’’پھر مجھے بھی اپنی اس ایک دن کی موت کے ساتھ خوش نصیبی عطا کر دو، نور...... کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اب تمہاری مرضی کہ اس معمولی حقیر نوکر کی اس بے اختیاری پہ اپنے غصے کا اظہار کرو، تھپڑ میرے چہرے پہ مار دو، میں اف تک نہیں کروں گا، مگر پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔‘‘

’’یا اللہ سائیں......‘‘ بے اختیار نور خاتون کے مرتعش لبوں سے یہ الفاظ برآمد ہوئے۔ ’’کیا مجھ پر پھر کوئی کڑی آزمائش آنے والی ہے۔‘‘

’’نہیں نور......‘‘ خالقو اب اسے بڑی محبت سے، نام لے کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

’’دوسری بار کوئی بھی کڑی آزمائش تمہارا مقدر نہیں بن سکتی۔ بس! میرا ساتھ دو، ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں، رب سائیں کی دنیا بہت بڑی ہے، ہم ہنسی خوشی اور پیار بھری زندگی کا کہیں بھی آغاز کر سکتے ہیں۔‘‘

نور خاتون کا پورا وجود مرتعش ہوگیا، اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سسکتی ہوئی اس سے دور ہوگئی۔

◉◉◉

وہ تیار ہو کے اور پورے ’’کیل کانٹوں‘‘ سے لیس ہو کر اپنی خادمۂ خاص سورٹھ کے ساتھ سائین جوڑیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ پر جا پہنچی۔

پھول نچھاور کرنے اور نئی ریشمی کڑھائی کی سوتی چادر چڑھانے کے بعد وہ سائیں عورتوں کے حصے کی طرف بڑھی۔ وہاں چند عورتیں موجود تھیں۔ سائین نے غصے سے پلٹ کر سورٹھ کو دیکھا اور بولی۔ ’’تو نے تو کہا تھا کہ اس وقت

سائلین نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، یہ کیا سب تیری مائیں بیٹھی ہیں؟‘‘ خادمہ سورٹھ گھبرا کے بولی۔

’’بی بی سائین! آپ اس وقت پہلے بھی آتی رہی ہیں اور خود بھی دیکھ چکی ہیں کہ یہاں کوئی سائل نہیں ہوتا، مگر جانے کیوں آج......‘‘

’’بند کر اپنی بکواس، اب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘ سائین کا غصہ ناک پر چڑھا ہوا تھا، سورٹھ اسے ایک طرف لے گئی اور وہاں بٹھا دیا۔ پھر خود ملنگ ساون کے حجرے کی طرف چکر لگاتی رہی، خاصی دیر بعد اس نے بتایا کہ تمام سائلین عورتیں جا چکی ہیں، پھر سائین جب سورٹھ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی حجرے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود ایک خادم نے راستہ روک لیا اور بولا۔

’’سائیں ملنگ فقیر (ساون) اب عبادت اور مراقبے میں مصروف ہوگئے ہیں، اب کوئی ان سے نہیں مل سکتا۔‘‘ درگاہ کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں مگر سائین کی پرغرور اور سرکش فطرت ان اصولوں کو کب تسلیم کرنے والی تھی، اس لیے کہ اس کے یہاں آنے کا مقصد اور ہوتا تھا، وہ ناک بھوں چڑھا کے اسے گھورتے ہوئے پرغرور لہجے میں بولی۔ ’’تو جانتا نہیں ہمیں، ہم کس کی بیٹی ہیں۔‘‘

خادم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’یہاں فقیر اور بادشاہ سب ایک ہوتے ہیں۔‘‘

’’تم اندر جا کر ملنگ فقیر کو بتا تو دو کہ باہر وڈیرے خدا بخش کی بیٹی سائین بی بی آئی ہیں۔‘‘

’’وڈیرے خدا بخش سائین کی عزت آنکھوں پر، مگر ملنگ سائیں جب عبادت یا مراقبے میں ہوں تو کسی سے ملاقات نہیں کرتے، آپ واپس تشریف لے جائیں اور کل آنا۔‘‘

ساون ملنگ سے ملاقات کیے بغیر واپس لوٹنا سائین کو بھاری پڑ گیا۔ وہ بلا کی انا پرست اور مغرور لڑکی تھی، ناک پر مکھی بیٹھنا تک گوارہ نہ کرتی، ہر وقت برتری کا بھوت سوار رہتا تھا سر پہ، اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس میں اس کی خوب صورتی کا تو دخل تھا ہی مگر وہ دولت مند بھی تھی اور آج تک اپنے باپ کا نام کما رہی تھی، وڈیرا حاجی خدا بخش کا بڑا نام تھا، اب جبکہ وہ چارپائی سے لگ گیا تھا، مگر اس کا اثر و رسوخ اور تعلق داری میں چنداں فرق نہ آیا تھا، اس کی ایک وجہ تھی، وہ حتمی طور پر آدھے گوٹھ کا مالک تھا، یہی نہیں ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک بھی تھا، دس بارہ مسافر لاریاں تھیں جو گوٹھ سے شہر اور شہر سے گوٹھ کے درمیان چلا کرتی تھیں۔ شہر میں بھی بڑی جائداد تھی، دو فلور ملوں کے علاوہ تین رائس ملز اور ایک سالونٹ پلانٹ کا مالک بھی تھا۔ شہر میں بھی شاندار بنگلا نما گھر تھا جو بھٹائی ہاؤس کے نام سے موسوم تھا۔ نوکر چاکروں کے علاوہ وفادار آدمیوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، کئی گوٹھوں کے وڈیروں اور وڈیرے زادوں کے رشتے اس کے لیے آئے تھے مگر سائین نے ٹھکرا دیے تھے۔ باپ کی اکلوتی اولاد تھی، سونے پہ سہاگا لاڈلی تھی اور خاصی پڑھی لکھی بھی، سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھی۔ مگر یہ بات اس کی انا پرست اور مغرور شخصیت کے برعکس جاتی تھی کہ وہ ایک نوجوان ملنگ فقیر ساون کے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس کی دو ہی وجوہات سمجھ میں آتی تھیں، پہلی تو یہ کہ اسے اپنے حسن پہ بڑا ناز تھا مگر ساون نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ملنگ ساون نوجوان تھا اور حد درجہ خوبرو اور وجیہہ لڑکا تھا۔ اب یہ معاملہ دل تھا کہ اس کا دل اس فقیر پر آگیا تھا، جس کی مسلسل بے رخی نے سائین کو مزید ضدی بنا دیا تھا، اب نجانے یہ سائین کے لیے انا کا مسئلہ بن گیا تھا یا پھر وہ اس سے واقعی محبت کرنے لگی تھی کہ وہ اس کے پیچھے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اسے رجھانے کے لیے ہر طرح کے ’’جمالیاتی‘‘ ہتھکنڈے استعمال کر ڈالے تھے مگر وہ اس کی طرف ذرا بھی راغب نہیں ہوا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنی ملازمۂ خاص سورٹھ کے ساتھ پھر درگاہ جا پہنچی۔ اتفاق تھا کہ اسے تنہائی میں شرفِ ملاقات حاصل ہوگیا۔

نوجوان ملنگ فقیر ساون اپنے حجرے میں تنہا موجود تھا، سائین اندر داخل ہو کے اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی اور ساون کا چہرہ تکنے لگی۔

’’بیٹھ جاؤ۔‘‘

حجرے میں ساون فقیر کی پرجلال آواز ابھری، سائین فرشی دری پر کسمسا کے بیٹھ گئی۔ ’’جو بات، جو راز ہے بول دے، میں سن رہا ہوں۔‘‘ ساون نے کہا۔

’’میں آج اپنے حسن کی بدصورتی تلاش کرنے آئی ہوں۔‘‘ سائین نے کہا۔ اس کے دلنشین ہونٹوں پر معنی خیز اور پرشوخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

ساون نے اس کی بات سن کے کہا۔ ’’پہلے اپنے اندر کا حسن تلاش کر پھر تجھے خود ہی اپنے تن کی بدصورتی نظر آجائے گی۔‘‘

’’میرے اندر تو کسی کی محبت کا دیا روشن ہے اور اس کی روشنی میں مجھے صرف ایک ہی نام نظر آتا ہے۔‘‘ سائین نے جیسے دل کی عمیق گہرائیوں سے کہا۔

’’محبت عبادت ہے، جا کر اللہ کو یاد کر۔‘‘

''میرے من میں ایک محبوب بسا ہوا ہے۔''
''اللہ کے سوا انسان کا اور کون محبوب ہوسکتا ہے؟''
''میں عشق مجازی کی بات کر رہی ہوں۔''
''عشق مجازی کی انتہا عشق حقیقی ہے۔''
''ابھی میں شاید اس منزل تک نہیں پہنچی، میرا محبوب تو مجھے پہچاننے سے ہی انکاری ہے۔''
''تجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے؟''
''ملنگ سائیں! تو تو سب جانتا ہے، پھر یہ سوال کیوں کیا؟''
''دلوں کا بھید صرف اللہ جانتا ہے، جو پوچھا ہے، اس کا جواب دے، تیرا محبوب کون ہے؟''
''میرا محبوب، اس وقت میری آنکھوں کا مرکز، میرے سامنے ہے۔''
''میں اس لائق نہیں۔''
''کیوں نہیں لائق؟'' سائین تڑپ گئی۔
''تجھ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔''
''کیا تو اللہ والا ہے، اس لیے؟''
''نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں تو گناہ گار ہوں۔''
''تو پھر؟''
''میں طبقاتی فرق کی بات کر رہا ہوں، تو بادشاہ کی بیٹی ہے اور میں ایک فرش پر بیٹھنے والا عام فقیر۔''
''فقیر کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے۔'' سائین نے اسے لاجواب کرنا چاہا۔
''فقیر کا دل سب کے لیے بڑا ہوتا ہے، اپنے لیے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس کے جواب پر سائین خود لاجواب ہوگئی۔ ٹوٹ کر بولی۔
''ساون! میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟ کیا شادی گناہ ہے؟''
''شادی سنت ہے اور ہم پر فرض ہے۔ پگلی! یہ گناہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے ساون فقیر پہلی بار اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اس کی نرم میٹھی مسکراہٹ نے سائین کا من مسرت سے بھر دیا۔ وہ بے اختیار کشش محبت سے اس کے قریب سرک آئی اور بے اختیار اس کے بازو پر اپنا سر رکھ دیا۔
''ہم محبت کے جذبے کی قدر کرتے ہیں، لیکن یہ ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ ہماری ذات سے کسی انسان کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچے۔''
''میں آپ کے ساتھ شادی کر کے خوش رہوں گی۔''

وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کے سرشاری سے بولی۔
''تیرا میرا کیا جوڑ ہے۔ تو ریشم و کمخواب کے بستر پر سونے والی نرم و نازک شہزادی ہے، سونے کے برتن میں تیرے لیے اعلیٰ اقسام کے طعام رکھے جاتے ہوں گے، میرے ساتھ تجھے کیا ملے گا پگلی؟ میں تو کھجور سے روٹی کھاتا ہوں، چٹائی پر سوتا ہوں اور اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔''
''میری ساری آسائشیں تیرے سامنے ہیچ ہیں میرے محبوب ساون!'' سائین کے گویا دل کی عمیق گہرائیوں سے آواز نکلی، ساون نے دھیرے سے اسے خود سے الگ کیا پھر بہ غور اس کے دلکش چہرے کو تکنے لگا۔ سائین بھی اسے مخمور نگاہوں سے تکنے لگی۔ حجرے کی پرنور فضا میں عجب رنگ گھلا ہوا تھا، ایک انوکھی محبت کی خوشبو تھی جو چہار سو گردش کر رہی تھی اور غیر مرئی احساس کی ڈور میں باندھے دے رہی تھی۔
ساون کو اس طرح یک ٹک اپنی طرف دیکھتے پا کر سائین نے بہکی بہکی سرشاری سے ڈوب کر کہا۔
''اسی طرح میری آنکھوں میں دیکھتے رہو میرے محبوب! تمہیں میرے اندر تک صرف اور صرف تمہاری محبت کا سمندر موجزن نظر آئے گا۔''
''ہاں! جذبات کے اس تلاطم خیز سمندر کو میں نہ صرف دیکھ رہا ہوں، بلکہ محسوس بھی کر رہا ہوں۔'' ساون نے ہولے سے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن......'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
''لیکن کیا میرے محبوب؟'' سائین نے تڑپ کر پوچھ لیا۔ ایسے میں اس کی ملائم و سپید جلد سے گندھی پیشانی پر سیاہ ریشمی بالوں کی لٹ سی جھول گئی جس نے سائین کے ملکوتی حسن کو چندے ماہتاب بنا دیا مگر ساون کا چہرہ بھی مردانہ وجاہت کے ساتھ وقار اور نور کے امتزاج میں شوکت بہار بکھیر رہا تھا۔
''ہم تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتے۔'' ساون نے ہولے سے کہا تو سائین یکدم بے چین ہوگئی، بولی۔
''کیوں؟...... ایسی کیا بات ہے؟...... جو تم سمجھ رہے ہو یا محسوس کر رہے ہو؟''
''میری عبادت کا وقت ہونے والا ہے، تم اب جا سکتی ہو۔'' ساون نے کہہ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔
سائین جانتی تھی، اب ساون سے مزید کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی تھی، وہ خاموشی سے اٹھی اور حجرے سے نکل گئی۔

⊙⊙⊙

نور خاتون نے نوجوان ملنگ فقیر ساون کی بات پر عمل

تاج محمد آنسو اتنے کنجوس تھے کہ ان کے قریبی دوست انھیں مکھی چوس تک کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک روز ''رنڈوے کی فریاد'' لکھتے لکھتے ان کا دل چاہا کہ ایک کیلا کھائیں انھوں نے بہت کوشش کی کہ دل کو اس بیہودہ خیال سے باز رکھیں مگر بڑا کائیاں دل تھا۔ اڑ گیا کہ کیلا کھاؤں گا اور ابھی کھاؤں گا ورنہ دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔
ناچار تاج محمد آنسو ادھوری نظم چھوڑ کر اٹھے، بازار میں گئے اور پھل فروش کی گود میں ۵ پیسے کا سکہ پھینک کر بولے ''میاں ذرا جلدی سے ایک اچھا سا کیلا تو دینا۔ دیکھو، کچا نہ ہو۔''
پھل فروش نے حیرت کی ایک نظر تاج محمد آنسو پر ڈالی۔ دوسری پانچ پیسے کے سکے پر۔ سمجھ گیا کہ یہ حضرت کیلا لیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور پانچ کی جگہ چھ پیسے بھی نہیں دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مرنے مارنے پر آمادہ ہوجائیں۔ عقل اور احتیاط کا تقاضہ ہے کہ دکانداری خراب نہ کی جائے۔
بس اس نے ایک بڑا سا کیلا اٹھایا اور ان کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''یہ لیجیے سرکار، کیلا حاضر ہے۔'' پھر مسکرایا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ حضور والا کے ہاں کوئی بڑی پارٹی ہونے والی ہے۔ جس کی خاطر آپ اتنی زوردار خریداری کرتے پھر رہے ہیں۔''
تاج محمد آنسو چپ رہے۔ تاج محمد آنسو ہنس دیئے۔ تاج محمد آنسو گھر کو کھسک لیے۔ منظور تھا کھانا کیلا!

از خالدہ نسیم ...... نیوزی لینڈ

کرتے ہوئے ایک رازدارانہ ملاقات کے دوران اسے ساون فقیر سے ملاقات کرنے کا عندیہ دیا۔
''کک...... کیا تم نے اس ملنگ فقیر کو اس بارے میں سب بتا دیا؟'' خالقو کے چونکے ہوئے لہجے میں تحیر اور آنکھوں میں قدرے تشویش تھی۔
''فکر کی بات نہیں، وہ ملنگ فقیر جانے کتنے ہی لوگوں کے رازوں کا امین بھی ہے۔'' وہ از راہ تشفی بولی۔
''مگر کیوں؟ میں اس سے کیوں جا کر ملوں نور! اور کس لیے؟''
''وہ تو تجھے کچھ سمجھانا چاہتا ہے۔''
''کیا سمجھائے گا مجھے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ''یہی کہ تجھے حاصل کرنے کی راہ سے ہٹ جاؤں؟''
''میری خاطر ایک بار اس سے جا کر مل لو۔'' نور خاتون نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور خالقو نے سر جھکا لیا۔

⊙⊙⊙

بلند چھت والی اوطاق میں وڈیرا الف خان اونچے اور قدرے چوڑے پشتے والے سرکنڈوں کے بنے مونڈھے پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کا بیٹا وزیر خان بھی اس کے برابر میں موٹے نقشین پایوں والے بان کے پیڑھے پر باپ ہی کی طرح بڑے کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آٹھ دس کمدار اور کچھ مسلح کارپرداز ایک طرف سر جھکائے مودبانہ کھڑے تھے۔
''اڑے بابا پھکو! منشی آر بیلو بتا رہا تھا کہ اس بار ایک نمبر باسمتی بہت کم اتری ہے کیوں......؟''
درباری سناٹے میں وڈیرے الف خان کی گونجیلی مگر کرخت آواز ابھری۔ ایک مضبوط تن و توش کا مالک شخص جھٹ سے آگے بڑھ کے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔
''سائیں بھوتار کے سر کی خیر ہووے! آپ نے ٹھیک سنا ہے، پر سائین وڈا! اس میں میرا قصور نہیں ہے، وارے کا پانی پورا نہیں پڑتا، زمین بیاہنے کے بعد اسے فوراً اور بہت سے پانی کی ضرورت پڑتی ہے مگر......'' اس کی آواز حلق میں دب گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے الف خان کی گونجدار آواز ابھری۔
''اڑے او، جبل!''
''حاضر سائیں وڈا!'' معاً ایک قد آور اجرک پوش کارپرداز آگے بڑھا، اس کی پشت سے گن جھول رہی تھی۔
''اڑے بابا! یہ وارے کے پانی کا کیا مسئلہ ہے؟''
الف خان نے پوچھا تو جبل نامی وہ کارپرداز مودبانہ بولا۔
''سائیں بھوتار! کوئی خاص نہیں، ساتھ میں زمیندار

حاجی خدا بخش کی زمینیں لگتی ہیں، وہ محکمۂ آب والوں کو ہم سے زیادہ آبیانہ دیتا ہے اس لیے...... وارے کا بہت سا پانی اس کے حصے میں چلا جاتا ہے۔"

اس کی بات پر وڈیرے الف خان کے گھنی مونچھوں اور ڈاڑھی بھرے چربیلے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ ابھری۔ پھر پر غرور لہجے میں بولا۔ "ڈھل (ٹیکس) اور آبیانہ تو ہم بھی دیتے ہیں، تھوڑا ہے تو کیا ہوا، دیتے تو ہیں ناں، آئندہ سے ہمیں وارے کا پانی بھی زمیندار حاجی خدا بخش کا نصف ملنا چاہیے۔"

"بابا سائیں! ہم کل ہی پانی کاٹ کر برابر کر لیتے ہیں، بھلا یہ بڈھا خدا بخش ہمارا کیا بگاڑ لے گا، وہ تو خود چارپائی سے لگا ہوا ہے۔" اس بار اس کے بیٹے وزیر خان نے کہا تو الف خان نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

◉◉◉

"تم آگ اور پانی کا کھیل کھیل رہے ہو جوان!" ساون فقیر نے اپنے سامنے موجود خالقو کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ فقیر ہمیشہ تم لوگوں کی بھلائی اور فلاح کی بات کرے گا۔"

جواباً خالقو نے سر اٹھا کے ساون فقیر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تو کیا میں بھلائی کا کام نہیں کر رہا، ایک زندہ درگور اور مجبور عورت سے بیاہ کر کے......؟" ساون نے بہ غور اس کے چہرے پر اپنی پرجلال نظریں گاڑ دیں پھر بولا۔

"جس دروازے سے گزر کر یہ کام تم کرنا چاہتے ہو، اس کے ایک ذرا کھٹکے سے تمہارا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ نہ تم زندہ بچو گے نہ نور خاتون۔"

"محبت کی خاطر کوئی نہ کوئی دروازہ تو پار کرنا ہی پڑتا ہے، ملنگ سائیں!" خالقو بولا۔

"لیکن محبت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم دانستہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی اور دوسرے کی موت کا سامان پیدا کرو۔" حجرے میں ملنگ ساون کی آواز ابھری۔

"تو پھر میں اسے کس راستے سے حاصل کروں؟"

"در سے حاصل کرو، اللہ کے در سے۔ اس سے لو لگا لو، پھر وہ جو بہتر کرے اس پر شاکر رہو، اسی میں سب کی بھلائی ہے۔" ساون ملنگ بولا۔

"میں اب یہاں سے جانا پسند کروں گا۔" خالقو نے کہا۔

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو، مگر میری بات پر غور ضرور کرنا۔" ساون نے آخر میں اسے دعا دیتے ہوئے تنبیہ بھی کر ڈالی۔

خالقو درگاہ سے نکل گیا۔ اسے یہ بات شروع ہی سے اچھی نہیں لگی تھی کہ نور خاتون نے اس کا ذکر بابا کالی چادر والے درگاہ کے ملنگ سے کر ڈالا تھا۔

اس سلسلے میں خالقو کا نظریہ مختلف تھا، وہ زور بازو کو سب کچھ سمجھتا تھا کہ یہ طاقت بھی اللہ ہی عطا کرتا ہے، اسے اپنے آپ پر پورا یقین تھا کہ اگر نور نے اس کا ساتھ دیا تو وہ اسے جابر باپ وڈیرے الف خان اور اس کے کارندوں کی پہنچ سے دور لے جائے گا، جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار نور سے کرتا رہتا تھا مگر نور خوف زدہ رہتی تھی، اگرچہ اسے بھی یہ جی دار مرد اچھا لگنے لگا تھا جو اس کی خاطر موت تک سے ٹکر لینے کو تیار تھا مگر بات وہی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسے، اپنی زندگی تو اس کی ویسے ہی زندہ درگور کر دی گئی تھی، نہیں چاہتی تھی کہ خالقو جیسا جیتا جاگتا تگڑا اور خوش باش آدمی کسی کڑی آزمائش کی نذر ہو جائے۔ نور خاتون کو اس سلسلے میں ملنگ ساون کی باتیں بھی یاد آئی تھیں، وہ کہتا تھا کہ محبت کو دل کے دروازے سے حاصل کرنے والے اس کی فلاح اور بھلائی کا بھی خیال رکھیں، اللہ کے در پہ سجدہ ٹیک کے بہتری کی دعا مانگیں، یوں دیوانہ وار جانتے بوجھتے موت کے منہ میں خود کو لے جانا کفر کے زمرے میں بھی آ سکتا تھا۔

لہٰذا ملنگ فقیر ساون کی یہی تعلیمات نور خان کو ازبر تھیں اور وہ خالقو کا ساتھ نہ دینے پر مجبور تھی لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی کہ وہ بہرحال ایک عورت بھی تھی، جوان اور صحت مند عورت' اس کے سینے میں بھی آگ کو دیکھ کر تپش اٹھتی تھی، احساس محرومی تو ایسی زنجیر ہے جسے آدمی توڑ کے پھینک دینا چاہتا ہے۔

لہٰذا اب نور خاتون حصوں میں بٹ گئی تھی، ملنگ ساون فقیر کے در پہ جاتی تو پائے استقلال میں ایک ذرا بھی لغزش نہ محسوس کرتی اور جب خالقو ایک محبوب نما اس کا نجات دہندہ بن کے دل کے دروازے سے اندر آنے کی سعی کرتا تو وہ ڈھے سی جاتی۔ خالقو کے جذبۂ دل سے وہ اپنے جذبات کو مماثل پانے لگتی۔

◉◉◉

وزیر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ پانی کی حد بندی والی جگہ پر پہنچا اور پھر اس نے اپنے کارندوں کو زمیندار حاجی خدا بخش کے حصے کا پانی کاٹنے کا حکم دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی، آبی کھالوں میں بیلچے اور پھاوڑے چلنا شروع ہو گئے۔ خدا بخش کے ہاری قریب ہی زمین پر کام کر رہے تھے، ان بے

چارے غریبوں کو تو انہیں پانی کاٹنے سے روکنے کی جرأت نہ ہو سکی، البتہ وہ سرپٹ دوڑتے ہوئے اس کی اطلاع دینے حاجی خدا بخش کے یہاں جا پہنچے۔ وہ تو بے چارہ فالج زدہ مریض کی طرح چارپائی پر اٹوائی کھٹوائی پڑے رہتا تھا، البتہ اس کی بیٹی سائین سے انہوں نے اس بات کا ذکر کیا۔ جوش غیظ سے سائین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لہٰذا اس نے بھی اپنے چند مسلح کارندوں کو تیار کیا اور جیپ میں سوار ہو کے مذکورہ مقام تک جا پہنچی۔

وہاں وزیر خان بہ نفس نفیس خود کھڑا اپنے سامنے زمیندار حاجی خدا بخش کے حصے کا پانی کاٹ رہا تھا۔ اس کے آدمی بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

دفعتاً فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور کام کرتے ہوئے ہاتھ تھم گئے، وزیر خان نے بڑی نخوت سے فائر کی سمت دیکھا۔ ایک ڈبل ڈور پجیرو قریب کھڑی تھی اور قریب اس کے چار پانچ مسلح آدمیوں کے درمیان میں اسے حاجی خدا بخش کی لاڈلی بیٹی سائین ہاتھ میں رائفل پکڑے کھڑی نظر آئی۔ جیسے ہی وزیر خان کی نگاہ اس پر پڑی، سائین نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور وزیر خان کے بالکل قریب پہنچ کر وہ سخت برہم لہجے میں اس سے بولی۔

"کیا اب اونچے شملے والے زمینداروں کی حیثیت اتنی کمتر ہو گئی ہے کہ وہ خود کھڑے ہو کر بڑی ڈھٹائی سے پانی کی چوری کروانے لگے ہیں۔" طنز اور طیش میں بجھے ہوئے ان الفاظ نے وزیر خان کا چہرہ سرخ کر دیا۔ ایک عورت کے منہ سے اپنے کمداروں کے سامنے ایسی سخت اور طنزیہ بات، کم از کم وڈیرے الف خان کے بیٹے وزیر خان کے لیے کسی طور بھی قابل برداشت نہ تھی، وہ انا، جبر اور مطلق العنانی میں اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا، آج ایک عورت کی زبان سے جو ضرب اس کی پرغرور، انا اور اکڑفوں پر پڑی تھی، وہ ایسے انسان کو زبان کی بولی کے بجائے بندوق کی گولی سے جواب دینے کا عادی تھا اور ہوا بھی وہی، وزیر خان نے یکلخت اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی سائین پر تان لیا اور انگلی ٹرائیگر پر تھر کنے لگی۔

"خوب! کیا اب عورتوں پر بھی گولی چلانے کا ایک نیا شیوا اختیار کرنا چاہتے ہو، تو چلاؤ گولی وزیر خان! یہ کھلونا مجھے بھی چلانا آتا ہے۔" سائین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اپنی رائفل بھی سیدھی کر لی۔ اب دونوں ایک دوسرے کی گولی کی زد میں تھے کہ اچانک سائین کے ایک آدمی نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور اچانک وزیر خان کا پستول والا ہاتھ آہستگی سے نیچے کر دیا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کے مودبانہ بولا۔ "چھوٹے سائیں! اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں، اس غلام کی جان وڈے سائین (الف خان) اور آپ پر قربان، اس عورت سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ابھی چلیں اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے، میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔"

وزیر خان نے پر طیش نظروں سے سائین کی طرف آخری بار دیکھا اور زمین پر تھوک کے پستول دوبارہ ہولسٹر میں اڑس لیا اور اس دوران اس شخص نے اچانک سائین کی رائفل کی نال پکڑ کے آہستگی سے نیچے جھکا دی۔ پھر اس کے سامنے آ کے بولا۔

"سائین! ہم معافی چاہتے ہیں، ہم سے غلطی ہو گئی۔ معاملے پر بات کرنے کے بجائے جھگڑے کی شروعات کر ڈالی۔" وزیر خان کا غصہ کم نہ ہوا تھا، مگر اس اثنا میں وہی آدمی جلدی سے مودبانہ لہجے میں سائین سے بولا۔

"بی بی جی! اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، مگر اس میں آپ کی، ہم سب کی بھلائی ہے، اللہ کا واسطہ ابھی چلے چلو یہ مردار خوروں کا غول ہے، ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، بعد میں اس مسئلے کو دیکھ لیں گے، میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔" اس چاکر کا نام مراد علی تھا، سائین نے کچھ سوچ کر رائفل جھکا دی۔ پھر اس کے بعد یہ لوگ پلٹ گئے۔

فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ پجیرو میں سوار ہوتی ہوئی سائین اور اس کے آدمی لمحہ بھر کو ٹھٹکے۔ وزیر خان کے آدمیوں نے فاتحانہ انداز میں ہوائی فائرنگ کی تھی۔

سائین وغیرہ کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھا دی۔ سب خاموش تھے، جیپ کا سفر جاری تھا۔ سائین کے چہرے پہ ابال کی کیفیت تھی وہ اندرونی طور پر شدید تناؤ کا شکار تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے ان کے حصے کا پانی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کاٹا جا رہا تھا اور ان کے ساتھ چوری اور سینہ زوری والا سلوک بھی روا رکھا گیا تھا۔ مراد علی کے بروقت اقدام نے انہیں اگرچہ ایک بڑی خوف ناک جنگ سے بچا لیا تھا، یوں بھی جانی نقصان ان کا ہی ہوتا، وزیر خان کے آدمیوں کے مقابلے میں یہ صرف چند افراد تھے لیکن اس طرح میدان چھوڑنا بھی انہیں بار بار کچوکے لگا رہا تھا، غیظ اور غیرت کی آگ تھی جو ان سب کو اندر ہی اندر سلگا رہی تھی، سائین کا تو معاملہ ہی اور تھا...... باپ خدا بخش پر بڑھاپے اور فالج کا حملہ ہوتے ہی اس نے یہ عزم صمیم کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے باپ کا بازو بنے گی اور اپنی

جاگیر کے ایک ایک انچ کے ٹکڑے کی نگرانی کرے گی تاکہ کوئی ان پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔ چنانچہ تب سے اب تک اس نے سارے معاملے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ مراد علی اس سلسلے میں سائین کا معاون ومددگار تھا اور مشیر بھی بعض اہم معاملات پر سائین اپنے باپ کے اس خاص آدمی پر بہت بھروسا کرتی تھی۔

''ہم کدھر جارہے ہیں اب مراد علی؟'' کافی دیر تک کی پرتپش خاموشی کے بعد سائین نے بارعب لہجے میں اپنے خاص آدمی سے پوچھا۔

''وڈیرے الف خان کی اوطاق، اس سے ملنے تاکہ اس کے بیٹے کی شکایت کرسکیں۔'' مراد علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کی بات پر سائین کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اسی لہجے میں مراد علی سے بولی۔ ''ایک شیطان کی شکایت دوسرے شیطان سے کرنے کا فائدہ؟''

''یہ محض خانہ پری ہوگی چھوٹی بی بی!'' مراد علی نے مودبانہ متانت سے کہا۔

''ہم سمجھے نہیں۔'' سائین کچھ الجھ سی گئی۔

مراد علی نے صراحت میں کہا۔ ''بی بی جی! محکمۂ آب پاشی والوں کے ہاں جانے سے پہلے وڈیرے الف کے علم میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ اس کا بیٹا اور اس کے گماشتے آخر کس کے ایما پر پانی کاٹنے کا جرم کررہے ہیں۔'' سائین اس کی بات کا مطلب جان کر چپ ہورہی۔

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ یہ لوگ وڈیرے الف خان کی اوطاق میں جا پہنچے مراد علی نے سائین سے جیپ میں ہی بیٹھے رہنے کی درخواست کی تھی، جسے اس نے رد کردیا اور چند آدمیوں کے ساتھ، جیپ سے اتر کر اوطاق میں داخل ہوگئی۔

اوطاق میں اس وقت چند ہی لوگ تھے، البتہ وڈیرا الف خان اپنے مخصوص مونڈھے پر براجمان تھا۔ سائین پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا گیا۔ سائین سے ابھی وہ واقف نہ تھا مگر زمیندار حاجی خدا بخش کے حوالے سے اس کا نام ضرور سنا تھا، تاہم اوطاق پر تعینات ایک خدمت گار نے اس کے کان میں سرگوشی کرکے اسے سائین کے سلسلے میں آگاہ کردیا تھا۔

سائین، پروقار چال چلتی ہوئی وڈیرے کے قریب پہنچی تو الف خان یکدم اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے ایک بڑی سی اجرک کی ریشمی چادر الف خان کو تھما دی، جسے الف خان نے فوراً نہایت عزت واحترام کے ساتھ سائین کے سر پر ڈال دیا اور خالص روایتی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر بھی رکھ دیا۔

''اس عزت افزائی کا شکریہ سائیں مان وارا...... لیکن افسوس سے مجھے کہنا پڑرہا ہے کہ میں اس وقت آپ کے بیٹے وزیر خان اور......'' اس کے بعد سائین نے اپنی شکایت اس کے گوش گزار کردی، نیز یہ بھی بتادیا کہ اس کے لاڈلے بیٹے وزیر خان نے اس پر پستول بھی تان لیا تھا۔

سائین اور مراد علی سمیت اس کے چار پانچ آدمیوں کو اس وقت شدید حیرت ہوئی جب وڈیرے الف خان نے ان کی توقع کے برخلاف اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ سب سے پہلے تو وڈیرے الف خان نے انہیں عزت واحترام سے اپنے پاس بٹھایا پھر اسی وقت اپنے خاص آدمیوں کو سخت حکم کے ساتھ اپنے بیٹے وزیر خان کو اپنی اوطاق میں طلب کرنے کے لیے روانہ کردیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ وزیر خان اپنے کارندوں کے ساتھ حیران پریشان سا اوطاق میں داخل ہوا، اور پھر سائین وغیرہ پر نگاہ پڑتے ہی اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

''اڑے تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' بیٹے کو دیکھتے ہی وڈیرے الف خان نے سخت نظروں سے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

وزیر خان باپ کی اس کایا پلٹ پر مزید اچھنبے میں پڑ گیا۔ بولا۔ ''لل...... لیکن...... بابا سائیں!......''

''اڑے بس کر اب، خبردار جو آئندہ اوڑی سائین کے حصے کا پانی کاٹنے کی کوشش کی تو......'' وڈیرے الف خان نے برہمی والے انداز میں بیٹے کی بات کاٹ دی، کیونکہ وہ شاید جانتا تھا کہ اس کا بیٹا یہی کہنے والا ہے کہ یہ سب اس کے (الف خان) کے حکم سے ہی تو کیا گیا تھا۔ مگر باپ کے اس طرح یکدم کینچلی بدل لینے پر خود بیٹا وزیر خان بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔

''چل! آگے بڑھ اور اوڑی سائین سے معافی مانگ...... جلدی کر......'' باپ نے ایک اور حکم دیا۔ ناچار بیٹے کو باپ کی بات ماننا پڑی۔ وہ سائین کی طرف آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وڈیرے الف خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔ ''بس سائین چاچا! اب اس کی ضرورت نہیں، آپ نے میرا مان رکھ لیا یہی بہت ہے۔ اب ہمیں جانے کی اجازت چاہیے۔''

تھوڑی دیر بعد سائین اپنے کارندوں کے ساتھ جیپ میں واپس لوٹ رہی تھی۔

⊕⊕⊕

شام کا وقت تھا، دور مغربی افق پر نارنجی سناٹے اترنے لگے تھے۔

ایک لمبی چوڑی نئے ماڈل کی انٹرکولر زمیندار حاجی خدا بخش کے مکان سے ملحق اوطاق کے سامنے رکی، وہاں موجود چند ایک خدمت گار گاڑی کو پہچانتے ہی بری طرح بدکے تھے، پھر تو جیسے یہاں سے وہاں بھاگم دوڑی مچ گئی۔ کوئی مکان کے دروازے کی طرف دوڑا تو کوئی اوطاق کے اندر جا گھسا۔ دو ایک وہیں سٹپٹائے سے کھڑے رہ گئے اور ہونقوں کی طرح گاڑی کی طرف دیکھنے لگے، شاید ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

کھٹا کھٹ دروازے کھلے، چار قدآور مسلح افراد بڑی تیزی سے نیچے اترے اور نہایت پھرتی کے ساتھ دو افراد نے گاڑی کے دونوں طرف کے بیک وقت دروازے کھولے تھے، دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ اترے تھے۔

یہ وڈیرا الف خان اور اس کا بیٹا وزیر خان تھا۔

الف خان کے مخصوص اشارے پر ایک کارندہ فوراً حرکت میں آیا اور گاڑی کے عقبی حصے سے پھل اور مٹھائی کے دو بڑے بڑے ٹوکرے نکال لایا۔

وہاں موجود چاکروں نے نہایت مودبانہ انداز میں دونوں باپ بیٹے کا استقبال کیا اور انہیں اوطاق میں لے آئے، ان میں چاکر خاص مراد علی بھی شامل تھا جو وڈیرے الف خان جیسے آدمی کو بہ نفس نفیس موجود پاکر اندر سے حیران بھی تھا اور الجھا ہوا بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ماجرا کیا تھا؟ وڈیرا الف خان تو ناک پہ مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا وہ یہاں کیسے آگیا؟ وہ بھی اپنے جوان بیٹے سمیت۔

''بابا ہمیں حاجی صاحب سے ملنا ہے۔'' وڈیرے الف خان نے مراد علی سے کہا۔

''ضرور سائیں وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جاکر......'' مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آکر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ''اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہوگیا ان سے ملے۔''

''ضرور سائیں وڈا! آپ نے ہمارے غریب خانے پر پاؤں رکھ کر اس کی رونقیں بڑھادیں، آیئے میرے ساتھ تشریف لائیں۔'' سائین نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد الف خان اور اس کا بیٹا مکان کے اندر ایک ہال کمرے میں تھے، ان کے سامنے بڑی سی موٹی نقشین پایوں والی مسہری پر اسی بچاسی سالہ انتہائی ضعیف شخص صاحب فراش حالت میں نیم دراز تھا۔ یہ سائین کا باپ حاجی خدا بخش تھا۔ اس کا دایاں حصہ فالج گرنے کے باعث مفلوج ہوچکا تھا تاہم وہ تھوڑا بہت بول اور سن لیتا تھا، مقدور بھر ہاتھوں کو جنبش دینے کی سکت رکھتا تھا۔ اس کی یادداشت بھی اس حد تک ہی متاثر ہوئی تھی کہ اگر کوئی یاد دلاتا تو وہ پہچان لیتا تھا، جیسا کہ اب ہوا، سائین نے باپ کے قریب ہوکے دھیرے سے اسے کان میں بتایا تھا کہ...... وڈیرا الف خان اور اس کا بیٹا وزیر خان ان کی عیادت کو آئے ہیں، یہ سن کر حاجی خدا بخش کے بشرے پر واضح طور پر چونکنے کے آثار نمودار ہوئے تھے، گویا اسے بھی ان کی آمد غیر متوقع لگی تھی۔

وڈیرا الف خان اور وزیر خان نے باری باری حاجی خدا بخش کا ہاتھ تھام کے اسے سلام کیا تھا۔ پھر خدا بخش کے لب مرتعش ہوئے۔ ''الف...... خان! تت...... تمہیں اپنے پاس...... اتنے قریب دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔'' اس کی آواز نحیف سی تھی۔

الف خان جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کے بولا۔ ''کیوں شرمندہ کرتے ہو بابا حاجی صاحب! آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے تو مجھے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا، مگر کیا کروں زمینوں کے مسائل ہی اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اپنی بھی خبر نہیں تھی اور پھر بابا حاجی صاحب! ہمارے یہاں آنے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا ایک نظر قریب کھڑی سائین کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''ہم آپ سے معافی بھی مانگنا چاہتے ہیں۔''

''معافی......؟ کیسی معافی؟'' حاجی خدا بخش ہولے سے کپکپایا تو وڈیرے الف خان نے ایک نظر سائین پر ڈالی اور نرمی سے بولا۔

''تو نے ابھی تک اپڑیں بابا جانی سے ہماری شکایت نہیں کی؟''

جواباً سائین نے اپنے سر کی چادر درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''چاچا سائیں! شکایت کیسی؟ جب آپ نے خود ہی سارا معاملہ حل کردیا۔''

حاجی خدا بخش حیران پریشان تھا، اس نے بیٹی کی

طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا تو سائیں نے باپ کو پانی کی چوری سے متعلق ساری بات گوش گزار کردی۔

''ارے الف خان! یہ بھی بھلا کوئی معافی مانگنے والی بات ہوئی، جب تو نے خود ہی ہماری دھی (بیٹی) سائیں کا بڑا بن کر الٹا اپنے بیٹے وزیر خان کو ڈانٹ دیا تو...... وزیر خان ہمارا بھی بیٹا جیسا ہے تھوڑا ہمارے لیے بھی حق چھوڑ کہ اس نالائق کے کان کھینچیں۔'' یہ کہتے ہوئے خدا بخش نے باپ کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے وزیر خان کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا جھکا ہوا سر حاجی خدا بخش کے قریب کر دیا۔ جس پر حاجی خدا بخش نے اپنا دست شفقت گھما دیا۔

''بس! سائیں مان وارا خدا بخش صاحب!'' وڈیرا الف خان جھٹ سے بولا۔ ''اب اس نالائق کو آپ اپنی فرزندگی میں لے لو...... یہی میری خواہش ہے۔ سائیں جوان دھی ہے، کب تک بٹھائے رکھو گے۔''

وڈیرے الف خان کی بات پر خدا بخش کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ خود سائیں گم صم سی ہوگئی۔

''کیا کوئی اعتراض ہے تجھے بابا خدا بخش! یا میرے بیٹے وزیر خان میں کوئی کمی ہے؟'' الف خان اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس اثنا میں سائیں نے وہاں کھڑے رہنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

''شرما گئی پگلی......'' باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔ لوہا گرم دیکھ کر وڈیرے الف خان نے بیٹے کو اشارہ کیا۔ وزیر خان نے فوراً چاکر کو حکم دیا۔ چاکر مٹھائی اور پھل کے ٹوکرے سنبھالے آگے بڑھا اور بڑی آہستگی سے حاجی خدا بخش کی مسہری کے قریب رکھ دیے۔

''اس کی کیا ضرورت تھی یار الف خان!''

''یار بھی کہتا ہے اور تکلف بھی برتتا ہے۔'' الف خان اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''مجھے فوراً تاریخ چاہیے، میں نہیں چاہتا یہ نالائق مزید آوارہ ہو جائے، سائیں بیٹی اس کی ناک میں نکیل ڈال کے رکھے گی۔''

''ارے نہیں...... نہیں، بابا الف خان! پٹ وزیر خان تو ہمارا ہونہار اور اچھا لڑکا ہے، بس ذرا جوانی کا نشہ ہوتا ہے، ہم پر بھی تو کبھی یہ نشہ چڑھا تھا، یاد نہیں ہے، فصلوں کی بٹائی پر ہم دونوں کس بری طرح سے لڑے تھے۔''

''ہاں! یاد ہے، خدا بخش! بس ہا۔ گتھم گتھا ہونے کی دیر تھی۔''

حاجی خدا بخش اپنی سادگی سے مار کھا رہا تھا اور وڈیرا الف خان اسے اپنی چالاکی سے پچھاڑے جا رہا تھا، بالآخر حاجی خدا بخش نے آخر میں نیم رضامند ہونے کے انداز میں کہا۔

''یار الف خان! سچ پوچھے تو تیری بات پر آج مجھ بوڑھے کو بہت خوشی ہوئی ہے، پر یار! سائیں دھی کو میں نے بڑے لاڈ، چاؤ اور محبت سے پالا ہے، مجھے تھوڑی مہلت دے دے، میں اس کا بھی عندیہ لے لوں۔''

''عورتوں سے کیسا عندیہ لینا بابا خدا بخش!'' الف خان بولا۔ ''ہمیں یقین ہے، بھلا سائیں بیٹی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟''

''پھر بھی الف خان! بیٹی کا تو عندیہ میں ضرور لوں گا، زندگی اسے گزارنی ہے، ہم بڈھوں کا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔''

''مرنے کے تو تیرے دن قریب ہیں خدا بخش! میں تو ابھی بڈھا نہیں ہوا۔'' الف خان نے دل میں کہا پھر بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے، ذرا جلدی جواب دے دینا۔'' یہ کہہ کر دونوں باپ بیٹے رخصت ہوگئے۔

☉☉☉

وڈیرا الف خان بلا کا عیار اور غاصبانہ سوچ رکھنے والا...! ایک جابر اور مطلق العنان شخص تھا۔ نہ اسے خدا بخش سے دلچسپی تھی نہ اس کی بیٹی سائیں سے، یہی حال اس کے بیٹے وزیر خان کا تھا، یہی سبب تھا کہ جب باپ نے اسے سائیں سے شادی پر آمادہ کرنا چاہا تو اس نے باپ کی چال سمجھے بغیر صاف انکار کر دیا تھا۔

''اڑے بے وقوف! شادی تو محض ڈراما ہوگا، میری نظریں خدا بخش کی ان زمینوں پر ہیں جو سندھو دریا کے رخ پر ہیں اور اس وجہ سے بہت پھل پھول رہی ہیں، دوسری اہم بات یہ کہ اس کی ساری زرخیز زمینیں ہماری جاگیر کے ساتھ بالکل ملی ہوئی ہیں۔ سوچو ذرا وزیر خان! اگر خدا بخش کی یہ زمینیں بھی ہماری جاگیر میں شامل ہو جائیں تو ہم کتنی بڑی جاگیر کے مالک کہلائیں گے۔ خدا بخش لب مرگ ہے، کسی وقت بھی اس کے گلے میں اٹکی ہوئی سانس نکل سکتی ہے، پھر سب کچھ تیری ہونے والی بیوی سائیں کا ہوگا۔''

باپ کی بات بیٹے کی سمجھ میں آگئی، حرص و طمع کی چمک نے دونوں باپ بیٹے کو اندھا کر دیا تھا، تاہم بیٹے نے قدرے الجھ کر باپ سے ایک سوال کیا۔

''مگر بابا سائیں! تو کیا ہمیں اس بڈھے خدا بخش کے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا؟''

''ہاں؟'' الف خان بولا۔ ''تب تک تو اس کی بیٹی یعنی اپنی ہونے والی بیوی سائیں کے ناز نخرے اٹھاتے رہنا۔''

''سائیں میری پسند نہیں ہے، میں شاید اس سے زیادہ محبت نہیں جتا سکتا۔''

''دولت حاصل کرنے کے لیے سب کرنا پڑتا ہے، پٹ وزیرا! ایک بار زمینوں کا مالک بن جانے دے پھر سائیں کو حویلی کے کسی کونے میں گلنے سڑنے کے لیے پھینک دیں گے۔'' وڈیرے الف خان کے مکروہ لہجے میں بڑی سفاکی تھی اور باپ کا منصوبہ جاننے کے بعد بھی بیٹے کے بدہیئت ہونٹوں پر بھی بڑی کریہہ مسکراہٹ تھی۔

☉☉☉

''نہیں بابا جانی! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' سائیں نے باپ کی بات سن کر اٹل لہجے میں کہا۔ ''وزیر خان کس قماش کا آدمی ہے، یہ میں ہی نہیں پورا گوٹھ جانتا ہے اور بابا جانی! وڈیرے الف خان کی خصلت سے تو تو خود بھی ذاتی طور پر واقف ہوگا۔ مجھے تو اس وقت ہی دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا تھا جب دونوں باپ بیٹے مٹھائی اور پھل کے ٹوکرے لیے اچانک یہاں آن پہنچے تھے۔''

خدا بخش نے غور سے بیٹی کی بات سنی، وہ اس کا عندیہ لے چکا تھا، وہ بیٹی پر شادی کے لیے ہرگز دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا تھا، تاہم نحیف سی آواز میں بولا۔ ''دھیئے! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، میں تو چاہتا تھا تجھے اپنی زندگی میں وداع کردوں۔''

''بابا جان! ایسی باتیں نہ کریں، اللہ سائیں آپ کو بڑی عمر دے، آپ میری فکر نہ کریں، میں بچی نہیں ہوں، اپنا برا بھلا سب جانتی ہوں اور یہ بھی جان سکتی ہوں کہ کون، کیوں مجھ سے شادی کا خواہش مند ہوسکتا ہے، مگر میں نے سوچ رکھا ہے، شادی کروں گی تو کسی غریب شریف اور سادہ دل انسان سے جسے میری زمین جائداد سے نہیں، صرف مجھ سے محبت ہو۔'' یہ کہتے ہوئے سائیں کے تصور میں، ملنگ فقیر ساون کا چہرہ رقصاں ہونے لگا اور وہ اس کے خیالوں کھو گئی۔

☉☉☉

خالقو، نور خاتون کے عشق کے جام جم میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا، اس پر کوئی نصیحت اور کوئی تنبیہ اثر نہیں کر رہی تھی اور اس کی دیوانگی و فرزانگی سے نور خاتون پریشان تھی، اسے اپنی فکر نہ تھی مگر اس دیوانے کی جان کی طرف سے تشویش زدہ ہو رہی تھی جو اسے حویلی سے لے کر بھاگنے کے لیے پر تولے بیٹھا تھا۔

''آج مجھ سے صاف بات کر لو نور! تم چلوگی ہمیشہ کے لیے میرے ساتھ یا پھر میں اپنا سر تمہاری اس بلند و بالا حویلی کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پھوڑ ڈالوں۔''

اس روز بالآخر خالقو نے نور سے حتمی لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر نور لرز گئی۔

''ہاں نور! میں سچ بول رہا ہوں۔'' وہ اس کی اپنی جانب تکتی، پھٹی پھٹی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولا۔

''لل...... لیکن، ہم جائیں گے کہاں؟'' نور کے لب مرتعش ہوئے۔

''کہیں بھی چلے جائیں گے، اللہ سائیں کی زمین بہت بڑی ہے۔''

''ہم مارے جائیں گے، نہیں بچیں گے ہم خالقو۔'' نور تڑپ کر بولی۔

''تو بزدل ہے، تو یہی چاہتی ہے کہ تجھے ادھر ہی گھٹ گھٹ کر مار دیا جائے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''میں بزدل نہیں ہوں، نہ ہی مجھے اپنی جان کی پروا ہے، میں تو صرف تیری زندگی چاہتی ہوں۔''

''میری زندگی تمہارے وجود سے ہے، نورا!'' خالقو نے بے قرار ہو کے اس کے دونوں بازو تھام لیے۔ وہ کپکپا سی گئی۔

''تمہارے بغیر میری زندگی روکھی پھیکی اور بے رنگ ہے نورا! مان لو میری بات، خود پر اور مجھ پر ظلم نہ کرو۔ آج ہمارے پاس اس منحوس جگہ سے نکل بھاگنے کا بہت اچھا موقع ہے۔'' وہ بولا۔ ''سائیں وڈا اور وزیر خان گوٹھ سے باہر گئے ہوئے ہیں، ابھی شام ہونے والی ہے، میں ایک عدد تیز رفتار بیل گاڑی کا بھی بندوبست کر چکا ہوں۔'' اس نے آخری بار نور کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ نور اس کی طرف بہ غور اور گہری نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اس نے کبھی خالقو کی باتوں پر غور نہ کیا تھا، اسے خالقو پر، اس کی بے لوث محبت پر مکمل بھروسا بھی تھا، یہ بھی اسے خوب اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے والا بھی نہیں، مگر باوجود اس کے نور نہیں چاہتی تھی کہ خالقو اپنی گبرو جوانی کو اندھی نار میں جھونک ڈالے، مگر وہ دیوانہ آج شاید یہ سب سامان کر کے ہی آیا تھا۔

''آؤ، نورا! چلو میرے ساتھ ابھی، ورنہ وقت نکل گیا تو پچھتاوے کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔'' خالقو نے دونوں ہاتھ سے اسے یوں تھامے رکھا تھا جیسے اب کبھی بھی اس سے

علیحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خالقو کے والہانہ پن، محبت کی دیوانگی اور بے لوث چاہت نور خاتون کے خستہ دل میں بھی گھر کر چکی تھی اور وہ اس کی بے قراری، بے چینی اور دیوانہ وار راہ پرخار کی جانب پیش قدمی کے لیے بے صبری پرواری بھی جا رہی تھی۔

''تھوڑا ٹھہر جاؤ، میں کچھ ضروری سامان اٹھالوں۔'' بالآخر نور خاتون نے کہا اور خالقو کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ روشن ہو گئے، وہ وہیں سنسان راہداری میں ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ نور کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

حویلی کے بلند و بالا در و دیوار پر شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ اوطاق میں موجود کچھ لوگوں کے وقفے وقفے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، وہاں روشنی بھی تھی۔ حویلی کے اندر البتہ عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔

خالقو ایک کونے میں کھڑا تھا، ابھی سردست اس نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ اسے کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا۔

اچانک وہ ایک کھٹکے کی آواز پر چونکا۔

''اوئے خالقو! تو ادھر کھڑا کیا کر رہا ہے؟'' ایک گرج دار آواز سنسان راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونج گئی، خالقو بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ نک چڑھی روشاں تھی، وڈیرنی کی خاص خدمت گار۔۔۔ منہ پھٹ اور منہ چڑھی، پکی عمر کی تھی اور غیر شادی شدہ بھی، اس کا لہجہ ہمیشہ روکھا ہوتا تھا، خود ملازمہ ہوتے ہوئے حویلی کے ملازمین پر ہر وقت حکم چلاتی رہتی تھی۔ موٹی اور کالی سی تھی، شکل سے ہی مرد مار نظر آتی تھی۔ مرد نوکروں کو بھی جوتے کی نوک پر رکھتی تھی، سب اس سے ڈرتے تھے، یہ وڈیرنی کو شکایت لگانے میں دیر نہیں لگاتی تھی اور اسی لیے حویلی کے تقریباً سبھی چاکر نوکر اس سے دبتے تھے۔

یہی سبب تھا کہ اس جیسی ڈھنڈورچی عورت کو ایسے نازک وقت میں دیکھ کر خالقو کی جیسے روح ہی فنا ہو گئی، اس کا جی تو چاہا کہ اس موٹی کالی ڈائن کی گردن ہی مروڑ ڈالے، مگر یہ آسان نہ تھا۔

''وہ...... میں...... ایسے ہی، وزن پاڑیں کرنے کا سوچ رہا تھا، یہ کونا مجھے اچھا لگا تو آ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کام مجھ سے؟'' خالقو نے بات بنائی، نوکروں چاکروں کا حویلی کے دور افتادہ کونوں کھدروں میں نشہ، بیڑی اور چرس بھنگ چھپ چھپ کے پینا عام بات تھی، اس لیے خالقو کی بات مائی عجیباں پر کارگر ثابت ہوئی، مگر ایک مشکل ضرور جان کو آ گئی، مائی عجیباں نے ہاتھ بڑھا دیا اور بڑے ٹھسے دار لہجے میں بولی۔ ''لا مجھے بھی ایک بھنگ کی بوٹی دے۔''

خالقو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''بھنگ تو نہیں ہے میرے پاس اماں!''

''تو پھر یہاں چوروں کی طرح کھڑا کیا کر رہا ہے؟'' مائی عجیباں نے تیوری پہ بل ڈال کے پوچھا۔

''کاسو کا انتظار کر رہا تھا، وہ ابھی آنے کا کہہ کر گیا تھا۔'' خالقو نے جلدی سے بہانہ بنایا۔

''اچھا...... اچھا، لے آئے تو مجھے بھی تھوڑی بوٹی (بھنگ) چکھا دینا۔'' وہ ہاتھ نچا کے بولی اور ایک طرف کو چلی گئی۔ خالقو نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر وہ مائی عجیباں کی آنکھوں میں ابھرنے والے تشکیک کے سائے بھانپ چکا تھا، صاف لگتا تھا کہ اسے خالقو کی طرف سے کوئی کرید پڑ گئی تھی۔ خالقو نے خود کو تسلی دی، ابھی تھوڑی دیر میں نور اپنا ضروری سامان سمیٹ کے آ جائے گی پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس منحوس جگہ کو خیرآباد کہہ دیں گے۔

نور آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بقچی تھامے ہوئے تھی، اس پر چادر تھی، اسے اپنے ساتھ مائل بہ رخصت پا کر خالقو کا دل مسرت و شادمانی سے بھر گیا مگر جب اس نے مدھم سی روشنی میں نور کا اداس چہرہ دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

''یہ کیا نور؟ تم روتی ہو؟'' اس نے ملائمت آمیزی سے پوچھا۔

''ہاں خالقو!'' وہ سسک کے دھیرے سے بولی۔ ''پتا نہیں ہمارا انت کیا ہو؟ ہمارا کیا انجام ہو؟''

''اللہ سائیں بہتر کرے گا، میرے ہوتے ہوئے کیوں فکر کرتی ہو، تم دیکھنا ہم بہت جلد اس منحوس جگہ سے بہت دور چلے جائیں گے اور خوشیوں اور محبت بھری زندگی کی ابتدا کریں گے۔'' اس کی بات پر نور نے زیرلب کچھ دعائیہ کلمہ ادا کیا تھا۔ پھر اس کے بعد دونوں آگے بڑھے۔ ان کا ارادہ حویلی کے عقبی چور دروازے سے باہر نکلنے کا تھا، باہر شام رات میں ڈھلنے والی تھی۔

یہ دونوں جب راہداری سے نکل کے حویلی کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے تو انہیں خبر نہ ہو سکی تھی کہ ایک خفیہ آڑ سے دو خرانٹ آنکھیں ان کی چور پیش قدمی کو گھور رہی تھیں، یہ مائی عجیباں تھی، جس کا ماتھا پہلے ہی خالقو کے انداز و اطوار کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

پھر جیسے ہی خالقو اور نور حویلی کے اس چور دروازے سے باہر نکلے، مائی عجیباں نے شور مچا دیا۔

''ارے کوئی ہے، قہر تھی ویو (غضب ہو گیا) وہ دو ٹکے کا چاکر خالقو اپڑیں نور کو لے گیا بھگا کے...... اٹھو پکڑو، ورنہ وڈا سائیں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

مائی عجیباں کے اس طرح شور مچانے اور چلانے سے جیسے پوری حویلی میں زلزلہ بپا ہو گیا۔ یہاں سے وہاں، خالقو اور نور خاتون کی ڈھنڈیاں پڑ گئیں۔

اس منحوس شور کی آواز کیکر کے جنگل کی طرف بھاگتے ہوئے، خالقو اور نور کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ نور کا چہرہ یکدم فق ہو گیا تھا، خالقو بھی پریشان ہو گیا تھا، وہ بیل گاڑی میں سوار تھے، خالقو نے چابک تھام کر دونوں بیلوں کو زور زور سے ٹٹکارنا شروع کر دیا۔

''وہ...... وہ...... لوگ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔''

بیلوں کی راسیں تھامے ہوئے خالقو کو اپنے عقب سے نور کی خوف سے کپکپاتی آواز سنائی دی۔ پھر اس سے پہلے کہ خالقو نور سے تسلی کے دو بول کہتا۔ اچانک عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ بے اختیار نور کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ خالقو نے پریشان ہو کے عقب میں ذرا دور دیکھا۔ لوگوں کا مختصر گروہ ہاتھوں میں لالٹین اور جلتی مشعلیں لیے ان کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔

''اب کیا ہو گا، خالقو؟......'' نور نے سراسیمہ آواز میں کہا۔ مگر خالقو کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے پل کے پل سوچا۔ بھاگنے سے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جانے کا خطرہ تھا، کیونکہ وہ بہرحال دیکھ لیے گئے تھے اور ان کے فرار کا بھانڈا ابھی پھوٹ چکا تھا۔ کوئی دم کو وڈیرے کے سفاک حواری تیز رفتار گاڑی میں انہیں چھاپ سکتے تھے، چنانچہ خالقو نے فوراً بیل گاڑی کا رخ آبادی کی طرف موڑ دیا۔

وہی ہوا، تھوڑی دور تک ہی گئے تھے کہ عقب سے کسی گاڑی کی دو ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔

ایک گلی میں داخل ہوتے ہی، خالقو نے بیل گاڑی روک دی اور نور کا ہاتھ پکڑے نیچے اترا پھر ایک سمت تاریکی میں دوڑ لگا دی۔ گاڑی کے انجن کی گھرگھراتی آواز لحظہ بہ لحظہ ان کے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

⊙⊙⊙

سائین نے باپ کو دودھ کا گلاس تھمایا اور اپنے سامنے اسے پلایا بھی۔ ورنہ مسہری کے قریب دھری تپائی پہ پڑا رہ جاتا تھا۔ رات کا کھانا باپ بیٹی نے مل کے کھایا تھا۔ سائین اپنے ہاتھ سے نوالے توڑ توڑ کے باپ کو بھی کھلاتی جاتی اور خود بھی اپنے منہ میں ڈالتی جاتی تھی۔

بہرطور فارغ ہونے کے بعد سائین کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے در و دروازے اچھی طرح چیک کر کے سوتی تھی۔

دفعتاً دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ وہ بری طرح ٹھٹکی، رات ہو چکی تھی، باہر گلی میں تاریک سناٹا تھا۔

''اس وقت کون ہے؟'' وہ زیرلب بڑبڑائی، گھر میں دو ایک ملازم تھے، وہ جا چکے تھے۔ مکان سے ملحق اوطاق میں بھی کوئی نہ تھا۔ چوکیدار شاید کسی کونے کھدرے میں ہو گا۔

ایک بار پھر دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا، اس بار سائین نے اندازہ لگایا کہ آنے والا نہ صرف عجلت میں تھا بلکہ کسی مصیبت میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہ دروازے کے قریب آئی، بہ آواز بلند پوچھا۔

''کون ہے؟''

''خخ...... خدا کے لیے جلدی دروازہ کھولو، ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔'' باہر سے ایک گھبرائی ہوئی مردانہ آواز ابھری، مگر سائین نے دروازہ نہ کھولا۔

پوچھا۔ ''مگر تم کون ہو؟ اور کس نے تمہاری جان کو خطرے میں ڈال رکھا ہے؟''

''ادی! اللہ سائیں کا واسطہ دروازہ کھول دو، ہمیں پناہ کی ضرورت ہے، میں...... میں وڈیرے الف خان کی بیٹی نور خاتون ہوں۔'' اس بار نسوانی آواز ابھری اور پھر سائین نے دروازہ کھولنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

⊙⊙⊙

صبح تک حویلی میں زبردست کہرام مچ گیا تھا۔

وڈیرے الف خان اور اس کے بیٹے وزیر خان کی مارے طیش و غضب کے بری...... حالت ہو رہی تھی، یہ معمولی بات نہ تھی، الف خان کی بیٹی ایک معمولی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور ابھی تک وہ دونوں مفرور تھے۔

اوطاق میں سارے کارندے دست بستہ سر جھکائے ناکامی کی تصویر بنے کھڑے تھے اور دونوں باپ بیٹے ان سب کے بری طرح لتے لے رہے تھے، پھر کسی کارپرداز خاص نے ڈرتے ڈرتے یہ مشورہ دیا کہ اس طرح وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کھوجی رحمو خان سے ''پیرے'' اٹھوائے جائیں (قدموں کے نشان تلاش کیے جائیں) لہٰذا اس تجویز پر فوری عمل کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔

⊙⊙⊙

سائین نے بڑے غور سے ان کی بات سنی تھی اور پھر

یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کس قدر خطرناک کام تھا، وہ ان دونوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، بولی۔

''یہ اچھا ہی ہوا کہ تم دونوں ادھر نکل آئے، ورنہ کم از کم شاید اس گوٹھ میں تم دونوں کو کوئی پناہ نہ دیتا، بلکہ الٹا الف خان کے حواریوں کے حوالے کر دیتا۔''

''ہاں! ادی سائین! ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے، بس! ہمیں کسی طرح گوٹھ سے فرار ہونے کا بندوبست کر دیں۔'' خالقو نے سائین کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نور ابھی تک گم صم اور سراسیمہ سی بیٹھی تھی حالانکہ سائین نے اسے تسلی دینے کی بھی کوشش کی تھی۔

''لیکن میں تم دونوں کو زیادہ دیر اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتی، یہ بہت حساس اور نازک مسئلہ ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ تم دونوں کو ابھی تو میں بھی نہیں یہاں سے جانے دوں گی، الف خان کے حواری تمہارے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔''

کمرے میں چند ثانیوں کے لیے دم بہ خود سی خاموشی طاری رہی پھر اس کے بعد سائین نے ان دونوں کو اپنے گھر کے تہ خانے میں لے جا کر چھپا دیا۔

باہر سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ کھوجی رحمو خان ایک پچاس پچپن سالہ دبلا پتلا مگر اپنے کام میں بڑا گھاگ اور تجربے کار تھا، گوٹھ میں کسی کی بکری یا بھینس چوری ہو جاتی تو چور کے قدموں کے نشانات ڈھونڈنے کے لیے اسی کی خدمات لی جاتی تھیں۔ چوروں کے لیے یہ مقامی زبان میں ''پڑی'' کہلاتا تھا، یعنی ان کا علاج تھا یہ۔

کھوجی رحمو خان کے ساتھ بہ نفس نفیس وڈیرا الف خان اور وزیر خان بھی تھے۔ رحمو خان نے جلد ہی ان پر یہ انکشاف کر کے سنسنی پھیلا دی کہ خالقو اور نور ابھی تک اس گوٹھ میں ہی کہیں پناہ لیے ہوئے ہیں اور گوٹھ سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

اس اعلان کی دیر تھی کہ فی الفور گوٹھ کی ناکا بندی کر دی گئی، پیروں کی تلاش جاری تھی اور بالآخر یہ سب لوگ زمیندار حاجی خدا بخش کے مکان کے سامنے جا پہنچے۔

''سائین وڈا! آپ کے دونوں شکار اسی گھر میں موجود ہیں اور ابھی تک یہاں سے نہیں نکلے ہیں۔'' بالآخر کھوجی رحمو خان نے دست بستہ عرض کی اور باپ بیٹا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، اگر کسی اور کا یہ گھر ہوتا تو اب تک یہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو چکا ہوتا مگر یہاں ان دونوں باپ بیٹے کا اپنا مفاد تھا۔

پھر ایک عجب بات ہوئی، دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسر کی۔ پھر اپنے کچھ حواریوں کو خفیہ طور پر یہاں تعینات کر کے کڑی ہدایات بھی دیں اور اسی طرح واپس لوٹ آئے۔

⊙⊙⊙

''بابا سائیں! کیا ہم نے اس طرح واپس لوٹ کے ٹھیک کیا؟'' حویلی آ کر وزیر خان نے باپ سے پوچھا۔

''ہاں!'' الف خان نے مختصراً مگر گہرے لہجے میں کہا۔

''مگر بابا سائیں! ہمارے پاس یہ سنہری موقع تھا...... شکار حاجی خدا بخش کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا، ضرور اس کی بیٹی سائین نے ہی یہ حرکت کی ہوگی، ہم اس طرح اپنا شکار ان کے گھر سے برآمد کر کے ان پر بہت سی باتوں کے لیے دباؤ بھی ڈال سکتے تھے، بہت سے مطالبات بھی منوا سکتے تھے۔''

''تمہاری بات صحیح ہے پٹ وزیر خان!'' باپ الف خان نے بیٹے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے بڑی اسرار بھری مسکراہٹ تھی۔ ''جب تک شکار وہاں موجود ہے، موقع ہمارے ہاتھ میں ہی رہے گا، ہم اب دراصل ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ شکار کی طرف سے بے فکر رہو، وہ اب کہیں نہیں جا سکتا، اس کے ساتھ اب چوہے بلی کا کھیل کھیلیں گے مگر اس طرح کہ ہماری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوں۔''

وزیر خان شاید باپ کی دہرے فائدے والی اس چال کو سمجھ رہا تھا کیونکہ اب اس کے چہرے پر بھی معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

⊙⊙⊙

زمیندار حاجی خدا بخش کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی سائین نے اسے آج تک کسی بیٹے کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ رہتی تھی، جہاں وہ جاتا جو کام کرتا، حتیٰ کے زمینوں کے معاملات سے لے کر شہر کے دفتری امور، محکمۂ آب سے ڈیلنگ، منڈی میں اناج کی فروخت، کارندوں سے کام لینا غرضیکہ وہ سب کچھ اس نے اپنے زمیندار باپ کے ساتھ رہتے ہوئے سیکھا تھا اور کیا بھی تھا۔

یہی سبب تھا کہ سائین باشعور اور سمجھدار تھی، نازک معاملات کو کیسے ہینڈل کیا جاتا تھا، وہ سب جانتی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ پس پردہ یا آنے والے وقتوں میں کسی معاملے

کے کیا نتائج نکل سکتے تھے، وہ اس کا ادراک بھی پہلے سے رکھتی تھی۔

یہی سبب تھا کہ جب وڈیرے الف خان نے اس کے باپ سے اپنے بیٹے وزیر خان کے لیے اس کا ہاتھ (رشتہ) مانگا تھا تو سائین فوراً اندر سے کھسک گئی تھی، خوب صورت تو خیر وہ تھی، اسے کوئی بھی پسند کر سکتا تھا لیکن جہاں تک وزیر خان کی پسند کا معاملہ تھا، وہ محض پسند کرنے تک ہی محدود نہ تھا، وہ ایک نمبر کا عیاش انسان تھا، کوئی بھی خوب صورت عورت اس کے لیے محض دل کا بہلاوا تھی۔ مگر سائین کے نسوانی وجدان نے اسے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ دونوں باپ بیٹے یعنی الف خان اور وزیر خان کی ان کی زمینوں پر نظر ہے، دونوں اسے مردار خور گدھ کی طرح نظر آتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سائین نے باپ سے صاف صاف کہہ ڈالا تھا کہ اسے یہ رشتہ ہرگز منظور نہیں اور منظور ہو بھی کیسے سکتا۔ وہ تو پہلے ہی کسی کو دل دے بیٹھی تھی۔

چنانچہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس نے موجودہ نازک حالات میں تجزیہ کیا تو اسے بہت سی متوقع ہولناکیوں کے ظہور پذیر ہونے کا خطرہ نظر آنے لگا۔

الف خان کی بیٹی اور وزیر خان کی بہن نور کو اس نے اپنے ہاں خفیہ پناہ دے رکھی تھی جو حویلی کے معمولی نوکر خالقو کے ساتھ بھاگی تھی، گویا دونوں ہی واجب القتل قرار دیے جا سکتے تھے مگر سائین کو اس خدشے کا بھی احساس تھا کہ......

ان کو پناہ دینے کا مطلب اس کی دور اندیش سوچ سے زیادہ خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ اگر الف خان یا وزیر خان کو حقیقت کا علم ہو جاتا تو وہ اس پر شادی سمیت اور بھی بہت سی باتوں کا دباؤ ڈال سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ یہاں کوئی بھی کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جاگیرداری نظام تھا اور فیصلوں کی تلوار عموماً ناداروں مجبوروں یا کمزوروں پر ہی گرتی تھی اور پھر یہ معاملہ تو کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ گوٹھ کے ایک بڑے اور بااثر زمیندار وڈیرے الف خان کے گھر کا تھا۔

لیکن...... ان سب خطرات، خدشات اور متوقع ہولناکیوں کے باوجود، سائین نے ان دونوں دیوانوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی وجہ سمجھ میں آنے والی تھی کہ سائین کا اپنا دل بھی تو کسی کا دیوانہ تھا۔

وہ دن خیریت سے گزر گیا، دوسرے دن رات کو سائین کا ارادہ ان دونوں کو خاموشی سے اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر لے جانے کا تھا وہاں بھی وہ ان کی مکمل سپورٹ کرنا

منگنی سے چند لمحوں قبل دوستوں نے تاج محمد آنسو کو دیکھا کہ انتہائی پریشان ہیں چہرا اترا ہوا ہے۔ پسینوں پر پسینے آ رہے ہیں۔

پوچھا۔ کیا بات ہے دوست؟ تم نے منگنی کی انگوٹھی تو نہیں کھو دی؟

''نہیں''۔ تاج محمد آنسو نے جواب دیا۔ ''میرا جوش و خروش کھو گیا ہے۔''

کلاسیکل بے عزتی

ایک لڑکا سائیکل پر جا رہا تھا۔ سائیکل کا ٹائر بھینس کے گوبر کے بیچ میں سے گزر گیا، قریب کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے تالیاں بجا کر کہا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ لڑکا رکا اور بولا ''وش کرنے سے کام نہیں چلے گا کیک تو کھانا پڑے گا۔''

☆☆......☆......☆☆

گرلز آر ویری اسمارٹ

گرل۔ ''اورنج کا ریٹ کیا ہے؟''

اورنج والا۔ ''100 کے 10''

گرل۔ ''کچھ کم کرو نا پلیز!''

اورنج والا۔ ''اچھا آپ 80 کے آٹھ لے لو۔''

گرل خوشی سے۔ ''تھینکس...... یہ ہوئی نہ بات...... دے دو۔''

☆☆......☆......☆☆

قابلیت

باپ: ''پیپر کیسا ہوا؟''

بیٹا: ''ایک سوال رہ گیا دوسرا آ نہیں رہا تھا ...... چوتھا کرنا بھول گیا پانچواں نظر نہیں آیا۔''

باپ۔ ''باقی تین سوالات؟''

بیٹا۔ ''صرف وہی غلط ہوئے ہیں۔''

مراسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور

چاہتی تھی مگر مسئلہ یہاں سے انہیں رازداری کے ساتھ نکال لے جانے کا تھا۔

سہ پہر کے وقت حاجی خدابخش کی قیام گاہ کے سامنے ایک بھاری بھرکم انٹرکولر اور پجیرو جیپیں آن رکیں، ان میں وڈیرے الف خان اور وزیر خان موجود تھے، باقی ان کے مسلح حواری۔

اندر ان کی آمد کی اطلاع دی گئی تو سائین کا دل دھک سے رہ گیا۔ ممکن تھا وہ اس کے رشتے کے سلسلے میں، اس کے باپ سے عندیہ لینے آئے ہوں، اس نے سوچا، تاہم اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا، سر کی چادر درست کی اور چند خدمت گاروں کے ساتھ ان کا استقبال کیا، دونوں باپ بیٹے کو حاجی خدابخش سے ملوایا گیا۔

رسمی سلام دعا کے بعد حاجی خدابخش نے اپنی بیٹی سائین کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو انکار کا عندیہ دے ڈالا۔ "یہ معاملہ بعد میں دیکھیں گے، حاجی صاحب!"

دفعتاً الف خان نے اکھڑے ہوئے لہجے میں خدابخش سے کہا۔ "ہم دراصل ایک اور مسئلے کے لیے آئے تھے۔"

"کیسا مسئلہ......؟" حاجی خدا بخش نے قدرے پریشان ہو کے پوچھا۔ سائین اس وقت کمرے کے دروازے کے عقب سے کان لگائے کھڑی تھی اور اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"مسئلہ بہت نازک اور حساس نوعیت کا ہے جو آپ کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر آپ نے ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو......" وڈیرے الف خان کے جھٹکے دار لہجے میں لرزہ دینے والی دھمکی پوشیدہ تھی۔ تاہم اس بات پر حاجی خدابخش کے چہرے پر شکنوں کا جال سا ابھرا، بولا۔

"ایسی کیا بات ہوگئی ہے، الف خان! جو میرے علم میں نہیں ہے، کچھ پتا تو چلے۔" دروازے کے عقب میں کان لگائے کھڑی سائین کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ وہ جیسے اب سرتاپا سماعت بن گئی تھی۔ وڈیرے الف خان نے ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے بیٹے پر ڈالی پھر ایک گمبھیر سی ہنکاری خارج کر کے بولا۔ "غیرت، عزت اور اپنی روایتی شان کی خاطر ہم اپنی اولاد تک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ جان بھی لینی پڑ جائے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔ ہماری بیٹی کو ایک بدبخت شخص ورغلا کے لے گیا ہے، خالقو نام ہے اس بدذات کا، اس نے تو خیر اپنی عبرت ناک موت کو آواز دے ہی ڈالی اور پاتال سے بھی ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے لیکن وہ بزدل تو اس گوٹھ سے ہی نہیں نکل سکا ہے اور اب ہماری معلومات کے مطابق ان دونوں کو آپ نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے، کیا یہ سچ ہے؟"

وڈیرے الف خان نے خاصے سنسنی خیز انداز میں اپنی بات کا اختتام کرتے ہوئے آخر میں خدابخش کے جھریوں بھرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

حاجی خدابخش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اختلاج قلب کے سے آثار اس کے چہرے سے مترشح ہونے لگے، اس کی سانسیں یکدم تیز تیز چلنے لگیں۔ اس پر تیزی تنفس کے ساتھ شدید کھانسی کا دورہ بھی حملہ آور ہوا تھا۔ دروازے کے عقب میں سرتاپا سماعت بنی کھڑی سائین سے اپنے بوڑھے بیمار باپ کی یہ حالت چھپی نہ رہ سکی اور وہ فوراً کمرے میں داخل ہوگئی۔

الف خان اور وزیر خان اسے یکدم کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے، پھر دونوں باپ بیٹے نے معنی خیز انداز میں بیک وقت اپنے سروں کو جنبش دی تھی۔

سائین باپ کو سنبھالنے لگی، وہ خاصی پریشان اور متوحش سی نظر آنے لگی تھی، ساتھ ہی اس نے کسی خدمت گار ملازمہ کو بھی چلا کے پکارا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حاجی خدابخش کی حالت کچھ سنبھل تو گئی، مگر وہ بات کرنے کے قابل نہ رہا تھا، اس پر نیم بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔

"بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اگر کوئی ایسی ضروری بات ہے تو آپ مجھ سے کرسکتے ہیں؟" سائین نے دونوں باپ بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا لہجہ معذرت آمیز تھا۔

الف خان کے چہرے پر درشتی عود کر آئی تھی۔ وہ اسی عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، پھر سائین کے چہرے پر نظریں جما کے بولا۔

"تم نے ہمارے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے؟"

"کیا بابا جانی نے آپ کو اس بارے میں ابھی جواب نہیں دیا تھا؟" سائین نے محتاط لہجہ اختیار کیا۔

"بتا دیا تھا، کیا ہمارے بیٹے میں کوئی خرابی ہے؟"

الف خان نے اکھڑ سے لہجے میں دریافت کیا تو سائین نے ایک نگاہ اٹھا کے باپ کے ساتھ کھڑے وزیر خان پر ڈالی، پھر بولی۔

"میں نے کسی خرابی کے باعث اس رشتے سے انکار

نہیں کیا تھا۔"

"تو پھر کیا وجہ تھی انکار کی؟"

"یہ بتانا ضروری تو نہیں ہوتا۔" سائین نے اس بار الف خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "لیکن میں آپ لوگوں کی دل سے عزت اور احترام کرتی ہوں مگر کچھ ذاتی معاملات میں سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ابھی شادی کا سوچا تک نہیں ہے، میرے بابا جانی کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ایسے میں، میں انہیں کس طرح تنہا چھوڑ کے اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔" اس بار وزیر خان نے سائین سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔ "شادی کے بعد حاجی صاحب کا پورا پورا خیال رکھا جاسکتا ہے۔"

سائین کو وزیر خان کا درمیان میں بولنا قطعی ناگوار گزرا تھا، جس کا اظہار اس نے اسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست اس کے باپ الف خان کی طرف دیکھ کر کیا۔ "ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرسکتی۔ مجبوری کی حد تک جتنی بات ہوسکی اسے کافی سمجھیں، یوں بھی میرے انکار کے بعد یہ موضوع اب ختم ہوجانا چاہیے۔"

سائین کے اس مسکت جواب پر دونوں باپ بیٹے کی ناک بھوں چڑھ گئیں۔ پھر الف خان نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"موضوع تو اب یہ کسی فیصلے پر پہنچ کر ہی ختم ہوگا کیونکہ الف خان کے بیٹے سے رشتے پر انکار پر تمہارا غرور بہت جلد خاک میں مل جائے گا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اب تک تم کو بھی اس بات کا پتا چل چکا ہوگا کہ ہمارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا تھا۔"

سائین نے تحمل مزاجی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "شاید نہیں، آپ بتا دیں۔"

"خوب! تمہارے اس انجانے پن کی داد دینی پڑے گی۔" وزیر خان نے اس کی طرف دیکھ کر زہریلے طنز میں کہا۔ "ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم یہاں تمہارے بابا جانی سے گفتگو میں مصروف ہوں اور تم نے دروازے کے پیچھے کان لگا کے سب سن نہ لیا ہو۔"

سائین کو خفت سی محسوس ہوئی، اس کا چور پکڑ لیا گیا تھا مگر وہ سنبھلتے ہوئے بات بنا کے بولی۔ "ظاہر ہے ہر لڑکی اپنے مستقبل کے بارے میں ہونے والی باتوں پر نہ صرف کان بلکہ نظریں بھی رکھتی ہے۔" اس نے اب بھی دانستہ تجاہل

جوتے میں پانی

میزبان، مہمان سے۔ "اپنے بیٹے کو سمجھائیں وہ میری ٹوپی میں پانی لا رہا ہے۔"

میزبان۔ "ارے وہ تو میرا بھتیجا ہے۔ میرا بیٹا تو وہ ہے جو آپ کے جوتے میں پانی لا رہا ہے۔"

☆☆☆

حادثہ

ایک محترمہ نے اپنی سہیلی سے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "شکیلہ میں نے سنا تھا کہ تمہارے شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا تھا؟"

شکیلہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں تمہیں تو پتا ہے کہ میرے شوہر پروفیسر ہیں۔ ہوا یوں کہ انہوں نے ایک کھلے مین ہول میں پہلے سگریٹ پھینکا اور پھر عادتاً جوتے کی نوک سے اسے بجھانے کی کوشش کی۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔ (انگریزی مقولہ)

☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے وہ ایک خاندان کا مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لیے اجنبیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔ (چیکوسلواکیہ کی کہاوت)

☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے ورنہ وہ بیٹی کو بھی کھو دیتا ہے۔ (کوالز)

☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو لیکن بیٹی تمام عمر کے لیے بیٹی ہوتی ہے۔ (فلر)

☆ بیٹی کی شادی میں سب سے دکھی ہستی باپ کی ہوتی ہے۔ (ہومر)

☆ نافرمان بیٹی ناقابل اصلاح بیوی ہوتی ہے۔ (فرینک لن)

مرسلہ: ماہا ایمان...... حافظ آباد

عارفانہ سے کام لیا تھا۔

''ہمیں تمہارے پورے گھر کی تلاشی لینی ہے۔'' بالآخر الف خان نے دھماکا کیا۔

سائین یکدم بپھر سی گئی۔ ''کیوں؟ کیا اب رشتے سے انکار کے جواب میں اسی طرح کی انتقامی روش کا سامنا کرنا پڑے گا ہم باپ بیٹی کو؟ کہ اب ہم پر چوری کا الزام بھی......''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں ہے، چھوکری!'' الف خان نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا اور پھر اصل بات بھی بتادی۔

''جس کو ہم پر اس بات کا شبہ ہوا ہے، اسے ہمارے سامنے لاؤ۔'' سائین نے اندر سے پریشان اور تشویش زدہ ہونے کے باوجود پورے اعتماد سے کہا۔

''کھوجی رحموں کو ہم کیا پورا گوٹھ جانتا ہے، کہ وہ اپنے کام میں کتنا ماہر ہے۔ اس نے ہی ان دونوں (خالقو اور نور) کے ''پیرے'' تلاش کیے ہیں جو حویلی سے بھاگنے کے بعد ہمارے آدمیوں کے تعاقب سے ڈر کے بیل گاڑی چھوڑ کے بھاگے اور سیدھا تمہارے گھر میں آ کے پناہ لی ہے۔'' الف خان نے اس کی طرف گھور کے بتایا تو سائین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب میں کہا۔

''پیسوں کے زور پر کسی بھی انسان سے کچھ بھی کہلوایا جاسکتا ہے۔ یہ بے چارے سوکھی دال روٹی کھانے والے کھوجی پھر کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ میں پھر یہ کہوں گی کہ یہ ہمارے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر اگر ہم جھوٹے اور تم سچی ہو تو ابھی اسی وقت اپنے گھر کی تلاشی دو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمیں کھوجی رحمو خان کی بات پر پورا یقین ہے کہ اس بدذات خالقو نے ادھر ہی پناہ لے رکھی ہے۔'' وزیر خان نے سائین کی طرف گھور کے کہا۔

سائین اندر سے بہت پریشان اور کبیدۂ خاطر ہو رہی تھی، جانتی تھی کہ وزیر خان جو کہہ رہا تھا وہ بہرحال جھوٹ نہ تھا، اگر وہ اسی طرح تلاشی پر اڑے رہے تو، یقینی طور پردہ نہ خانے سے خالقو اور نور کو برآمد بھی کر سکتے تھے۔

سائین زمانہ شناس تھی، جانتی تھی ایک حسین عورت کو کب تریا چلتر چلتے ہوئے مرد کو بے وقوف بنانا ہے، کب ضد پہ اڑنا ہے اور کب جھکنا ہے، لہٰذا اسے اب ضد پہ اڑنے سے کام بنتا نظر نہیں آیا تو جھکی ہوئی پھل دار ٹہنی بن کر وزیر خان پر پہلی بار مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے بولی۔

''خوب! ہمیں زبردستی اور بلیک میل کر کے حاصل کرنے کا طریقہ اچھا نکالا ہے تم نے۔ تمہاری ہمیں حاصل کرنے کی یہ کوشش جارحانہ سہی لیکن ہم اسے بھی اپنے لیے تمہاری محبت کا ایک انداز سمجھتے ہیں۔'' سائین کی اس اچانک کایا پلٹ اور بے باکی پر باپ بیٹا دونوں چند ثانیے کے لیے حیران اور ہونق سے نظر آنے لگے، مگر وزیر خان تو ریجھ سا گیا۔ الف خان کو بھی دال گلتی نظر آنے لگی، دونوں باپ بیٹے نے ہلکی آواز میں ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسر کی۔

بیٹا باپ سے بولا۔ ''بابا سائیں! عورت کے ہزار روپ ہیں، کب بے وقوف بن کے خود کو سپرد کردے۔ لگتا ہے بے وقوف ہماری بلیک میلنگ کو محبت سمجھ رہی ہے، موقع اچھا ہے، وہ دونوں (خالقو اور نور) بھلا اب کدھر جاسکتے ہیں، کیوں نہ پہلے اس پر ہاتھ صاف کرلیا جائے۔''

جواباً باپ بولا۔ ''بے وقوف! عورت کے ہزار روپ ضرور ہوتے ہیں، لیکن کیا خبر اس کے کس روپ میں محبت اور کس روپ میں موت چھپی ہوئی ہے؟ تلاشی لینے پر اڑے رہو، یہ مجرم ثابت ہو جائے گی تو راجواڑیں (جرگے) کے فیصلے میں اسے خود ہی حاصل کرلیں گے۔'' بیٹے پر باپ کی بات کا اثر نہ ہوا، بولا۔

''بابا سائیں! جب گھی سیدھی انگلی سے نکل رہا ہے تو ٹیڑھی انگلی کرنے کی کیا ضرورت ہے، ترپ کا پتا ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جب چاہے خالقو اور نور کو یہاں سے برآمد کرلیں گے، بلکہ ادھر ہی مروا دیں گے دونوں کو، لیکن...... یہ بیل اگر آسانی سے منڈھے چڑھ رہی ہے تو راجواڑیں (جرگے) وغیرہ کا کھڑاگ پالنے کی پھر کیا ضرورت ہے؟''

باپ فکرمندی سے بولا۔ ''اور اگر اس نے ان دونوں کو یہاں سے ہماری بےخبری میں فرار کروا دیا تو......؟''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وزیر خان دھیمی آواز میں بولا۔ ''ہمارے آدمی چوبیس گھنٹے اس مکان کو گھیرے رکھیں گے، جیسے ہی خالقو اور نور یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے، ہمارے آدمی ان دونوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے، اب چٹ بھی اس کی پٹ بھی اس کی، لیکن ہمیں وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

سائین خاموش کھڑی دونوں باپ بیٹا کو کھسر پھسر کرتے دیکھ رہی تھی، وہ بہ ظاہر پرسکون نظر آرہی تھی لیکن ......اس کے اندر بھی زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ اندر ہی اندر یہی سوچنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح یہ بلا اس وقت ٹل جائے، اس کے بعد وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر خالقو اور نور کو یہاں سے بھگا لے جائے گی۔

''ہمارے انکار کو آپ نے شاید دل پہ لے لیا تھا اور اسے ہمارا غرور یا ناپسندیدگی سمجھا، لیکن ایسی بات نہ تھی جو سچ بات تھی، وہ ہم نے بتادی تھی کہ ہمیں اپنے بیمار اور بوڑھے بابا جانی کی فکر تھی، کہ ہماری شادی کے بعد ان کی دیکھ بھال کون کرے گا لیکن جب وزیر خان نے ہم سے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، ہم تمہارے بابا جانی کا شادی کے بعد بھی ہر طرح کا خیال کریں گے، تو ہم کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئے۔'' بالآخر سائین نے ان دونوں باپ بیٹا کی کھسر پھسر کو اختتام تک پہنچانے کی غرض سے ایک نیا تیر اچھالا تو وہ دونوں یکدم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور وزیر خان اس کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں اور باچھیں پھیلا کر بولا۔

''تو کیا پھر ہم تمہارے انکار کو اقرار سمجھیں؟''

''انکار کی وجہ تو تم نے خود ہی ختم کردی، رہی ہمارے اقرار کی بات تو وہ اس پر منحصر ہے کہ تم ہم پر کتنا بھروسا کرتے ہو۔ دراصل ہم اپنے گھر کی تلاشی دینے کو اپنی سبکی سمجھتے ہیں۔ کہنے والے تو یہی کہیں گے ناں کہ، پتا نہیں، حاجی خدابخش کی بیٹی نے کیا چوری کر ڈالی ہے کہ، وڈیرے سائیں کو حویلی کی تلاشی لینے پر مجبور ہونا پڑا۔''

سائین نے چالاکی سے کہا۔ وہ دانستہ کبھی آپ کا تکلم استعمال کر رہی تھی تو کبھی تم کا صیغہ......

''اگر یہ بات ہے تو ہم ابھی بغیر تلاشی لیے لوٹ جاتے ہیں کیونکہ ہمیں بھی اپنی ہونے والی بیوی کے باپ کے گھر کی عزت کا خیال رکھنا پڑے گا۔'' وزیر خان نے سائین کی طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو سائین نے پر حیا شرم کی اداکاری کرتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا۔

دونوں باپ بیٹا، اپنے حواریوں کے ساتھ بغیر گھر کی تلاشی لیے واپس لوٹ گئے۔

لیکن ......ساتھ ہی اپنے ان کارپردازوں کو پہلے سے زیادہ چوکس ہو کے مکان کی خفیہ نگرانی کی ہدایت بھی کر ڈالی جنہیں یہاں خفیہ طور پر مامور کر رکھا تھا۔

اب یہ سائین کی بدقسمتی تھی یا پھر حد سے زیادہ اعتماد یا شاید...... غلط وقت پر غلط چال چلنے کا نتیجہ کہ...... اسے اس حقیقت کا اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ الف خان اور وزیر خان ان کے مکان کی خفیہ طور پر مستقل نگرانی بھی کروا سکتے ہیں۔

بہرطور...... دونوں باپ بیٹے کے جاتے ہی سائین نے فوراً تہ خانے کا رخ کیا اور خالقو اور نور کو ساری تفصیل بتا

اقوالِ زریں

اچھی بات یہ نہیں کہ اچھے وقت پر اچھی بات کرو بلکہ اچھی بات ہے کہ برے موقعے پر بری بات نہ کرو۔

+++

اگر کوئی تم سے زیادتی کرے اور تم اس سے اچھائی کرو تو ریت پر لکھو اور کوئی تم سے اچھائی کرے تو اسے پتھر پر لکھو۔

+++

جو آدمی فارغ ہو اور اس کی نظر دوسروں کے عیوب پر نہ ہو وہ مصروف ہے اور جس کی نظر دوسروں کے عیوب پر ہو وہ فارغ ہے۔

+++

غلطی جتنی بڑی ہو اسے ماننے والا اس سے بڑا ہوتا ہے۔

+++

اگر تم نے سب کچھ کھو دیا ہے مگر حوصلہ، ہمت، دلیری نہیں کھوئی تو تم نے کچھ نہیں کھویا۔

+++

مرسلہ: امتیاز احمد، کراچی

عورت کیا ہے

☆ عورت پورا چاند ہے اگر بادل اسے چھپا نہ لیں۔

☆ بادِ نسیم ہے اگر اس کا دامن کینہ اور فساد کے دھبوں سے آلودہ نہ ہو۔

☆ دلوں کا قرار ہے، اگر بے وفا نہ ہو۔

☆ زندگی ہے اگر اسے پیار کیا جائے۔

☆ حسن ہے اگر اس پر توجہ دی جائے۔

☆ خوبصورت ہے...... اگر میک اپ نہ کرے۔

☆ زندگی بھر کا ہم سفر ہے۔ اگر اسے صدق دل سے اپنایا جائے۔

مرسلہ: ریاض بٹ...... حسن ابدال

دی اور کہا۔

''اب تم دونوں کا یہاں میرے پاس رہنا کسی کے لیے بھی بہتر نہ ہوگا۔''

نور بولی۔ ''ادی سائین! تمہارا ہم پر بہت بڑا احسان ہے، تم نے خود کو مصیبت میں ڈال کر ہماری جان بچائی اور اب بھی ہماری مدد سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہو، لیکن...... خود مجھے امید نہیں ہے کہ ہم زندہ بھی بچ سکیں اس لیے جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں خود سے دور کردیں۔'' نور یہ کہتے ہوئے فرط غم سے رو پڑی۔ سائین کا دل بھی پسیجنے لگا، خالقو نے بے اختیار محبت سے نور کو اپنے سے لگالیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''مایوسی کی باتیں مت کرو نور! اللہ سائیں پر کامل بھروسا رکھو، وہ ہمارے ساتھ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں میں کسی بھی موڑ پر تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ آخر دم تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گا مگر تم بے حوصلہ ہونے لگو گی تو پھر میں کچھ نہ کر پاؤں گا۔''

''ادا خالقو ٹھیک کہہ رہا ہے نور! ایک مرد کی طاقت ایک عورت ہی ہوتی ہے اور تم خالقو کی طاقت ہو۔ پھر تم میری فکر نہ کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ الف خان یا وزیر خان جیسے جابر انسان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مگر ہمیں کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔'' سائین کی بات پر خالقو نے اس سے کہا۔

''ادی مان واری! اللہ سائیں کی تجھ پر رحمت ہو نور کی یہ بات بہرحال درست ہے کہ ہماری وجہ سے آپ بھی خطرے میں گھری ہوئی ہیں اور پھر الف خان وغیرہ کو بھی میں سمجھتا ہوں، اس بات پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا ہے کہ ہم اس مکان میں چھپے ہوئے ہیں، اس لیے اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے بھی نکل جانا ہوگا۔''

''ہاں! اب ایسا کرنا ناگزیر ہے۔'' سائین نے بھی اس کی بات کی تائید کر ڈالی اور مزید بولی۔ ''لیکن میں تم دونوں کو تنہا نامساعد اور غیر یقینی حالات کے سپرد ہرگز نہیں کروں گی بلکہ میں خود تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر روانہ ہوجاؤں گی، وہاں بھی ہماری ایک خالی قیام گاہ ہے، وہاں کچھ روز رہنے کے بعد تم سوچ سمجھ کر کسی اور دوسرے شہر چلے جانا۔'' نور اس بات پر رضامند نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ وہ بھی خطرے کا شکار ہوجائے لیکن خالقو چاہتا تھا کہ سائین کی مدد سے وہ بہ خیریت یہاں سے نکل سکتے ہیں۔

سائین کا اپنا دل کسی کا دیوانہ تھا اور جب دو دیوانے مل بیٹھے تھے، تو بھلا ایک دوسرے کو کیسے تنہا چھوڑ سکتے تھے اس لیے سائین نے آخر دم تک ان دیوانوں کی مدد کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے سائین نے اپنے کچھ خاص خدمت گاروں کو گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا تھا، جنہوں نے آکر یہ تشویش ناک اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ مکان سے باہر کچھ مشکوک لوگوں کی نقل و حرکت دیکھی گئی ہے۔

اس انکشاف پر سائین نے بے بسی کے مارے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنی مطلب براری کے لیے الف خان اور وزیر خان ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل، کھیل رہے تھے، یہ مشکوک لوگ یقیناً انہی کے متعین کردہ ہو سکتے تھے۔

سائین کی اب کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، وہ لحہ بہ لحہ خود کو الف خان اور وزیر خان کے مقابلے میں کمزور محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ سائین کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ اس نے الف خان وغیرہ کے انتہائی مطلوب و معتوب افراد کو اپنے ہاں نہ صرف خفیہ پناہ دے رکھی تھی بلکہ ان کی بھرپور مدد کرنے پر بھی کمربستہ تھی، کبھی کبھی تو سائین خود بھی یہ سوچ کر لرز سی جاتی تھی کہ اگر معاملہ بگڑ گیا تو اس کا اپنا کیا حشر ہوگا؟ وہ سوچتی رہی اور سارا وقت پریشان ہوتی رہی کہ آخر وہ کیا کرے؟ کہ ایک اور نئی پریشانی نے جنم لے لیا۔

حاجی خدا بخش کا انتقال ہوگیا۔ باپ کے بغیر سائین خود کو اکیلا محسوس کرنے لگی، یہ اس کے لیے ان حالات میں بڑا دکھ تھا مگر اس نے سوچا اللہ کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی، شاید کوئی بڑی مشکل یا مصیبت آنے والی تھی جو اس بیمار بوڑھے کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور وہ بڑا بے چین ہو کے اس دنیا سے رخصت ہوتا مگر اس متوقع مصیبت کو دیکھنے سے پہلے ہی بستر پر بڑی پرسکون موت مرا تھا۔ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا، معاملات چلتے رہتے ہیں۔ سوگ کے تین روز بعد متوقع آنے والی مصیبت سے بچنے کی تدبیر کے لیے سائین نے اس دن سائیں جوڑیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ کا رخ کیا۔ سائین کے جی کو جانے کیا سوجھی تھی کہ اس نے اس سلسلے میں ساون فقیر سے مدد اور مشورہ کرنے کی ٹھانی تھی۔

تنہائی میں موقع پا کر وہ ساون فقیر کے دوار پہنچی اور دھیرے دھیرے اسے ساری حقیقت سے آگاہ کر ڈالا۔

ملنگ ساون فقیر، جو پہلے ہی سے خالقو اور نور کے

معاملۂ دل سے آگاہ تھا، اب جو اس نے ان کے متعلق یہ تازہ مگر مخدوش صورت حال سے آگاہی حاصل کی تو وہ یکدم گم صم سا ہوگیا۔ وہ کئی ثانیے تک کسی گہری اور پرسوچ خاموشی میں مستغرق رہا۔

سائین بھی خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو تکے جارہی تھی، اپنے محبوب کے دوار اور قربت میں از خود اس کے اندر کی ساری پریشانیاں اور بے چینیاں ختم ہونے لگتی تھیں۔ یہاں ہمیشہ اسے ایک روحانی سکھ اور سکون سا ملا کرتا تھا۔

''کیا مجھے اور کوئی بات بتانے کو رہ تو نہیں گئی ہے؟'' معاً ساون فقیر نے وجدانی سی آواز میں سائین کی طرف دیکھ کر کہا۔

سائین کو جانے کیوں ایک جھٹکا سا لگا۔ ساون کے پوچھنے پر سائین کے ذہن میں اچانک ہی ایک جھماکا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا بات تھی اور...... جو بتانے کو رہ گئی تھی اور جسے ملنگ ساون نے فوراً محسوس کیا تھا۔

تب پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ وزیر خان سے متعلق اسے یہ بتانے سے دانستہ یا غیر دانستہ کترا گئی تھی کہ وزیر خان اس سے شادی کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ یہ بتانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا، مگر اب ساون کے پوچھنے پر اس نے سر جھکا کے یہ بات بھی بتادی۔

یہ بات سننے کے بعد ساون فقیر نے جلالی آواز میں کہا۔ جبکہ اس کے لہجے میں سائین کے لیے بالخصوص تشویش کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔

''تمہیں نادیدہ چال کے جال میں جکڑا جارہا ہے اور ان دونوں (خالقو اور نور) کے ساتھ بھی کسی خاص مقصد کے تحت چوہے بلی کا کھیل کھیلا جارہا ہے۔''

سائین نے کہا۔

''سائیں! آپ کی بات کو میں جھٹلا نہیں سکتی، لیکن اب کیا کیا جائے؟ کیونکہ میں تو نیک نیتی سے ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔''

''در کو جھٹلانے والے جب نفس کے دروازے کا رخ کرتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

حجرے میں ساون فقیر کی جلالی آواز ابھری۔ ''اللہ سائیں کے در پہ ماتھا ٹیکنے سے جب خدا مل جاتا ہے تو محبوب کیسے نہیں ملتا، میں نے خالقو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آگ سے مت کھیلے اور وقت کا انتظار کرے، ورنہ اپنے ساتھ کسی اور کی جان کو بھی اس میں جلا ڈالے گا۔''

''سائیں! دیوانے کو ایسی باتیں سمجھ میں آنے لگ جائیں تو پھر اسے دیوانہ ہی کیوں کہا جائے، وہ تو بس اپنے محبوب کو ہر قیمت پر پالینے کے لیے...... دیوانہ وار آتش نمرود میں بھی کود جاتے ہیں۔'' سائین نے بڑے نپے تلے انداز میں سہی، یہ جملے کہے تھے مگر ان جملوں کی تپش سے وہ خود پگھلنے لگی تھی۔

ساون فقیر نے بڑے دھیان سے محبت کا یہ فلسفہ سنا تھا، باریش چہرے پہ اسرار بھری مسکراہٹ ابھری تھی پھر بولا۔ ''ہاں! دیوانہ واقعی دیوانہ ہی ہوتا ہے، وہ تو خود سے بھی بیگانہ ہوجاتا ہے، سمجھانے والے الفاظ و جملے اس کے لیے بے معنی ہوتے ہیں، لیکن ہمارے لیے وہ بڑے معنی رکھتے ہیں، المیہ تو یہی ہے کہ جوش و جذبات میں نصیحت اثر نہیں کرتی مگر نصیحت کرنے کی ضرورت بھی ایسے ہی وقت پڑتی ہے لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہے، غیرت اور عزت سے بڑھ کر بے انت خواہشات کا خارزار ہے، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور زہر، زہر کو...... لہٰذا اب اس مسئلے کا مجھے ایک ہی حل نظر آتا ہے۔''

''وہ کیا سائیں؟'' سائین نے یکدم بے قرار ہو کے پوچھا۔

ساون فقیر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم خواہشات کے دروازے سے اپنا ماتھا اٹھاؤ اور رب سائیں کے در پہ ماتھا ٹیک دو، تمہیں دو انسانوں کو بچانے اور ان کی فلاح کی

جوان اور خوبصورت لڑکی

نجومی کے پاس اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے گئی نجومی نے جوان لڑکی کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے انداز سے کہا۔

''تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہوگی جو جوان، خوبصورت اور صحت مند ہوگا۔''

''اور دولت مند بھی؟'' لڑکی نے سوالیہ نظروں سے نجومی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں دولت بے انتہا ساتھ میں عمر بھی ۲۸ سال کے قریب!'' نجومی نے جواب دیا۔

لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

''آپ مجھے یہ بھی بتادو کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس طرح جان چھڑا سکتی ہوں!!''

خاطر ایک بڑی قربانی دینا ہوگی، مگر خبردار...... اس کا اجر کسی بشر سے نہیں صرف اور صرف اللہ سائیں سے مانگنا۔''

''مجھے کک...... کون سی قربانی دینا ہوگی سائیں؟'' سائین کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

''وڈیرا الف خان اور وزیر خان سے معاملے کی بات کرو۔'' ساون نے گہرے لہجے میں کہا۔

''معاملے کی بات؟'' وہ الجھ سی گئی۔ ''کون سے معاملات کی بات سائیں؟''

ساون فقیر نے اسے تسبیح والے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنے ذرا قریب آنے کا کہا۔ سائین دھیرے سے سرک کے اس کے قریب ہوگئی۔

●●●

جو کام اسے سمجھایا گیا تھا وہ فوری عمل کا متقاضی تھا۔ یہ سب اگرچہ سائین کے دل ودماغ پر ایک پہاڑ جیسے بوجھ سے کم نہ تھا مگر اس کے سائیں، اس کے محبوب...... ساون فقیر کی اسے یہی کرنے کی نصیحت تھی سائین کو یوں یہ سب کرنا ناممکنات میں سے ہی نظر آرہا تھا لیکن محبوب کی بات...... اس کی نصیحت...... سائین کے لیے تو حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

سائین نے جب ساون فقیر کی پوری بات سن لی تو بے اختیار رو دی، اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا سب کچھ ختم ہو رہا ہو، سارا کچھ چھن رہا ہو، اس نے کس قدر بے چارگی اور رحم طلب نگاہوں سے اپنے محبوب کی طرف دیکھ کر اتنا کہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو میرے سائیں؟ میں تو جیتے جی مرجاؤں گی۔''

''پگلی! تم مروگی نہیں، امر ہو جاؤ گی۔ آج تک تم دل کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتی رہیں، اب ذرا در پہ ماتھا بھی ٹیک کے دیکھو، یہ اللہ کا در ہے جہاں انہونی بھی ہونی ہوجاتی ہے، انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے جسے اس کی توقع بھی نہیں ہوتی، پس! ایک ذرا اس کے لیے قربانی تو دے کر دیکھ۔''

ساون فقیر کے پرجذب لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ سائین کو اپنے تن مردہ میں ایکا ایکی انجانی قوت سی اترتی محسوس ہوئی اور اس نے دل کا دروازہ چھوڑ کے در مولا پہ سر ٹکا دیا۔

●●●

زمیندار حاجی خدا بخش کے مکان کے ایک گوشے میں ان تینوں کے درمیان بڑی خفیہ اور اہم نوعیت کی ''ڈیلنگ'' ہو رہی تھی۔ سات پردوں میں، کسی خفیہ گوشوں میں ایسی ''ڈیلنگ'' بے شک اپنے اندر بڑی کریہہ حقیقت رکھتی ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس میں ایک انداز مثبت ہوتا ہے اور دوسرا منفی۔

جن تین افراد کے درمیان رات کے اس پہر یہ اہم نوعیت کی خفیہ ڈیلنگ ہو رہی تھی، ان کے نام تھے...... وڈیرا الف خان...... اس کا بیٹا، وزیر خان...... اور تیسری ایک عورت جو حاجی خدا بخش کی بیٹی...... سائین تھی۔

اس قسم کی خفیہ ''ڈیلنگ'' میں ساری باتیں صاف صاف اور کھل کے کر دی جاتی ہیں۔ ایسی ڈیلنگ کے نتیجے میں سب کچھ متوقع ہوتا ہے، غیروں سے گٹھ جوڑ، اپنوں سے ناتا توڑنا، عزت نفس کا جنازہ، غیرت بالائے طاق اور...... خونی رشتوں کے سودے بھی...... یہاں بھی ایک ایسا ہی سودا ہو رہا تھا۔

تاہم یہ بات واضح تھی کہ اس ڈیلنگ میں سائین کا مقصد مثبت تھا اور وہ یہ سب ساون فقیر کے ایما اور نصیحت کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے کر رہی تھی۔

''ہمیں پہلے ہی یقین کی حد تک شبہ ہوگیا تھا کہ ان دونوں کو تم نے ادھر ہی پناہ دے رکھی ہے۔'' الف خان کی سرسراتی آواز ابھری جو کسی حد تک سرگوشی سے مشابہ تھی۔ سائین نے انہیں بالآخر بتا دیا تھا کہ ان کے دونوں شکار خالقو اور نور اس کی پناہ میں تھے۔

''ہم چاہتے تھے تو زبردستی تلاشی لے کر یہاں تہ خانے سے ان دونوں کو برآمد کر سکتے تھے، پھر ان دونوں کا ہم جو حشر کرتے سو کرتے، تم بھی نہیں بچ سکتی تھیں۔'' یہ آواز وزیر خان کی تھی، جو فتح اور نشے کے غرور سے لبریز تھی۔

سائین نے سپاٹ، مگر دھیمی آواز میں کہا۔

''ہونے کو سب، کچھ ہوسکتا تھا، لیکن اسی ''سب کچھ'' ہونے میں ایک بھی بات نہ ہو پائے تو سمجھو کچھ نہیں ہوا۔ تم راجواڑیں فیصلے میں مجھے گھسیٹ کر خود سے شادی پر مجبور تو کر سکتے تھے، مگر میں تمہارا اصل مقصد پھر بھی کبھی پورا نہیں ہونے دیتی، تم کیا، کوئی بھی شوہر قانوناً اور شرعاً اپنی بیوی کی جائداد اور دولت زبردستی اپنے نام نہیں لکھوا سکتا۔''

سائین کے اس نپے تلے اور دوٹوک جواب پہ دونوں باپ بیٹے کو لمحہ بھر کے لیے سانپ سونگھ گیا پھر وزیر خان نے لب کشائی کی۔

''اب کیا چاہتی ہو تم؟''

''ان دونوں معصوموں کی جان بخش دو، انہیں جانے دو، میں اس شادی پر آمادہ ہو جاؤں گی، نہ صرف یہ بلکہ اپنا سب کچھ تمہارے نام بھی بہ رضا وخوشی لکھ دوں گی۔''

یکلخت کمرے میں اسرار بھری خاموشی طاری ہوگئی۔

''تم بھول رہی ہو کہ اس وقت تم اپنا کوئی بھی مطالبہ ہم سے منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو سائین!'' الف خان نے گمبھیر لہجے میں اس سے کہا۔

''ہم اب بھی چاہیں تو......''

''بھول تم رہے الف خان......'' معاً سائین نے اس کی بات کاٹ کر غیر تاثر لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی کہا تھا کہ زبردستی اور طاقت کے زور پر مجھے حاصل تو کیا جاسکتا ہے، مگر میری دولت جائداد نہیں، اگر میرے ساتھ ایسا کیا بھی تو میں جرگے کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہوں۔ جس کی شروعات تم سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی اور تمہیں اندازہ ہوگا ہی کہ ایک بار معاملہ جرگے سے حل ہو بھی جائے تو وہی جرگہ ملزم کے لیے نجات دہندہ بھی بن سکتا ہے۔''

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ ان کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ حاجی خدا بخش کی بیٹی، اتنی ذہین فطین اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ ''پیش آئند'' حالات کا اس قدر کھلا اور واضح ادراک بھی رکھتی ہے۔

یہی سبب تھا کہ سب کچھ کر سکنے کا اختیار رکھنے کے باوجود بھی وہ دونوں باپ بیٹے، ایک عورت کے سامنے خود کو مجبور سمجھ رہے تھے۔

بالآخر ''یہ ڈیل'' دو طرفہ کامیاب قرار پاگئی۔

●●●

سائین کی ایک آخری کوشش یہ بھی تھی کہ وہ...... خود کو وزیر خان جیسے ناپسندیدہ شخص سے شادی کرنے سے بچا لیتی اور ایسے ہی سب کچھ الف خان اور وزیر خان کے حوالے کر کے، خالقو اور نور کی زندگی بچانے کا سودا کر لیتی مگر...... بلاجواز اتنی بڑی جائداد اور زمینوں سے محروم ہو جانا اور پھر الف خان وغیرہ کی ملکیت میں چلے جانا، بہت سی باتوں کو جنم دے سکتا تھا، اس سے بچنے کے لیے، سائین نے اس بات پر بھی غور کیا تھا کہ جرگے کا ڈراما ہی رچا کے جرمانے کی صورت میں ہی وہ اپنا سب کچھ الف خان وغیرہ کے حوالے کر دیتی تو، اس میں یہ قباحت تھی کہ...... خالقو اور نور کو جرگے کے سامنے ظاہر کرنا پڑتا اور پھر دونوں کو روایتی اصول کے مطابق الف خان وغیرہ کے حوالے کر دیا جاتا،

معاوضہ

''آپ مجھے اس طرح پیار کیوں نہیں کرتے جس طرح شاہ رخ فلم میں کاجول سے کرتا ہے؟'' بیوی نے بڑے لاڈ کے ساتھ پوچھا۔

''وہ پیار کرنے کے دو کروڑ لیتا ہے!'' شوہر نے آنکھیں نکال کے جواب دیا۔ ''تمہارے ابا نے کبھی مجھے دو سو روپے بھی دیے!''

ہانیہ عزیز، کراچی

زندگی کے موڑ

یاد رکھو کہ ہر شخص کی زندگی میں دو اہم موڑ آتے ہیں... ایک داہنا موڑ اور دوسرا بایاں موڑ...!

رافع چودھری، جہلم

پھر چاہے جو حشر ان کا کیا جاتا۔

لہٰذا...... سائین کو اب احساس ہوا تھا کہ ساون فقیر نے پہلے ہی سے ان سارے عوامل اور مضمرات پر غور کر کے ہی اسے راستہ اختیار کرنے کی نصیحت کی تھی۔

●●●

نہایت قلیل عرصے میں سب کچھ انجام پا گیا۔

''ڈیل'' کامیاب ہوتے ہی سب سے پہلے خالقو اور نور کو بہ خیر وعافیت جانے دیا گیا کہ وہ کہیں بھی جا کے بلاخوف اپنی مرضی کے مطابق شادی کر کے زندگی بسر کر سکتے تھے۔

اس کے بعد سائین کی شادی وزیر خان سے ہوئی اور سائین نے خاموشی سے اپنا سب کچھ وزیر خان کے نام کر دیا۔ اس کی ہزاروں ایکڑوں پر پھیلی ہوئی قیمتی زمینیں الف خان کی جاگیر میں شامل ہوگئیں۔

اپنا سارا کچھ اپنے شوہر وزیر خان کے نام کرنے کے بعد سائین گم صم سی ہوگئی تھی ایک عجیب سی چپ لگ گئی تھی اسے، چہرہ روکھا پھیکا اور آنکھیں بے رونق سی نظر آنے لگی تھیں، دل بوجھل تھا، دماغ سن......

یہ سب کچھ ہو چکنے اور کر چکنے کے بعد...... سائین خود پر ایک لمحہ کے لیے ششدر بھی تھی۔ کبھی سوچتی تھی کہ وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس کے اندر بہت تبدیلی آگئی تھی...... شاید

یہ ساون فقیر کی محبت کا اثر تھا؟ وہ سوچتی کہ محض ایک اشارے پر اس نے اپنی زندگی کا اتنا اہم بڑا اور کڑا فیصلہ کیسے کرلیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں اس کے اپنے محبوب کی مرضی کا دخل تھا، اس کی نصیحت، اس کا حکم تھا۔ شاید یہی بات تھی۔ مگر نہیں، سائین کے لیے صرف یہی بات نہیں تھی اس کا حکم، اس کا کہنا ماننے کے لیے کچھ اور بھی تھا، کچھ ایسا تھا جس کے باعث سائین نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا اور اہم قدم اٹھایا تھا۔ اس کی بات میں ایسا کیا تھا جو اس کے کہنے پر اس نے یہ عمل کیا تھا؟ کیا اس میں اس کی فرماں برداری تھی یا کسی برآور ہوتی امید کا لالچ ...... پھر کیوں ساون فقیر کے یہ الفاظ بار بار اب اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ وہ آخری الفاظ جن پر اس نے فوراً عمل کیا تھا۔

''تم خواہشات کے دروازے سے اپنا ماتھا اٹھاؤ اور رب سائیں کے در پہ اپنا ماتھا ٹیک دو، تمہیں دو معصوم اور بے گناہ انسانوں کو بچانے اور ان کی فلاح کی خاطر اپنی خواہشات کی ایک بڑی قربانی دینا ہوگی، لیکن خبردار اس کا اجر کسی بشر سے نہیں صرف اور صرف اپنے اللہ سائیں سے مانگنا، اسی سے اجر کی توقع رکھنا۔''

''سائیں! میں تو جیتے جی مرجاؤں گی۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔

''پگلی! تم مرو گی نہیں امر ہوجاؤ گی اللہ کے در پہ تم سرخرو ہوجاؤ گی۔'' ساون فقیر نے بڑے جذب کے عالم میں اور پورے یقین سے کہا تھا۔

''آج تک تم دل کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتی رہی ہو اب اس در پہ ماتھا بھی ٹیک کر دیکھو، یہ اللہ کا در ہے جہاں انہونی بھی ہوتی ہوجاتی ہے اور انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے، جسے اس کی توقع بھی نہیں ہوتی، پس! ایک ذرا اس کے لیے قربانی تو دے کر دیکھ......''

اب سائین اس امید کے آسرے پہ کچھ دیکھنے کی منتظر تھی۔

⊛⊛⊛

دونوں باپ بیٹے بہت شاداں وفرحاں تھے، ان کی جاگیر میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً شمالاً جنوباً تک پھیل گئی تھیں۔ وقت کا وتیرہ گزرنا ہے، وہ گزرتا رہا۔ پھر تھوڑے عرصے میں وزیر خان نے وہی کیا تھا جس کی توقع سائین کو بھی تھی، یعنی اسے بیکار ''شے'' سمجھ کر حویلی کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی طرف سے بڑی سنگ دلی اور بے رخی برتی جاتی۔ وقت نے پلٹا کھایا۔ امید کا جادو چلا، اجر کے ملنے کا وقت اور قربانی کے صلے کا وہ بڑا انوکھا دن تھا کہ پتا چل گیا، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے، حرکت میں آتی ہے تو ظالم جابر اور نفس پرست انسان اس کی تیزی کی پیمائش تک بھی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

وزیر خان شکار کے لیے چھو کے نیم صحرائی علاقے کی طرف گیا تھا کہ کسی نامی گرامی خطرناک اور صوبائی شہرت یافتہ ڈاکوؤں کے گروہ سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ اسے تاوان کی خاطر اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر وزیر خان اور اس کے چند مسلح ساتھیوں نے ان سے جنگ کی ٹھانی۔ اس جنگ میں وزیر خان سردار ڈاکو کی گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔

جوان بیٹے کی لاش حویلی پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ باپ الف خان یہ غم نہ سہ سکا، اسے سکتہ ہوگیا۔

کومے کی صورت میں وہ تین دن شہر کے بڑے اسپتال میں رہا اور چوتھے دن وہ بھی چل بسا۔

سائین نے چالیس روز سفید جوڑا پہنے رکھا۔

اس کے سات روز بعد وہ اب عام لباس میں نظر آنے لگی۔

اس روز وہ ...... سائیں جوڑیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ پہنچی۔ وہ ملنگ ساون فقیر سے ملنا چاہتی تھی مگر وہاں مریدین اور خدام سے معلوم ہوا کہ ملنگ فقیر ساون کسی کو بتائے بغیر کہیں چلے گئے ہیں۔ سائین کے دل کو دھچکا لگا۔ اسے ساون کے یہ الفاظ یاد آنے لگے۔ ''در مولا پر اس کی امید جگائے رکھو، اجر بشر سے نہیں، صرف رب سے مانگو جو انہونی کو ہونی کر دیتا ہے۔''

وہ سوچنے لگی، انہونی تو ہوگئی تھی اور شاید اجر بھی مل گیا تھا مگر آس کیوں قریب ہوتے ہوئے دور چلی گئی تھی؟

وہ دل مسوس کر واپس لوٹ آئی۔

اب وہ ساری جاگیر کی مالک تھی، گوٹھ کی دولت مند بیوہ وڈیرنی کہلانے کی حقدار تھی مگر اس نے اپنا سارا مال غریبوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے گوٹھ ہی میں باقاعدہ غریب، نادار اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ادارہ قائم کر دیا اور اس میں عورتوں ہی کو ملازم رکھا۔

ایک روز وہ خود اپنی حویلی کے باہر اپنے ہاتھ سے لنگر بانٹ رہی تھی کہ اچانک دو ہاتھ آگے بڑھے۔ وہ کسی کی مخصوص خوشبو کو پہچان گئی اور چادر ہٹا کے، سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے ساون فقیر کھڑا تھا، اس کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ بے اختیار سائین نے ان دونوں ہاتھوں کو تھام کر چوما اور اپنی آنکھوں سے لگالیا۔